(ماہ نامہ)

سب رس



ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

[illegible] ۱۵۳
[illegible] ۲۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
[illegible] ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۹ — بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء — شمارہ ۱

فہرست مضامین

آئرن کے لئے لوہا، سلفر کے لئے گندھک وغیرہ۔

(۳) یہ ضروری نہیں کہ جو انگریزی الفاظ اردو میں لئے جائیں ان کو بجنسہ لکھا جائے بلکہ انہیں اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے مثلاً جسٹس آف دی پیس کو اردو میں جسٹس پیس کہہ سکتے ہیں۔

(۴) سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے مترادف کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لئے جائیں تو کوئی ہرج نہیں مثلاً (Genus, Species, Order) وغیرہ

(۵) یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اردو میں اس سے قبل لکھی جا چکی ہیں انھیں پیش نظر رکھے اور وہی اردو الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرے جو ان کتابوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

(۶) اگر انگریزی جملے میں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیہ پر یا مناسب ہو تو متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے۔

(۷) ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۸) کیمسٹری کی اصطلاحات کو بجنسہ اردو میں لے لیا جائے۔ البتہ کیمیائی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں تو انھیں برقرار رکھا جائے لیکن مرکبات کے نام انگریزی ہی میں رہیں جیسے ہائیڈرو سلفرک۔ سلفرک ایسڈ وغیرہ۔

دہلی کالج نے اردو میں سائنس کی جو کتابیں شائع کیں ان کی اشاعت میں مسٹر بتروس پرنسپل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے یہ کام چھوٹے پیمانہ پر شروع کر دیا تھا جب سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کا کام بھی کالج والے ہی کرتے تھے۔ ورنیکلر سوسائٹی ٹرانسلیشن سوسائٹی اردو سوسائٹی۔ لائبریری آف یوسفل نالج وغیرہ سب ہی کے نام ہیں۔ مسٹر بتروس کے خلیفہ پر ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل ہوئے جو ان کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔

اس انجمن کے قیام سے قبل دہلی کالج میں ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کالج کے تین طالب علم (جن میں ماسٹر رامچندر پیش پیش تھے) اوقات درس کے بعد فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کر کے مسٹر بتروس کو دکھاتے اور وہ اس ترجمے کی اصلاح کرتے تھے۔ اس طرح جب ترجمہ مکمل ہو جاتا تو طباعت کے بعد نیچے کی جماعتوں کے نصاب میں داخل کر دیا جاتا۔ دہلی کالج میں تراجم کی ابتدا سنہ ۱۸۴۱ء میں ہوئی جبکہ مسٹر بتروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر ہوا۔ ۱۸۴۵ء تا سنہ ۱۸۵۳ء کے نصاب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس کی تعلیم کس درجے تک تھی۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں تو سائنس کی جماعت الگ قائم ہو چکی تھی اور جماعت اول تا ششم کی اردو میں ہی تعلیم دی جاتی تھی۔

غرض دلی کالج ہی ایک ایسی درسگاہ تھی جہاں مغربی علوم مثلاً ہیئت، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور نتائج ہر سال اچھے رہتے تھے۔ چنانچہ مسٹر کارگل پرنسپل دلی کالج نے اپنی رپورٹ بابت سنہ ۱۸۵۲ء میں یہ لکھا ہے کہ

"مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے طالب علم سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے"

اس رپورٹ پر لفٹننٹ گورنر بہادر نے اس طرح اظہار خوشنودی کیا ہے۔

"طلبہ شعبہ مشرقی کی سائنس کی ترقی کے متعلق

اردو میں سائنسی ادب

(دہلی کالج کی خدمات)

شمس الامراء اور شاہان اودھ کے بعد اردو کو علمی موضوعات سے روشناس کرانے کی باضابطہ اور منظم کوشش دہلی کالج میں کی گئی۔ اس کا دائرۂ عمل ان دونوں سے زیادہ وسیع اور منظم تھا۔ خوش قسمتی سے اس کو ایسے ذی علم اصحاب مل گئے تھے جنہوں نے اردو کے تہی دامن کو مغربی علوم کے جواہر پاروں سے مالا مال کر دیا۔ چونکہ اس کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اس لئے نصابی ضروریات کے تحت سائنس اور دیگر مغربی علوم کی کئی کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور اس کے فیض یافتوں نے بھی اس قسم کی کتابیں تالیف کیں۔ مختلف علوم اور سائنس کی اشاعت کے لئے ۱۸۴۳ء میں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے پہلی دفعہ ترجمے کے ایسے اصول مرتب کئے جو ترجمے کی مشکلات کو دور کرنے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوئے۔

اگرچہ یہ کالج ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا لیکن اس کے ابتدائی (۳۰) سال کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس عرصہ تک اس میں انگریزی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم ہوتی ہوگی۔ مجلس تعلیم عامہ کی سفارش پر ۱۸۲۵ء میں اس کالج کے لئے پانسو روپے ماہانہ مقرر کئے گئے اور باضابطہ تعلیم کا انتظام عمل میں آیا۔

۱۸۲۸ء میں سر چارلس مٹکاف کی سفارش پر اس درسگاہ میں ایک انگریزی جماعت کھولی گئی۔ نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر وزیر بادشاہ اودھ نے ۱۸۳۳-۳۴ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپے تعلیمی اغراض کے لئے وقف کر دیے۔

اس کالج کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ یہاں کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور سوائے انگریزی کے دوسرے تمام مضامین مثلاً ریاضی، فلسفہ، ہیئت اور سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ مغربی علوم کو اردو میں پڑھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ان علوم کی اردو میں کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں۔ اردو کے حامیوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۸۴۰ء میں ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی۔ اس سے قبل سکول بک سوسائٹی کی طرف سے ہزاروں نصابی کتابیں تیار ہو کر شائع ہو چکی تھیں لیکن یہ سب ابتدائی قسم کی کتابیں تھیں۔ ۱۸۴۱ء میں ایجوکیشنل کمیٹی کے تحت ایک ذیلی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں ایسے اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا جو انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے کے اہل تھے۔ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ درسی کتابوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے کتابیں پہلے انگریزی میں لکھوائی جائیں اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔

دہلی ورنیکلر سوسائٹی کے قیام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ جدید ترین کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے ذریعہ اردو زبان کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کو آگے بڑھانے میں ہندوستانی اور انگریز برابر کے شریک تھے۔ اس سوسائٹی کے اخراجات کی پابجائی کے لئے چندے اور عطیے لئے گئے۔ شاہ اودھ ان کے صاحبزادے اور ان کے [illegible] امراء نے بھی عطیے دیے۔ اسی طرح حیدرآباد دکن سے نواب سراج الملک بہادر نے بھی رقمی عطیوں سے اس سوسائٹی کی مالی امداد کی۔ اس سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر بتروس پرنسپل دہلی کالج تھے۔ سوسائٹی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے جو قواعد وضع کئے تھے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۱) سائنس کا کوئی ایسا لفظ جس کا مترادف اردو میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو [illegible] لے لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً سوڈیم۔ کلورین وغیرہ۔

(۲) اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا مترادف اردو میں موجود ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کیا جائے جیسے

جو یقین دلایا گیا ہے اس سے بعید مسرت ہوگی۔[1]

دلی کالج اور ورنیکلر سوسائٹی نے جو ترجمے اور تالیفات شایع کیں ان کی فہرست درج ذیل کی جاتی ہے:—

(۱) اصول علم مثلث و تراش ہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر۔ رامچندر سنہ ۱۸۴۳ء۔
(۲) رسالہ مساحت مستعمل و علم مثلث۔ پنڈت اجودھیا پرشاد سنہ ۱۸۴۴ء۔
(۳) رسالہ در باب پیمایش انگریزی بوسیلہ تھیوڈولائٹ کے ترجمہ ہر دیو سنگھ سنہ ۱۸۴۰ء
(۴) اصول قواعد مالیات۔ پنڈت اجودھیا پرشاد سنہ ۱۸۵۰ء
(۵) جبر و مقابلہ۔ مولوی کریم بخش۔ سنہ ۱۸۴۸ء
(۶) ہندسہ بالجبر۔ رام چندر۔ سنہ ۱۸۴۲ء
(۷) رسالہ مقناطیس (لائبریری آف یوزفل نالج کے رسالے کا ترجمہ) سید کمال الدین حیدر۔ سنہ ۱۸۵۲ء
(۸) تحریر اقلیدس (مقالہ ا تا ۶ و ۱۱ تا ۱۲)
(۹) الجبرا (ترجمہ برجز)
(۱۰) عملی علم ہندسہ
(۱۱) اصول علم ہیئت (ترجمہ علم ہیئت ہرشل)
(۱۲) رسالہ کیمسٹری (ترجمہ پارکر)
(۱۳) استعمال آلات ریاضی
(۱۴) تحلیلی علم ہندسہ
(۱۵) میکانیات (لارڈنر)
(۱۶) مساحت (ترجمہ تھیوڈولک)
(۱۷) طبیعیات (ترجمہ ارناٹ) سنہ ۱۸۴۷ء
(۱۸) رسالہ طب (انگریزی سے) پنڈت رام کشن دہلوی سنہ ۱۸۴۰ء
(۱۹) رسالہ جراحی۔
(۲۰) حرکیات و سکونیات
(۲۱) علم المناظر (ترجمہ فلپ)
(۲۲) حرارت (لائبریری آف یوزفل نالج کے رسالہ کا ترجمہ)
(۲۳) ہائیڈرالکس (" " " ")
(۲۴) Double refraction and Polarization of Light
(۲۵) رسالہ علم برق (ترجمہ راجٹ)
(۲۶) گالوانزم (" " ")
(۲۷) رسالہ اصول حساب (ترجمہ ڈی مورگن) بابو ہر دیو سنگھ

کالج کے اساتذہ میں مولوی مملوک علی۔ ماسٹر رامچندر، پنڈت اجودھیا پرشاد۔ پنڈت رام کشن دہلوی۔ بابو ہر دیو سنگھ نے ریاضی۔ سائنس اور طب پر مختلف کتابیں لکھیں۔ ماسٹر رامچندر نے ایک کتاب شایع کی جس میں تفرقی احصا (Differential Calculus) کا ایک نیا طریقہ بیان کیا۔ اس پر پروفیسر کلانڈ (اڈنبرا یونیورسٹی) اور پروفیسر فنشر (سیلین اینڈ ریوس) نے بہت اچھی رائے دی۔ ماسٹر رامچندر نے جو طریقے ایجاد کئے یورپ اور ہندوستان کے کالجوں میں رائج ہو گئے۔ ڈاکٹر سید سجاد صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ دہلی سے لا کر کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ میں داخل کیا تھا۔ مگر ہم کو اس کا پتہ نہ چلا۔ اس کتاب کے دیباچہ میں ماسٹر رامچندر نے لکھا تھا کہ "اس کتاب کی کاپیاں انگریزی زبان میں مطبع میں بیٹھ کر میں خود لکھتا تھا" یہ کتاب انگریزی زبان میں لیتھو میں چھپی تھی۔ ان کی ایک دوسری کتاب کلیات و جزئیات (Maxima and Minima) کلکتہ میں چھپی۔ اس کتاب کے کئی نسخے انگلستان بھیجے گئے اور پروفیسر مارگن پروفیسر ریاضیات لندن یونیورسٹی نے اس کتاب کی بہت قدر کی۔ پروفیسر موصوف نے ان کے چیرمن کرنل سائیکس کو ایک خط لکھا جس میں ماسٹر رامچندر کی اس ایجاد کی بہت تعریف کی تھی اور یہاں تک لکھا تھا کہ اس کتاب کے انتخابات انگلستان کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شریک کئے جائیں۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے معزز ممبروں نے ایک خلعت پنج پارچہ اور دو ہزار روپے نقد بطور انعام ماسٹر رامچندر کے لئے

[1] و [2] مرحوم دہلی کالج

منظور کئے اور یہ خلعت وانعام ۱۸۵۰ء کے ایک جلسہ میں
ماسٹر رامچندر کو ان کی علمی و تعلیمی خدمات کے صلے میں عطا کیا گیا۔
کالج کے قدیم طلبہ میں ماسٹر رامچندر نے جو بعد میں
دہلی کالج کے مدرس ہو گئے تھے، سائنس کی کئی کتابیں لکھیں۔
شمس العلماء ذکاء اللہ نے ریاضی کی تمام شاخوں پر ادنیٰ
سے اعلیٰ درجے تک نیز طبیعیات وغیرہ پر بے شمار کتابیں
لکھی ہیں جو بجائے خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ہیں۔ ہم
ان کی کتابوں کا آئندہ باب میں تفصیل سے ذکر کریں گے۔
۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی وجہ سے دہلی تباہ ہو گئی۔
کالج (۷) سال تک بند رہا اور ۱۸۷۷ء میں حکومت ہند
نے اس کو لاہور کالج میں مدغم کر دیا اور جو سعید علی دا دہلی
کا نام ہو رہا تھا اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب
اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" میں اس طرح اپنے دلی تاثرات
کا اظہار کرتے ہیں:۔

"اس نے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا جس سے
بہتر کوئی اور ہمارے ملک کے حق میں ہو نہیں سکتا۔ اگرچہ اس کے
مٹتے ہی یہ طریقہ بھی مٹ گیا لیکن اتنی مدت کے تجربے کے بعد
ہماری یونیورسٹیاں رفتہ رفتہ پھر اسی طرف عود کر رہی
ہیں اور آخر یہی ڈھنگ اختیار کرنا پڑے گا۔ ایسی حالت
میں اسے مرحوم تو کیا شہید بھی کہیں تو بجا ہے۔ کیونکہ وہ
بلا وجہ اور بغیر کسی الزام کے ملکی اور سیاسی مصلحتوں کے
بھینٹ چڑھا دیا گیا۔"

باوجود کوشش اور تلاش کے ہم کو دہلی کالج کی مطبوعات
میں سے صرف (۹) کتابوں کا پتہ چلا۔ اب ان کتابوں کے متعلق
تفصیلی معلومات درج کی جاتی ہیں۔

اصول علم مثلث وتراشہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر

تقطیع ۱۰½" × ۷" صفحات (۲۱۷) سنہ طباعت ۱۸۴۳ء مترجم رامچندر سرورق پر انگریزی اور
اردو دونوں میں کتاب اور مترجم کے نام درج ہیں۔ مطبع کا نام
کہیں حوالہ نہیں۔ سرورق کی اردو عبارت یہ ہے:۔

"اصول
علم مثلث وتراشہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر کے
ترجمہ رامچندر اسکالر اعلیٰ دہلی کالج کے نے تصنیفات ہٹن صاحب
اور بوشارلٹ صاحب اور سمسن صاحب کے سے کیے"

صفحہ (۲) اور (۳) پر "نقشہ فہرست" کی سرخی کے تحت
کتاب کو حسب ذیل عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے:۔

(۱) علم مثلث مستقیم الاضلاع بالہندسہ (اس میں دو باب ہیں)
(۲) علم مثلث مستقیم الاضلاع بالجبر (اس کے نو ابواب ہیں)
(۳) علم مثلث کروی (جو چار ابواب پر مشتمل ہے)
(۴) تراشہائے مخروطی (" ")
(۵) علم ہندسہ بالجبر (اس میں آٹھ ابواب ہیں)
(۶) تتمہ

مترجم کے دیباچہ کا اقتباس درج ذیل ہے:۔
"...... باعث تالیف کرنے اس رسالہ کا...... بیان
کرتا ہوں...... کہ صاحب عالی مراتب والا مناقب جناب
بوٹروس صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ دہلی کو منظور نظر یہ ہے کہ
جمیع کتب علمیہ انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ ہو کر طلبہ عربی
اور فارسی خواں کو پڑھائی جاویں اور طلبہ مدرسہ فارسی کا
بھی میل طبیعت طرف تحصیل علم ریاضی کے بسبب ان کی سعی بلیغ
کے بیچ سیکھنے رسالہ جبر و مقابلہ کے جو اسی خاکسار نے پہلے تالیف
کیا ہے۔ دریافت ہوا اس سبب سے اس ہیچمدان نے قصد
اس رسالہ کی تالیف کا کیا اور ہٹن صاحب اور سمسن صاحب
اور بوشارلٹ صاحب کے مصنفات سے استعانت چاہی۔
باعث اس کا یہ ہے کہ بہت سی کتابیں علم ہیئت اور علم ادوات
کی زبان انگریزی میں ایسی ہیں کہ بغیر جاننے علم مثلث اور فروع
ریاضی کی سمجھنا ان کا متعذر ہوتا ہے۔ پس اول بیان کرنا ان
مطالب ضروری کا جو کتب مذکورۃ الصدر میں سے اخذ کی گئی
ہیں لازم پڑا...... امید ناظرین اس کتاب کے سے یہ

ہے کہ اگر بوقت مطالعہ کے اس کی رطب و یابس پر مطلع ہوں تو اس خاکسار کی کم استعدادی پر نظر کرکے اغماض نظر اس سے واجب جانیں بیت

بپوشش گر بہ خطائی رسی و طعنہ مزن
کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نہ بود

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور معیار کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ اس ضخیم کتاب میں مترجم نے بڑی محنت اور کاوش سے پورا مواد یکجا کر دیا ہے۔ ہر مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ ہندسی اشکال اور مثالوں سے اس کی تشریح کی گئی ہے۔

"علم مثلث مستقیم الاضلاع بالہندسہ" کے تحت جدول مثلثی بنانے اور مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ "علم مثلث مستقیم الاضلاع بالجبر" میں جیب مستوی و جیب التمام کے جدول بنانے کی ترکیب، مثلث قائم الزاویہ۔ حادۃ الزاویہ اور منفرجۃ الزاویہ کے سوالات حل کرنے کے طریقے اور پیمایش مثلثی وغیرہ کے سوالات مع امثلہ و اشکال درج کئے گئے ہیں۔ اس حصے کی ایک عبارت یہ ہے جس میں طالب علم کو صورتوں کے یاد کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"اگر طالب علم خوب مہارت پیدا کیا چاہوے علم مثلث میں اور خوب واقف ہوا چاہوے فوائد صورتوں مذکورۂ بالا کے سے اور بوسیلہ ان صورتوں کے اور صورتیں پیدا کرنے کی قوت حاصل کیا چاہوے تو لازم ہے اسے کہ بہت مشق کرے اور ہر قیمت جس لا اور جم لا اور مس لا مفصلۂ ذیل کو خوب سمجھے اور بغیر اعانت کسی کے ثابت کرے۔"

اس کتاب میں جو سوالات درج ہیں ان میں سے ایک کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:

"معلوم ہیں ہمیں تینوں ضلع ایک مثلث کے۔ چاہتے ہیں ہم دریافت کرنا نصف قطر اس دائرہ کا جو بنایا جاوے بیچ اس مثلث کے۔"

"علم مثلث کروی" کے تحت قائم الزاویہ مثلثوں اور غیر قائم الزاویہ کروی مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتشریح بیان کئے گئے ہیں۔

"تراشیں مخروطی" کے تحت تین قسم کے خطوط کا حال درج ہے جن کو قریب البیضوی، بیضوی اور بعید البیضوی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور ہر خط کے متعلق ضروری معلومات اور اشکال دی گئی ہیں۔

"علم ہندسہ بالجبر" میں علامات جبریہ کے ذریعے مقادیر ہندسی معلوم کرنے کی ترکیب، مساوات خط مستقیم و تراش ہائے مخروطی وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔

"تتمہ" کی سرخی کے تحت قوس اور کرہ و مخروط کی مساوات کا حال درج ہے۔

اس کتاب کا اسلوب بیان تقریباً وہی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں کا ہے۔ عربی الفاظ کا جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً "علی الاستقامت۔ فی النسبت۔ متقاطع علی القوایم۔ مابین اور منطبق" وغیرہ مانناکو ماننا۔ ہاتھ کو ہات۔ لوکار ثم کو لوکارسم لکھا ہے۔

صفحہ (۲۶) کے بعد کتاب کے آخری صفحات: (۳۱۱ تا ۳۱۴) غلطی سے لگ گئے ہیں۔ یہ کتاب کتبخانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر (م ۵۱۰) پر رکھی ہوئی ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

صحیفہ مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

ترقی پسند فن کار سے

اے ہمصفیر! گو تری پرواز ہے بلند
لیکن بتا، کسی کو ترقی ہے ناپسند؟

میری نظر سے تیرے مقاصد نہاں نہیں
تیرے خلوصِ عزم سے میں بدگماں نہیں

ہے تلخیٔ حیات سے معمور تیرا جام
تیری نظر میں قہر ہے بے ربطیٔ نظام

تیری نوا میں جذب ہے آوازِ زندگی
تیرے تفکرات ہیں دمسازِ زندگی

دل تیرا کائنات کا آئینہ دار ہے
تیری صدا شکستہ دلوں کی پکار ہے

فطرت کو تو نے طرزِ تکلم سکھا دیا
احساسِ زندگی کو ادب میں بسا دیا

لیکن، سمجھ رہا ہے یہ سارا زمانہ کیا—؟
"کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"—؟

سُن! میں بتاؤں اصل حقیقت عتاب کی
اور اہلِ فن کی برہمی و اجتناب کی

وابستہ ہے جو شیشہ گرانِ ہنر سے تو
ہے دُور دُور اس لئے اہلِ نظر سے تو

رشحاتِ فکرِ خام کا تو پردہ دار ہے
مہمل نگارشات کا خود اشتہار ہے

چھوٹے نگوں کی عام ہوئیں ریزہ کاریاں
نااہلیت بھی زعمِ ہنر میں ہے سرگراں

سطحِ ادب تباہی کی آماجگاہ ہے
اور شرمسارِ عفتِ قلب و نگاہ ہے

تنگ آگہی ہے فکرِ فرومایہ سے نظر
ہے مرگِ ذوق، یہ ترا اندازِ درگزر!

فہرس میں کرگسوں کے جو شاہیں کا نام ہو
چرچا نہ کیوں ضمیر فروشی کا عام ہو

محصور کر رہا ہے تجھے تیرا حسنِ ظن
تو دل شکن نہیں، ترا عنوان ہے دل شکن!

ہے مضمحل ضمیر ترا قید و بند میں
ناحق الجھ رہا ہے پسند ناپسند میں

اس طرح اپنے خونِ جگر کو تلف نہ کر
فطری صلاحیت کے تحفظ پہ کر نظر

"جس کی بہار تو ہو، یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں"

ہر دور اپنے دور میں خود مجتہد رہا — مقصد حیاتِ نو کا سدا متجدد رہا
فرق و تمیز رنگ و اثر ناگزیر ہے — ہر ذوقِ تندرست، ترقی پذیر ہے
تابندہ یہ جو کاخ علوم و فنون ہے — دیکھ، اس کے بند بند میں کس کس کا خون ہے!
تیرے بیان، تیرے قلم کی ہے جو زباں — وہ خود ہے انقلابِ مسلسل کی داستاں
نقشِ دوام گرمیٔ خونِ جگر سے ہے — یہ ارتقائے فن، تب و تابِ ہنر سے ہے
کسبِ کمال، سلسلۂ ناتمام ہے — معماریٔ سلف کا تو قائم مقام ہے
اسرارِ کائنات کا فن کار ہے امیں — اخلاصِ عالمی سے ہے پیدا دمِ یقیں
شاہیں کو احتیاجِ نشیمن، نہ انجمن — ہے شاہ باز کے لئے سارا جہاں چمن

تو اپنی جاں فشانی کا عنواں بدل کے دیکھ!
جوہر پھر اپنی ندرتِ فکر و عمل کے دیکھ!

بن کر سحابِ فیض، زمانے پہ چھائے جا — انسانیت نواز، ترانے سنائے جا
افکارِ نو میں وحدتِ نوعی تلاش کر — اور سرمدیٔ حیات کے اسرار فاش کر
تیرا پیامِ فکر و نظر عالمی رہے — سررشتۂ فروغِ عمل باہمی رہے
پیدا جہانِ تازہ ہو تیری نگاہ سے — روشن ہو چشمِ دہر تری جلوہ گاہ سے
وابستہ تیرے دم سے ہے رنگینیٔ حیات — تیرے لہو سے گرم و رواں روحِ کائنات
احسان کر، رعونتِ احساں کو بھول جا — سوزِ یقیں میں شہرتِ ارزاں کو بھول جا

ذوقِ سفر پہ عشرتِ منزل حرام ہے!
تیرا تو ہر مقام سے آگے مقام ہے!

بشیر النساء بیگم بشیر

[illegible] گھر
[illegible] شیشے سے بالکل دوڑی کچھ
[illegible] میں داخل ہو دروازہ بند
[illegible] ایک ایک کرکے سب کپڑے
[illegible] کا احساس ہوا تو بازوؤں والی کرسی
[illegible] دبک کر بیٹھ گئی، کرسی میں بیٹھی بیٹھی وہ
[illegible] پہن کر جانے کے لئے سوچا تھا۔ "وارڈروب"
[illegible] نکلی۔

سہیلیاں باہر کھڑی تھیں۔ فضا میں ایک نگین
[illegible] مختلف سروں میں اس کا [illegible]
[illegible] سب وقت اس طرح ادا ہو رہے تھے۔
"عجیب بھولی بھالی ہے اپنی وسیم..... اس کو
[illegible] نہیں آتی۔ یہ بھی تو نہیں سمجھتی اس کا اثر
[illegible] پر کیا ہوگا..... اس کو تو کالج کی ہوا نے
[illegible] نہیں!"

سہیلیاں بے وقت اور بغیر اطلاع کے آگئی تھیں۔
[illegible] نے بیٹھے بیٹھے شلوار ایک چلی سی دے دی تھی کہ وہ
[illegible] فرزند تھیں۔

وہ چھوٹی چھوٹی گول سڈول چھاتیوں کے ابھار پر
[illegible] بہت ملائم تھی، پھر بھی اس نے زردہ، تربوزی
[illegible] رنگ کی شیز لباس فیشن کے خرید کر رکھی تھیں،
[illegible] کرسی میں دبکی اور سکڑی بیٹھی بیٹھی کر نیم گلابی
[illegible] معلوم ہوئی، الجھا سا پیدا ہوا اس نے
[illegible] نہ پہن لے، سہیلیوں کا
[illegible] وقت سے کچھ
[illegible] پہننے کا خیال بھی
[illegible] کشش بھی

اسے ہی پہننے پڑتے تھے وہ سمجھتی تو تھی [illegible]
مگر [illegible] سے ابھی پوری طرح کی [illegible]
بھالی سمجھ کر سب اسے آگے ڈھکیل دیتے [illegible]
کو تجربہ ہو گیا تھا کہ اسے شکستہ [illegible] خیال
ہوتا ہے...... اسے خود بھی بغیر کسی [illegible]
آگے پیچھے ہونے میں کچھ لطف محسوس ہوتا تھا۔ آج [illegible]
میں اسے اپنی ذمہ داری کا احساس بہت ہی ستا رہا تھا۔
خیالات میں کھوئی ہوئی، موتیا شلوار ڈھونڈھنے
میں مصروف تھی، اس روا روی میں جوڑا بدلنے کا
مقصد بھی محض موتیا شلوار ہی تھا۔ تنہائی میں ساتھ والیوں
کے انتظار کے خیال اور ان کی کھسر پھسر سے تلملا رہی تھی فوراً
کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر ہاتھ بڑھا دیا اور نیم گلابی شیز
کھینچ کر پھر بازوؤں والی کرسی میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اور بڑے
اطمینان سے شیز کے بازو اپنے گرد پھیلا شیز پہننے لگی،
ایک دفعہ نیچے اوپر کرکے دیکھا [illegible] پھر سیدھے کر دیکھا
...... ہاں گھڑی نے وہ بجا دئے [illegible] کے لئے ابھی
وقت کافی تھا، تمام بند پورے اتار چڑھاؤ کا خیال رکھتے
سلیقے سے باندھتی گئی، جب شیز باندھ چکی، تو گردن [illegible]
کی طرف جھک گئی، ایک لمبا سانس [illegible] کھڑی ہو گئی۔ [illegible]
تنگی کا احساس کھو چکی تھی، سینے کا ابھار [illegible]
[illegible] وارڈروب میں موتیا شلوار تلاش کرنے لگی.......
ایک ایک کرکے تمام کپڑے بازوؤں والی کرسی پر ڈال دیئے
...... موتیا شلوار کی تلاش میں ایک بہت بڑی کوفت محسوس
کر رہی تھی، جو ہاتھ آتا الٹ پلٹ کرکے ادھر پھینک دیتی
تھی۔ ہونٹ کھلے کے کھلے تھے، گویا کسی طویل بوسہ کی لذت
سے محروم ہیں، رگ رگ سے اس پڑی ہوئی [illegible]
طرح پھڑکی ہوئی ظاہر تھی، بال بھی وہ [illegible]
پھر گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلا رہی [illegible]
[illegible] کا ہی صورت میں [illegible]
[illegible]

نہ دیا تو دروازہ کھٹکھٹانے لگی، ماما کو زور زور سے آوازیں دیں۔۔۔۔ ماما دروازے کے باہر آکر رکی۔

"میری موتیا شلوار کہاں ہے؟"۔۔۔۔ ماما کا رنگ زرد پڑ گیا، بیچاری سہم کر دروازے کے ساتھ لگ گئی، وسیم پھر زور سے چلائی۔۔۔۔ "میری موتیا شلوار۔۔۔۔" ماما نہایت نرم لہجے میں بولی "بڑی بی نے شاید میلے کپڑوں میں ڈال دی ہو۔۔۔۔ اسے سخت غصہ آیا، اور جھنجھلا کر کہا وہ ہر صورت میں اس کی موتیا شلوار تلاش کر کے لائے۔

ماما شلوار تلاش کر کے لائی تو گورا گورا نیم گلابی بازو نکال کر شلوار کو پکڑ لیا۔ وسیم کے ننگے بازو پر شلوار رکھتے ہوئے، ماما کے جسم میں ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی، جیسے چھوٹی بی بی کے تنگ سے دوچار ہو گئی ہے! شلوار لے کر وسیم کو ایک اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔۔۔۔ ڈرائینگ روم سے گزر کر ماما مسکراتی جا رہی تھی۔ سیڑھیاں پر چڑھنے کو تھی کہ وسیم کی سہیلیوں نے پوچھا "وسیم کہاں ہے؟"۔۔۔۔ ماما کے ہونٹ پھر پھڑائے اور وہ یہ کہہ کر اوپر چڑھ گئی "صرف موتیا شلوار پہننی باقی ہے!"

کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ وسیم کی موتیا شلوار پر پان کا داغ لگ گیا تھا۔ اور پیک کچھ اس طرح سے گری تھی کہ داغ اگر بے پروائی سے بھی دیکھا جائے تو انگور کا چھوٹا سا پتا معلوم دیتا تھا۔ وسیم پان کھانے کی عادی نہ تھی، کسی نے دیا تھا، اور وہ خلوص سے کھا گئی تھی۔ جب داغ اس کی موتیا شلوار پر پڑا تھا تو اسے اپنی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا کافی صدمہ ہوا تھا۔ یہ موتیا شلوار اسے اپنی ہر شلوار سے پیار تھی کہ سرخ بانات کی شلوار سے بھی عزیز تھی، اور وہ اسے اسی وقت پہنتی تھی، جب کبھی کچھ مسرور ہونے کی اہمیت محسوس کرتی تھی۔

وسیم اپنی سہیلیوں کے ساتھ برآمدے میں کھڑی بے تابی سے تانگے کا انتظار کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ تازہ دم اور خوبصورت معلوم دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک بشاشت کھیل رہی تھی، سینما جانے اور نئی فلم دیکھنے کا احساس لئے ہوئے نہایت خوش تھی۔

تانگہ جب آخری موڑ مڑا، تو اس کی آنکھوں کے سامنے بالوں کی ایک لٹ آگئی۔ اس نے اس کو ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا۔ اور بازار کی آمد و رفت پر حقیرانہ طور پر سخت نکتہ چینی کرنے لگی، سب نے اس کی طرف دیکھا، ایسی طنز اور نکتہ چینی وسیم کی فطرت کے خلاف تھی۔۔۔۔ دو بچے اور آٹھ لڑکیاں دو تانگوں میں تماشا دیکھنے جا رہے تھے۔ اس مختصر سے قافلے پر ہر راہ گزر کی نظر پڑ رہی تھی۔ یہی بات وسیم کی نکتہ چینی اور طنز کا باعث تھی، وہ چاہتی تھی برقعہ الٹ دے اور بے نقاب ہو جائے، اور دیکھے کون اس کی طرف دیکھنے کی جرأت کرتا ہے۔

تانگہ کھٹ سے تھیٹر کے سامنے آکر رکا۔ وسیم کو ایک دھکا سا لگا۔ اس کے خیالات کا تسلسل رک گیا۔ وہ کچھ خوفزدہ سی ہو کر اتری۔۔۔۔۔۔۔ وہ سب خوش خوش اور ہم مجاتی اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھیں اور لوگوں کا بڑے دل فریب زاویوں سے مطالعہ کرنے لگیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہی تھیں۔۔۔۔ نفسیاتی لذت سے ہم کنار ایک ایک پر تنقید کرتی تھیں۔ آس پاس بیٹھنے والوں کا بیٹھنا دوبھر کر دیا تھا۔ ہر نگاہ ان پر اٹھ رہی تھی۔ اور ہر نگاہ ایک خوشگوار تعجب ظاہر کر کے ایک دوسرے سے جگہ بدلنے میں مصروف تھی۔ وسیم خوب بے تکلفانہ انداز میں کمل کرا اپنی "سیٹ" پر بیٹھی تھی۔ اسے ساتھ والیوں کی حرکات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور نہ کوئی گہری دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنا موتیا شلوار کا داغ جس کا رنگ کچھ سیاہی مائل سا ہو گیا تھا، بڑی احتیاط سے واضح کر دیا، اور کمل کا کونا ران کے اوپر کر لیا۔ پھر خود بخود فرداً تمین بن کر بیٹھ گئی اور چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر اس بات کا انتظار کرنے لگی، کہ دیکھیں آج سب سے پہلے اس داغ کا ذکر کون چھیڑتا ہے

رجحنا۔ نینا۔ پدما اور روزا، اپنی اپنی دھن میں محو تھیں، وہ محسوس بھی نہ کر سکیں کہ وسیم کیوں چپ چپ ہے، اور اس کے خیالات اسے کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں ——

وسیم ان سب کے درمیان بھولی بھالی ماڈرن بلی کی مانند تھی، اس کے سامنے وہ بہت سی باتیں کرتی ہوئی جھجک بھی جاتی تھیں، اور جب کسی اہم بات سے انھیں لذت حاصل ہوتی تھی اور وہ برداشت کر جاتی تھیں تو ایک دوسری کو اعتماد میں لے کر کہہ اٹھتی تھیں، وسیم کو ان جنسیاتی رجحانات سے باخبر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وسیم اور اس کی سہیلیاں آج سے ایک ہفتہ پہلے اسی تھیٹر میں ایک امریکن فلم دیکھنے آئیں تھیں، وسیم نے اس روز بھی یہی موتیا شلوار پہن رکھی تھی —— اور پان کا داغ اس کی شلوار پر ایک شام پہلے ہی لگا تھا۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب یہ جھنڈ کا جھنڈ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے نینا کی نگاہ اس پان کے داغ پر پڑی تھی۔ وہ پان کے داغ کا ذکر کرتے کرتے اس کی ران پر ہاتھ رکھے داغ کو مسلنے لگی تھی، پھر دوسری اور پھر تیسری اسی طرح باری باری سب نے داغ کو مسلا اور اس کا ذکر کیا تھا۔ اور اس کی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا افسوس ظاہر کیا تھا۔ جوں جوں اس کی موتیا شلوار کے داغ پر بات چلتی گئی، اس کی رانوں پر پہلے ایک پھر دوسرا اور پھر تیسرا ہاتھ حرکت کرتا رہا۔ اس مسلنے اور حرکت کرنے سے اس کے تمام جسم میں ایک نامعلوم سی سرسراہٹ رینگتی رہی —— وسیم چاہتی تھی، یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ فلم بند ہو جائے۔ لائٹ فیل ہو جائے، پر اس کے داغ کا ذکر چلتا رہے اور مختلف ہاتھ اس کو مسلتے رہیں —— پان کا داغ دونوں رانوں کے درمیان لگا تھا۔ تیفے سے تقریباً کوئی بالشت بھر نیچے، چاہتی تو اسے اندر کی طرف سرکا کر چھپا دیتی یا اس روز وہ اپنی موتیا شلوار نہ پہنتی، داغ کی وجہ سے اس کے جسم میں زندگی کی بالیاں پھوٹ اٹھی تھیں —— وہ کسی صورت بھی، اپنی مسرت کا اظہار دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پان کا داغ چھوٹے انگور کے پتے کی شکل نما تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے چھینٹا پڑ جانے کے ساتھ ہی کسی نے دبا دیا ہے، یا کسی بچے نے کاغذ پر سیاہی گرا کر کاغذ میں شکن ڈال کر ایک موہوم سی شکل بنا دی ہے۔ آج ہال کے اندر وہ اکھٹی بیٹھی چپ سادھے رہی، اور پہلی سی باتیں کرنے لگی، مگر پان کا داغ کسی کی نگاہ کا مرکز نہ بن سکا۔ راستہ میں جب تانگے کے پہیئے گھوم رہے تھے، تو وہ ایک مضحکہ خیز آزمائش میں سے گزر رہی تھی۔ اس کا خیال اور نگاہیں پان کے داغ کا پیچھا کر رہی تھیں، اگر تانگہ کسی وجہ سے دھیما پڑ جاتا تھا تو اس کا ہاتھ بغیر سوچے سمجھے رانوں کے درمیان کچھ ٹٹولنے لگتا تھا شکنیں بن بن کر مٹتی اور گم ہوتی جا رہی تھیں، اس نے ذرا تن کر ٹانگوں میں اکڑا پیدا کر لیا، اس کا ہر سانس تانگے کی آواز کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ اور وہ بڑے پیار سے کبھی نینا سے اور کبھی روزا سے لگ جاتی تھی

فلم پوری رفتار سے سکرین پر چل رہی تھی، ہر لمحہ ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے آتا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے مذاق کے مطابق مسرور ہو رہا تھا۔ سب ساتھ والیاں بھی کافی سے زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھیں لیکن وسیم کے خیالات کا تسلسل ہر بار ٹوٹتا اور بنتا تھا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے جمائی لینے لگتی۔ جیسے مضمحل ہوتی جا رہی ہو، اور کبھی سیٹ پر اپنا آپ پھیلا دیتی، اور پان کا داغ نمایاں کر کے بیٹھ جاتی۔

انٹرول ہوتے ہی اس نے داغ اور بھی نمایاں کر دیا، داغ کو دیکھ کر اس کے اندر کچھ ہیجان سا اٹھ رہا تھا۔ کاش یہ ہیجان طوفان کی صورت اختیار کر لیتا اور اس میں وسیم بہہ جاتی، مایوسی نے اس کے چہرے کو مرجھا دیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بند ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے سر سے پاؤں تک رطوبت کھینچ لی گئی ہو ——

مریم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پیچھے ہٹ کر بیٹھی تھی —— اور بازو بھی ڈھیلے چھوڑ رکھے تھے، پیچھے سے روزا نے وسیم کو زور سے جھنجھوڑا اور کہا "سب تیری طرف دیکھ رہے ہیں۔ رات بھر جاگتی رہی تھی کیا —— یہ جمائیاں لینے کا کوئی وقت ہے؟"

وسیم کے ساتھ والی سیٹ پر دو عورتیں بیٹھی تھیں ایک کی گود میں بچہ تھا۔ بچہ چابیوں سے کھیل رہا تھا۔ دوسری وسیم کو بڑے لاڈ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے متوجہ پا کر دوسری بھی کھنچ گئی —— دونوں وسیم کے بھولے پن سے نہایت متاثر ہوئیں اور اسے دوسروں سے مختلف پایا۔

عورتوں کی نگاہ پان کے داغ پر جا پڑی، داغ اس گھڑی کچھ پُراسرار سا بن گیا، پہلی نے دوسری کے چٹکی لیتے ہوئے کہا: "بچی ہے ہوئی نادان ہی تو ہے —— انجان پن میں خون کا دھبہ لگ گیا ہے غریب کے!"

انٹرول کے بعد فلم پھر چلنے لگا۔ ہال میں اندھیرا چھا گیا تھا اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ آگے کی طرف جھکتی ہوئی سمٹ کر بیٹھ گئی، جیسے بازوؤں والی کرسی میں دبک کر اپنے آپ کو ننگا محسوس کر رہی ہو۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیاں سڈول اور تناؤ لئے ہوئے نیم گلابی سٹینز میں ٹھنڈی ہو رہی تھیں —— خاموش اور مگن —— فلم تیزی سے چل رہی تھی!

چغتائی

نوید زندگی

جب نظر انتخاب ہو جائے
منتخب لاجواب ہو جائے

زندگی کو بھی جی کے بتلا دے
جبکہ جینا عذاب ہو جائے

ضبطِ گریہ ہو گر تو ایسا ہو
صبر بھی آب آب ہو جائے

عقل و تدبیر کے تعاون سے
ہر عمل کامیاب ہو جائے

روشنی ہو وہ حسنِ ایماں میں
دل بھی اک آفتاب ہو جائے

یہی آغاز ہو بھلائی کا
کام کوئی خراب ہو جائے

گونج اٹھے صدائے حق اس سے
دل کی حرکت رباب ہو جائے

عزم راسخ ہو جس کی فطرت میں
فضلِ حق ہم رکاب ہو جائے

گر تو پا جائے نفس پرستا ہو
رازِ حق بے نقاب ہو جائے

گر پڑے اشکِ انفعال اگر
پاک فردِ حساب ہو جائے

ہے عمل ہی میں زندگی کی بقا
ورنہ جینا حباب ہو جائے

گر تو سمجھے حیات کا مقصد
ہر سکوں اضطراب ہو جائے

نہ ہو گر موجزن جو الفتِ دوست
زندگانی سراب ہو جائے

تیری فطرت میں تھا یہی روحی
شاعرِ بو تراب ہو جائے

"روحی"

جھلکیاں

پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہوں۔ لکھتے لکھتے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے یا کبھی فکرِ آرام کو جی چاہتا ہے تو سونے کے کمرے میں ورا آتا چلا آتا ہوں اور دھڑام سے بستر پہ چاروں شانے چت گرا۔ آتا ہوں۔ بے تعاقب کرنے والے خیالات کے ہجوم کو دھکا سا لگتا اور کچھ دیر کے لئے ان سے نجات پاؤں۔ چت لیٹ کر چھت کی باتیں گننے لگتا ہوں۔ گھوم پھر کر نظر ایک جگہ اٹک سی جاتی ہے، مکڑی کے جالے میں۔ مہین مہین ساز رتار، پیلا پیلا، اجلا اجلا جال — جو لرز لرز کر تھرک تھرک کر اور زیادہ حسین اور جاذبِ نظر ہو جاتا ہے۔ بیچوں بیچ جیسے ڈرائنگ روم ہو، بی مکڑی بیٹھی ہیں۔ بے ڈھنگی سی مکروہ لیکن اک ذرا چمک دار — مکڑی پر نظریں جم جاتی ہیں۔ اگرچہ "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کا معاملہ نہیں لیکن ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ مکڑی کی قوتِ ارادی نے میری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے کہ ہٹتی ہی نہیں۔ جھپکتی ہی نہیں۔ میری ساری حیات باصرہ میں سمٹ آتی ہیں اور مکڑی پر مرتکز ہو جاتی ہیں — مکڑی پھیلنے لگتی ہے۔ کبھی جالا نظروں سے اوجھل سا ہو جاتا ہے، کبھی مکڑی پھیلتے پھیلتے جالے سے پرے نکل جاتی ہے اور صرف مکڑی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر مکڑی سمٹنے لگتی ہے اور ایک نقطہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نقطہ، موٹا، باریک، مہین — اپنی تمام تر معنوی و صوری کیفیات و تعریفات کا حامل۔ چمکتا ہے، جھلملاتا ہے، لرزتا ہے، مدھم پڑتا ہے۔ روشن ہو جاتا ہے، ڈوبتا ہے اور ابھرتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جالا پھیلنے لگتا ہے، لرز لرز کر، چمک چمک کر بے نام نقوش بنتے، بگڑتے، ابھرتے اور دھندلاتے ہیں۔ نقطے میں حرکت سی ہوتی ہے اور چمک سے روشن، جیسے میکنیشیم کا فیتہ آن کی آن میں جلے، چمکا اور بجھتا۔ پی چھا جائے اور اس نقطے کی جگہ — گوری گوری چمپئی رنگت، چھریرا بدن، کھنچی ہوئی بھنویں، کسی قدر چھوٹی لیکن تارہ جیسی روشن آنکھیں، ناب دار نظر کو برماجاتیں۔ ستواں، دہانہ گلاب جیسے ہونٹ، ان پر اودی اودی سی لی دھڑی، گالوں پہ چمپئی کا کلیں، آڑی مانگ، ناک میں کیل جھل جھل کرتی ہیرے کی کنی، سونے کے جھمکے، ہیرا اور پھول، ہاتھ میں گجرے اور پاؤں میں پازیب۔ موتیا رنگ کی بڑے بڑے رپہلے پھولوں والی ساری، اسی کا جمپر —— اجلا اجلا فرش، فرش پر قالین، دیوار سے گاؤ تکیہ لگا، اور یہ اس سے تکیہ لگائے بیٹھی ہیں، سامنے لٹاؤ پاندان، ادھر خاص دان، ادھر اگالدان۔ سراپا عمر خیام کی رباعی، بھرپور جوانی، تیز و تند شراب، خود ہی بدمست و سرشار۔ پاس ہی ان کی رازدار سہیلی خیر بیٹھی ہیں۔ چہرہ مہرہ بالکل بہن میں ویسا ہی۔ بہن کہو تو کسی کو شبہ نہ ہو، سہیلی کہو تو قسمیں کھانے پر کوئی یقین نہ کرے۔ ہاں یہ ایک ذرا متین ہیں لیکن پیٹ میں گن بھرے ہیں، ہیں شیطان کی خالہ، آفت کی پرکالہ، بنتی ہیں بڑی معصوم۔ کچھ راز کی باتیں ہو رہی ہیں، دھیرے دھیرے کہ کسی کو بھنک نہ پڑ جائے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت لوٹ رہی ہے ...... ٹرن ٹرن، سیکل کی گھنٹی نے اپنے مخصوص بول نکالے اور انھوں نے خیر کو جھکیے سے اشارہ کیا۔ کمرے کا وہ دروازہ دھیرے سے بند کر دیا گیا جس کے بند ہونے سے یہ حصہ مکان سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے اور پھر یہاں کیا کچھ نہ ہو جائے کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھتے ہی سرو قد اٹھ کھڑی ہوئیں، سر پر آنچل ڈال لیا، منہ پر بہار چھا گئی، آنکھیں میں حیا لوٹ گئی اور گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ گردن خم ہوئی، پنجۂ مرجان پیشانی تک پہونچا —— سلام کرتی ہیں۔ میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ بولیں "سرتاج راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں آپ تو روٹھ ہی گئے اپنی کنیز سے۔" یہ سریلے بول

کانوں ہی میں نہ پڑے دل و روح کی گہرائیوں میں بھی سما گئے۔ ترنم، شعریت اور نقوش سبھی تو جاگ اٹھے تھے۔ لیکن ہونٹوں کی مسی، پور پور مہندی اور گلے کی کالی پوت پر نظر پڑتے ہی دل کچھ سا ہوا ——— صغرا کی تو شادی ہو چکی۔ !! اندھیرا چھانے لگا آنکھوں میں۔ جب یہ تاریکی اندھیرے وہ ابھرنے چھٹ گئی اور اجلا فرش، ایرانی قالین گاؤ تکیہ، پاندان، سرو قامت، چھلکتا جسم، دمکتے عارض، گلابی ہونٹ تھامیں ہنستے ہوئے مسی کی اداہٹ میں تو ایسی اداہٹ میں وہی نقطہ ابھرنے لگا۔ باریک سا، مہین مہین، چمکتا دمکتا، ابھرتا ڈوبتا ——— پھر وہی مکڑی کا جال، کڑی کڑی سے نظر پھسلتی، دمکتی، اجلی اجلی مٹیالی مکڑی ———

پھر نظریں جھپکنے لگیں مکڑی پر، پھر نقطہ سامنے لگا۔ وہی ڈوبتا، ابھرتا، چمکتا زرتار نقطہ، چمکا، ڈوبا، ابھرا اور پھر غائب۔ اب جو ابھرا تو پھیلنے لگا۔ رکشا کے بے رنگ پھیپھڑے بھرنے، پھیلنے، سمٹنے۔ رکشا حرکت کرنے لگا ———

چھریرا بدن، میانہ قد، نکھرا ناک نقشہ، تیکھے خط و خال، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، گھنی پلکوں سے ایسی جھانک رہی ہیں جیسے پہاڑوں میں جھرنا جھل جھل کر رہا ہو۔ آنکھیں، شوخ، چنچل جیسے کچھ کہہ رہی ہوں، کچھ گنگنا رہی ہوں، کچھ یاد دلا رہی ہوں، بھولی ہوئی کہانیاں ——— کانوں میں صرف لمبے لمبے ایرنگ، گلے میں چندن ہار، ہاتھ میں دو دو چوڑیاں، ننھی سی سنہری گھڑی کلائی پر۔ سبز کنجالی ساری لپٹی لپٹی سی، چست بلاؤز ایسا کہ سینہ و کمر کا ہر نقش اور ابھار واضح اور جاذب نظر ہو گیا ہے۔ آواز بھاری بلکہ لونڈ پن اگر لوچ نہ ہو تو دور کا آدمی نہ پہچانے کہ مرد بولا کہ عورت۔

رکشا میں اکیلی تنہا یہ تقدیر! پیچھے کا پردہ ایک طرف سے کھلا، ایک لمحے کو چین نہیں۔ پردہ اٹھا، آنکھیں ملیں، کچھ کہہ گئیں، کچھ یاد دلا گئیں کچھ بھلا گئیں ——— پھر ویسے ہی یہ پلے گراؤنڈ ہے، وہ بارہ دری، سلکٹ ٹاکیز پیچھے رہ گئی یہ سامنے نیا پل رہا۔ اب کی دیکھا تو آنکھیں کہہ رہی ہیں چلے آؤ برابر کچھ کہہ سن لیں۔ سیکل رکشا کے برابر تھی۔ بازو کا پردہ پیچھے ہٹا دیا گیا، بالکل نظر کے سامنے تھیں جیسے اگلے وقتوں کی جان پہچان ہے۔ اور تھی بھی یہی بات نظریں بھلا دیں تو کیا من پہچان ہی جاتا ہے، ان کی نظریں نہیں چوکتیں۔ سلام و تعارف کی ضرورت ہی کیا۔ انسان ہی کس تپکے لہجہ میں کہنے لگیں "تو آپ کا نام .... میاں ہے نا"

میں چکرایا۔ یا اللہ یہ تو دنیا دیکھی معلوم ہوتی ہیں میرا خیال شاید صحیح نہ ہو، ہو نہ ہو محبوب ہی ہو۔ چھ سال پہلے کی بات ہے کہ پیک بڑی تھی؟ ایسی اوجھل ہوئیں نظروں سے کہ جیسے وجود ہی نہیں ان کا۔ کچھ یقین نہ آتا تھا کہ وہی ہیں کہ کوئی اور۔ ناک نقشہ، بات چیت کا انداز آواز بالکل وہی لیکن وہ ذرا دبلی دبلی نازک نازک تھیں۔ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے بوکھلا کے جواب دیا "جی ہاں ——— لیکن آپ"

وہ ہنس پڑیں "یہ شاید نہ معلوم ہو سکے آپ کو"

میں اور بوکھلا گیا لیکن متانت سے کہا "اچھا تو یوں ہی سہی"

ذرا بل کھاتے ہوئے جواب دیا "تو کیا نداقی ظلم ہے آپ کا لے ٹہلئے"

میں نے کہا "تو حاضر ہوتا ہوں پھر"

اب وہ چکرائیں، اس چڑیمار کی طرح جس کے لیے دار بانس میں چڑیا چمٹے چمٹے پھڑپھڑا کر نکل جائے۔ سر کا خیال رہا اور نہ راہ گیروں کا، چلائیں "سنئے تو ———

اے صاحب .... میاں، ایک ذرا سنتے تو جائیے میری بات"

لیکن ہم پلٹ چکے تھے۔ نام معلوم کرنے کی دھن سوار تھی سیدھے راشننگ کی دوکان پر پہنچے، میاں عزیز تھے۔ نام معلوم کرنے کچھ دیر نہ لگی۔ وہی نکلیں جن کا شبہ تھا۔ واہ ری عورت، وہ دن گئے کہ بھی جاتی تھیں، سائے کی طرح چمٹی رہتی تھیں اور ہم بھاگے بھاگے پھرتے تھے کہ آپا نہیں کی تو کیا کہیں گے!؟ وہ دن اور آج کا دن۔ دنیا ہی بدل گئی۔ کیا یہی عورت کی نفسیات ہے اور یہی اس کی محبت؟ آگے بڑھئے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیرلے، اور اپنا من

چاہے تو قدموں پر گر پڑے، لاکھ جاگئے پر پیچھا نہ چھوڑے! الجھن بڑھنے لگی، تاریکی سی چھانے لگی۔ جیسے یہ نقطے تھرکنے لگے ناچنے لگے اس تاریکی میں آن کی آن میں سب ڈوب سے گئے اور صرف ایک نقطہ رہ گیا وہی تھرکتا، چمکتا، ابھرتا ڈوبتا —— پھر وہی جال تھا، وہی مکڑی، رہ رہ کر نظر ملیالی، چلبلی مکڑی ——

پھر نقطے سے گھٹنے لگیں۔ نقطہ سامنے لگا۔ بڑھتا ابھرا چہرہ کا پیرہن غائب —— وہ سامنے بیٹھیں ہیں لد گرا جسم بوٹا سا قد سانولی سلونی رنگت تیکھے خط و خال، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں اک ذرا موٹے ہونٹ اودے اودے ملیانی چہرہ، گال پر دو چار مہاسے اور وہی قوری سفید سفید براق ساری، اسی رنگ کا کرتا چھوٹے دامنوں کا، پیٹ ابھرے ہوئے۔ پورے آستین چنسے چنسے کلائی میں چپت، روپہلی چوڑیاں ہاتھوں میں جیسی تن کی اجلی ویسی ہی من کی لیکن کنفل کے کان موم کی ناک ماں اور بہن نے جدھر چاہا موڑ لیا۔ جانتی ہیں کہ بہن ٹہلے مار رہی ہیں لیکن یہ مسکرا رہی ہیں۔ کچھ من کی کمزور کچھ سعادت مندی کا گھمنڈ۔ استانی ہیں، انھیں سے گھر چلتا ہے۔ ماں بڑی بیٹی پر مٹی جاتی ہیں وارے نیارے ہو رہے ہیں، بچے نہ جلو ہتیلی میں چھو، انھیں کوئی پوچھتا نہیں لیکن کیا مجال کہ چتیالی پر کوئی بل تک آ جائے۔ بلکہ بظاہر خود بھی شریک ہیں اس لاڈ میں جو کھلا دیا کھا لیا، جو پہنا دیا پہن لیا، نہ شکوہ نہ شکایت لیکن اندر والا ابھی تو مانے، گھلی جاتی ہیں اندر ہی اندر یہیں کا سن ہے، ماں کہتی ہیں ابھی بچہ ہے اور یہ دل پر پتھر رکھے چپ —— کوئی سمجھا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بولتیں، ماں کو جو پسند نہیں اور ماں کو کیا پسند ہے یہ خود انھیں بھی نہیں معلوم سارے خاندان کے لیلیٰ مجنوں مشہور ہیں لیکن یہ ادھر چپ اور وہ ادھر خاموش۔ جانے کب چھوٹے یہ جوا الکھی؟ پیام سلام بس آنکھوں کی زبانی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ وہ چار سال سے انھیں پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ادھر ان کا بھی کچھ نہیں ہوتا جانے کیا بات ہے —— ہاں تو وہ بیٹھی ہیں ہاتھ میں "سب رس" ہے جس میں ان کے سلیقوں کا قصہ بنا ہوا ہے پڑھتے پڑھتے بولیں "اللہ یہ کیسے لکھنے بیٹھیں آپ ہمیں بھی لکھ دیتے نا" میں نے کہا "بٹ گیا" و اجازت لے لی ہے اپنی ماں سے

تلملا گئیں چہرہ ہوائیاں اڑنے لگیں، ہونٹ خشک ہونے لگے مصافی ہنسی، پتلیاں آنکھ میں آنسو بھر آئے کہنے لگیں "میں ہی دکھی رہی ہوں —— تم کو تو ناری ہوں، کیوں اس سارے قصے سے کاٹ دیں سے یاد کئے لو اپنے کچھ نہیں" ——

میں نے کہا جی ہاں او دنیا کو [illegible] شادی وہ [illegible] نے تکیں [illegible] پر پلکیں بند لیتیں۔ کانوں تک ایک رنگ چلنے لگا چہرے پر [illegible] کے جال والے ایک باریک مہین نکتے سے جال بیچ بیچ کر رہی —— میں سوچنے لگا لڑکیاں بھی نوبس کاڑاپ ہی ہیں نازک نازک سی۔ چکیلی، بھڑکیلی، دبلی، موٹی، چپچپلی شوخ بے آزار اور بس جی۔ کوئی مورت پیچکی ہے کوئی گھات لگائے بیٹھی ہے۔ کوئی جھپٹ چکی ہے شکار پر کوئی قائم کئے دور سے جال پھیلا رہی ہے کوئی مرد پر طنز کر کے لبس ہوا رہی ہے کوئی کہتی ہے "الٰہی مرد ہوتی —— جیسے ہم نے بڑا نیر مارا مرد ہوئے اور جو وہ مرد ہوتیں تو سارے جہاں کے مردوں کی کمزوریاں دھو ڈالتیں —— کاش کوئی انھیں سمجھائے ماں، بیوی اور بہن بنیں تو سب کچھ بن سکیں۔ مرد کی ساری [illegible] دھری رہ گئی" قربانیاں نے تم پر کیا بن پہاڑ توڑ دیئے، کلیوپترا، قرۃ العین اور رادھا رانی کی کمی نہیں —— اللہ یہ لڑکیاں اور کاڑیاں بھی تو بھانت بھانت کی ہوتی ہیں، اجلی اجلی، لال لال، دھانی، دبلی، موٹی سب آزار اور [illegible] —— ——

بالوں کی [illegible] سٹ پٹی اور کانوں پر مہری اپنے رنگ کو گھیر لیا اپنے [illegible] کچھ اس انداز سے جیسے عشق

طالب مسلم ہندوستان کا نقشہ اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے یہ کالا زنجیرا، یہ سنہرا جال ... مکڑی سامراج، لیگ و کانگریس اور دلی والا صاحب ہیں، اور یہ لیس کروڑ مکھیاں، پرجا کی، اس ہرے جال میں پھنسی بھنبھنا رہی ہوں۔ کچھ دم توڑ چکی ہیں۔ جیسے جلیان والا باغ کے شہید اور کشمیر کے جاں نثار، کچھ سوکھ چکی ہیں صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ جیسے بنگال کی ۵۰ لاکھ فاقے کی شکار جنتا، کچھ نیم جان ہیں جیسے ہم اور آپ، مزدور اور کسان۔ لیکن ان کے سکڑے ہاتھ بھنچے ہوئے ہیں، مٹھیاں کسی ہوئی ہیں، دہکتی ہوئی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے زرد چہروں پر عزم کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ یکبارگی بھنبھناہٹ میں شور ہوا۔ حرکت، تڑپ اور ایک جھکولا ـــــ مکڑی نیچے آ رہی۔ جال ٹوٹ چکا تھا ـــ ابھی سیاہ بھی۔ اور مکھیاں اڑ اور بھنبھناہٹ اور بڑی۔ میں چونک سا گیا ـــــ

بانسوں میں نئی جالا تنا تھا، مکڑی بیچوں بیچ بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے دو مکھیاں، ایک ذرا بھوری اور دوسری سیاہ ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں اڑتیں، بھنبھناتیں گتھ جاتیں۔ اب کی بہت دیر تک گتھی رہیں، پھر بڑی تیزی سے الگ ہو گئیں۔ سامنے نیا جالا تھا، دونوں میں چپک سی گئیں۔ مکڑی نے حرکت کی کبھی ادھر کو اور کبھی ادھر کو جیسے کہتی ہو ہماری مانو، ہو تھکـــ ہیں۔ لیکن وہ پھر بھنبھنانے لگیں جیسے کہتی ہوں!

سنو میری اور آؤ ـــــ سر.... ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ دہلیز سے دروازہ کے دونوں پٹ کھل گئے پردہ لہرا کر چھت کو چھونے لگا۔ آن کی آن میں جالا ٹوٹ گیا۔ مکڑی فرش پر آ پڑی، چڑیا نے جھٹ سے اچک لیا بکھرے ہوئے جال ایک سرا ہوا میں لہرا کر عجیب عجیب شکلیں اور نقشے بنا رہا تھا۔ رام راج کا نقشہ، پاکستان کے حدود سکھ استان کی سرحد، گاندھی، جناح، ویول، مکرجی، ... کے کارٹون۔ دھیرے دھیرے یہ نقوش دھندلا سے گئے جیسے ریڈیو پر کسی فیچر میں آواز پس منظر میں ڈوب جاتی ہے اور نئی آواز نئی تان چھا جاتی ہے۔ ننھے ننھے سبز ہلالی ترنگے جھنڈے لہرائے، ان سب پر سرخ پرچم سایہ سایہ کئے تھا۔ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اسے چالیس کروڑ ہاتھ تھامے ہوئے تھے مزدور اور کسانوں کے ہاتھ بھاری بھرکم اور مضبوط۔ میں پلنگ سے اچھل پڑا۔ جالا لہرا لیتا ہنسیا کی شکل بنا تا جو اب تیر رہا تھا۔ میں گنگنانے لگا۔

"جب دست و قدم آگے بڑھیں گے چالیس کروڑ انسانوں کے"

حسینی شاہد

محبت کی چھاؤں :- مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بے باک اسلوب اور اس کے افسانوں کی بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

محبت برباد

کسی نے پوچھا۔ افسانہ کیسے بنتا ہے۔ [illegible]
جواب ملا۔ بس ایسے ہی جیسے عورت اپنے بالوں میں کنگھی
کرتی ہے۔ پھر سوال ہوا۔ یہ کیسے کہا۔ یہ تو [illegible] بات
ہے۔ تو جواب ملا۔ [illegible] میرا یہ خیال ہے
کنگھی کا ایک ایک [illegible] کی تاریخ [illegible] تو پھر [illegible] مصور
کے فن سے بھی پرانی ہوگی۔ ہر عورت کے ذہن [illegible] تماشا
تری پیدا کر دیتا ہے۔ اور کنگھی چوٹی کے الگ الگ [illegible]
رائج ہیں۔ [illegible] ویسے ہی افسانہ لکھنے [illegible]
ڈھنگ ہیں۔ تو یوں ہے یہ قصہ۔ یہ افسانہ بھی لکھا نہیں
لکھوایا جا رہا ہے۔ اس ترقی پسند زمانہ میں ہر شے ترقی پسند
ہی کہلاتا ہے۔ ——— ہاں تو ———

جیسے جیسے تیرے دن، مہینے، سال [illegible] یہ جنگ چھڑ
رہتی تو [illegible] صدیاں بیت جاتیں۔ [illegible] وخوشحالی [illegible]
تمناؤں کی ڈولی آ [illegible] کے [illegible] جا کے کتنے اور
نکلتے کتنی تمناؤں سے پالا تھا اس کے والدین نے اس کو
سولہ برس تو اولاد ہوئی تھی۔ آرزو اور ارمان کا درخت [illegible]
لگا۔ جبری بھرتی کے احکامات نکلے۔ [illegible] نے خوشی خوشی اپنا
نام لکھوا دیا۔ جان کی بازی لگانے سے جان بازی [illegible]
پیش کرے اپنے ملک اور اپنی قوم پر بھینٹ [illegible]
زبردست قربانی، کتنا روح پرور ایثار۔ [illegible]
جرأت و شجاعت کے جذبات پر [illegible] الدین کو فخر [illegible] لگا۔
اپنی قسمت پر اس ہونہار سپوت کے غازیانہ [illegible] ——

محمود ——— اس سے صرف دو ہی سال [illegible]
تھا۔ وہ کیا جانے جام شہادت کا مزہ۔ قریب بیوی کا [illegible]
موت کے فرشتے سے آنکھیں چار کرنا ——— بڑی التجا کی
کہ بھیا نہ جاؤ۔ ہماری دنیا تم بن سونی ہو جائے گی۔ امی
کا رو رو کے برا حال ہوگا۔ ابا کی زندگی کا چراغ جھلملانے
لگا ہے۔ مگر خسرو نے اس کی نہ مانی [illegible] کہ [illegible]

[illegible] سمجھ نہیں [illegible] کہیں کا ———
[illegible] اور بھی تو تھا ہی۔ [illegible] شادی
[illegible] تو بھول گئے۔ پھر بانے قسمت
[illegible] کیا گل کھلاتا ہے [illegible]
[illegible] کھیلے ہوں جو [illegible] ہوئے
[illegible] ساتھ ہی ساتھ منہ سے پڑھی کی
[illegible] کی فوج میں بھرتی ——— ؟ [illegible] پڑھتے
[illegible] گویا الزام ہے [illegible]
[illegible] اور اس طرف ذہن انسانی کے [illegible]
[illegible] جاتے ——— اب رہی محبت ——— اس کی
[illegible] تو کئی [illegible] پشیمانی ناکامی۔ ذلت۔ سب ہی دیکھے
[illegible] ہیں۔ تو پھر اب [illegible] کا [illegible] قسمت ——— یہ
[illegible] کی دھار [illegible] کشش جہاں دم توڑ دیتی ہے تمنا
[illegible] بنا دی ہے۔ [illegible] جہاں ایک ایک [illegible]
[illegible] ہو جاتی ہیں [illegible] معقول ہیں ——
[illegible]
[illegible] اس کی دیکھا جا سکے
[illegible] دکھاتی ہے قسمت، ہاں جلوہ فرما ہو کر تجلی
[illegible] اس کے تو آنکھیں
[illegible]

[illegible] ہی تھی خسرو کی محبت۔ اب جو
[illegible] پوچھ لیتی تھی محبت کی دلکشی
[illegible] سے بدل چکی
تھی [illegible] ہو چکی تھی۔
[illegible] اس کی دنیا اندھیری
[illegible] نہ جانے کتنی مرتبہ مر چکی
[illegible] ان کے لوٹنے
[illegible] جیسے کوئی بہت زیادہ خطرناک
بیماری سے [illegible] بیکر نکل جائے۔ لیکن [illegible]
اس [illegible] پہلے ہی خسرو کی ہو چکی تھی

عقد و شادی ـــ یہ سب خود فریب دنیا کے ٹھاٹ [illegible] ایسا [illegible] روح تو متحرک ہو جاتی ہے۔ بہت پہلے ہی ـــ میں کیا کروں لیکن اس سنسار میں رہ کر ـــ خسرو کے بغیر زندگی [illegible] کیوں نہ کہوں اس زندگی کو۔ غرض یہ [illegible] جانے والے خیالات تھے۔ اور رضوانہ کی مضطرب [illegible] حال [illegible] زندگی کے مقصد سے [illegible] ـــ یہی [illegible] جاتے [illegible]

[illegible] کی ہم بھی کچھ کم [illegible] نہ تھی۔ ایسا [illegible] عزت شہرت جیسے الفاظ [illegible] تھے ـــ دوسری جانب محبت جس کی [illegible] زندگی کے اس دور [illegible] اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کون سا رخ اختیار کرے [illegible] رضوانہ [illegible] تنہا ـــ [illegible] دولت [illegible] عزت و شہرت [illegible] سماج کی [illegible] نظریں [illegible] آرزو میں تھیں ـــ [illegible] عالم تھا۔ اس نے [illegible] ہو جاتا [illegible] ہو جاتے ـــ [illegible] ہو جاتی ہے۔ تو پھر [illegible] رہتا [illegible] ہی [illegible] چاہتے۔

[illegible] آنکھوں میں [illegible] ـــ [illegible]

کل شادی ہو جائے گی اور پرسوں ـــ خسرو محاذِ جنگ کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ایک جنگ پر جانے والے دولہا کی شادی۔ شادیانوں میں ایک غمگین سا نغمہ بھی چھپا چھپا تھا۔ جس کو کسی اور نے نہیں، صرف رضوانہ کے دل کی دھڑکنوں نے سنا۔ زندگی سنور رہی تھی بگڑنے کے لئے۔ قسمت کا بندھن دونوں کو ایک ہی دھاگے میں باندھ رہا تھا۔ لیکن جدائی کا تخیل جان لیوا [illegible] پر [illegible] رہا تھا۔ مہمانوں کی کثرت تھی۔ اس کی جانبازی نے اس کو ہیرو بنا دیا تھا۔ اور اس ہیرو کو دیکھنے ملک کے گوشے گوشے سے خلقت چلی آتی تھی۔ پھول کے ہاروں نے اس کے قد و قامت کو ڈھک لیا تھا ـــ ہ

بس کہ تھا بزم [illegible] کے مارے ہوئے
جلوۂ گل نے سوا گرد اپنے مدفن [illegible]

پھولوں کی زبان کون سمجھے۔ پھول سے پھول کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن کیا ـــ؟ شادی کے تحفوں میں امام ضامنیں بھی تھیں۔ حرز جان کی تعویذیں بھی تھیں۔ غرض دوسرے ہی دن خسرو روانہ ہوا۔ اس کے [illegible] یہ ایک [illegible] شدہ امر ہے۔ اور [illegible] کی بات ـــ دن ہفتے سال۔ ایک دو تین [illegible] سات سال گزر گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں ـــ

[illegible] قصہ [illegible] جمال
[illegible] دیدۂ و گوش ہے

تین چار سال [illegible] آتے [illegible] اس کے بعد سکوت۔ [illegible] جنگی قیدی [illegible] آزاد ہو سکتے ہیں۔ خط لکھیں۔ وہاں تو [illegible] کسی نے کہا [illegible] زندہ ہوتے تو خط لکھتے [illegible] ہوشربا تنقیدیں عقل کی [illegible] کا خیال۔

رضوانہ جیسے [illegible] مر چکی تھی۔ اس خبر نے اس کی [illegible] پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس پر لیکن

انسان میں برداشت کی قوت پیدا ہو جائے تو ہر بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کی ہمتوں کے آگے اپنا سر کچل کر رکھ دیتی ہے۔ مصائب و آلام خود اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنا ان کا تخیل ہوتا ہے! بہادری و شجاعت صرف مرد کی میراث ہی نہیں۔ یہ عورت کا بھی جوہر ہے۔ ایک بزدل عورت ایک شجیع و جانباز سپوت کو کیسے جنم دے سکتی ہے۔

رضوانہ نے جہاں اس کی جدائی گوارا کر لی تھی اب اس کی دائمی جدائی کو سہنا بھی گو اس کے بس کی بات نہ تھی ــــ لیکن جینے کے لیے خود کو بے بس پاتی۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ تقدیر کے سامنے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ قدرت کے اٹل قانون کیسے بدل سکتے ہیں مشیت ایزدی ــــ اور کیا ــــ

دھیرے دھیرے محمود کی ہمدردی رضوانہ سے بڑھتی جاتی تھی۔ ہمدردی شاید محبت کا پہلا زینہ ہے۔ لیکن ــــ رضوانہ کے دل میں محمود نے وہ جگہ نہ لی جو خسرو کی ہو چکی تھی۔ یوں مروت و اخلاق کے کارن وہ اس سے جبراً و قہراً متوجہ بھی ہو جاتی۔ لیکن عورت شاید زندگی میں ایک ہی مرتبہ محبت کر سکتی ہے۔

والدین محمود کے بھی وہی تھے جو خسرو کے تھے۔ ان کی تو یہ دونوں آنکھیں تھیں۔ انھوں نے سوچا خسرو تو اب اس سنسار میں نہیں۔ محمود سے رضوانہ کا عقد کر دینا بہتر ہوگا۔ ادھر بدنامی ــــ اور سماج ــــ اس کا کون مقابلہ کرے۔ بزدل قسم کی مخلوق 'سماج' سے بہت ڈرتی ہے۔ کاش اتنا ہی خوف اخلاص ضمیر کا ہوتا۔ اور یہ سماج ــــ اسکی روح فرسائیوں سے خدا پالا ڈالے۔

خسرو اس دنیا میں نہ ہو لیکن رضوانہ کے دل سے اس کو کون نکالے۔ ادھر والدین کی دھمکیاں۔ پھر ساتھ ہی ساتھ پیار اور چمکار کی باتیں۔ غرض سب ہی کچھ۔

محمود اور رضوانہ کا عقد ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی دریافت کے۔ اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہوئے کہ خسرو تو اب اس دنیا میں نہیں۔

رضوانہ ایک مجرم کی طرح زندگی بسر کر رہی ہے۔ [illegible] تو وہ بھول ہی چکی تھی ــــ [illegible] سالہا سال ہوئے انھیں دفن ہوئے۔

یہ ایام تمام و [illegible] کی شادی ہوتے چھ ماہ گزر گئے کہ جنگ [illegible] ولوٹ [illegible] اپنے لڑکوں کی واپسی کا حسین تخیل ان کے دل و دماغ کی [illegible]

خسرو کے والدین کی تو اس [illegible] اب کسی کا انتظار نہ تھا۔ اسی بنا پر رضوانہ [illegible] بھینٹ چڑھا دی گئی تھی۔ [illegible] ساری التجائیں ٹھکرا دی گئیں۔ زبان رکھتے ہوئے بھی اس قسم کا سلوک جیسے بے زبانوں سے ہوتا ہے۔

ہندوستانی لڑکی کی تمنا اس کی اپنی تمنا کب ہوتی ہے؟ اس کے ارمانوں سے تو جوا کھیلا جاتا ہے۔ اس کے اپنے دل میں، اس کی "اپنی خواہش" تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتی اور پھر طنز نگاروں کا طنز ہے کہ عورت بے وفا ہے، مکار ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں۔ اس کی بات کا کیا بھروسہ۔ خیر ــــ رونا اس کا ہے کہ قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے۔

ع۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

لیکن اس کی تو آرزو ہی رہ گئی۔

خسرو لاکھوں تمناؤں کی دنیا کامیابی کا سہرا لیے ہوئے وطن واپس ہوتا ہے۔ وہ جیتا جاگتا ہے۔ صحیح و سالم ہے۔ رضوانہ اس کے حدود تخیل سے ایک لحظہ کو ہٹ نہ سکی۔ لیکن یہاں آکر اپنے چمن حیات کو گلچیں کی دست برد سے پامال و برباد دیکھ کر اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہتا ــــ سارے گھر پر مردنی سی چھا جاتی ہے ــــ والدین کے دلوں میں اب کس قسم کی امنگیں ہوں گی؟ رضوانہ کے قلب کی بے پناہ دھڑکنوں میں کس نوعیت کی کیفیت کا

احساس ہوگا؟ ہے؟ اصولاً و شرعاً ——— ؟ اس کا فیصلہ ——
محمود کے ضمیر اور اس کی اپنی جلد بازی کا آخر کون کرے۔
کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ رضوانہ اب درحقیقت کس کی بیوی

جہاں بانو

(نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)

احتراز

ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی
وہ مجھے بزدل بے دل سمجھتے ہیں ہنوز
وہ مجھے نقش زنگار سمجھتے ہیں ہنوز
زر کے زیر جیب سبوؤں سے نوازتے ہیں مجھے
اپنی محفل میں وہ ہنس ہنس کے رلاتے ہیں مجھے
حسن معصوم کی سوگند ستم گر ہیں وہ
میری نظروں میں تماشا ہے کسی کا ذہن ہیں وہ
وہ سخن فہم سمجھتے ہیں جو اسرار کو خوش
شکر پرستی ہی ہے مذہب شاعر کا خموش
وہ مجھے شاعر و دلدار سمجھتے ہی نہیں
وہ تو فنکار کو فنکار سمجھتے ہی نہیں

میں اگر چاہوں تو محفل تہ و بالا کر دوں
ساغر عیش سر طاق الٹ کر رکھ دوں
بزم شادی کو عزا خانہ بنا کر رکھ دوں
ہر چراغ شب عشرت کو بجھا کر رکھ دوں
نور آدم ہوں فرشتوں کو بھی حیراں کر دوں
شاہد دوشیزگی دامن کو گریباں کر دوں
میری تقدیر کی مشکل اگر آساں نہ ہوئی!
فطرت حسن اگر پھر بھی پشیماں نہ ہوئی
اور پھر بھی وہ اگر میرے گریباں نہ ہوئے
اپنے محبوب مشاغل سے گریزاں نہ ہوئے
مستقل طور پہ ہے میرا ارادہ ساقی
ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی

ساقی صدیقی

فیشن

انسان خواہ وہ کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ ہو مسلسل کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے تبدیلی ضروری ہوتی ہے اور اسی تبدیلی کا نام فیشن ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

فیشن کا بدلنا ضروری ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے نئی نئی ایجادیں ہو رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ فلاں چیز ہمارے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ بعض مروجہ فیشن میں دقتیں پیش آنے لگتی ہیں اس لئے اس کو ترک کرکے نیا فیشن اختیار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں رواج کا ہر زمانے کے ساتھ بدلنا بدرجۂ اتم ضروری ہے۔ مثلاً پچیس تیس سال قبل ہندوستان میں الکٹریسٹی کا رواج نہ تھا۔ مکان میں دیئے اور شمعیں جلائی جاتی تھیں لیکن جب بجلی کی خصوصیات اور اس کے استعمال کی سہولتیں معلوم ہوئیں تو بجائے لیمپ کے معمولی معمولی گھروں میں بجلی کی روشنی آئی۔

ملک کی فضا اور موسم کا بھی فیشن پر اثر پڑتا ہے۔ ہر ملک کے فیشن جدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے جو چیز ہندوستان میں رائج ہو وہ انگلستان میں خراب قرار دیں۔ مثلاً مغربی ممالک میں بال کٹانا فیشن ہے۔ ہندوستان میں لانبے بال رکھنا خوبصورتی میں شامل ہے۔ مغربی ممالک میں دن میں تین چار مرتبہ کپڑے بدلنا تہذیب ہے اور یہاں اس طرح کرنا وقت کی بربادی تصور کرتے ہیں۔ آج کل عموماً فیشن کے معنی صرف کپڑوں کی حد تک لیتے ہیں لیکن دراصل اس کا پتہ انسان کی زندگی کے ہر شعبے سے چلتا ہے۔ مثلاً بود و باش، کپڑے، کھانا پینا وغیرہ۔

ہماری معاشرت میں آج کل بناوٹ بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہماری طرز زندگی میں تکلف اور نمائش بہت داخل ہو گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور فیشن کا مطلب غلط سمجھا گیا ہے اور یہ بات ذہن نشین کر لی گئی ہے کہ جب تک ظاہری چمک دمک سے سادگی اور بے تکلفی کا خون نہ کیا جائے انسان مہذب [illegible] نہیں بنتا۔ اس طرح ہماری زندگی ایک گورکھ دھندا بن گئی اور ہمارے ہر معمولی کام میں بناوٹ اور تصنع داخل ہو گیا مثلاً ملنے جلنے میں، کھانے پینے میں، الغرض زندگی کے ہر شعبے میں۔

وہی فیشن اچھا اور قابل تقلید ہے جس میں ہمیں آرام و چین نصیب ہو جس سے لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔ آج کل بیسیوں عمدہ عمدہ رواج ہیں اور ان فیشنوں پر چلنے سے ہماری زندگی بہت اچھی ہو گئی ہے۔ مثلاً مکانات جو سو سال پہلے بنائے جاتے تھے عموماً بے ترتیب اور صحت کے لئے خراب ہوتے تھے لیکن آج کل کے خوبصورت مکان میں رہائش کے علاوہ حفظان صحت کا بھی بہت کچھ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایسے مکانات بنانے کی تقلید ہندوستانیوں نے بھی کی اور وہ اس حد تک اچھی بھی تھی لیکن یہ [illegible] کے مکان جن کا حیدرآباد میں بہت رواج ہے میرے خیال میں ہندوستانیوں کے لئے موزوں نہیں۔ کیوں کہ ایسے مکانوں کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے جو مغربی ممالک کے لئے کافی ہے کیونکہ وہاں کا موسم بھی بہت سرد رہتا ہے اور پست مکان گرم ہوتے ہیں لیکن حیدرآباد میں اس کی تقلید کرنا کہاں تک مناسب ہے؟

کسی دوسرے ملک کے فیشن کی اندھی تقلید کرکے تختۂ مشق بننے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم سوچیں کہ ان لوگوں نے کیوں اس قسم کا فیشن اختیار کیا۔ ہمارے لیے اس کی تقلید میں کیا برائی اور کیا بھلائی ہے۔ اگر اس پر غور کرکے ہم کوئی چیز اختیار کریں گے تو بجائے انگشت نمائی کے ہم قابل تحسین ہوں گے۔ ہم میں اور انگریزوں میں یہی فرق ہے۔ وہ ہماری اچھی چیز بھی چھین کر اپنا لیتے ہیں اور ان کا استعمال سلیقہ سے کرتے ہیں برخلاف اس کے ہم بدھو کی طرح بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے"۔

ہمارے دوسرے ہندوستانی بھائی ہم پر ہنستے ہیں اور انگریز بھی بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اس بھونڈی تقلید سے ہم اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں۔

ایک صاحب کیا خوب فرماتے ہیں کہ فیشن کا دوسرا نام "ایک حمام میں سب ننگے" کا ہے بظاہر تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ فیشن کی اندھی تقلید کہئے یا بھونڈی نقالی ہندوستان کی بربادی اور تباہی کا باعث ہے۔

دنیا کا ہر ملک دوسرے ممالک کی اچھی چیز کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں تقلید اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ بہت کم ہندوستانی ایسے نظر آئیں گے جو اپنی خاص وضع پر قائم ہوں ورنہ عام طور پر غیر ممالک کی تقلید اس حد تک کرتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کا بھی امتیاز باقی نہ رکھا۔ یورپ سرد ملک ہونے کی وجہ سے وہاں شراب کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں نے اس کی نقل شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گردے اور پھیپھڑے خراب ہو گئے۔ باوجود اس کے وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

یورپی دنیا میں فیشن کا مرکز کئی سال سے فرانس رہا۔ یہاں جو فیشن رواج پاتا ہے ساری دنیا میں اسی کی تقلید ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل حیدرآباد ہندوستان کا پیرس بنا ہوا ہے۔ یہاں کسی دعوت یا جلسہ میں جائیے قسم قسم کے لوگ نئے نئے روپ میں نظر آتے ہیں اور لطف تو یہ کہ خواہ انھیں وہ لباس اچھا معلوم ہو یا برا۔ انگریزوں کا لباس عریاں نہیں تو نیم عریاں تو ضرور ہے۔ ان کے گلے اور آستین چھوٹے رہتے ہیں۔ ہم بغیر غور کئے اس نمونے کے لباس پہنتے ہیں۔ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ہم فیشن کی خاطر عریاں ہو رہے ہیں اس لئے ہمیں چاہیے کہ کسی فیشن کو اختیار کرنے سے پہلے امتیاز کریں کہ آیا وہ اچھا ہے یا برا۔

جب کوئی برگزیدہ ہستی یا کوئی شہزادی کسی چیز کو اختیار کرتی ہے تو لوگ اس کی تقلید کرنے لگ جاتے۔ اس طرح نئے نئے فیشن وجود میں آتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسٹیل نے اپنے ایک مضمون (Fashionable affectations) میں اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کی گردن ایک طرف ذرا سی جھکی ہوئی تھی لوگ اس کی تقلید کرنے لگے۔

فیشن کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی نئی طرز اختیار کریں۔ آج کل پرانے فیشن کی طرف بہت میلان پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی نقالوں کے سامنے چند بدترین چیزیں فیشن بنا کر پیش کی جائیں تو وہ اس کو فوراً قبول کر لیں گے۔ ہم لوگوں پر تقلید اس قدر غالب آگئی اور ہر چیز پر اس قدر بناوٹ غالب ہے کہ ہم خود مصنوعی ہو گئے ہیں۔ ہم ہر چیز میں انگریزوں کی پیروی کرتے ہیں مثلاً ہندوستانی مٹھائی کے بجائے چاکلیٹ پسند کرتے ہیں۔ روٹی مسکے کو بریانی پر ترجیح دیتے ہیں۔ گو دل تو چاہتا ہے کہ بریانی چکھیں لیکن فیشن کے خیال سے روٹی مسکہ کھاتے ہیں۔ یہ ہے ہماری معاشرت کا رنگ۔

رہنے سہنے کے طریقوں میں بھی بہت نقل کرتے ہیں۔ مغربی ممالک کے لوگ فرش پر نہیں بیٹھتے بلکہ صوفوں پر اپنی عمر گزارتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب بھی ہے۔ وہاں فرش اس وجہ سے استعمال نہیں ہوتا کہ وہاں کا موسم بہت سرد ہوتا ہے اور پتھروں کی ٹھنڈک سے بیمار پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان جیسے گرم ملک میں ہمیشہ صوفہ پر بیٹھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن کیا کریں فیشن ایبل کہلانے کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں اپنے آپ کو بیمار رہنا شاید ایک فیشن سمجھا جاتا ہے۔ کچھ زمانہ پہلے جس کسی کو دیکھو وہ درد گردہ میں مبتلا ہے چاہے درد اس کے پاؤں میں ہوتا ہو چاہے سر میں لیکن ہمیشہ وہ خود کو اس مرض میں مبتلا کہتا ہے۔ اب تو

ناانصافی کی شکایت عام ہو گئی ہے ممکن ہے آئندہ صحت مند لوگ
نا... فاقہ میں مبتلا نظر آئیں!!!

آج کل سینما لوگوں کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں سینما کا اثر فیشن پر بہت پڑ رہا ہے۔ اونچے اخلاق والوں پر سینما کا اچھا اثر پڑتا ہے لیکن کمزور اطوار والے چال ڈھال بات چیت، الغرض ہر ایک چیز میں ایکٹروں کی تقلید کرتے ہیں

باوجود ان تمام باتوں کے فیشن کا ہونا ضروری ہے اگر ہم اس کو اچھی طرح عمل میں لائیں تو یہ ایک بہت اچھی چیز ہے۔ یکسانیت کی زندگی سے موت بہتر، ترقی کے لئے تبدیلی ضروری ہے لیکن اس قسم کی تبدیلی ——— جو تبدیلی ہمارے موافق ہو اور اس لئے ہمیں راحت و آرام ... اس تقلید جو ممکن ہے ہمیں پیرس کی طرح انجمنیں بنانے کی اجازت دے اور ہماری حالت اس شعر کے مصداق ہو جائے۔

ہوئے اس قدر مہذب کہ نہ دیکھی گھر کی صورت
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

فریدہ

خوش آمدید

یہ کون جھجکتا آتا ہے! کیوں آتے ہوئے شرماتا ہے
انداز تو چلنے کے ہیں وہی ہر گام پہ ہے اک موسیقی
ہے قد میں وہی ڈالی کی لچک سونے کی نظر بندوں کی چمک
وہ ہاتھ ہے ساغر کھنکے ناہید نے چھیڑے ساز نئے
خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں دامانِ فضا مہکاتی ہیں
لو آ ہی گئے وہ آ ہی گئے اور دیدہ و دل پر چھا ہی گئے

اب جانے کہاں کھو جاؤں گا
میں ان پہ فدا ہو جاؤں گا

دو قطعے

۱

گر نہیں قسمت میں لطفِ بہاراں نہ سہی
عیش و عشرت نہ سہی بزمِ شبستاں نہ سہی
ہو مبارک یہ جو اک دل کا دیا ہے تجھ کو
جس میں ہو تو ہے ملکِ سلیماں ہی سہی

۲

لطفِ ساحل نہ سہی تلخیٔ طوفاں ہی سہی
نورِ ایماں نہ سہی ظلمتِ عصیاں ہی سہی
ہائے محرومیٔ جاوید کہ یہ بھی تو نہیں
زندگی خواب سہی، خواب پریشاں ہی سہی

محسوسات

نگاہوں میں تمہارا آتا ہوا محسوس ہوتا ہے
تصور جام چھلکاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

خرام ناز اور ان کا تصور ناز کیا کہنا
زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تصور ایک ذہنی جستجو کا نام ہے شاید
دل ان کو ڈھونڈ کر لاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

کسی کی نقرئی پازیب کی جھنکار کے صدقے
مجھے سارا جہاں گاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تھرکتا ہے گھٹا کا عکس موجوں کی روانی پر
کوئی آنچل سا لہراتا ہوا محسوس ہوتا ہے

لچکتا جسم رقصاں بیخودی میں دیکھنے والو
سنہرا سانپ بل کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیل اب دل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی
کوئی میری طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیل شفائی

مشرق

(از موپساں)

جیسے ہی سردی شروع ہوتا ہے میں اپنے دوست کو یاد کرنے لگتا ہوں جو بہت دور ایشیا کی سرحد پر رہتا ہے۔

پچھلی دفعہ میں اس سے ملنے گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ دوبارہ اس سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ آج سے تین سال قبل ستمبر کی بات ہے کہ میں ایشیا گیا تھا، میں نے وہاں اس کو اپنے دیوان خانے میں افیون کے نشہ میں نیم خوابی کی حالت میں پایا۔

اس نے بغیر حرکت کئے کہنا شروع کیا "بیٹھ جاؤ پھر تم جو کچھ پوچھو گے میں اس کا جواب دیتا جاؤں گا، لیکن میں حرکت نہیں کر سکتا"، میں بیٹھ گیا اور پیرس کے متعلق ہزاروں باتیں کہہ ڈالیں۔ لیکن اس نے کہا "تم کیا کہہ رہے ہو مجھے اس سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں کیونکہ میں ایسے ممالک کا دلدادہ ہوں جو دوسرے آسمانوں تلے بستے ہیں۔ وہ بیچارا کاشر ایتو نے مشرق دیکھنے کی خواہش میں جان دیدی۔ تم نہیں جانتے کہ یہ ملک کس طرح مسحور کرتا ہے۔ یہ تمہاری آنکھوں کی راہ تمہارے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور اپنی محبت کے غیر مرئی دھاگے میں باندھ لیتا ہے۔ میں یہاں افیون کی رنگینیوں سے کھیلتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کیں۔

میں کہا "تمہیں زہر میں کیا مزہ ملتا ہے۔ تمہیں اس سے کیا جسمانی لذت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ یہ تمہارا ایک نہ ایک دن خاتمہ کر کے رہے گا۔" بات کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ جسمانی لذت نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حسین شئے ہے۔ افیون تمام دنیوی جھگڑوں سے دماغ کو نجات دلاتی ہے۔" "کیا تم جاننا چاہتے ہو مجھے کون کونسی چیزیں پسند ہیں۔ دوست! ایک تو ہے افیون اور دوسرے ہے مشرق۔ میں جب افیون کھا کر لیٹ جاتا ہوں تو پہلے ہلکا ہلکا سا خمار ہوتا ہے اس کے بعد تمام اعضاء پر یہ اثر چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں بالکل بے خود ہو جاتا ہوں، مجھے بے اندازہ مسرت ہوتی ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا، میں خیالات کے انتہائی سمندروں میں بہتا ہوا مسرت و انبساط سے ہمکنار ہوتا ہوں۔ دوبارہ اس نے آنکھیں بند کیں۔

میں نے کہا "تم جو مشرق سے اتنی محبت کرتے ہو وہ صرف اس نشہ کی وجہ سے ہے ورنہ کوئی کیونکر اس وحشی ملک کو پسند کرے گا جہاں دماغ بے حس ہیں، جہاں خیالات پر صدیوں کی روایتوں کا بار ہے، جہاں جہد حیات نام کو نہیں۔"

"میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ خواب ہے، وہ حسین ہے تم کہتے ہو مشرق ایک وحشی ملک ہے۔" "خاموش" بیہودہ آدمی یہ ایک فرشتوں کا ملک ہے، وحشی ہم مغرب کے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو متمدن اور شائستہ سمجھتے ہیں، ہم قابل نفرت وحشی ہیں جو وحشیوں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔

ہمارے پتھر سے بنے ہوئے شہروں اور خوبصورت فرنیچر کی طرف دیکھو ہماری ساری زندگی نمائش ہے۔ گھروں کے دود کش کو دیکھو جن میں سے خون کو جما دینے والی ٹھنڈی ہوائیں اتنی کافی آتی ہیں کہ ان سے چکی چل سکتی ہے۔ ہماری ساری زندگی کرسیوں پہ کھڑے گزرتی ہے۔ کتنی مضحکہ خیز چیز ہے...... ہماری دماغی زندگی پر بھی نظر ڈالو جو کتنی مصیبتوں اور کشمکشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ آئے دن لڑائیاں ہوا کرتی ہیں ہر طرف تباہی کا بازار گرم ہے۔ وہ تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہو گیا پھر کہنا شروع کیا: میں اس مکان کو جانتا ہوں جس کو قریب میں خریدنے والا ہوں وہ ایک مشرقی وضع کا بنا ہوا لکڑی کا مکان ہے۔ تم اس مکان سے سمندر کو آسانی سے دیکھ سکتے ہو۔ سفید بادبان تھرتھراتے ہوئے دکھائی دیں گے، لوگوں اور یونانیوں کی کشتیاں نظر آئیں گی۔ مکان میں چھوٹا سا چمن ہے جس میں ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں سرسراتی ہیں، درختوں کی شاخوں سے فوارے ابلتے ہیں اور آبشار کی صورت

میں ایک حوض میں گرتے ہیں جس کی تہہ سونے کی بنی ہوئی ہو وہاں میں ہر وقت نہاؤں گا۔ میں کوئی نوکر نہیں رکھوں گا اس لیے کہ وہ اپنے میلے پیروں کی ٹھوکروں سے فرش کو خراب کرتے ہیں۔ میں اب فرش پر بھی جوتوں کی آواز نہیں سن سکتا۔ میں خوبصورت کالی عورتوں کو نوکر رکھوں گا جو سفید برقعوں میں ننگے پیر قالین پر پھرا کرتی رہیں گی۔ میرے مکان کی دیواریں ایسی صاف اور چکیلی ہوں گی جیسے ایک حسین عورت کا شفاف سینہ۔

جب میں ان تمام حسین اور دلکش مسرتوں سے تھک جاؤں گا، جب میری خوشی میں تھوڑی سی کمی ہوگی کسی سفید یا سیاہ گھوڑے پر سواری کروں گا۔ میں شام کی خاموش فضاؤں میں گھوڑے پر سوار دیوانہ وار ڈوبتے سورج کی طرف دوڑوں گا۔ ... ہر چیز گلابی ہوگی —— پہاڑ —— ریت —— عربوں کے کپڑے —— اور گھوڑوں کے سفید کپڑے۔ انسانوں کو سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تکلیف دہ زمینوں پر بات چیت کرتے ہوئے سڑکوں کے کنارے ہوٹلوں میں کبھی بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں اپنے حسین و دلکش مکان میں اطمینان سے زندگی بسر کروں گا۔ تمام دنیوی ہنگاموں سے —— اور بہت دور۔ میری چند پانچ بیویاں ہوں گی جو قیمتی قیمتی لباسوں میں ملبوس رہیں گی۔ یہ دنیا کے مختلف گوشوں سے آئیں گی اور مجھے دنیا کی ہر نسل کی نسوانی خوبصورتی اور لذت کا مزہ چکھائیں گی۔

ایک دم وہ خاموش ہوگیا اور کہنے لگا۔ مجھے چھوڑ دو —— مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تین مہینے کے بعد اس نے ایک خط لکھا جس میں فقط یہی درج تھا "میں خوش ہوں۔"

اس کا خط روح پرور خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔

محمود قادری

دھوکے

میں جانتا ہوں تخیل میں کیا نہیں ہوتا
شباب شعر کی دنیا شراب کی بستی

وفورِ صبحِ گل افشاں نشاطِ شامِ نجوم
زمیں سے عرش تلک ایک بے پناہ مستی

ہر ایک چیز نہاں زیرِ دامنِ امکاں
نگاہِ ذوقِ طلب پر ہر ایک شے سستی

وہ چند لمحے تصور کی وسعتوں سے لطیف
وہ ہر وجود سے اک بوجھ سی مری ہستی

ندیم کاش یہ لمحے ہی زندگی ہوتے!
کہ میرے دل کو نہ ڈستی مری تہی ہوتی

میں اِس زمین سے کچھ دور ہو گیا ہوتا
اُسی جہانِ تخیل میں کھو گیا ہوتا

اقبال متین

محمد قلی قطب شاہ اور رومانیت

محمد قلی قطب شاہ [illegible] گولکنڈہ کا [illegible]
جبکہ دکن میں اسلامی [illegible] کا شکوہ [illegible]
سلطنت کا ایک [illegible] محمد قلی قطب شاہ
پہلا دکنی سلطان [illegible] ہندوؤں کے [illegible]
اور [illegible] کی [illegible] اور [illegible]
کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد قلی [illegible] قطب شاہی [illegible]
ہندوؤں سے [illegible] اور محمد قلی کی حسن پرست طبیعت
نے ایک عجیب و غریب [illegible] پیدا کر دیا۔
کلیات محمد قلی قطب شاہ [illegible] کو دیکھنے تو [illegible]
نظر آتا ایسی [illegible] محمد قلی کے دربار میں
حسن و عشق کے [illegible] نظر میں رکھے۔ یہ دربار
کیا تھا گویا حرم [illegible] کیا [illegible]
کی زندہ [illegible]
فضاؤں میں محمد قلی [illegible] زندگی [illegible] میں تو
حسن و عشق کے کسی [illegible] حقیقت [illegible]
چھلکتے نظر آتا ہے [illegible] کا [illegible]
بچپن ہی سے قدرت [illegible] اور رومانیت
[illegible] Sensuousness [illegible]
اس کی [illegible] رومانی [illegible] نظر آتی ہے۔
[illegible] قطب شاہ کی کلیات دو حصوں پر مشتمل ہے
ایک [illegible] دوسرے میں غزلیات
[illegible] علیحدہ [illegible]
[illegible] کلیات محمد قلی قطب شاہ میں
ایک [illegible] رومانیت [illegible]

[illegible] غزلوں میں
یہ [illegible] رنگینی [illegible] ہے اور محمد قلی
قطب شاہ کی [illegible]
جیسا شاعر کے عہد [illegible] کا ایک دھندلا سا عکس [illegible]

[illegible] پایا جاتا ہے۔ لیکن نظم کا حصہ خاص طور پر محمد قلی کے دیار
[illegible] ہے جس سے حسن و عشق کی ایک عجیب و غریب
Physical world [illegible] پیدا ہے۔ اس
دنیا میں محمد قلی [illegible] ساری کائنات سے پرے [illegible]
فلسفہ [illegible] اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے
ہاں اگر اہمیت ہے تو ایپی کیورس (Epicurus)
کے [illegible] علیحدہ [illegible] چنانچہ
[illegible] عیش کا ترانہ [illegible]

دنیا کی حکمت [illegible] ہرگز [illegible] عالم ہوں
[illegible] ترانہ [illegible] ہر جا [illegible]

اس ترانہ عیش [illegible] اپنی [illegible] دنیا کی محفل سجاتا ہے۔
اور ان [illegible] کی [illegible] ان محفلوں میں ہر موضوع کی
[illegible] حسن [illegible] آرائش و زیبائش
[illegible] اور عشق [illegible] کیفیتوں
اور جوانی [illegible] کے لیے بے پناہ جذبات [illegible]
کرتی ہیں۔ محمد قلی کی پیاریوں میں [illegible] پیاری
[illegible] بلقیس [illegible] بھاگ متی [illegible]
[illegible] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
ان پر محمد قلی نے مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے حسن و جمال
[illegible] اپنے عاشقانہ تعلقات کا
اظہار [illegible] محمد قلی کو ان پیاریوں سے جو لگاؤ تھا اس کا
[illegible] کہا جاتا ہے کہ بھاگ متی
کی خاطر محمد قلی نے موسی ندی کی [illegible] اپنا گھوڑا
[illegible] اپنی پیاری بھاگ متی کی [illegible] اس جرم
[illegible] محل میں چند روز قید بھی رہنا پڑا۔
[illegible] اور غمزہ و عشوہ کی تصویر محمد قلی
[illegible] ہے اس کے چند اشعار ہم ذیل میں
پیش کرتے ہیں

ننھی :-

دو کرلاج سوں انچل وو ننھی لنکی چمن
اس ننھی ڈال اوپر کیوں لگیا ہے سیو یوں

سونا سوں کریں جو غصہ و ناز کی باتاں
جب ہونٹاں تے جھڑے پھولی جیو منکے نکوں گن

(شرح :- جب چمن میں ننھی محو خرام ہوتی ہے تو شرم سے سارا انچل ڈال دیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ننھی ڈالی پر اتنی جلدی سے شباب کے پھل کیوں لگ گئے۔ جب وہ غصہ یا ناز سے نہایت سہولت کے اشارہ سے بات کرتی ہے اور اس کے ہونٹ عرق آلود ہو جاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو گن دیکھوں)

کنولی :-

تازگی تھے تازہ چنچل آئی میرے بر منے
بیل کوں لے سبز آنچل پھول جیغہ پر منے

کنولی پیاری پہلی باری ڈاو ساری داؤ سوں
نین ماری رنگ سے ساری مدھماری سرمنے

نیہہ دھن کا ناز مٹھن کا پاوں جھنکاریں کے
آس من کا عیش تن کا ذوق کن کا ہر منے

(شرح :- یہ شگفتہ چنچل پھر میرے یہاں سبز آنچل اوڑھے اور پھولوں کی کلغی لگائی ہوئی آئی۔ اس کی الھڑ چال سے شراب کا خمار اور آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آتے ہیں۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکار دل کے لئے امید، تن کے لئے عیش اور کان کے لئے ذوق کا باعث ہے)

پیاری کے متعلق لکھتا ہے :-

رین دن کو سچ جلنے نا جو کوئی جیو عاشق ہے تیرا
لگیا ہے یاد یوں تیرا کہ جیوں کچ یاد آئے لگی

(شرح :- جو دل سے تیرا عاشق ہے اس کو رات اور دن کچھ بھی سجائی نہیں دیتا۔ تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا) محبوب کی یاد اور اس کی مرکزیت کی مثال ہمیں مومن میں ملتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مشتری کے متعلق لکھتا ہے :-

ترا ہستی ای کا نانو ہے تن میں حیا ہو
تو نچ مستی گھٹے تا ابد لگ باصفا ہو

ای مستی کے تئیں توں جب پیا ہوویس اس میں
ہزاراں شکر و سجدے کر کہ تج سو مرتبہ ہے

ہمن دل کے گنوارے میں سجن کا نور دستا
سورج کرناں کی ڈوریاں سوں جھلکتا خوش کامی

(شرح :- زندگی اسی کا نام ہے کہ جسم میں دل ہو اور ہمارا دل ہمارا معشوق ہے جس میں عشق کی ابدی مستی ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے دل میں ہوس سے جگہ پائے ہوئے ہے۔ جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوشنما اور روشن ہے)

ان اقتباسات کے علاوہ ہمیں کلیات محمد قلی قطب شاہ میں بیسیوں نظمیں ایسی ملیں گی جو محمد قلی کی حسن افروز اور عشق لبریز زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اپنی پیاریوں کی محبت میں محمد قلی نے جذبات و احساسات کا اظہار جس حسن کارانہ انداز میں کیا ہے وہ محض تخیل کی قلابازیاں نہیں ہیں بلکہ سچی تصویریں ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے کلیات کے مقدمہ میں بڑی درست اور عمیق بات لکھی ہے کہ

" دنیا کا کوئی شاعر اپنے کلام میں اپنی زندگی کو اتنا عریاں نہیں پیش کر سکتا تھا جتنا کہ محمد قلی نے کیا۔ اس کا کلام قلب کی گہرائیوں سے

کھلتا تھا اس کو مبالغہ، تصنع یا آورد کی
ضرورت ہی نہ تھی۔"

ایک اور مقام پر زور صاحب یوں رقمطراز ہیں:۔

"شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ قدرت تخیلی یا فرضی عشق و عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکی۔ محمد قلی صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا۔ اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں یہ قومی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمایش گاہیں تھیں۔"

محمد قلی کی ان نظموں کا مقابلہ ہم اردو ادب کے شباب پیغمبر جوش ملیح آبادی کی نظموں سے کر سکتے ہیں۔ دونوں میں ہمیں وہی رومانیت کا شدید ترین احساس مشترک طور پر ملتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محمد قلی میں عریاں واقعیت ہے اور جوش میں جس کو غالباً محمد قلی جیسا جمالیاتی ماحول نصیب نہیں تخیلیت اور واقعیت کا امتزاج ہے۔ محمد قلی نے پیاریوں کے ذکر میں بعض راز و نیاز کے معاملات بھی اس انداز سے پیش کئے ہیں کہ موجودہ ترقی پسند ادب کے بعض عریاں افسانوں اور نظموں کو بھی شرم آ جائے گی۔ لیکن یہ محمد قلی پر کوئی الزام نہیں کیوں کہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے محمد قلی اپنی زندگی کے ہر پہلو کو عریاں سے عریاں انداز میں اور پوری پوری واقعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ شعر و سخن کا شوق ادبیات میں کوئی خاص مقام حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے جذبہ عشق کی تسکین کے لئے کرتا ہے اور یہ مقصد بے مقصود یا کانٹ کے الفاظ میں (Purposiveness without purpose) اس کو صحیح معنوں میں ایک بڑا حسن کار بنا دیتا ہے، خواہ اس کا پیرایۂ اظہار عریاں ہی کیوں نہ ہو چلے۔ چنانچہ "نقشۂ وصال"، "عیش وصال" اور "بعد وصال" وغیرہ اس کی عریاں نگاری کی مثالیں ہیں۔ اپنی پیاریوں کے ناز و انداز پر بھی اس کا قلم جذب و کیف کے ساتھ رواں

رواں ہے۔ "نازنین"، "اسرار شباب"، "انداز شباب"، "چنچل مین"، "ماہ ابرو"، "کعبہ رخ"، "سرو خوش قد"، "چاندنی اور سجن"، "چاندنی اور پیا" ——— ان تمام نظموں میں شباب کی لذتیں اور عیش کی وسعت گیر رعنائیاں اپنے انتہائی نقطہ پر نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مدعا نہیں کہ محمد قلی کی عشق و عاشقی اس کے مادی ماحول (یعنی اپنی پیاریوں کی زلفوں میں) الجھ کر رہ گئی۔ بلکہ محمد قلی اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس کی محبت کی ابتدا عورت سے ہوتی ہے لیکن انتہا اس (Great She) پر جس کو خدا کہتے ہیں۔

When a man Loves a woman, Then He Knows God's secret and secret of The world (Oskar Wilde)

اگرچہ آسکر وائلڈ کی طرح میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ محمد قلی کی اس عشق و عاشقی نے اس پر کائنات کے سارے راز فاش کر دیے تھے۔ اور نہ میں اس کا قائل ہوں کہ ایک رومانی شاعر کہاں تک فلسفہ طرازی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس مادی ماحول کی محمد قلی نے اپنے کلام میں عکاسی کی ہے وہ اپنی پوری گہرائیوں کے ساتھ اس میں موجود ہے اور پھر حافظ کے مطالعہ نے محمد قلی کی طبیعت پر تصوف و عرفان کا کچھ ایسا رنگ چڑھا دیا تھا کہ بعض نظمیں حافظ کی غزلیات کا بالکل ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔

محمد قلی نے نہ معلوم اپنی پیاریوں کے تعلق سے یا کسی اور سیاسی وجوہ کی بناء پر باشندگان دکن سے کچھ ایسے قریبی اور گہرے روابط پیدا کر لئے تھے کہ "مرج البحرین یلتقیان" کے بمصداق اسلامی اور ہندو کلچر کے دو دھارے گولکنڈہ کی سرزمین میں بہنے لگے۔ چنانچہ اس نے بعض ایسی عیدیں اور تہوار رائج کئے جو صرف اس کی رومان پسند طبیعت میں ترنگیں پیدا کرتیں بلکہ اس کی رواداری اور

سیاسی قابلیت کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ "نوروز" "بسنت" شب برات، بقرعید اور دوسری عیدوں پر محمد قلی نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں ان دونوں پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ خاص کر "نوروز" اور "بسنت" میں محمد قلی دلچسپی سے حصہ لیتا اور عیش و طرب کی داد دیتا تھا۔ ان موضوعات پر محمد قلی قطب شاہ کے نہایت بلند پایہ قصیدے اور نظمیں ملتی ہیں جو اس کی انتہائی مسرت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ بسنت کی عید میں محمد قلی کی ہندوستانیت پرستی جھلکتی ہے اور یوں بھی عیش و طرب کے لئے (جو فطرتاً محمد قلی میں جذبہ موجود تھا) بسنت سے بڑھ کر کون سا موسم ہو سکتا ہے۔ ان نظموں میں اس نے جس بے ساختگی اور رنگینی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

شب برات پر ایک نظم میں لکھتا ہے :-

ہر ایک دھن ہر یک کردھن پہن نورتن کے ابرناں
پی وہ لٹ جھلکا بدن شہ یک چمن کوں آئے ہیں سوں
مکھ شباب کے رنگ تے کوں آفتاب جھلکاتے ہیں
دکھلائے کر جیتا ب کوں بےتاب کر بجلاتے ہیں
سو دھن لٹک کے جب جھلکا، دو توں الک کر سو مہک
مہکیا ملک پر تھے فلک لے سد ہو لٹک آئے ہیں
چھاتی اپر چھاتی سندر لٹ بام در پیچ لٹ بھتر
جانے کر کالے ابر دو نگر پہ چڑنے آئے ہیں

(شرح :- ہر طرف سے ہر ایک نازنین نورتن کا لباس پہن آئی ہے تاکہ بادشاہ کے ساتھ چمن میں نکلے۔ شراب عشق پینے سے ان کے جسم جھلک رہے ہیں۔ اور اپنے نوجوان چہروں کی آب و رنگ اور آفتاب جیسی جھلک سے مہتاب کو بے تاب بنا کر جلا رہی ہے۔ نازنیں اس انداز سے خرام ہے کہ اس کی زلفوں کے لہرانے کی وجہ سے خوشبو آسمان تک پہنچی ہے اور سارا آسمان مہک گیا ہے۔ ایک سے ایک کے پستان زیادہ خوبصورت ہیں جن پر سیاہ بالوں کی لٹیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑیوں پر کالے بادل چڑھائی کرنے آئے ہیں)۔

بسنت پر ایک قصیدے کے چند اشعار ہیں :-

پلا ساقی سرا مدمے کہ تا ہوئے کشف ہمنا کون
کہ تا ہمنا سے تجھ دلیسے تج کوں سدا سب راز پنہانی
عنبر ہور عود و مشک و زعفراں کا رت آیا
سو سب کے باس انو کا جگ میں کرتا ہے گلستانی
بسنت پھل کا مالا پہن کر آئی آنگن میں وطن
سو پھل سنگار کے نقشاں تھنے حیران ہے مانی

(شرح :- اے ساقی! شراب پلاتا جا تاکہ مجھ کو کشف ہونے لگے کیونکہ شراب کی وجہ سے مجھے پوشیدہ راز بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ عنبر، عود، مشک، زعفران کی رت آئی ہے۔ اس وجہ سے ان سب کی خوشبو دنیا کو گلستان بنا دیتی ہے۔ بسنت کے پھولوں کی مالا پہن کر وہ جیسے چمن میں نکل آئی ہے۔ جس کے پھولوں کے نقش و نگار کو دیکھ کر مانی بھی حیران ہے)

اسی طرح عید میلاد نبی، شب معراج، شب برات، عید کوری، عید غدیر وغیرہ پر محمد قلی کی بلند پایہ نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں کی ایک خاص خصوصیت اس کی منظر نگاری اور محاکاتی پہلو ہے۔ بعض بعض مقامات پر موسم کی کیفیتوں کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ کہیں ورڈسورتھ کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ اور اپنی پیاریوں کی وہ تصویریں (Pastoral) جو عیش و طرب کی حالت میں اس کے پیش نظر ہوتیں اس انداز سے بھی عکاسی کرتا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ہمارے ادب میں ملتی ہے۔

حسن کا یہ پرستار محمد قلی جو پایہ اپنی شاعری میں رکھتا ہے وہ رتبہ دکن کی معاشرت اور تمدن کی تعمیر کاری میں بھی اسے حاصل ہے۔ اپنے عہد حکومت میں اس نے بعض ایسے

رسم و رواج کی بنیاد رکھی جو اس کے مرنے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک دکن میں قائم رہیں۔ چنانچہ اب بھی شادی بیاہ کی رسومات میں جلوہ اور اہنسدی محمد قلی کی ہی روایت پر دار ہیں۔ ان رسومات پر بھی محمد قلی کا قلم حسن افشانی کرتا چلا جاتا ہے۔

محمد قلی کے اسٹائل اور خیال میں وہ سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے جس کا مقابلہ ہم یا تو جوش کی شاعری اور نیاز کے رومانی افسانوں سے کر سکتے ہیں یا پھر آسکر وائلڈ، بائرن اور والٹر پیٹر وغیرہ کے شاہکاروں سے۔ انداز بیان میں "فطری بہاؤ" ہے اور کہیں بھی یہ دھوکا نہیں ہوتا کہ شاعر نے خواہ مخواہ خیال آرائی کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محمد قلی کی شاعری تخیل کی بلند پروازیوں سے خالی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے تخیل کے پاؤں اس کے جغرافیائی ماحول میں محو خرام ہیں تو اس کے پر شاعری اور خیال کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔

محمد معین الدین

غزل

فریبِ وہم سہی یہ جینا، مگر کہاں آ کے فریب کھائیں
یہی جو ہے زندگی کا حاصل، تو کیوں نہ جینے سے باز آئیں

جنوں کو کچھ اور آزمائیں، حضور جی بھر کے مسکرائیں
مرے نشیمن کے تنکے تنکے پہ شوق سے بجلیاں گرائیں

غمِ گزشتہ کا تذکرہ کیوں کشاکشِ بیم و آرزو کیا
وہ دیکھو اٹھی ہیں پھر گھٹائیں اٹھاؤ ساغر پئیں پلائیں

مجھے غمِ عشق دینے والے فسانۂ غم پہ ہنس رہے ہیں
الٰہی! ایسا بھی وقت آئے، مرا فسانہ مجھے سنائیں

مری طرف آپ دیکھئے تو جھکی جھکی سی ہیں کیوں نگاہیں
اگر جفاؤں پہ منفعل ہیں، مری وفاؤں کو بھول جائیں

مرے جنوں سے نہ مٹ سکے جو انھیں زمانہ مٹائے گا کیا
مری وفاؤں کے نقش ہیں یہ مٹا سکیں آپ تو مٹائیں

کبھی جو تھیں زندگی کا حاصل ظفر وہ اب خواب ہو گئی ہیں
وہ روح پرور سہانی راتیں، وہ بھیگی بھیگی ہوئی فضائیں

مظفر الدین ظفر

فریبِ مسلسل

(محبت بھرے دل کے ساتھ — اپنی نسیم بخاری کے نام ——!)

جنگل میں جب کوئی بڑا سا جانور مرجاتا ہے تو چاروں طرف سے گدھ ٹوٹ پڑتے ہیں —— کوئی شہد کی مکھی مرجاتی ہے تو اسے بیسیوں چیونٹیاں گھسیٹ لے جاتی ہیں سمندر میں بڑی مچھلی ہزاروں ننھی منی مچھلیوں کو ہضم کرجاتی ہے ——

سود کھانے والے مہاجن خود پھولتے چلے جاتے ہیں اور جن سے وصول کرتے ہیں وہ جلدی جلدی سوکھ کر قبر کے کنارے پا پہنچتے ہیں — —

ہمارے جنت نشان ہند وستان میں جہاں کوئی مرا مثلاً بھائی —— بھتیجا — چچا یا اور کوئی رشتہ دار — اور یہ فکر لاحق ہوئی کہ حق داروں کو خانہ بدوش بنا کر خود مالِ غنیمت پر قبضہ کرلیں۔

بقولِ شاعر ع

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا

راشدہ کا سہاگ لٹا تو جیٹھ صاحب کو فوری فکر جو پڑی وہ مکان کی تھی —— صحن میں دو گز زمین اپنی طرف کرکے دیوار کھینچ دی۔ — — اس ظلم کی داد تھی نہ فریاد؟ بچی دو سال کی تھی اور بچہ دو مہینے کا —— جس نے باپ کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی۔ باپ کے مرنے کے دوسرے مہینے دنیا میں قدم رکھا تھا۔ تیرہ سال کی راشدہ بیاہی گئی تھی اور پانچ سال بادشاہت کی۔ سترہ اٹھارہ سال کی کمسن لڑکی منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دنیا کے مکر و فریب سے ناآشنا —— پھر خدا کا خوف کرکے کچھ دنیا کی شرم کرکے چار روپے گزارے کے باندھ دئے۔ جیسے بہت بڑا احسان فرمایا ہو ——

راشدہ خدا معلوم کس بے زبان ماں کی بچی تھی جس نے یہ تمام مصیبتیں چپکے چپکے سہہ لیں۔ پندرہ سال تک متواتر —— فاقہ پہ فاقہ کرتی تھی اور اپنے دونوں بچوں پر آنچ نہ آنے دیتی تھی۔ پیسا دو پیسہ کر چرخہ کات کر۔ سلائی سی کر اس نے اپنے بچے کو پڑھایا تعلیم کا تو اس نے غریب گھرانے میں انکار کر دیا۔ گھر کے کام سے سبکدوشی حاصل کی —— لڑکی کی نکاح لگ گئی اب اس کی یہ کوشش تھی کہ بیٹا کہیں نوکر ہو جائے۔ افسوس یہ بڑی مشکل سے کرایا تھا آگے تو بھلا ہمت ہی کیا ہوتی — — — دو تین سال اور یہی کشمکش میں گزر گئے۔ خیر خدا خدا کرکے اقبال اس قابل ہوا کہ وہ لکھنؤ کی دکان پر ملازم ہو گیا — یہ خوش خبری ناقابلِ بیان تھی راشدہ مسرور تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔ زندگی کے چار روپیوں میں گزارہ کی تھی اب آٹھ روپیے بھی — — کیا تھے؟ اقبال ہی بس دلکش تھا۔ پہلی تنخواہ اقبال نے ماں کو بھیجی — دوسرا مہینہ پورا بھی نہ ہوا پایا کہ ماں ختم —— وہ روتا بلکتا آیا تیسرے دن گھر سے جو نکلا آیا تو کرانچ سے گریں۔ گرتے ہی دل فیل ہو گیا —— اس کے دلِ ناتواں میں رکھا ہی کیا تھا؟ سترہ اٹھارہ سال فریبی سسرال کے پتھر کے کھانے نے محض تپا سا رہ گئی تھی۔ خون کا نام سے پہنچنا تک نہ تھا۔ صرف نقشہ سے پتہ اتنا چلتا تھا کہ یہ مسکراتا ہوا چہرہ کبھی حسین ضرور ہوگا۔ پینتیس سال کی عمر میں تمام مدارج طے ہو گئے ——

شادی — بیوگی — سہاگ — بچے —— پرورش شادی —— تعلیم —— آرزو —— ملازمت ——

حسرت بھری موت۔ جس وقت ماں کے مرنے کا تار اقبال کو ملا تو وہ اپنی ماں کی صورت کا مشتاق تھا کی طرح تڑپ کر آیا لیکن وہ غریب تو لاکھوں من مٹی کے نیچے دب چکی تھی —— گھر خالی پڑا رہ گیا تھا۔ مختصر سا جھونپڑا — دالان منہ سے

فریاد ہو تھا کہ اس کی مالکہ گھر سونا کر گئی ——
در و دیوار وحشت سے خاموش تھے —— اداسی
کی غمناک گھٹا چھائی ہوئی تھی —— نیموں کا
درخت سر جھکائے منتظر تھا کہ نازک ہاتھ توڑیں گے
—— مرغیاں دانے کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں ——
محبت سے دانہ پانی دینے والی اب کہاں تھی جو مضطر
ہو کر بلاتی۔ —— اقبال دیوار سے لگ لگ کر
روتا تھا۔ پیڑے پھاڑتا تھا۔ آوازیں دیتا تھا ——
اماں! —— ماں —— ہائے میری اماں ——
اب وہ اماں کہاں تھی جو بے چین ہو کر پہلی ہی آواز
پر دوڑ پڑتی تھی؟ ہزاروں آنسو گرتے تھے اور
خاموشی —— بہن وہ چار دن کو آئی ہوئی تھی
لیکن وہ بھی سسرال کی دبی ہوئی تھی۔ زیادہ نہ
رہ سکی اور بھائی کو تڑپتا چھوڑ چار و ناچار ساس
کے حکم سے واپس چلی گئی ——
اب اقبال اس کھنڈر میں لاوارث سا پڑا رہتا۔
تائے صاحب تائی صاحبہ کا حکم بھی بجا لاتا ——
ایک دن اقبال نے کہا "تائے ابا یہ جو
صحن میں میرے والد کی زمین آپ نے ادھر کر لی۔
ہو سکے تو اس کا کچھ روپیہ دیدیجئے تاکہ میں بیماری
بیکاری میں کچھ کام لا سکوں"
اتنے جملے سننے کی تاب بھلا بے ایمان، ضمیر فروش
بے درد، تائے ابا کو کب ہو سکتی تھی۔ ہزاروں
گالیاں دیں مارنے کو چڑھ دوڑے —— چار
روپیے مہینے کا طعنہ دیا۔ سرپرستی کا زمانہ یاد
دلایا۔ احسانات گنائے —— اقبال نے جل کر کہا
اس چار روپے کے بدلے میری ماں سے تمام گھر کا کام
جو لے لیا جاتا تھا کیا جب بھی معاوضہ پورا نہ ہوا؟
یہ جواب پاکر تلملا گئے —— عاقبت سے
بے خبر، خوفِ خدا سے ناآشنا بڈھے تائے نے
جوان بھتیجے کا ہاتھ پکڑ دن دھاڑے نکال باہر کیا۔
اور اس کا سامان کچھ تو توڑ پھوڑ دیا اور کچھ
سڑک پر یہ کہہ کر پھینک دیا —— لے جاؤ یہ
کاٹ کباڑ —— اور جاؤ دعویٰ کرو —— میرے
بھائی کا مال ہے۔ میں مالک ہوں۔ اقبال نے
کھڑے اور پڑے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ اپنی بے بسی
سے مجبور ہو کر تائے کے پاؤں پکڑ لئے لیکن اب بھلا
کہاں ترس آسکتا تھا —— ؟ جنون چڑھ چکا
تھا۔ ٹھوکر ماری تو سر سے خون چھوٹ پڑا ——
دو من کی زندہ لاش اژدہے سانپ کی طرح "فوں فوں"
کر رہا تھا ——
محلے والے یہ تماشا دیکھتے رہے اور نہ بولے۔
گھر کے چھوٹے بڑے سب یہ منظر ہنس ہنس کر دیکھتے
رہے اور دل نہ پسیجا ——
اب اقبال خانہ بدوش ہو چکا تھا وہ آسرا دیکھ رہا تھا
کہ کوئی اسے سہارا دے؟
تمام تکلیفیں تو اٹھا چکا تھا۔ فاقے کر چکا تھا۔ ماں کے
ساتھ گھنٹوں رو رو کر چپ ہو چکا تھا پر گھر کی مصیبت
آج نئی تھی۔
تائے ابا نے یہ فریب سے حاصل کیا ہوا مکان کھٹ
سے اپنی بیٹھک بنا لیا —— عالی شان مکان میں اور
اضافہ ہو گیا ——
کئی روز تک اقبال گھر کے لئے ایک ایک کا منہ تکتا پھرا۔
آخرکار اس کی رشتہ کی ایک غریب بہن کو ترس آگیا۔
اس نے اس مصیبت میں اپنا ہاتھ بڑھایا —— اپنے
مختصر سے ٹوٹے ہوئے مکان میں محبت سے بلا لیا مکان
اگرچہ ٹوٹا پھوٹا تھا لیکن دل غنی تھا۔ دل میں جذبہ تھا۔
درد تھا۔ ہمدردی تھی۔ فریب کا دخل نہ تھا ——
انسانیت فخر کر رہی تھی —— محبت سر اٹھائے
عملی ثبوت دے رہی تھی کہ لاکھوں زیبیوں کے درمیان

ابھی اہلِ دل بھی باقی ہیں؟

قسمت دھکّے دیتی ہے تو دھکے چلی جاتی ہے۔ یکساں قسم کی ٹھوکریں ..... دکھ ---- بے بسی۔ محتاجی اور جب پلٹتی ہے ---- تاش کے پتوں کی طرح ---- الٹی چال ---- تو مہربانی کا پانسہ سیدھا پھینکتی ہے۔ اقبال کے دن جب پھرے تو ایک دنیا اسے اپنا اپنا رشتہ دار بتانے لگی ---- رستہ چلتے خود بخود "آپ تو میرے چچا زاد بھائی ہیں"

"ارے آپ تو ہمارے بہت قریب کے رشتہ دار ہوتے ہیں ----"

"آپ کے والد سے تو میری بہت دوستی تھی"

"آپ بے حد محبت والے ہیں۔ ہم تو آپ کی دادی کی بہن کے پوتے ہیں اتنا قریبی رشتہ ہے"

یہ آوازیں ---- یہ دعوے پرانے زخم ہرے کر ڈالتے ایسا لگتا جیسے کوئی ہزاروں پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔

جنگ ۱۹۴۲ء کی بہت ہی بھاگوان ہوئی ---- بہتوں کو تو بے گھر، بے در، یتیم بیوہ بنا گئی لیکن چند سہاروں کو زندگی کا عملی سبق بھی دے گئی ----

اقبال نے جس وقت نام لکھوایا تو یہ سمجھ کر کہ میرا کوئی رونے والا تو ہے نہیں ---- چلو یونہی سہی ---- اگرچہ وہ خیالات میں بے حد آزاد تھا اور غلامی کو موت سے بدتر سوچا کرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں فوج میں چلا گیا۔ جوں توں کر کے دو سال وہ مختلف جگہوں پر رہتا رہا۔ بصرہ، مصر، عدن وغیرہ گھوم کر وطن لوٹا ---- اس بدتمیز وطن کی طرف جہاں وہ سگے ناتے کے ہاتھوں خانہ بدوش ہوا تھا۔ جہاں اسے ٹھوکریں نصیب ہوئی تھیں، جہاں سترہ اٹھارہ سال ماں کے ساتھ وہ فاقہ کشی کر چکا تھا ----

ہاں اس وطن میں اس نے اس انداز میں قدم رکھا۔ چمکتے ہوئے بٹن اس کی وردی میں تھے ---- ٹوپی میں ستارہ چمک رہا تھا ---- بازو پر امتیازی نشانات تھے۔ سینے پر تمغہ تک رہا تھا ---- پاؤں میں بھاری بھاری جوتے ---- لفٹ رائٹ کے انداز سے قدم اٹھتے ہوئے ---- جیسے یہ ساری دنیا کو زیر کرنے کا اعلان فرما رہے ہوں ----

اب وہ خاصا خوبصورت جوان نکلا تھا۔ البتہ ماتھے پر چند شکنیں پڑ چکی تھیں تو ثبوت دیتی تھیں کہ دنیا کی جو تلخیاں سہی ہیں ان کا گہرا اثر چہرہ پر نمایاں ہو گیا ----

جو اپنے پرائے پرچھائیں سے بھوت کی طرح خوف کھاتے تھے اب قریب رہنے کے لئے مختلف ہتھیار لے کر آگے بڑھے ---- کوئی ہمدردی کی باتیں لے کر ---- کوئی رشتہ داری کے بہانے سے کوئی مبارک باد کے سنہرے الفاظوں کے ساتھ ---- کوئی دعوت کا مکروہ بہانہ کر کے غرض سب نے فریب کے جال تیار کر کے قسمت آزمائی کی ----

اقبال بھولا نہ تھا اسے سب کچھ یاد تھا۔ ایک ایک سلوک اس کے کلیجہ پر ناسور بنا ہوا اب بھی موجود تھا ---- جب دنیا کو اس کی ضرورت اگر نہ تھی تو اب اقبال کو مطلق ان مردار لوگوں کی حاجت نہ تھی ----

اس نے سب سے بے رخی کا برتاؤ کر کے منہ پھیر پھیر لیا۔ یہی رشتہ دار اپنے اپنے کمزور جال پھیلا کر الٹے مایوس گئے ----

اقبال نے اپنی شادی کی بات براہ راست خود ایک غریب لیکن شریف گھر سے طے کی اور شادی کے بعد ان ہی لوگوں میں رہنے سہنے لگا۔ وہ لوگ بھی اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ---- بیوی قناعت کے ساتھ شوہر کی دلداری میں مصروف رہتی۔ صحیح معنوں میں سچی ہمدرد، محبت پرست، نیک طبیعت

جو کچھ فوج کی ملازمت سے پایا تھا اس روپے سے

اس نے تجارت شروع کی نہایت کامیاب رہا ۔
چند سال بعد اس کے پاس سب کچھ ہو گیا تھا ۔
مکان، دکان، نوکر چاکر، عیش و عشرت ۔ بچے [illegible] ۔ ہاں بعض کبھی گزشتہ تکلیفیں یاد کر [illegible] تڑپا دیا کرتی تھیں ۔ ان [illegible] کا جلبہ [illegible] ناقص میں آواز نہیں ہوتی ۔ بخار آیا [illegible] ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ یہ علامت ہے [illegible] رہے ۔
[illegible] وہی ہوا ۔ چیچک نکلی اور ایسی زور وشور کی [illegible] خالی ہو گیا ۔ زندگی سے سب ہاتھ دھو بیٹھے [illegible] ہوتا ناممکن تھا ۔ بے حد تعفن تھی ۔ [illegible] تو خیر ہو گئے لیکن تمام جسم [illegible] گوشت کی طرح [illegible] چیچک کی نذر ہو گئیں ۔۔۔ گھر کا گھر خدمت [illegible] لگا ۔ [illegible] اندھے اگر تھوڑا بہت [illegible] کیا ہو گیا ؟ کالرا کا بہت زور شور تھا ۔ [illegible] معلوم ہوا کہ وہ اس فریبی دنیا میں فریب [illegible] آیا ہے ۔ تین جوان لڑکے [illegible] لوٹ پوٹ ہو کے رہ گئے گویا قضا کی [illegible] باپ [illegible] میں بے گناہ پس گئے ۔ بڑھیا یا پھر اندھاپن ۔ یہ داغ دہکتے ہوئے انگارے تھے ۔ [illegible] ہر وقت تڑپتا تھا اندر جل اٹھتا تھا ۔۔۔۔۔
ایک لڑکی رہ گئی تھی ۔ اس کا بھی غریب سے نکاح پڑھا دیا ۔ باپ تو نوکری سے بیٹھ ہی چکے تھے ۔ داماد کو محتاج ہاتھ پاؤں سے کچھ تھوڑی بہت [illegible] خدمت کرنے کو تھی نہیں مفلسی نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا ۔ آئے دن بیمار رہنے لگی ۔
ایک دن [illegible] سستی بک رہی تھی وہ لے لی ۔ خدا جانے کئے دن کی سڑی گلی تھی ۔ پکا کر بھوک میں کھا لی ۔ اب قدرت نے نئے ڈھنگ سے انتقام لیا دونوں کا جسم پھوٹ نکلا ۔ اور ہر دیکھنے والے نے توبہ توبہ کر کے دوری اختیار کی ۔
گھر کی چیزیں تو اندھے پن کے بعد ہی سب نیلام کر کر کے ختم کر ڈالی تھیں ۔۔۔ اب تو صرف مٹی کے چند ٹھیکرے پڑے رہ گئے تھے اور یا وہ عالی شان کھنڈر کھڑا رہ گیا تھا جس کے دروازے سے اقبال ٹھوکریں کھاتا ہوا فریاد ہی نکلا تھا ۔
۔ جس سے مرمت طلب مکان یوں ہی کھڑا تھا ۔۔
اچانک بارشیں ہوئیں ۔۔۔ ایسی ایسی موسلا دھار کہ پختہ پختہ منزلیں سر بسجدہ ہو کے ڈھیر ہو گئیں ۔ ایک رات کو پڑا رہنے کا ذرا ٹھکانا تھا وہ بھی گیا ۔۔ ورنہ سارے دن تو لکڑی کے سہارے دونوں بڈھے بڑھیا گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے ۔ کبھی کبھی شہر کی طرف بھی نکل جاتے ۔۔۔ جہاں بعض آنکھیں اب بھی ان ہستیوں کو پہچان لیتی تھیں ۔
برسات جب رو رو کر اقبال کے مکان کو بالکل ڈھا گئی صرف بنیادیں چھوڑ گئیں یا وہ لیموں کا شاداب چھوٹا سا درخت جو بڑھ کر اب چھت سے بھی اونچا ہو چکا تھا تو موسم نے ایک اور کروٹ لی ۔۔۔ یعنی سردیاں تو یہ کرانے آن پہونچیں ۔۔۔۔۔
ایک دن حسب معمول چیتھڑے لگائے بھیک مانگتے جا رہے تھے ۔۔۔ آہٹ پا کر بڈھے نے دردناک صدا لگائی بابا دے کچھ ۔۔۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ ۔ اقبال کا دل چاہا کہ تھپڑ مار کر بھاگ جائے ۔۔۔ یا دونوں کی گردن دبا دے ۔۔۔ کمینے اب بھی کچھ اور فریب دینا چاہتے ہیں کیا ؟ لیکن اچانک دل کانپ گیا ۔ نیکی نیک راہ بدی پیش راہ ۔ جھٹ دس کا نوٹ پکڑا آگے بڑھ گیا ۔۔۔ لیکن پاس ہی کوئی محلے کا نوجوان کھڑا تھا بولا او بڑھیا ! بڈھے کی تو خیر اندھی آنکھیں ہیں وہ تو بھلا کیا پہچانتا ؟ کچھ تو نے بھی پہچانا یہ کون تھا ؟ وہی اقبال ۔۔۔ اقبال

جس کو تم لوگوں نے حق سے ناحق کیا — سمجھے — ڈوب مرو کہیں چلو بھر پانی میں — لوٹ بڑی جاری سے پکڑ لیا ہے؟"

یہ سنتے ہی دونوں کو گویا سانپ سونگھ گیا — — نوجوان نے ایک اور تیر پھینکا — "اگر میں تم لوگوں کا بھتیجا ہوتا تو ابھی مارے جوتوں کے تم دونوں کا بھیجہ پلپلا کر ڈالا ہوتا — تم [illegible] دفان ہو جاؤ — [illegible] — تمام محلہ کی آب و ہوا گندی کر رکھی ہے — لعنت کے [illegible] نے بہت کچھ کہیں تم سے دور جا کے چلی ہے [illegible]"

آج کا دن شاید خدا نے انصاف کے لئے رکھا ہے دودھ کا دودھ پانی کا پانی دنیا کو نمایاں دکھانا تھا — رات آئی — [illegible] ساتھ جاگتا ہوا انصاف لائی — ایسا انصاف — جو دنیا [illegible] والوں سے نہ ہو سکا نہ قانون سے ہو سکتا۔ نہ بڑے بڑے عبا و قبا والے فتویٰ دے سکے کہ مظلوم کے لئے کیا ہونا چاہئے تھا۔ قدرت نے چند منٹ میں [illegible] کر دیا برسوں کی پانی کھائی دیواریں تو [illegible] ہو چکی تھیں۔ بغلی کوٹھری ذرا کچھ [illegible] تھی اسی میں یہ فریبی مکار بڈھا [illegible] رہتا تھا۔

آج بھی سردی میں [illegible] دیوار سے لگے بیٹھے تھے — اچانک ایک [illegible] کے ساتھ دیوار اڑا...... اڑا دھم ہو کر آ پڑی — [illegible] بلند ہوئیں اور ختم — [illegible] دو بجے لحافوں میں سے نکل کر دوڑتا اور [illegible] محلے والوں کو جمع کرتا —

یوں ہی سسک سسک کر دم صبح تک [illegible] —
جب تک کہ پولیس آ گئی — ملبہ ہٹایا گیا —
آخری سانس آ [illegible] -
بڈھے کے [illegible] ... [illegible]

میں نے ظلم کیا تھا ..... بہت بھاری ظلم ......
[illegible] — ظلم کیا تھا [illegible] کا چھینا تھا ....
بے گھر کیا تھا ......

انسان کو خبر لگی — بھاگا چلا آیا — اس کے سینے میں [illegible] کرنے لگا — [illegible] ختم ہو گیا —

[illegible] اور بڈھے کی بیٹی کو اطلاع [illegible] زندگی میں ختم [illegible] کی ٹھوکریں [illegible] پسند نہ آیا — [illegible] مکان کے اللہ نام پر [illegible] بیواؤں کو تقسیم کر دیا — [illegible] مسلسل قریب کے ٹکڑے [illegible] — —

شفیق بانو

تجلیات

[illegible] نہیں معلوم — [illegible] کی دوا نہیں معلوم

[illegible] — [illegible] دنیا [illegible]

عشق کی ابتدا تو ہے لیکن — عشق کی انتہا نہیں معلوم

[illegible] — کیا غضب ڈھا گیا نہیں معلوم

[illegible] — [illegible] نہیں معلوم

[illegible] آخر

[illegible] نہیں معلوم

عظیم حیدرآبادی

ہسپتالوں اور صحتی اداروں میں نرسوں کی کمی

(نرسوں کے لئے بہتر انتظامات اور اعلیٰ تعلیم و تربیت)

محکمۂ تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر زراعت پیشہ لوگ بیماری کے باعث جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور ہو چکے ہوں تو وہ بحیثیت جماعت ترقی نہیں کر سکتے۔ یہ بات شہری آبادی پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ہندوستان ابھی تک علاج معالجہ اور صحت و صفائی کے انتظامات کے لحاظ سے دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ صوبائی حکومتیں ان سروسوں پر اپنی آمدنی کا اوسطاً ساڑھے پانچ فی صدی حصہ صرف کرتی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ مرکزی حکومت کی مالی امداد کے ساتھ صوبے ترقی کی بہتر اسکیموں پر عمل درآمد کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ان سروسوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرسوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زمانۂ جنگ میں نرسنگ سروسوں کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا گیا لیکن ابھی تک ایسی نرسوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے جو عمدہ اور اعلیٰ تربیت حاصل کر چکی ہوں۔

نرسنگ سروسوں کی ترقی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا اور انڈین ملٹری نرسنگ سروس قائم کی گئی۔ مگر وہ بڑھتی ہوئی جنگی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکی۔ اس کے بعد سرکاری رجسٹرڈ نرسیں اور شہری ہسپتالوں کی نرسیں بھرتی کی گئیں لیکن اس کے باوجود ہندوستانی فوجوں کے بیماروں اور زخمیوں کی خبرگیری کے لئے مزید نرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور ۱۹۴۲ء میں آگزیری نرسنگ سروس آف انڈیا قائم ہوئی۔ جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی خواتین شامل ہوئیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ سے بھی نرسوں کے دستے آتے رہے۔ مگر مذکورہ کوششوں کے باوجود نرسوں کی بدستور کمی ہے۔

نرسوں کی کمی

۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو ٹرینڈ نرسز ایسوسی ایشن آف انڈیا کی چوتھی کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں تعلیم وصحت و اراضی کے ممبر آنریبل سر جوگندر سنگھ .... نے بھی نرسوں کی کمی کے متعلق اظہار خیال فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس امر پر زور دیا کہ نرسوں کے رہنے سہنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہتر انتظامات کئے جائیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر سروس کے حالات کو ترقی دی جائے تو ہسپتالوں میں کام کرنے کے لئے تعلیم یافتہ خواتین کافی تعداد میں اپنی خدمات پیش کر دیں گی۔

اس کمی کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں نرسنگ سروس اور اس کی معاون سروسوں نے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی جتنی تیزی سے طبی سروسوں نے ترقی کی ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بڑے ہسپتالوں میں ۵۱ ہزار بیمار ہیں جن کی تیمارداری کے لئے ۱۷ ہزار نرسیں ہونی چاہئیں۔ مگر ان کی موجودہ تعداد ۷ ہزار ہے جن میں سے صرف نصف تربیت یافتہ ہیں اور چھوٹے ہسپتالوں میں تو حالت اور زیادہ خراب ہے۔

بہرکیف سروس کے حالات کو سدھارنے کے لئے زبردست کوششیں کی جارہی ہیں ——

کل ہند نرسنگ کونسل کے قیام کے لئے مرکزی اسمبلی نے آئندہ اجلاس میں ایک مسودۂ قانون پیش ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ نرسنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ہندوستانی اسکول قائم کرنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اسکول جلد کالج بن جائے جس میں انسٹرکٹروں کا نصاب پڑھایا جائے اور صحت عامہ کی نرسنگ کے متعلق بھی) تربیت دی جائے۔

تعلیم وتربیت کے بہتر انتظامات

حکومت ہند نے نرسنگ کے متعلق صوبوں کے لئے چند تیار تجویز کئے تھے۔ صوبائی حکومتیں ان سے دلچسپی ظاہر کر رہی ہیں۔ چنانچہ بمبئی اور صوبہ متحدہ میں نرسنگ سروس کی نگران خواتین مقرر کی جا چکی ہیں۔ مدراس میں نرسنگ کی سپرنٹنڈنٹ ۱۹۴۱ء میں مقرر کر دی گئی تھی اور اب بنگال میں بھی اس کا تقرر عمل میں آنے والا ہے۔

بیرونی ملکوں میں نرسوں کی اعلیٰ تربیت کا سر دست چھوٹے پیمانہ پر بندوبست کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے بعض ممتاز ہسپتالوں میں ہر سال ۲۲ ہندوستانی نرسوں کو تربیت دی جائے گی اور ان آموزگار نرسوں کے لئے وہی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی جائیں گی جو برطانوی آموزگار نرسوں کے لئے مہیا کی جاتی ہیں۔ (۵) طالبات برطانیہ پہنچ چکی ہیں جن میں سے دو "سسٹر ٹیوٹر" کے نصاب کی تکمیل کریں گی۔ حکومت ہند نے بنگال کی ایک خاتون مس سوروما بسواس کو بھی رائل کالج آف لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

دو سال ہوئے سر جوزف بھور کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ صحت عامہ کا جائزہ لے اور اپنی سفارشیں پیش کرے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ جلد پیش کر دے گی اور صحت عامہ کی منصوبہ بندی میں بھی نرسنگ سروس کی ترقی کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

ہلتھ وزیٹر خواتین

اس ضمن میں ڈائرکٹر جنرل میڈیکل سروس و صدر انجمن تپ دق ہندوستان لفٹننٹ جنرل جے۔ بی۔ ہانس کی وہ تقریر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جو انھوں نے تپ دق کے ہلتھ وزیٹروں کی کلاس کا افتتاح کرتے ہوئے حال ہی میں فرمائی ہے۔ یہ کلاس تپ دق کے کلینک نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔

اس میں آپ نے ہلتھ وزیٹروں کی اہمیت نہایت پرزور الفاظ میں بتائی جن میں خواتین کثیر تعداد میں شامل ہوں گی اور اس امر پر زور دیا کہ "سینیٹوریموں" کے علاوہ "کلینک" بھی کثیر تعداد میں قائم کئے جائیں جو تپ دق کے ابتدائی درجوں کے علاج کے لئے نہایت ضروری ہیں اور ہر کلینک میں کئی اعلیٰ تربیت یافتہ لائق اور سرگرم ہلتھ وزیٹروں کو مقرر کیا جائے۔

اس کام کے لئے بھی ہندوستانی خواتین کی خدمات درکار ہیں اور وہ انسداد تپ دق کے متعلق بھی نہایت مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

از محکمۂ اطلاعات ہند

نئی کتابیں

۱۔ ہمارے قائد (نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے حالات) از محمد احمد خاں حجم ۲۷۱ صفحے قیمت عہ پتہ قائد ملت اکادمی فیل خانہ قدیم حیدرآباد دکن
۲۔ پیمانے (مختلف شعرا کا مجموعہ کلام) مرتبہ اکبر وفاقانی و علی اشرف حجم ۱۸۴ صفحے قیمت عہ پتہ قیوم اکادمی۔ حیدرآباد دکن۔
۳۔ مسکراہٹیں (ظریفانہ مضامین) از کوثر چاندپوری حجم ۲۴۰ صفحے قیمت للعہ پتہ ادارہ اشاعت اردو۔ ״
۴۔ فتراک (افسانے مضامین) از جہاں بانو بیگم ״ ۲۰۴ ״ عہ ״ مکتبہ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ ״
۵۔ سربریدہ (افسانے) از ساحل بلگرامی قیمت عہ پتہ رضوی اینڈ کمپنی۔ نظام شاہی روڈ ״
۶۔ سرخ پرچم تلے (روسی افسانے) مترجمہ سردار اہمام ״ راج پبلشنگ ہاؤس۔ سلطان بازار۔ ״
۷۔ دور اسیری (راجہ لکشمی پنڈت کی خود نوشت سوانح) مترجمہ ظفر جاوید پبلشنگ ہاؤس۔ سلطان بازار۔ حیدرآباد دکن
۸۔ جہنم کے دیوتا (ہندی افسانے) مترجمہ سیدہ سلمیٰ راشد قیمت عہ پتہ مکتبہ عزیزیہ۔ حویلی قدیم۔ ״
۹۔ نقش امروز (مجموعہ کلام) از علی اشرف۔ حجم ۱۰۳ صفحے ״ عہ ״ عبدالحق اکیڈیمی۔ اردو گلی۔ ״
۱۰۔ اردو پارے (تنقیدی تقریریں) از ضیاء الاسلام حجم ۱۰۹ صفحے قیمت عہ پتہ علم و ادب ۱۳۔ اسٹینلی روڈ۔ الہ آباد
۱۱۔ روسی ظرافت (افسانے) مترجمہ مسلم ضیائی۔ حجم ۲۰۵ صفحے قیمت عہ پتہ اردو محل معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن
۱۲۔ تیر بہدف (مجرب نسخے) مرتبہ حکیم محمد ظفرالدین حجم ۲۱۰ صفحے۔ قیمت عہ۔ پتہ مینیجر رسالہ حکیم دکن شفا خانہ حکمت نگر حیدرآباد دکن
۱۳۔ نئے ترک اور ترکی با تصویر از محمد عبدالرشید خاں ״ ۳۴۴ ״ ״ ״ نذیر حسین نظام الرحمن تاجران کتب۔ دریبہ کلاں دہلی
۱۴۔ آئین جغرافیہ از پروفیسر ایم۔ اے علوی۔ حجم ۴۴۳ صفحے قیمت سے۔ پتہ مسلم ایجوکیشنل پریس۔ علی گڑھ
۱۵۔ پریشان جلوے (افسانے) از حیات زیدی ״ ۲۴۰ ״ ״ عہ پتہ دیا سیہ اکادمی بغداد الجدید۔ بھوپال
۱۶۔ ایشیا کی سب سے بڑی شخصیت (جناح کے حالات) از محمد عبداللہ منہاس۔ حجم ۶۴ صفحے۔ قیمت ۱۲ پتہ مکتبہ راست گفتار۔ ہال بازار امرتسر
۱۷۔ ہندوستانی موسیقی کی کشش از مرزا فی ساہوکار۔ قیمت عہ پتہ تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی
۱۸۔ نیا رنگ (ستر مشہور شعرا کا منتخب کلام) مرتبہ ذکیہ سلطانہ ساغر قیمت عہ پتہ تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی
۱۹۔ یاد اقبال (نظمیں جو اقبال کی وفات پر لکھی گئیں) مرتبہ غلام سرور فگار حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ پتہ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور
۲۰۔ جھلکیاں (افسانے) از زہرہ پٹیل حجم ۱۹۲ صفحے قیمت عہ پتہ مکتبہ ۔۔۔ بھنڈی بازار بمبئی ۳
۲۱۔ کاشت ترکاری از رحمت خاں ״ ۲۸۸ ״ ״ عہ ״ ۔۔۔ اینڈ کمپنی ۔۔۔ روڈ۔ لاہور
۲۲۔ برہنہ (ناول) از قیسی رامپوری قیمت عہ پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی
۲۳۔ رونق (״) از قیسی رامپوری ״ سے ״ ״ ״ ״ ״
۲۴۔ اس نظم میں (منتخب نظمیں) از میرا جی ״ سے ״ ساقی بک ڈپو۔ دہلی
۲۵۔ پائل (گیت) از اسلام قیمت عہ ״ ״ ״
۲۶۔ چالیس کروڑ بھکاری (افسانے) از ابراہیم جلیس قیمت عہ پتہ نفیس اکیڈیمی۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
۲۷۔ صد پارہ دل (مضامین) از خواجہ حسن بقائی دہلوی قیمت عہ پتہ مینیجر رسالہ پیشوا۔ جامع مسجد۔ دہلی

مرزا سیف علی خاں

نظارے

میں صبح سے مارا مارا پھر رہا تھا۔ ٹھیک طور سے تو کہہ نہیں سکتا کہ جب جو مارا مارا پھر رہا تھا تو وہ آخر کس سلسلے میں تھا۔ کوئی چیز خریدنی نہ تھی، کسی کی تلاش نہ تھی، کسی کا کام کیا نہ کرنا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی خاص وجہ کے تحت مارا مارا نہیں پھر رہا تھا۔ فرصت تھی۔ ہاں تو یاد آیا، فرصت تھی۔ دفتر بند تھا اور گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا سی گئی تھی۔ وقت گزارنے کے لئے گھر سے نکلا تو بس مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک جگہ لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ میں بھی رک گیا اور ایک تماشائی کے کاندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے میری اس حرکت پر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گردن موڑ لی۔ ارے یہ تو میرے ہم محلہ شیخ صاحب تھے۔ "دیکھئے شیخ صاحب اچھے تو ہیں آپ۔ کیا تماشا ہو رہا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے شیخ صاحب سے پوچھا۔ شیخ صاحب کا بگڑا ہوا چہرہ یک لخت اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ "کچھ نہیں وہ کوئی ہمالیہ کی طرف سے آئے ہیں۔ بعض جڑی بوٹیاں بہت خاص ہیں ان کے پاس۔ ابھی پتہ چلا بھی۔ دیکھئے خدا کی قدرت" شیخ صاحب نے اپنی گردن پھیر لی۔ وہ ہمالیہ کے [illegible] ایک کپڑا بچھائے اس پر جڑی بوٹیوں کا ڈھیر لگائے کھڑے تھے۔ میں بھی دیکھنے لگا اور میں نے دیکھا اس شخص نے تماشائیوں کو ایک گلاس بتایا، خالی گلاس، اس کے بعد اس نے اس میں پانی ڈالا۔ پھر تھیلی میں سے ایک جڑی نکالی۔ کہنے لگا "بھائیو! یہ جڑی ہمالیہ کے دامن میں دستیاب ہوتی ہے اور اس کو ڈھونڈنے کے لئے پانچ سال میں نے جنگلوں میں گزارے۔ پانچ سال بعد یہ ملی۔ میں اس کی تعریف نہیں کرتا۔ اس کا کرشمہ دکھاتا ہوں۔" اس نے وہ جڑی پانی میں ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد سارے تماشائی پھٹے ہوئے دیدوں سے دیکھ رہے تھے کہ پانی جمنے لگا۔ دوا کا کرشمہ دکھانے کے بعد اس نے کھنکار کر چاروں طرف فتحمندانہ نظر ڈالی اور ایک دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار کھنکار لگا کر کہنا شروع کیا "اسکے گن بھی سن لو۔ یہ ... بوڑھے کو ......" میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور لاحول پڑھتا ہوا اپنی راہ پر لگ گیا۔ پل پر سے گزرنے لگا تو کئی راہ گیر ایک جگہ جمع ہوتے جا رہے تھے اور جھانک جھانک کر نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی رک گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ لوگ آخر کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی جھانک کر نیچے دیکھا، ندی بہہ رہی تھی۔ صرف ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو والے صاحب سے پوچھا "کیا بات ہے جناب۔" کہنے لگے "میں بھی ابھی آیا ہوں۔ آپ ان سے پوچھئے" ان صاحب کے بازو جو صاحب کھڑے تھے ان سے میں نے رکتے رکتے پوچھا "آپ کو معلوم ہے جناب، یہاں یہ سب کیوں جمع ہیں؟" "جی جی" کہتے ہوئے انھوں نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا۔ "ارے" وہ کہنے لگے۔ "ارے دیکھئے جناب بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ایک صاحب جھانکتے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہم سب بھی جھانکنے لگے۔ وہ صاحب چلے گئے کہیں۔ ورنہ ان سے پوچھ لیتے۔ ہم کو تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ندی تو البتہ بہہ رہی ہے مگر صاحب کچھ تو ہوگا۔ کچھ تو ہوگا ضرور۔ تب ہی تو وہ بے چارے دیکھنے لگے" "خودکشی کے امکانات پر غور کر رہے ہوں گے وہ۔" میں نے وہاں سے ہٹتے ہوئے اپنے دل میں سوچا۔ مجھے تو وقت گزارنا تھا۔ میں کیوں پل پر سے ندی میں جھانکتا رہوں۔ پل کے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دو فقیر آپس میں تکرار کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ خوانچہ والے کے تو نے ٹانگ کیوں ماری۔ دوسرا کہتا .... " اور تو نے کیوں سارے بھیجے اس کے

جا رہے تھے۔ میں جو نہی ان کے قریب پہونچا تو وہ دونوں مشتبہ صورت بنا کے سوال کرنے لگے۔ میں اپنی نگاہوں کو [illegible] دوڑا رہا تھا [illegible] جیبوں میں ہاتھ ڈالے تھا۔ میں آگے بڑھ گیا تو وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ "ایک روپیہ کا چلر ہے تیرے پاس" .... دوسرے نے [illegible] چار آنے کم ہیں [illegible] کے بارہ آنے [illegible] ایک تانگہ پان کی دکان کے آگے کھڑا تھا۔ تانگے والا پان سگریٹ خرید رہا تھا۔ [illegible] سے تانگے والے سے پوچھا "[illegible] چلو گے" تانگے والے نے جواب دیا "کہاں جانا چاہتے ہیں صاحب" [illegible] صاحب نے کہا "[illegible]" تانگے والے نے پان چباتے ہوئے کہا "ایک روپیہ [illegible] بیٹھئے صاحب" [illegible] صاحب نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا "ایک روپیہ نہیں تین آنے دیں گے" تانگے والے نے [illegible] پر پیک تھوکی۔ وہ صاحب آگے بڑھ گئے۔ تانگے والا کہتا رہا "چلو چھ آنے [illegible] اور [illegible] ایک روپیہ نہیں تین آنے" [illegible] سارے بازار [illegible] تو تانگے والے [illegible] بیٹھنے کے لئے [illegible] ایک [illegible] نل سے پانی نالے جاری تھا [illegible] ان سے بھی زیادہ تیزی سے [illegible] وہ پیدل سوار [illegible] دو سیکلیں دونوں [illegible] سمت چپ چاپ چل نکلے۔ میں مسکرا [illegible] رہ سکا۔ گو مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری فرصت کا وقت ٹھیر گیا ہے [illegible] نہیں [illegible] سانس [illegible] چلنے لگا۔ دو اخبار بیچنے والے لڑکے آوازیں لگاتے ہوئے [illegible] گزرے۔ میں نے ایک کو [illegible] کر اخبار خریدا۔ ایک صاحب گھبرائے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ "جناب!" "جی آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "دیکھئے جناب آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟" میں نے کہا "ابھی کچھ دیر تو نہیں ہوئی" "تو آپ نے ادھر سے کسی رکشا والے کو جاتے دیکھا۔ کچھ سامان تھا اس رکشا میں [illegible] ایک ٹوکری بھی تھی۔ دیکھی ہے آپ نے" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا "[illegible] رکشا ......" "جی بس شکریہ ادھر ہی کو گئی ہے" [illegible] کے [illegible] گر [illegible] کو دوڑ پڑے۔ وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک رکشا [illegible] سامان تھا [illegible] ٹوکری تھی جس میں میرے سامنے آکر رکی۔ رکشا والے نے پوچھا "[illegible] صاحب [illegible] سے عینک لگائے ہوئے چھوٹی سی ڈاڑھی [illegible] وہ چلا [illegible] واپس [illegible] میں نے جلدی سے کہا "ارے بھائی ادھر ہی کو گئے ہیں وہ تجھے ڈھونڈتے ہوئے" [illegible] رکشا والے نے کہا "صاحب ایک دکان سے کچھ خریدنے لوگئے تو بس لاپتہ ہیں" میں نے کہا "اس طرف چلے جاؤ وہ ابھی گئے ہیں تمہیں مل جائیں گے۔" میں نے اخبار کھولا اور پڑھنے لگا۔ میں درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ کوئی چیز اوپر سے عین اخبار کے صفحہ پر گری۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ ایک کوا ڈالی پر بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ میں نے اخبار پھینک دیا اور پھر سے چلنے لگا۔ ایک کتا بھی میرے ساتھ ہو گیا کبھی کبھی وہ

مجھ سے بہت آگے نکل جاتا - [illegible] کسی [illegible] کو سمجھتا [illegible] تو میں آگے نکل جاتا۔ [illegible] دونوں ساتھ [illegible] ایک دفعہ [illegible] لیکن وہ تو جیسے شرط باندھ کر میرے ساتھ دوڑ [illegible] ایک [illegible] تو وہ [illegible] پیچھے [illegible] ایک موری میں گھس گئی تو [illegible] موری [illegible] مجھے اُس کا جیسے [illegible] دیکھتے اُس مورتی [illegible] جیسے [illegible] وقت [illegible] تھا۔ [illegible] اب [illegible] چھوڑ دیا [illegible] ایک صاحب [illegible] اطلس کی صدری پہن [illegible] ان کی آواز بھی دھیمی [illegible] تھی۔ جب وہ [illegible] اور آگے بڑھتے گئے تو بہت [illegible] اونچی ہوتی تھی [illegible] کو [illegible] وہ [illegible] دن کی بھوکی ہو [illegible] گلا گھونٹ کر مار نہیں ڈالا ---- [illegible]

[illegible] تھی [illegible] کو [illegible] اپنے [illegible] اللہ والے ملازم [illegible] اپنے اپنے کام [illegible] آگے [illegible] کھڑی تھیں ان [illegible] کے ہاتھ [illegible] مٹھائی کی چھلکی ہوئی ٹوکری تھی [illegible] دھاگہ کھولتی جا رہی تھی - وہ [illegible] دونوں میں [illegible] اور [illegible] مٹھائی کی ٹوکری سے لپٹا ہوا قوام قطرہ قطرہ زمین پر ٹپک رہا تھا۔ بعض گاہک دکان [illegible] گرم گرم جا [illegible] بھکارن لڑکیوں کے [illegible] آگے بڑھتے ہوئے تھے۔ چھوٹے [illegible] پیچھے [illegible] تھے۔ [illegible] لیکن ان بھکارن لڑکیوں کے [illegible] ایک [illegible] سیٹھ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک مکھی ان کی ناک میں گھس [illegible] تھی۔ [illegible] سیٹھ [illegible] لڑکی نے [illegible] اور انھوں نے اپنی چوکی کے نیچے سے ایک [illegible] ان بھیک منگوں کو مار بھگانے کے لئے [illegible] کے [illegible] ڈھیلوں [illegible] ساتھ رکھا تھا ان ڈھیلوں کے بازو ہی [illegible] کا صندوق [illegible] لڑکی ڈھیلے [illegible] سر تھام کر بیٹھ گئی - دوسری لڑکی ایک موٹر [illegible] ایک [illegible] دوسری لڑکی کے پہنچتے پہنچتے موٹر چلی گئی - ایک [illegible] ایک چھوٹے بچے نے سر لٹکا لا اور [illegible] کے لئے [illegible] رکوایا گیا - اور مٹھائی [illegible] دونوں لڑکیاں [illegible] کی طرح چل رہی تھیں - دو بھکاری

لڑکیوں اور ایک تازہ دم گھوڑے کا مقابلہ تھا۔ میں دور تک ان کو دیکھتا رہا۔ آخر ایک لڑکی گھبرا کر پڑی۔ میں نے اپنی گردن پھیر لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایک دکان پر بھیڑ لگی تھی۔ معلوم ہوا سستے غلے کی دکان ہے۔ پیسے دے کر ایسی مشکل سے اناج ملے۔ یہ عذاب نہیں تو پھر کیا ہے۔ بوڑھے کتنا ... رہے ہیں جوان آگے بڑھ رہے ہیں۔ عورتیں ان کے پیچھے کھڑی ... ہیں لیکن سارے مجمع میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اناج بہر صورت لینے کا عزم اور خوف ... ان کے چہروں سے ابلا پڑتا تھا۔ پیٹ! تیری جے۔ ایک سیٹھ کا ... سے ... "کیوں بھائی کچھ ہٹلر زندہ ہے کہتے ہیں" گاہک نے جواب دیا ... سیٹھ صاحب نے کہا "تو پھر جنگ بھی ہوگی" "ہاں" گاہک نے جواب دیا "... چاول کا کیا بھاؤ ہے" سیٹھ صاحب نے کہا "چاول نہیں ہیں ہمارے پاس" گاہک آگے بڑھ گیا۔ مزدوروں سے کچاکچ بھری ہوئی ایک لاری سامنے سے گزری۔ مزدور گو جا رہے تھے۔ ... مزدوریاں بھی بڑھ گئی ہیں ... اور سواری کے لئے موٹر بھی۔ مگر غلہ؟......

... جب میں ایک ہوٹل کے قریب پہنچا تو مجھے وہ ریکارڈ سنائی دیا جس کی موسیقی دل پر جادو کرتی تھی۔ مجھے اس گانے کے بول یاد نہ تھے۔ طرز یاد ہوگئی تھی۔ میں گنگنا سکتا تھا مگر ... ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا اور اس کے بول ذہن نشین کرنے لگا۔ ریکارڈ ختم ہوگیا تو میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ مجھے پورا گیت حرف بہ حرف یاد ہوگیا تھا۔ لیکن آگے بڑھتے ہوئے جب گنگنانے کی کوشش کرتا ہوں تو ہائیں طرز ہی بھول گیا۔ تانگوں، رکشاؤں اور سائیکل سواروں کو دیکھتے دیکھتے گھومنے لگا۔ دنیا کی ہر چیز حرکت کر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ساری دنیا تھم جائے۔ سناٹا چھا جائے اور اکیلا دل بہلاتا ہوا ہر چیز کا معائنہ کرتا پھروں۔ تانگے اپنے اڈوں پر کھڑے رہیں۔ رکشائیں پھیر جائیں سینما بند ہو جائیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند پڑے رہیں۔ وہ دوا فروش ہمالیہ کی چوٹی پر چلا جائے ریکارڈ بجتا رہے اور میں ٹہلتا ہوا یا تیز تیز چلتا ہوا یا دوڑتا ہوا چاروں طرف گھوموں۔ چاروں طرف ... اور ... فرصت کا وقت گزرتا جائے۔ لیکن دنیا کے کاروبار کبھی بند نہیں ہوتے۔ یہ کل کبھی نہیں رکتی ... مضمحل اور بہت زیادہ بے کیف اپنے گھر میں داخل ہوا۔ ایک بوجھ سا میرے دل سے اتر گیا۔ ... اور مجھے سوائے رات کا کھانا کھا کر سو جانے کے اور کوئی کام نہ تھا۔

رشید قریشی

ابراہیم ظفر

(اس افسانہ کا پلاٹ ان قصوں اور کہانیوں سے لیا گیا ہے جو زرل کی پہاڑی بستی میں مشہور ہیں) مجید

"جہاں پناہ! ہمارے جاسوسی نظام کے ذریعہ مملکت حیدرآباد کے طول و عرض میں جال کی طرح پھیلا ہوا ہے اس مرتبہ نہایت اہم خبریں وصول ہوئی ہیں۔ جن میں سب سے پہلے پرگنہ زرل کے متعلق ہے کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان نے زرل میں حکومت کے خلاف رعایا کو اکسا دیا ہے اور اگر اس طرف جلد توجہ نہ کی جائے تو بغاوت کا اندیشہ ہے"

سراج حیدرآباد کے طبقہ امرا کا ایک مشہور فرد تھا جس نے دربار آصف جاہی میں یہ کیفیت پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔

"ہم بہت جلد توجہ کریں گے سراج" اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا اس کے بعد دوسرے اور اہم معاملات پیش کئے گئے۔

زرل ایک پہاڑی بستی ہے۔ کئی تالاب دائرے کی شکل میں اس کو گھیرے ہوئے ہیں، ان تالابوں کے سروں پر چاروں طرف سیاہ دیو ہیکل پہاڑ زرل کے سنتری کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ بائیس سال قبل سپاہیوں کا ایک گروہ زرل آیا تھا۔

"یہ سامنے کونسی بستی ہے؟" سردار نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ "یہ بستی زرل کہلاتی ہے سردار" "بڑا ہی روح افزا مقام معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے چند دن یہیں قیام کیا جائے۔" یہ سنتے ہی سبھوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی اور تجارت کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔ ان کا شمار متمول گھرانوں میں ہونے لگا۔ سردار کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام ابراہیم رکھا گیا۔ ابراہیم زرل ہی کو اپنے اسلاف کا وطن سمجھتا تھا۔

"وطنی مجلس" کے صدر ابراہیم اور مجلس کی متفقہ طور پر یہ رائے قرار پائی کہ زرل کے حکام کو سزا دی جانی چاہئے۔ اس لئے کہ شاہ وقت دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور ان حکام کو جیسے قید سے رہائی مل گئی۔ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ رعایا سے من مانی مالگزاری وصول کی جا رہی تھی۔ پہلے پہل تو "وطنی مجلس" نے خفیہ طور پر کام جاری رکھا اور جب رعایا کو قابو میں کر لیا گیا تو باضابطہ طور پر کھلے کھلا تقریریں ہونے لگیں، جلسے منعقد کئے جانے لگے۔ ابراہیم ان سب کا راہ نما تھا۔ عوام اس کے اشارے پر ناچتے تھے۔ بالآخر بغاوت ہو گئی، اسد اللہ حاکم زرل معہ اپنے ساتھیوں کے قتل کر دیا گیا۔

سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا، آسمان پر کالی ٹکڑیاں ادھر سے ادھر منڈلا رہے تھے۔ ایک سوار شاہ زور گھوڑے پر زرل سے نکلا اور شمالی پہاڑیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا تیس میل پر ایک گاؤں میں جا کر دم لیا۔ گھوڑا پسینے میں شرابور تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ تھپکی اور ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

"فاطمہ"

"کون؟ ابراہیم! تم آ گئے۔ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں تو آج بہت پریشان تھی، سنا ہے زرل میں بغاوت ہو گئی۔ ابراہیم! تم یہ سب کیا کر رہے ہو، بغاوت کر دینا آسان ہے اور اس کا نتیجہ؟ ابراہیم! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالنا کوئی عقلمندی ہے!"

"فاطمہ۔ تم اس کی فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے میں نے تو تم کو اصل بات بتائی ہی نہیں، سنو گی تو پاگل ہو جاؤ گی۔ کہہ دوں؟"

"ہاں ہاں"

"اب تم ملکہ ہو" اور اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ کھڑی اس کا منہ تک رہی تھی پھر یکایک اس نے کہا۔

"اب میں تمہارے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی، اکیلے میں جی بہت گھبراتا ہے، خوفناک خیالات ستاتے ہیں۔ رات کو کئی مرتبہ چیخ کر جاگ گئی۔"

"فاطمہ! مگر میں اب تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ زرل میں ہر طرف بغاوت کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ گو شاہ حیدرآباد کو جلد ہی اطلاع ہو جائے گی لیکن وہ ابھی اس طرف

متوجہ ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ آج کل سلطنت کے دوسرے اور اہم معاملات میں الجھے ہوئے ہیں" پھر لہجہ بدل کر۔

"زحل میں کل بادولت کی رسم تاج پوشی منائی جائے گی اور ملکہ عالیہ کی خدمت میں تحفے روانہ کئے جائیں گے۔ فاطمہ! تم خواہ مخواہ افسردہ ہو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ کل تمہارے ابراہیم کی رسم تاج پوشی ہے اور ہاں اب تو یہ کہنا بھول ہی گیا کہ سال یا ڈیڑھ سال کے بعد ہماری شادی بھی ......" اور اس نے مسکرا کر فاطمہ کی طرف دیکھا، فاطمہ کے رخسار انگاروں کی طرح تپ رہے تھے۔

ابراہیم نے کپڑے اتارے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ فاطمہ اس کے لئے گلاس میں دودھ لے آئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے لے کر پی لیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد وہ رخصت ہونے لگا۔ ستارے آسمان پر نکل آئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں دونوں خراماں خراماں گھر سے نکلے۔ پھر ایک جگہ رک گئے۔

"ہم بہت جلد ملیں گے فاطمہ! ارے، تمہاری آنکھوں میں آنسو؟ پگلی! سپاہی کی بیوی اور آنسو؟ فاطمہ! تم سپاہی کی ہونے والی بیوی ہو"

اور فاطمہ کی آنکھیں جیسے ان آنسوؤں کو پی گئیں۔ "اچھا! اب ذرا ہنس دو" اس نے کہا اور وہ مسکرا دی، چاند بادل کے پیچھے چھپ گیا۔

"ابراہیم ظفر الدولہ" کی رسم تاج پوشی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا، زحل کے ہر رہنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی، مسکراہٹیں، قہقہے، چہل پہل، نوبت نقارے، زحل دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

باضابطہ طور پر حکومتی نظام قائم ہو گیا۔ ایک ہی سال کے اندر اندر رعایا خوش حالی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس سے فارغ ہوتے ہی ابراہیم ظفر نے حفاظتی تدابیر شروع کیں کیونکہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تازہ آئی ہوئی خبروں سے جنگ کا امکان قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔

زحل کے اطراف، خندقوں، قلعوں، مورچوں وغیرہ کی تعمیر شروع ہو گئی اور فوج میں بھرتی بھی۔ تین چار مہینوں [illegible] فوج باقاعدہ زحل کی حفاظت کے لئے تیار تھی۔

"جہاں پناہ! وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا [illegible] میں آج سے ڈیڑھ سال قبل یہ عرض کیا تھا کہ زحل میں ابراہیم نامی ایک شخص رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دے رہا ہے اور اب وہی "ابراہیم ظفر" کے نام سے وہاں حکومت کر رہا ہے۔ زحل اس کا پایۂ تخت ہے ہمارے نمائندوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

"بہت عالی ہمت شخص معلوم ہوتا ہے" اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا۔ "حضور! باغی کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے غلام کو اجازت مرحمت فرمائی جائے"

"یہ تو بہت معمولی سا کام ہے سراج! خیر ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں" اور پھر دربار ختم کرتے ہوئے سراج سے مسکرا کر فرمایا "اس کی رگوں میں بھی بہادروں کا خون معلوم ہوتا ہے سراج!"

ایک ہی ہفتے میں سراج نے اپنا فوج کو تیار کر کے زحل کی طرف کوچ کیا۔ ابراہیم ظفر کو جاسوسوں نے سراج کی آمد کی اطلاع دی اور زحل میں بھی طبل جنگ بج گیا۔

سراج انتہائی تیزی سے تین ہی دن میں زحل پہنچ گیا اور دریائے گوداوری کے دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ دوسرے ہی دن "شام گڑھ" پر حملہ ہوا۔ دن تمام خونریز لڑائی ہوتی رہی۔ ایک طرف سے گونڈوں کے پے در پے گوریلا حملے دوسری طرف شام گڑھ کے اونچے قلعے سے آتش باری، سراج کی فوج میں سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ رات ہو گئی اور لڑائی دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو گئی۔

دوسرے دن صبح سراج نے اپنے دو جرنیل اور دو مشیر اپنے خاص ڈیروں میں مردہ پائے، بڑی حیرانی ہوئی۔ سراج نے خود فوج کی کمان لی لیکن دوپہر ہونے ہوتے تک آتشباری، پہاڑوں کی گرمی اور سب سے زیادہ گونڈوں کے عجیب طرز جنگ نے سراج کو ہراساں کر دیا اور رات ہونے ہوتے تک سراج اپنی فوج لے کر زحل سے بھاگ رہا تھا۔ ابراہیم ظفر کے گونڈ کپتان نے کئی میل تک اس کا پیچھا کیا۔

...سے پوچھتا رہتا اور نادم تھا کہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی کسی روز بھی جرأت نہ کر سکا۔ بالآخر اعلیٰ حضرت نے بہ عطوفت شاہانہ خود سراج کو یاد کیا۔

"سنا! تمہیں ابراہیم ظفر نے شکست دی؟"

"جہاں پناہ"

"اس کی رگوں میں بہادروں کا خون رواں ہے سراج! ہم نے اس سے پیشتر تم سے کہا تھا"

"عالم پناہ"

"خیر! ایک مرتبہ اور کوشش کرو"

اور چند ہی دن بعد سراج ایک زبردست فوج، بہترین توپ خانہ اور اسلحہ کے ساتھ زحل پر حملہ آور ہوا لیکن وائے بدقسمتی کہ اس مرتبہ بھی وہ شام گڑھ سے آگے نہ بڑھ سکا اور شکست کھا کر واپس آیا۔

"جوش بہت زیادہ اور قوت عمل کم، حیدر آبادی امرا کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے" اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"درست جہاں پناہ"

"قوت عمل پیدا کرو اور تم اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے شاہ کا وفادار پاؤ گے"

"جہاں پناہ"

"اب کی دفعہ ہم شاہی فوج کو زحل پر حملہ کے لئے بھیجتے ہیں"

"فاطمہ!"

"میرے سرتاج!"

"اب ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا، تمہاری معصوم دعائیں بارگاہ رب العزت میں قبول ہوئیں اور میں نے دوسری مرتبہ سراج کو شکست دے کر اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا ہے۔ سارے حیدر آباد میں ہلچل سی مچ گئی ہے اور ہر شخص کی زبان پر "ابراہیم ظفر" ہے .... اب جلد ہی ہم ایک بندھن میں ...."

"خدائے بزرگ و برتر آپ کو ایسے کئی مسرت کے دن دکھائے، میرے سرتاج!"

"آمین"

"ابراہیم ظفر الدولہ ظفر الملک" شاہ زحل کی شادی کی تیاریاں بڑے ہی زور شور پر جاری ہیں، سارا زحل جنت فردوس بنا ہوا ہے۔ دن رات نوبت نقارے دھوم مچا رہے ہیں، روزانہ جشن چراغاں ہو رہے ہیں کہ جنوب کی طرف سے ایک بگولہ تیز تیز آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے داخل ہوتے ہی شام گڑھ، تیس گڑھ اور تمام قلعوں پر طبل جنگ بجنے لگتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر ہر طرف آگ کی طرح پھیل جاتی ہے کہ زحل پر کوئی حملہ ہونے والا ہے۔ ابراہیم ظفر مسکرا دیتا ہے۔

"شکست سے ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی سراج کی"

ایک جاسوس آکر اطلاع دیتا ہے۔

"جہاں پناہ! سراج اس فوج میں موجود نہیں، شاہی کمانڈر اس فوج کی کمان کر رہا ہے"

"تب تو مقابلہ سخت ہے" ابراہیم ظفر نے مقابلہ کی اہمیت محسوس کر لی۔

حملہ شروع ہوا، گونڈا جرنیل نے چار گھنٹوں کی لڑائی میں شاہی توپ خانہ کی آتشباری اور شاہی فوج کے سخت حملوں کی تاب نہ لا کر "شام گڑھ" چھوڑ دیا اور شہر پناہ میں داخل ہوا۔

"پل اٹھا دیا جائے" ابراہیم ظفر خود کمان کر رہا تھا۔ "سامنے کے مورچے پر چار توپیں اور چڑھا دو ---- دو دستے پچھلی جانب سے ۔ اسد خاں! دو دستے سرنگ کے راستے سے ۔ احمد! بایاں بازو کمزور ہو رہا ہے ----" وہ ہدایات دیتے چلا جا رہا تھا اور اس کی فوج جانبازانہ لڑائی لڑ رہی تھی۔

"اگلا مورچہ چھوڑ دو ---- پیچھے ہٹتے جاؤ ----
بائیں بازو سے گھیر لو ----" لڑائی اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری تھی۔ شاہی کمانڈر اس کوشش میں تھا کہ رات ہونے ہونے تک کسی طرح بھی وہ اپنی کامیابی مکمل کر لے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور لڑائی دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو گئی۔

شاہی فوج کے کیمپ میں رات "دو قاتل جاسوس" پکڑے گئے۔ یہ قاتل جاسوس ابراہیم ظفر کی تربیت شدہ ایک خاص جماعت تھی جس کا کام نہ صرف جرنیلوں کو قتل کرنا تھا بلکہ دوسری اور ضروری معلومات بھی حاصل کرنا تھا۔

صبح ہوتے ہی پھر لڑائی شروع ہو گئی اور دوپہر تک اپنے شباب پر تھی۔ اسلحہ کی جھنکار، بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں، توپوں کی گرج، چیخ پکار، نعرے عجیب عبرتناک

منظر تھا' ابراہیم ظفر مجبور ہوگیا اور اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ ہتیس گڑھ پہونچا دیا - شاہی فوجوں نے ہتیس گڑھ کا محاصرہ کرلیا -

"حضور! صلح کرلینی بہتر ہے" ایک فوجی افسر نے کہا

"جنگ جاری رکھو جبار!"

"جہاں پناہ!"

"یہ میرا حکم ہے"

"مگر حضور ...."

ٹھائیں اور جبار اس کی فوج کا ایک افسر زمین پر خون میں لوٹ رہا تھا -

"ہم اپنے آخری قطرۂ خون تک جنگ جاری رکھیں گے اسد!"

"بے شک' جہاں پناہ"

"ہم بہادروں کی موت مرنا پسند کرتے ہیں"

ابراہیم ظفر خود چار دستوں کے ساتھ ایک سرنگ کے ذریعہ سے شاہی فوج کے پچھلے حصے پر نمودار ہوا' شاہی فوج آسانی سے گھبر گئی' شاہی کماندار پریشان ہوگیا - لیکن جلد ہی اپنی فوج کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کردیا اور لڑائی نے شدت اختیار کرلی - ابراہیم ظفر اپنے ایک جرنیل کے سپرد یہ کام کرکے قلعہ میں واپس آگیا -

" اوہ! توپچی دیکھتے نہیں ہو' کیا کر رہے ہو؟" وہ شیر کی طرح غرایا -

"ہماری فوج کے اس حصے پر زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے توپوں کے دہانے اس طرف پلٹ دو' تم ہٹ جاؤ' گدھے ہو تم" اور اس نے توپچی کی جگہ سنبھالی - آتشباری تیز سے تیز تر ہوگئی' نزلی جرنل جو میدان میں شاہی فوج سے مقابلہ کر رہا تھا اپنی جگہ پر جما ہوا تھا -

"قلعہ کی اس طرف کی توپ سے" شاہی کماندار نے بائیں طرف اشارہ کیا "بہت زیادہ آتشباری ہو رہی ہے ہماری فوج پریشان ہو رہی ہے' خدانخواستہ کہیں ——

اس توپچی کو ختم کردو" اور ایک افسر اس توپ کی تاک میں لگا ہوا تھا - نزلی جرنل بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا - قلعہ کی طرف سے آتشباری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا - ابراہیم ظفر کا چہرہ کھیل گیا - وہ اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ دوسری طرف سے آتشباری تیز کرنے کا حکم دے -

ٹھائیں!

آہ! اسد' دائیں طرف کی آتش باری ....

اور تیز ...... کردو"

"جہاں پناہ! یہ کیا ہوگیا حضور کو"

"جاؤ اسد .... تم جاؤ ...... پہلے جاؤ"

اور ابراہیم ظفر دھم سے زمین پر گر گیا -

"میرے سرتاج!"

"کون .... فاطمہ .... میری فاطمہ ... تم یہاں کیسے آگئیں ...."

لڑائی زوروں پر جاری تھی -

"میرے سرتاج یہ کیا ہوگیا آپ کو؟ اف خدایا ...."

اور ابراہیم ظفر مسکرانے لگا -

"فاطمہ - ہنسو - ہنسو' ایک بار ......" "میں بہادروں ...... کی موت ...... مر رہا ہوں -

فاطمہ! میں ...... بہت خوش ہوں ..... بہت" اس کا سر فاطمہ کی گود میں تھا - سینے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا -

فاطمہ! وطن کی خاطر سب کچھ ...."

ایک ہی گھنٹہ بعد آصفی پرچم "ہتیس گڑھ" پر لہرا رہا تھا اور ابراہیم ظفر —— اپنی محبوبہ کی آغوش میں ابدی نیند سو رہا تھا -

عبدالمجید

وضع جسمانی

اس سے قبل کی تقریر میں میں نے بچپن کے زمانے میں وضع جسمانی کی نوعیت کو ضروری توضیحات کے ساتھ پیش کر کے اس کے اصلاحی پہلو کو واضح کیا تھا۔ آج کی تقریر میں زمانۂ بلوغ کی وضع جسمانی پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میں اس امر کی توضیح کی کوشش کروں گا کہ زمانۂ بلوغ زندگی میں کس قدر اہم ہے، اس زمانہ میں وضع جسمانی کی پرورش کس نوعیت پر ہونی چاہیے اور وہ کون سے ایسے داخلی اور خارجی امور ہیں جو زمانۂ بلوغ وضع جسمانی پر خوش گوار یا غیر خوش گوار اثرات مرتب کرتے ہیں اور جس سے جوانی، ادھیڑپن اور بڑھاپے کے زمانے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

بلوغ کا دور مختلف ممالک میں آب و ہوا کے لحاظ سے مختلف ہے۔ سرد ممالک میں بالعموم بچے ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ سال کے درمیان زمانۂ بلوغ میں قدم رکھتے ہیں۔ لیکن گرم ممالک میں بچے کسی قدر قبل ہی بالغ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بچے بالعموم ۱۶-۱۷ اور ۱۸ سال کے درمیان بلوغ کے دور میں آ جاتے ہیں اور لڑکیاں ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ سال کے درمیان بلوغ کے زمانے میں پہونچ جاتی ہیں۔ جغرافی حالات کے علاوہ غذا اور اس کی نوعیت کا تعلق بھی بلوغ کے دور سے بہت زیادہ ہے۔ گرم مسالہ دار اور چٹ پٹی غذا کھانے والے بچے اس سے بھی پہلے زمانۂ بلوغ کو پہونچتے دکھائی دیتے ہیں۔ قطع نظر اس کے تخیلات کو بھی اس زمانے کے قبل از قبل آغاز سے زیادہ تعلق ہے۔ جنسی میلان اور اس کے متعلق معلومات کی فراہمی ہر بچے میں فطرتاً موجود ہے۔ ایسی معلومات کے حصول میں اگر اس کی صحیح رہبری نہ ہو تو وہ خود اس کی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ عام حالات اور اس کے نتائج کے اعتبار سے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ ایسی قسم کی کھوج اور اس کے بلاواسطہ یا بالواسطہ کھوج کے طریقے بالعموم گمراہ کن ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ تمام اعلیٰ اور مقدس تخیلات جو جنسی اعتبار سے دل اور دماغ میں پرورش پانے چاہئیں ان کی بجائے وہ نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر اپنی انسانی قدر و قیمت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر مذہب میں بلوغ کے آغاز کے ساتھ ہی ہر انسان پر مذہبی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ جنسی تعلقات تو اس نازک ترین حالت میں واضح کیے گئے ہیں جن میں ذرا سی لغزش بھی گناہ کبیرہ بن جاتی ہے۔ بہرحال اس خصوص میں میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا بلکہ صرف اس قدر اشارہ کیے دیتا ہوں کہ بچے کے بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ اس میں جنسی تخیلات اور اس کی فراہمی کے طریقے اس پیرایہ میں مہیا کریں جن کے ذریعہ ایک پاک اور مقدس خیال اس کے دماغ پر مسلط ہو جائے تاکہ وہ گمراہی سے بچ جائے اور اپنی زندگی کو تباہ و برباد نہ ہونے دے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت ہر ترقی یافتہ ملک میں جو اپنے نونہالوں کو تندرست اور قوی تر بنانا چاہتے ہیں، جنسی تعلیم ان بچوں کے لئے عام اور لازمی کر دی گئی جو زمانۂ بلوغ کے قریب تر ہوں۔ غرض مجھے یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ قبل از قبل جنسیاتی تخیلات کی پیدائش سے بھی بلوغ کے زمانے کا آغاز کسی لڑکے یا لڑکی پر ہو سکتا ہے۔

زمانۂ بلوغ دراصل بچپن اور جوانی کے درمیان کا حد فاصل ہے۔ انسان تعیشات کے لامتناہی پھیر میں پڑ کر یا معاشی تخیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا مقصد کچھ ہی متعین کرے لیکن قدرت انسان سے کچھ اور ہی توقع رکھتی ہے۔ زمانۂ بلوغ میں انسان میں جنسی میلان کی پیدائش قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔ اس میلان کو پیدا کرنے کا یہ منشا ہے کہ انسان اس بات کی تیاری کرے کہ آئندہ اس کو ایک باپ یا ماں بننا ہے اور اس خصوص میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی ہونے والی اولاد توانا اور طاقتور ہو سکے۔

ابھی ہم نے بتایا کہ بلوغیت کا زمانہ تیاری کا زمانہ ہے۔

اس زمانے میں وضع جسمانی میں کئی ایک تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ لڑکیوں میں قد ہوتا ہے اس لیے اسی مناسبت سے گوشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ عصبی نظام پر بھی اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ گویا [illegible] ہر دو [illegible] تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ بلوغ کا [illegible] قد [illegible] اسی قدر زیادہ [illegible] سے اس کے [illegible] وضع جسمانی [illegible] کی [illegible] کا اثر [illegible] وضع جسمانی کی جانچ قد کے لحاظ [illegible] ماہران وضع جسمانی [illegible] وزن میں مختلف تجربات کی بنا پر [illegible] کسی حد تک کا معیاری وزن کہا جاتا ہے۔ معیاری وزن کی بڑی اہمیت ہے اس سے وضع جسمانی کی [illegible] کا اندازہ قائم کیا جاتا ہے۔ معیاری وزن کا تعلق [illegible] سب [illegible] اور غذائی [illegible] منحصر [illegible] آپ کو [illegible] کی [illegible] نوعیت غذا کے [illegible] واضح کرتے ہیں [illegible] بلوغ [illegible] وزن کا معیار [illegible] سب سے [illegible] کا معیاری وزن [illegible] عمر اور قد کے لحاظ سے کیا ہوا ہے۔

۱۶ سال کی عمر والے بچے

اگر ان کا قد ۴ فٹ ۱۰ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۹۰ پونڈ ہو

۴	۱۱	[illegible]
۵ فٹ		۱۰۰
۵	۱	۱۰۲
۵	۲	۱۰۶
۵	[illegible]	۱۱۰
۵	[illegible]	۱۱۶
۵	[illegible]	۱۲۲
۵	۹	۱۲۶
۵	[illegible]	۱۳۰

اگر ان کا قد ۵ فٹ [illegible] انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۳۴ پونڈ ہو

۵	۹	۱۳۸
۵	۱۰	۱۴۲
۵	۱۱	۱۴۶
۶ فٹ		۱۵۰

یہ تھا ۱۶ سال کی عمر والے بچوں کا معیاری وزن اب ہم ۱۸ سال کی عمر والے بچوں کا ان کے قد کے لحاظ سے معیاری وزن لکھتے ہیں۔

اگر ان کا قد ۴ فٹ ۱۱ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۹۵ پونڈ ہو

۵		۱۰۰
۵	۱	۱۰۵
۵	۲	۱۱۰
۵	۳	۱۱۵
۵	۴	۱۲۰
۵	[illegible]	۱۲۵
۵	۶	۱۳۰
۵	۷	۱۳۵
۵	۸	۱۴۰
۵	۹	۱۴۵
۵	۱۰	۱۵۰
۵	۱۱	۱۵۵
۶		۱۶۰

واضح رہے کہ ۱۸ سال تک بالغ بچوں کا ان کے قد کے لحاظ سے معیاری وزن ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۸ سال میں بالغ ہو جانے والے بچوں کا [illegible] ہوتا ہے ان کا قد ۵ فٹ [illegible] ان کا بھی معیاری وزن [illegible]

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۱ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۱۰ پونڈ ہو

۵	۲	۱۱۵
۵	۳	۱۱۸
۵	۴	۱۲۱

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۵ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۲۰ پونڈ ہو

۵ فٹ	۶ انچ	۱۳۰
۵ فٹ	۷ انچ	۱۳۲
۵ فٹ	۸ انچ	۱۳۶
۵ فٹ	۹ انچ	۱۴۰
۵ فٹ	۱۰ انچ	۱۴۵
۵ فٹ	۱۱ انچ	۱۵۰(?)

۶ فٹ ہو تو جوانوں کا معیاری وزن ۱۵۰ [illegible]

جو لڑکوں کا معیاری وزن ہو [illegible] چاہیے۔ لڑکیوں کا سن بلوغت لڑکوں سے [illegible] ہی آغاز ہوتا ہے کیونکہ بعض [illegible] لڑکیوں میں پہلے ہی ظاہر ہونے لگتی ہے۔ [illegible] آب و ہوا اور غذا کے مد نظر لڑکیوں کا سن بلوغت ۱۵، ۱۶، ۱۷ سال کے درمیان بالعموم شروع ہوتا ہے [illegible] ان ہی سالوں کے لحاظ سے [illegible] کے تناسب سے مدنظر ان کا معیاری وزن واضح کرتے ہیں۔ پہلے ہم ۱۵ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن بتاتے ہیں۔

اگر ۱۵ سال کی لڑکیوں کا قد ۴ فٹ ۱۰ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن [illegible] پونڈ ہو

۱۵	۴ فٹ	۱۰ انچ	۹۰
۱۵	۴ فٹ	۱۱ انچ	۹۵
۱۵	۵ فٹ	—	۱۰۰
۱۵	۵ فٹ	۱ انچ	۱۰۶
۱۵	۵ فٹ	۲ انچ	۱۱۱
۱۵	۵ فٹ	۳ انچ	۱۱۵
۱۵	۵ فٹ	۴ انچ	۱۱۹
۱۵	۵ فٹ	۵ انچ	۱۲۳
۱۵	۵ فٹ	۶ انچ	۱۲۴
۱۵	۵ فٹ	۷ انچ	۱۲۷
۱۵	۵ فٹ	۸ انچ	۱۳۰
۱۵	۵ فٹ	۹ انچ	۱۳۴
۱۵	۵ فٹ	۱۰ انچ(?)	۱۴۰
۱۵	[illegible]	[illegible]	۱۴۵

اگر ۱۵ سال کی لڑکیوں کا قد ۵ فٹ ۱۱ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۴۶ پونڈ ہو

اب ہم ۱۶ سال کی لڑکیوں کا وزن [illegible] ان کے قد کے [illegible] کوشش کرتے ہیں

اگر ۱۶ سال کی لڑکیوں کا قد [illegible] ہو تو ان کا معیاری وزن ۹۵ پونڈ ہو

۱۶	[illegible]	[illegible]	۹۶
۱۶	۵ فٹ	[illegible]	۱۰۲
۱۶	۵ فٹ	۱ انچ	[illegible]
۱۶	۵ فٹ	۲ انچ	۱۰۳
۱۶	۵ فٹ	۳ انچ	۱۱۰(?)
۱۶	۵ فٹ	۴ انچ	۱۲۰(?)
۱۶	۵ فٹ	۵ انچ	۱۱۱(?)
۱۶	۵ فٹ	۶ انچ	۱۲۰
۱۶	۵ فٹ	۷ انچ	۱۲۸
۱۶	۵ فٹ	۸ انچ	۱۳۲
۱۶	۵ فٹ	۹ انچ	۱۳۵
۱۶	۵ فٹ	۱۰ انچ	۱۳۸
۱۶	۵ فٹ	۱۱ انچ	۱۴۲
۱۶	۶ فٹ	—	[illegible]

اب ہم ۱۷ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن ان کے قد کے تناسب سے بتاتے ہیں۔ جو لڑکیاں ۱۷ سال کی عمر میں سن بلوغ میں داخل ہوتی ہیں وہ بالعموم بہت توانا اور تندرست رہتی ہیں ایسی لڑکیاں عمدہ اور صحت مند [illegible] ہوا کرتی ہیں ان میں نسوانی کمزوریاں جو ان کی صحت کو تباہ کرتی ہیں، بہت کم پیدا ہوتی ہیں اور ان کے بچے بھی نہایت توانا اور مضبوط قویٰ کے ہوتے ہیں۔ بچپن کی اموات بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ اب ۱۷ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن بغور سنیئے۔

۱۷ سال کی عمر رکھنے والی لڑکیوں کا وزن اگر وہ ۴ فٹ

اگر ۵ فٹ قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۹۰ پونڈ ہو
۵ فٹ ۱ انچ قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۱۰۴ پونڈ ہو۔
۵ ۱ انچ تا قد رکھنے والی نوجوان کا معیاری وزن ۱۰۹ پونڈ ہو

۵	۲	۱۱۴	"
۵	۳	۱۰۸	"
۵	۴	۱۲۱	
۵	۵	۱۲۴	"
۵	۶	۱۲۶	"
۵	۷	۱۲۹	"
۵	۸	۱۳۳	
۵	۹	۱۳۶	
۵	۱۰	۱۳۹	
۵	۱۱	۱۴۲	
۶ فٹ		۱۴۰	

ہم نے زمانہ طفولیت اور اس زمانے کے لڑکوں اور بچیوں کا بلحاظ عمر معیاری وزن بتلا دیا ہے۔ معیاری وزن دراصل صحت جسمانی اور عمدہ وضع جسمانی کا ایک معیار ہے۔ اسی لئے بھی اس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اسی وجہ سے اکثر بیمہ کمپنیاں بیمہ کے وقت عمر اور وزن کے تناسب کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ فوجی خدمات کے سلسلہ میں بھی معیاری وزن کو بطور خاص پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بہرحال اب ہم صرف زمانہ بلوغ میں وضع جسمانی کے بعض حالات پر روشنی ڈالیں گے جس سے وضع جسمانی کی نوعیت صحت جسمانی کے اعتبار سے واضح ہوسکے بلوغت کے دور میں جسم کے ہر عضو میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور یہ تبدیلی خاطر خواہ اس وقت ہوگی جب کہ اس خصوص میں بطور خاص خیال رکھا جائے اس کے صحیح نشو و نما کے لئے مناسب اور صحت بخش ماحول پیدا کیا جائے۔ اس میں سب سے اہم غذا کا سوال ہے۔ انڈا۔ گوشت۔ مچھلی۔ پھل۔ ترکاریاں بالخصوص زمانہ بلوغت میں وضع جسمانی کے نشو و نما میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ دودھ کا استعمال اس زمانے میں بچوں کو اگر کرایا جائے تو ان کے عام نشو و نما میں بڑی ترقی ہوتی ہے۔ غذا کے ساتھ اس زمانہ میں ورزش کا سوال بھی بہت اہم ہے۔ بالعموم اس زمانے میں خود بخود بچے اور والدین میں جسمانی طاقت کے حصول کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ جسمانی توانائی اور وضع جسمانی کو قوی کرنے کے لئے کس قسم کی ورزشیں کرائی جائیں۔ ہم نے معیاری وزن تبلا دیا ہے اس کو پیش نظر رکھئے اور یہ دیکھئے کہ اپنا وزن معیاری سے کم ہے یا زیادہ۔ کم ہونے کی صورت میں ایسی ورزشیں کی جائیں جو عضلات اور اعصاب کو تقویت پہنچا سکتے ہیں جن میں غیر آلاتی ورزشیں بہت مفید ہیں۔ سیدھی سادھی ورزشیں بلحاظ صورت کسی ماہر وضع جسمانی سے تیار کرائی جائیں اور اس کے حسب ہدایات روزانہ صبح و شام ان ورزشوں کو کرتے رہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ ضرور یاد رہے کہ کم وزن رکھنے والے بچے کھیلوں میں زیادہ حصہ لیں۔ ہاکی وغیرہ جو بہت کم تھکاتی ہیں اور جن کو بہت دیر کر سکتے ہیں کرتے رہیں۔ وزنی ورزشیں جو بہت جلد تھکا دیتی ہیں ہرگز نہ کریں۔ کیونکہ اس قسم کی ورزشیں عضلات اور اعصاب پر بار ڈالتی ہیں اور اس قسم کے بار سے ان میں تھکن زیادہ پیدا ہوجاتی ہے اور اس سے عضلات اور اعصاب کے نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ بظاہر انسان تو ایسی ورزشوں سے موٹا تازہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا اثر دوران خون ہاضمہ اور عصبی نظام پر بہت برا پڑتا ہے۔ وقت سے پہلے ہی اعضا کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وزنی ورزشیں مثلاً ڈمبل۔ بار اور رنگ اور نگا تار ڈنڈ اور بیٹھک انسان کے جسم کو بہت جلد تیار کر دیتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو اس قسم کی تیاری کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بے ضرورت تیاری سے سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں۔ وزنی ورزشیں بھی اپنی خاص خصوصیات اور افادیت رکھتی ہیں بشرطیکہ ان سے مناسب اور ضرورت کے لحاظ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جسم کی تیاری کا مفہوم ہمیشہ معیاری وزن رہے۔ اگر آپ کا اپنا معیاری وزن

گیا تو یہ سمجھئے کہ آپ نے وضع جسمانی کا [illegible] قاعدہ [illegible] لیا ہے۔ [illegible] بیٹھنے والے [illegible] جسمانی [illegible] پیدا ہوتے ہیں۔ بالخصوص [illegible] میں [illegible] سے۔ کمر کب اڑ جاتی ہے۔ [illegible] دل [illegible] حافظہ بھی کچھ ایسا ویسا ہی [illegible] طبیعت میں فتور آجاتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی اس میں کئی ایک خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ [illegible] معمولی باتوں پر غصہ آنے لگتا ہے۔ طبیعت [illegible] میں منتقل [illegible] رہتا ہے۔ جسمانی اور [illegible] اعتبار سے مثلاً اچھی طرح [illegible] ہوں کو محسوس کرنے لگتا ہے [illegible] اس میں [illegible] نمایاں ہونے لگتی ہے جس سے اس کے آئندہ زندگی کے منازل میں [illegible] بڑی رکاوٹیں پیدا ہو [illegible] وہ ایک [illegible] شخصیت کے تحت اپنا کام [illegible] کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح معیاری وزن کے اعتبار سے جن کا وزن زیادہ [illegible] یا کبھی زیادہ تو یہ [illegible] قابل [illegible] کو سب [illegible] رکھا جائے تو [illegible] مرض [illegible] بھری [illegible] ہونے لگتی ہے۔ بلکہ اس میں خرابیوں کا ایک [illegible] سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ ہونے پن کا پہلا اثر [illegible] ہے۔ تدریج غذا ایک کم ہونے لگتی ہے۔ پانی زیادہ [illegible] خون اور اعصاب پر [illegible] پڑتا ہے۔ ایسی [illegible] کے اندرونی [illegible] زیادہ [illegible] خون کا دباؤ۔ تیز [illegible] متعلق بہ امراض میں [illegible] ہونے [illegible] ہیں اگر [illegible] پتا ہو [illegible] اور [illegible] سے مبالغہ نہ پڑے گا [illegible] سے زیادہ وزن رکھتے ہوں وہ [illegible] کریں۔ ترکاریوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ [illegible] چاہیے۔ پسینہ آور ورزشیں اور کھیل زیادہ کھیلیں [illegible] لئے تھوڑی بہت ورزش [illegible] ہوتی ہیں [illegible] ہلکی ورزشوں کے ساتھ ان ورزشوں کو ملا کر لیں۔ [illegible]

[illegible] وضع جسمانی کو [illegible] بلکہ اپنے وضع جسمانی کی [illegible] کیفیات اور [illegible] بھی کچھ [illegible]

[illegible] وضع جسمانی کی [illegible] انسان [illegible] عادات کو بھی زیادہ [illegible] اکثر [illegible] دیکھا ہوتا ہے [illegible] اس میں [illegible] پیدا ہو جاتی [illegible] کہ اس کے [illegible] اچھے بڑوں کی عادات کو [illegible] عادات کو حاصل [illegible] بچوں کے [illegible] کئی ایک ناقص عادات میں [illegible] ہمارے ملک [illegible] عادات [illegible] صحت [illegible] ہوتی۔ اس [illegible] نتیجہ کی ہے [illegible] کے اعتبار سے بچوں کو [illegible] عادات سے باز رکھتا ہے ان میں سگریٹ نوشی چائے نوشی [illegible] کا استعمال بہت پیش پیش ہے [illegible] یہ عادتیں صحت بخش کسی طرح نہیں [illegible] لطف آتا ہے۔ [illegible] لطف [illegible] وہ [illegible] پنہاں ہیں۔ ان عادتوں سے وضع جسمانی اور اس کی صحت [illegible] پر [illegible] برا اثر پڑتا ہے۔ بلوغ جو [illegible] ہے اس میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ان عادتوں [illegible] سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن اس قدر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان عادتوں سے جنسی تحریکات میں [illegible] پیدا ہوتا ہے اور کئی ایک جنسی [illegible] پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ لباس [illegible] بھی اس [illegible] خاص اہمیت رکھتی ہے۔ [illegible] تنگ کپڑے [illegible] پہنے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کا حد سے زیادہ [illegible] اونچی ایڑی کے جوتوں [illegible] استعمال ان کی قدرتی جنسی حالت میں رکاوٹ ڈالنے کا

... ہوتے ہیں

[illegible] وضاحت

[illegible] مخصوص [illegible]

[illegible]

[illegible] لوگوں

[illegible] وقت سے پہلے

اولاد کو [illegible] ہوتے

ہیں اگر [illegible] ہی [illegible]

اور ناتواں [illegible] ہے کہ یہی [illegible]

بچے [illegible] ترقی نہیں کیا [illegible]

[illegible] لڑکیوں کی [illegible]

[illegible] آئندہ ایک [illegible]

ماں اور باپ بن کر ناتواں اولاد پیدا کریں۔

(دکنی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

محمد غوث الدین

حسینِ گماں!

وہ بھی ویسی ہے ہوش کی [illegible]

آرزو نگاہوں میں چھپی سی ہے

ہو رہی ہے جنون کی تکمیل

ہر عمل میرا بے عمل سا ہے

---

(۲) تیرے [illegible] تو [illegible]

میرے [illegible] کا خون چھلکتا ہے

اور ان سرخ سرخ ڈوروں میں

ایک آنچل ہے جو ڈھلکتا ہے

میری زیست کا [illegible] سرخ آنچل

اس کے شانوں پہ یوں سرکتا تھا

جس طرح زیست کا نقاب اٹھے

اور وہ مرمریں گداز سا جسم

نغمہ گیتی [illegible] نازسا جسم

میری باہوں میں یوں نکھرتا تھا

جوں تڑپ کر نسیم حباب اٹھے

میری امید ہوگئی بے کل

---

(۳) ہو رہا ہے گماں پلکوں پر

دل شکن [illegible] پلکوں کا

تیری [illegible] بیان پلکوں پر

ان [illegible] دراز پلکوں کا

---

(۴) تیری نظروں میں موج ہائے جنوں

اے مری غمگسار، زندہ باد

پوچھ مت مجھ سے میرا حالِ زبوں

اے سراپا بہار، زندہ باد

تشنگی اور بھی ہو جس سے فزوں

وہ نظر بار بار زندہ باد

افسر آذر

اندھیرا

عورت ... کی [illegible] تب
تھی [illegible] تھا [illegible]
[illegible] کی طرف [illegible] خوف [illegible]
[illegible] ایک عورت سر جھکائے [illegible]
جاری تھی [illegible]
[illegible] اس کا بچہ [illegible]
[illegible] کے لیے [illegible] نہیں [illegible] اس کے لیے [illegible]
ہے۔ وہ اپنی روزی [illegible] کے ساتھ خاموشی سے چل رہی تھی مگر جب [illegible] کے پاؤں کی سوکھی ہڈیوں کو آگ سے جلانا شروع ہوا تو وہ [illegible] رکھ کر چیخنے لگا۔ عورت نے آگے بڑھ کر جلدی سے اسے گود میں اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگی [illegible] اس کا سہارا تھا۔ بچہ اس کے سینے سے لگ کر خاموش ہو گیا۔ اس نے چتا کی طرف دیکھا۔ لوگ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ شعلوں کے درمیان [illegible] راموکا سوکھا جلتا ہوا جسم نظر آ رہا تھا۔ سرخ سرخ شعلوں [illegible] گزرے ہوئے دنوں کی یاد دلا رہے تھے اور وہ ماضی کی یاد میں کھو گئی۔

وہ نئی نئی بیاہ کر آئی تھی۔ ان دنوں وہ [illegible] رامو کے ساتھ کام کرتے۔ [illegible] کی بہت ضرورت تھی۔ وہیں ایک جگہ ان دونوں کو [illegible] مل گیا تھا۔ [illegible] نے مالک سے تھوڑی سی جگہ مانگ کر اپنی جھونپڑی بنا لی تھی۔ [illegible] صبح [illegible] آواز سن کر وہ جلدی جلدی [illegible] کی طرف [illegible] ہو جاتے اور دن بھر ساتھ کام کرتے۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے سے انہیں کچھ زیادہ تھکن محسوس نہیں ہوتی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے کام کرتے۔ کبھی رامو شرارت سے اس کے کان میں کچھ کہہ دیتا اور وہ شرما کر سر جھکا لیتی۔ اسی طرح دن آہستہ آہستہ گزر جاتا اور شام میں وہ دونوں لوٹتے۔ وہ کھانا پکانے بیٹھتی اور رامو بچے سے کھیلنے لگتا۔ دن یونہی گزر رہے تھے۔

[illegible]

[illegible] بچپن [illegible] اس کے ساتھ [illegible] کی طرح [illegible] ساتھ [illegible]

[illegible] رامو [illegible] کی قدرت [illegible] پہلے کی طرح [illegible] ساتھ [illegible]

[illegible] اس کی صحت خراب ہو گئی [illegible] پریشان رہتا [illegible] طرح حالت ہو گیا [illegible] اس کا علاج [illegible] کی حالت [illegible]

[illegible] کے علاج [illegible] قرض [illegible] ان لوگوں نے اپنی [illegible] خراب ہو جاتی [illegible]

[illegible] جہاں کی آسودگی [illegible] اس کا [illegible] اچھا تھا اور [illegible] پھر وہ رامو کے [illegible] اور رامو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ اور اس کا بچہ سسکنے کے لیے رہ گئے۔

ہولی آئی اور آشائیں جاگ اٹھیں۔ ہولی کے دن رامو [illegible]

اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ چتا کے شعلے بجھ چکے تھے۔ فضا میں اندھیرا چھا گیا تھا [illegible] اس کی زندگی پر بھی چھا گیا تھا اور [illegible] جو اس کا ہاتھ تھام لے اور پھر دونوں ایک دوسرے کے سہارے زندگی کا راستہ طے کریں [illegible] تنہا رہ گئی۔

[illegible]

تنقید و تبصرہ

اسلام کے معاشی تصورات

مرتبہ غلام دستگیر رشید ایم اے
ناشر۔ ادارۂ ادب جدید حیدرآباد دکن۔ قیمت ۳ روپے ۱۲ / ۸ / عثمانیہ
۳ روپے ۴ / کلدار۔ حجم ۲۵۸ صفحے۔

غلام دستگیر رشید صاحب نے بائیس مقالوں کو ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ یہ مقالے اپنی جگہ نہایت اہم اور قابل غور ہیں۔ آج کل عوام خصوصاً نوجوان طبقہ نظام اشتراکیت سے بہت متاثر ہے۔ اور اسلامی نظام پر اسے فوقیت دیتا ہے۔ لائق مرتب نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر مضمون میں اس کے معاشی نظام کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر حمید اللہ اور علامہ اقبال کے مضامین میں اشتراکیت اور اسلام کا بہترین موازنہ موجود ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ معاشی پیچیدگیوں کا حل ڈھونڈنے کے لئے اس کتاب کو رہبر بنانا چاہیے۔

اسلام کے سیاسی تصورات

مرتبہ غلام دستگیر رشید ایم اے
ناشر نفیس اکیڈیمی عابد روڈ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۳ عثمانیہ عہ کلدار حجم ۱۴۲ صفحے

زیر نظر مجموعہ میں دس مقالے شامل ہیں اسلامی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ عملی عالمگیر سیاسی نظام ایک ہی ہے اور وہ اسلامی نظام ہے مقالہ نگار بھی انتخاب ہیں۔ ہر شخص کے لئے اسلامی سیاست سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔ اور اس سے واقف ہونے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

سالنامۂ آجکل باتصویر

قیمت سالنامہ عہ
سالانہ چندہ دس روپے
حجم ۱۵۲ صفحے۔ ملنے کا پتہ۔ ادارۂ مطبوعات متحدہ۔ پوسٹ بکس ۱۹۶ دہلی

رسالہ آج کل اردو کا پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ اس رسالہ کی مقبولیت اس امر کی شاہد ہے کہ رسالہ عام فہم اور دلچسپ ہے اس میں معلوماتی مضامین خاص طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔ مستند اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین بھی سالنامہ میں موجود ہیں خالص ادبی اعتبار سے تو یہ رسالہ بہت بلند نہیں لیکن معلوماتی لحاظ سے یہ ہندوستان کا واحد مفید رسالہ ہے۔ زیر نظر سالنامہ میں تاریخی، سوانح، تنقیدی، علمی، معاشیاتی مضامین، افسانے، ڈرامے اور نظمیں سب ہی شامل ہیں۔ زبان عام فہم ہے۔ ہر رنگ و مذاق کے مضامین موجود ہیں۔

نئی صبح

ترجمہ ل۔ احمد ناشر۔ قومی دارالاشاعت بمبئی ۴
حجم ۴۲ صفحے قیمت عہ

"نئی صبح" ایک روسی افسانہ کا ترجمہ ہے۔ افسانہ خیالی نہیں زندہ حقیقت ہے۔ اس میں ایک روسی عورت کی داستان حیات قلمبند کی گئی ہے جس نے انقلاب میں مردوں کے برابر حصہ لیا اور اپنی عزت اور حریت کی قربانی قومی آزادی کے لئے کی۔ انقلاب سے پہلے اور بعد کی روسی زندگی کا اچھا مطالعہ ہے۔

ابو جعفر منصور

تالیف ابوالقاسم رفیق دلاوری
ناشر۔ اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور۔ حجم ۱۵۱ صفحے۔ قیمت ۱ے مجلد ۱۸ر

تاریخ کی اہم شخصیتوں کی سوانح عمریاں شائع کرنا قومی معیار اخلاق کو بلند کرنے اور بنانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ بھی اسی قسم کی سوانح عمری ہے طرز بیان دلچسپ ہوتے تو اچھا تھا کیونکہ نوجوان طبقہ نصیحت میں دلچسپی کو ڈھونڈتا ہے۔

"ز س"

نتیجہ امتحان اردودانی (دوم) بابتہ ۱۹۴۵ء

حسب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب
سب سے زیادہ نشانات حاصل کیے۔

۲۱۴۔ دیاشنکر دویدی اول (بلدہ فوج)
۳۰۸۔ شوکت جہاں بیگم دوم (نظام آباد)
۱۶۱۔ شیخ ابوبکر باشراحیل سوم (بلدہ فوج)

بلحاظ رول نمبر

مرکز بلدہ (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۔ خدیجہ بیگم
۴۔ غوثیہ بیگم
۵۔ مریم بی
۷۔ ہاجرہ بی
۸۔ رابعہ بی

(کامیاب)

۱۔ کنیزہ عائشہ
۹۔ صالحہ بیگم

مرکز بلدہ (ذکور)

(کامیاب)

۱۰۔ محمد حسین
۱۱۔ محمد عبدالوہاب انصاری
۱۲۔ رام نرسوامی
۱۴۔ حیات خاں
۱۵۔ ڈی ستیا نارام
۱۶۔ ابوالحسن محمد ریاض الدین
۱۷۔ جے رام ناتھم

مرکز بلدہ (فوج)

(کامیاب بہ امتیاز)

[illegible]۔ نور احمد
۲۲۔ عبدالعزیز خاں
۲۴۔ محمد غوث
۲۶۔ محبوب خاں
۳۲۔ جگن ناتھ پرشاد
۴۰۔ احسان اللہ خاں
۴۹۔ امتیاز حسین خاں
۵۰۔ [illegible]
۵۹۔ سید سلطان محی الدین
۶۲۔ عبدالحق خاں
۶۴۔ منور علی خاں
۶۹۔ عبدالحفیظ
۷۰۔ احمد حسین خاں
۷۶۔ محمد عبدالرحیم
۸۰۔ منور خاں
۸۱۔ محمد اسحق
۸۷۔ احمد حسین
۸۸۔ مارکنڈے سنگھ
۸۹۔ رنگیا
۹۴۔ شیخ ابراہیم
۱۰۲۔ شیخ محبوب
۱۱۴۔ نارائن سنگھ
۱۱۹۔ عبدالرشید
۱۲۱۔ محمد فاضل
۱۲۳۔ سید غوث
۱۲۴۔ محمد پاشاہ
۱۲۵۔ محمد عبدالغفور
۱۳۱۔ میر حسن علی
۱۱۲۔ محمد جواد
۱۵۰۔ سید [illegible]
۱۶۱۔ شیخ ابوبکر باشراحیل
۱۶۴۔ [illegible]
۱۶۹۔ حسن
۱۸۲۔ غلام محمد ربانی
۱۹۱۔ کیسو پرشاد
۱۹۲۔ محمد یعقوب
۲۰۳۔ محمد پاشاہ
۲۰۵۔ محبوب شریف
۲۱۴۔ دیاشنکر دویدی
۲۱۶۔ عبدالقادر
۲۱۹۔ یوسف خاں
۲۲۰۔ عبدالعزیز
۲۲۳۔ [illegible] پرشاد
۲۵۷۔ محمد عمر خاں

(کامیاب)

۱۹۔ رامیہ
۲۰۔ محمد عبدالرحیم
۲۳۔ شیخ چاند
۲۷۔ محمد حفیظ اللہ
۳۰۔ محمد عبدالجبار
۳۲۔ محمد حبیب
۳۳۔ شیخ تاج الدین
۳۴۔ سید حسین

۳۵۔ محمد اکبر
۳۶۔ سید رسول
۳۷۔ عبداللطیف
۳۸۔ سلطان خان
۴۲۔ عبدالرحیم
۴۳۔ محمد حبیب
۴۴۔ سید نور الدین
۴۶۔ غلام مصطفیٰ خان
۴۷۔ غلام معین الدین
۵۰۔ محمد علی خان
۵۴۔ قدیر محمد
۵۵۔ سید جعفر
۵۶۔ محمد عبدالرحیم
۵۷۔ امیر الدین خان
۵۹۔ محمد نصیر الدین
۶۰۔ ملک عثمان علی خان
۶۱۔ عبدالرؤف خان
۶۴۔ نیلین شہ بیت
۶۵۔ محمد عبدالقادر
۶۶۔ احمد خان
۷۱۔ قدرت اللہ بیگ
۷۲۔ محمد حسین
۷۳۔ عبدالحکیم خان
۷۴۔ عبدالوحید خان
۷۸۔ شیخ عبدالقدوس
۷۹۔ محمد صدیق
۸۰۔ ۔۔ خان
۸۲۔ محمد عبدالحفیظ
۸۳۔ شیخ محبوب
۸۴۔ محمد سلطان

۸۸۔ شیخ محی الدین
۹۰۔ مہابیر
۹۱۔ محمد شہاب الدین
۹۲۔ کارگیدین
۹۳۔ طاہر علی
۹۵۔ عبدالواسع
۹۶۔ مشتاق حسین
۹۷۔ حاجی خان
۱۰۰۔ مرزا قیصر بیگ
۱۰۱۔ محمد ابراہیم
۱۰۳۔ محمد یعقوب
۱۰۴۔ محمد شفیع الدین خان
۱۰۵۔ ابوالخلیل بن سعید
۱۰۶۔ علی احمد
۱۰۸۔ عبدالجبار خان
۱۰۹۔ محمد عظیم الدین
۱۱۰۔ شیخ [illegible]
۱۱۱۔ شاہ ۔۔ خان
۱۱۲۔ عبدالعزیز
۱۱۳۔ محمد صدیق
۱۱۴۔ احسان اللہ خان
۱۱۶۔ غفار خان
۱۱۹۔ سید رسول
۱۲۰۔ محمد مولانا
۱۲۳۔ کے۔ کے۔ جوزف
۱۲۸۔ غلام رسول
۱۲۹۔ محمد ابراہیم
۱۳۳۔ محمد نظام الدین
۱۳۵۔ محمد عبدالوہاب
۱۳۶۔ محمد ۔ شاد

۱۳۷۔ غوث الدین
۱۳۸۔ انور خان
۱۳۹۔ غلام حسین
۱۴۱۔ رام رتن پرشاد
۱۴۴۔ نذیر احمد
۱۴۵۔ وحید الدین
۱۴۶۔ سرور خان
۱۵۱۔ عوض بن سعید ابی البیل
۱۵۲۔ عبدالقادر صاعری
۱۵۳۔ عمر باحمید
۱۵۴۔ سید عمر بغدادی
۱۵۵۔ احمد عبیس
۱۵۶۔ علی عکبری
۱۵۷۔ سالم بلشرم
۱۵۸۔ حبیب عبدالرحمن بغدادی
۱۵۹۔ حبیب خان
۱۶۰۔ محمد خان
۱۶۲۔ عامر باجرائی
۱۶۴۔ احمد سعید بغدادی
۱۶۵۔ محمد بادحج
۱۶۷۔ صالح مثقال
۱۶۸۔ احمد باحشوان
۱۷۰۔ تیسیر
۱۷۱۔ عبدالرحمن
۱۷۲۔ محمد
۱۷۳۔ سعید
۱۷۴۔ عمر
۱۷۶۔ عبدالحق
۱۷۷۔ عبدالقادر
۱۷۸۔ محمود

۱۸۱۔ شیخ نظام الدین
۱۸۳۔ وہاب خاں
۱۸۸۔ محمد جہانگیر
۱۸۹۔ عبدالعزیز
۱۹۵۔ محمود علی
۱۹۶۔ محمد خاں
۱۹۷۔ غوث الدین
۱۹۹۔ علی بن محمد یمانی
۲۰۰۔ نرسیا
۲۰۱۔ محمد امام الدین
۲۰۴۔ محمد عباد اللہ
۲۰۵۔ سید یوسف
۲۰۷۔ بندہ علی
۲۰۹۔ شیخ جعفر
۲۱۰۔ محمد حسین
۲۱۱۔ شیخ معین الدین
۲۱۳۔ محمد یٰسین
۲۱۵۔ محمود علی
۲۱۷۔ فیاض علی
۲۱۸۔ سید حامد
۲۲۰۔ محمد غوث
۲۲۳۔ گوپال جی
۲۹۳۔ محمد عبدالرشید
۲۹۴۔ کریم خاں
۲۹۵۔ محمد اسمٰعیل دوم
۲۹۶۔ محمد غوث الدین
۲۹۸۔ نارائن سنگھ
۳۰۰۔ عبدالمجید خاں

مرکز بمبئی

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۴۳۔ قلی کونانا

(کامیاب)

۲۲۶۔ جعفر خاں
۲۲۸۔ جوزف
۲۲۹۔ جوزف روزانت
۲۳۳۔ زینل
۲۴۳۔ شہید جمال
۲۳۵۔ شیخ محبوب
۲۳۶۔ شیخ محبوب
۲۳۹۔ محمد الحبیب
۲۴۹۔ محمد قسمت [illegible]
۲۵۰۔ محمد مولانا
۲۵۵۔ مختار احمد خاں

مرکز دوم گنٹور (ذکور)

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۶۶۔ پیڈمری سیتا رام مورتی
۲۷۰۔ ڈی۔ ستیا
۲۷۸۔ پیڈمری بلرام مورتی

(کامیاب)

۲۶۰۔ سعید
۲۶۱۔ کشٹیا
۲۶۲۔ [illegible]
۲۶۵۔ ستیانارائن راؤ
۲۶۷۔ [illegible] ناگیا
۲۶۸۔ ویکنڈو [illegible]
۲۶۹۔ [illegible]
۲۷۱۔ گوتا بالیا
۲۷۲۔ نرسمہوان راؤ
۲۰۳۔ ابوار نرسیا
۲۰۴۔ آسانی راملو

۲۷۵۔ [illegible]
۲۷۶۔ [illegible] رام مورتی
۲۸۰۔ [illegible]
۲۸۱۔ [illegible]
۲۸۲۔ [illegible]
۲۸۳۔ [illegible]
۲۸۴۔ [illegible]
۲۸۵۔ [illegible]
۲۸۶۔ [illegible] خاں
۲۸۷۔ [illegible]
۲۸۸۔ [illegible]
۲۸۹۔ [illegible]
۲۹۰۔ [illegible]
۲۹۱۔ [illegible]
۲۹۲۔ [illegible]

مرکز دوم [illegible] (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۹۲۔ [illegible]

مرکز [illegible] (ذکور)

(کامیاب بہ امتیاز)

۳۰۳۔ [illegible]
۳۲۴۔ [illegible]
۳۲۹۔ [illegible]

(کامیاب)

۲۹۴۔ محمد عبدالعزیز
۲۹۷۔ [illegible]
۲۹۹۔ خواجہ [illegible]
۳۰۰۔ محمد [illegible]
۳۰۱۔ سید غیاث [illegible]
۳۰۲۔ محمد شیخ [illegible]

۳۰۴۔ محمد قاسم
۳۰۶۔ کرشنا راؤ
۳۰۹۔ محمد عظیم الدین
۳۱۰۔ پی۔ وینکٹ راؤ
۳۲۰۔ محمد جہانگیر
۳۲۱۔ پی۔ ترہیت ریڈی
۳۲۳۔ غلام غوث خاں
۳۲۰۔ شاہ جہاں بیگم

مرکز نامکرنول (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

۳۳۱۔ ناگمنی بی

(کامیاب)

۳۳۵۔ خدیجہ بی

مرکز نظام آباد (ذکور)

(کامیاب بہ امتیاز)

۳۳۷۔ شیخ حسین
۳۳۰۔ محمد اعجاز الدین قریشی
۳۳۶۔ محمد عبدالغفور

(کامیاب)

۳۳۹۔ نصیرالدین
۳۴۰۔ نظام الدین
۳۴۲۔ محمد عبدالمجید خاں
۳۴۳۔ عبدالخالق
۳۴۴۔ کلیم الدین احمد
۳۴۵۔ منظور احمد
۳۴۷۔ احمد حسین
۳۵۰۔ افتخار علی خاں
۳۵۱۔ محمد نصیرالدین
۳۵۲۔ عبداللطیف
۳۵۴۔ شجاعت علی خاں
۳۵۵۔ شیخ محمد حنیف الدین
۳۵۶۔ محمد مولانا
۳۵۷۔ سید وحید الدین
۳۵۸۔ محمد علی
۳۶۰۔ گنگا رام
۳۶۱۔ کے ویریگنی
۳۶۲۔ وی۔ راجیشور راؤ نیتا
۳۶۳۔ دیوا سنگھ
۳۶۵۔ بی۔ نرسیا
۳۶۶۔ نرسلو
۳۶۷۔ وینکٹ راملو

مرکز نظام آباد (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

۳۷۸۔ شوکت جہاں بیگم
۳۷۹۔ امۃ المجیب
۳۸۳۔ جمیل النساء بیگم
۳۸۴۔ قمیہ اختر جہاں

(کامیاب)

۳۶۸۔ شانتا بائی
۳۶۹۔ کملا وتی
۳۷۰۔ رکھمنی بائی
۳۷۳۔ دروپدی بائی
۳۷۴۔ گنگا بائی
۳۷۵۔ راجمنی بائی
۳۷۶۔ طاہرہ بیگم
۳۷۷۔ رضیہ بیگم
۳۸۰۔ امۃ الحمید
۳۸۲۔ افسر پاشاہ
۳۸۶۔ حمید النساء بیگم
۳۸۸۔ نجم النساء بیگم
۳۸۹۔ عابدہ بیگم

مرکز بمبئی ۔ ۵ دسمبر ۱۹۴۵ء کو صبح ۶ بجے بمبئی پہنچا اور اسٹیشن کے قریب انجمن اسلام گیا اور وہاں قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی قریشی صاحب نے میری آمد سے قبل ہی جناب مولوی عبدالعزیز صاحب دہلوی کو میرے استقبال کے لیے اسٹیشن روانہ کیا تھا لیکن میری بدقسمتی سے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکی۔ اقامت خانہ انجمن اسلام میں میرے لیے ایک کمرہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کو سویرے ہی سے قریشی صاحب اور ان کے رفقائے کار امتحان کے کمرہ کے انتظامات میں منہمک تھے۔ چونکہ ہدایت کے مطابق ٹھیک ۹ بجے میری حاضری کے بعد پرچے تقسیم کیے گئے اور وقت سے پہلے ہی امیدوار دل سے جوابات لکھ رہے تھے۔ قریشی صاحب کی خواہش پر میں نے زبانی امتحان لیا۔ اس کے بعد تمام جوابی پرچوں کو لفافہ میں بند کر کے مہر لگا دی گئی۔ امتحان گاہ کے انتظامات کی خوبی کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جناب قریشی صاحب حقیقی معنوں میں امتحان کی روح رواں ہیں اور ان کے رفقائے کار بھی۔ میں بہ خوشی یہ کہتا ہوں کہ قریشی صاحب نے تعلیم بالغان کی طرح کامیابی کے ساتھ توجہ کی ہے وہ قابل تحسین ہے اور ہمت افزائی ہے۔ آخر میں میں قریشی صاحب و رفقائے کار کی مہمان نوازی کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے قیام کی وجہ سے بہت زحمت اٹھائی۔ جناب قریشی صاحب کی توجہ اور انتھک سعی سے عنقریب ان امتحانات کو بہت ترقی ہوگی۔ میری دلی تمنا ہے کہ جناب معتمد صاحب سے ملاقات ہو۔ بمبئی کا کام بہت اچھا ہو رہا ہے۔

"نذیری"

ادارہ ادبیاتِ اردو کی چند دلچسپ ادبی کتابیں

گریہ و تبسم: صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ شعری اور جناب پروفیسر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جدید شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ صفحات ۱۹۰ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام۔ قیمت عالہ

نمود زندگی: حضرت سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۱) غزلیں اور (۵) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ صفحات (۲۱۴) قیمت عہ

انوار: حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت [illegible] کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات [illegible] ہے۔ [illegible] صرف ایک پختہ مشق اور پرگو شاعر ہی نہیں [illegible] ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کی [illegible] ہر شعر ان کے [illegible] زمانے میں سوائے جوش [illegible] شاعر [illegible] نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے جدید اردو شاعری میں ایک گرانبہا اضافہ ہوا ہے۔ صفحات ۲۸۰ قیمت عہ

ارمغان جذب: جناب رائے [illegible] صاحب جذب عالم پوری کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے سنسکرت اور بھاشا کی شاعری کے اخلاقی اور روحانی پہلو کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکثر رباعیاں سنسکرت اور بھاشا کے شعرا کے خیالات کا عکس ہیں اور بعض خود ان کے دل و دماغ کی سنسکرت کاوش کا نتیجہ ہیں۔

روانی، سلاست، خیالات سلجھے ہوئے اور طرز بیان اس قدر سادہ اور بے تکلف کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکے۔ ہر رباعی دل کی دھڑکن ہے جو شعر مجسم بن گئی ہے۔ ابتدا میں جناب ماہر القادری صاحب کا ایک بسیط اور معلومات آفریں مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحات ۱۲۰ قیمت مجلد ۱۲؍

ماہ لقا: مولوی عزیز احمد صاحب بی اے آنرز (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ و مترجم شہزادی درشہوار کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جن میں یورپ کی شاعری کے مفید اثرات جلوہ گر ہیں۔ جدید یا ترقی پسند اردو شاعری کے دلدادہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صفحات (۱۰۰) قیمت عہ۔

فیض سخن: میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز ہے۔ وہ ایک خاص مکتب شاعری کے بانی [illegible] عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا [illegible] انتخاب شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے جس میں ان کی حیات اور شاعری پر محققانہ [illegible] کی گئی ہے۔

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی مثنویوں اور دیگر کلام کا بھی انتخاب شامل ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ میر درد اور حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کے بعد تصوف و عرفان اور شعر و سخن کا امتزاج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام میں موجود ہے کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ تعداد صفحات (۱۴۴) مع تصویر مرقد حضرت فیض قیمت ۱۲

بادۂ سخن:۔ ڈاکٹر ماحد حسین مائل کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور خداداد بے تکلفی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا معرکتہ الآرا مقدمہ بھی شریک ہے۔ جس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے۔ صفحات ۱۲۷ قیمت ۱۲

متاعِ سخن:۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز داغ دہلوی کے شاگرد اور حیدر آباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ادبی لطافت اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مقدمہ بھی ہے جس میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ شاعری اور زبان کا مذاق رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ تعداد صفحات ۱۲۹ مع تصویر شاعر قیمت ۱۲

مرقعِ سخن جلد اول:۔ یہ دکن کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبہ فارغین اور اہلِ قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعرا کے نام دیئے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے۔ شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایانِ دکن اور قدردانِ ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔ (۵۰۰) صفحات ۵۵ تصاویر قیمت (صہ)

مرقعِ سخن جلد دوم:۔ پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے ہر شاعر کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ صفحات ۴۳۴ تصاویر ۵۰ قیمت صہ

تاریخ گولکنڈہ:۔ حیدر آباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ بڑی سائز سوا چھ سو سے زیادہ صفحات قیمت (سے)

مقدمۂ تاریخ دکن:۔ یہ کتاب بھی پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقاء، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کر دی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔ متوسط تقطیع ۱۴۴ صفحات قیمت (صہ)

سالار جنگ اعظم:۔ یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مولف مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ ہیں جن کو سوانح نگاری کا خاص ملکہ ہے اور مفید معلومات کو بڑے دلچسپ اور سادہ پیرایہ میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب مدرسوں کے طلبہ اور عوام کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے۔ چھوٹی تقطیع ۸۰ صفحات قیمت مجلد (۶ر)۔

عماد الملک:۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی عالم فاضل ہونے کے علاوہ مدبر اور فرزین تھے۔ وہ آخر عمر تک

پاسی سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے بچے رہے۔ انھوں نے حیدرآباد کو علم کی ایسی دولت سے مالا مال کر دیا جس کی وجہ سے ان کا نام رہتی دنیا تک اس ملک کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ مولوی لطیف محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ نے ان کے سوانح حیات بڑے قرینے سے مرتب کئے ہیں طلبا اور عوام کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ چھوٹی تقطیع ۴۰ صفحات قیمت

میر محمد مومن :- عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلی بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عال۔

مدراس میں اردو :- اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد عہ

تاریخ ادب اردو :- اردو زبان اور ادب کی کوئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی اگرچہ اس موضوع پر دو چار کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن ان سے نہ عالموں کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ عوام اور طلبہ کی۔ اردو ادب کی کوئی مکمل تاریخ اس سے قبل لکھی بھی نہ جا سکتی تھی کیونکہ گزشتہ ربع صدی میں اردو کتابوں، شاعروں اور ادیبوں سے متعلق ایسی نئی نئی معلومات حاصل ہوتی جا رہی تھیں کہ اس وقت جو بھی کوشش کی جاتی وہ نامکمل رہ جاتی اب اردو کی گزشتہ تاریخ بڑی حد تک بے نقاب ہو چکی ہے اور بہت سی ایسی کڑیاں مل گئی ہیں جن کی وجہ سے ایک مربوط اور مسلسل تاریخ مرتب کر لی جا سکتی ہے۔ اس سہولت کے پیش نظر ادارہ نے یہ تاریخ مرتب کرائی ہے۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ چھوٹی تقطیع ۱۷۶ صفحات۔ قیمت عہ۔

اردو مثنوی کا ارتقاء :- بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے فائدہ اور معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا نام ہی کافی ہے۔ سروری صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر اتنی وسیع اور باریک بین ہے کہ اس خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمسری نصیب نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت نیز تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔ بڑی سائز (۱۴۳) صفحات قیمت عہ

مغربی تصانیف کے اردو تراجم :- یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی۔ نقاد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص

اہمیت ہوتی ہے۔ چھوٹی تقطیع ۴۸ صفحات قیمت مجلد ۸؍

آریائی زبانیں :- یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو ادارہ کے لئے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۴۰ قیمت ۸؍۔

شعرائے عثمانیہ :- سلسلہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے جس میں چھبیس شعرائے جامعہ عثمانیہ کے کلام کا پاکیزہ انتخاب درج ہے۔ یہ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید کی گئی ہے۔ تقریباً بیس سال سے یہ جواہر پارے بکھرے پڑے تھے جن کو مولوی سید معین الدین صاحب قریشی ایم اے اور مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم اے ریسرچ اسکالر نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ کہیں خیالات کا لطف ہے تو کہیں زبان کا کہیں جذبات کی تازگی اور بلندی ہے تو کہیں اسلوب بیان کی جدت۔ کلام کا انتخاب اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہر شاعر کی عظمت اور اس کا معیار پورے طور پر سامنے آتا ہے۔ جدید اردو شاعری کے رجحانات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک کمیاب اور کارآمد تحفہ ہے۔ رائل سائز (۲۳۱) صفحات بتصویر قیمت مجلد عاں۔

محمد حسین آزاد :- اردو کے اس بڑے شاعر اور انشاء پرداز کے مکمل حالاتِ زندگی اب تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار اردو کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ نے نہایت تفحص و تلاش اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تصویر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت عاں۔

گارساں دتاسی :- اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستانیوں کے محسن

ہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس سے ہمدردی رکھنے والی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور ہم عصروں کا اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب صفحات (۱۲۰) قیمت ۸؍۔

نذرِ ولی :- اس میں دکن کی چار قابلِ فخر خاتون انشاء پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں۔ جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگانِ ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔ صفحات ۱۴۴ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام قیمت مجلد عاں۔

محبت کی چھاؤں :- مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے کل افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر افسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحاتِ فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد ۸؍

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
لندن ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۲ر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

زیر ادارت
معین الدین احمد انصاری
بی۔ ایس سی (علیگ)

سب رس

بچوں کے لئے

جلد (۹) بابت ماہ جنوری ۱۹۴۶ء شمارہ (۱)

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ) کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں طبع ہوکر خیرت آباد سے شایع ہوا

آپ کی ہماری باتیں

سب رس نے اپنی عمر کے نئے سال میں قدم رکھا ہے اس کی سالگرہ پر ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں اور سب رس کی طرف سے ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنھوں نے مبارکباد کے خط بھیجے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ سالگرہ نمبر ہم شائع نہ کر سکے۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ جنوری کا پرچہ شاندار نکلے لیکن ہم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے جس کے کئی اسباب ہیں۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ مصور صاحب جو سب رس کے لئے اچھی اچھی تصویریں بنایا کرتے تھے عین وقت پر بیمار ہوگئے۔ پھر ایک دوسرے مصور صاحب صرف چند تصویریں بنا سکے۔ اب سنئے پریس کا حال ہمارا ارادہ تھا کہ اس پرچے کے صفحات کچھ بڑھا دیں لیکن مشکل یہ ہے کہ پریس میں آج کل کام بہت ہے ہمارے پاس وقت کم تھا اس لئے خاص نمبر نکال نہ سکے لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم بہت جلد خاص نمبر شائع کریں گے۔ ان سب مضمون نگار بھائیوں اور بہنوں کے مضامین ہمارے پاس محفوظ ہیں جو انھوں نے سالگرہ نمبر کے لئے بھیجے تھے۔ ہم دوسرے بچوں سے بھی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس خاص نمبر کے لئے اچھے اچھے مضامین ہمارے پاس بھیجیں۔ جنوری کے پرچے میں بھی تقریباً سب ہی مضامین اور نظمیں دلچسپ ہیں۔ آپ ان کو پڑھ کر ضرور خوش ہوں گے۔ اس پرچے میں جو مضمون یا نظم آپ کو سب سے زیادہ پسند آئے اس کے متعلق اپنے تاثرات لکھ بھیجئے۔

معین الدین احمد انصاری

معمۂ طالع نمبر ۱۴

ذیل میں چند ناموں کے حروف کو بے ترتیب لکھ دیا گیا ہے۔ ان کے صحیح نام بتائے جائیں۔

(۱) ب-ا-ا-خ-د-و-ل۔ دکن کا مشہور اور مقدس مقام (۷) حرفی

(۲) ہ-ہ-ا-ا-ر-ب-م-ت۔ ایک مشہور کتاب کا نام (۸) حرفی

(۳) ل۔ن۔ن۔و-ر-چ-چ-س-ٹ موجودہ عہد کے مشہور مدبر اور سیاست داں کا نام (۹) حرفی

(۴) ل-ل-ش-م-م-ا-ا-ک-خ-ر ایک مشہور مدبر و مصلح قوم کا نام (۱۰) حرفی

(۵) م-م-ل-ل-ل-ی-ے-ن-پ-گ-ہ بلدۂ حیدرآباد کا ایک مشہور میلہ (۱۱) حرفی

ہدایات

(۱) صحیح حل اس مہینے کی آخری تاریخ تک دفتر سب رس پر پہنچ جانا چاہئیں۔ (۲) صحیح حل پر ایک اچھی کتاب بطور انعام دی جائے گی۔ (۳) انعام کے مستحق وہی ہوں گے جن کا پورا حل (پانچوں نام) صحیح ہو۔ (۴) شریک مقابلہ ہونے کے لئے صحیح حل کے ساتھ آٹھ پائی کا ٹکٹ آنا ضروری ہے ورنہ حل جانچا جائے گا۔ (۵) بپابندی شرط نمبر (۴) کسی ایک ہی نام سے ایک سے زیادہ حل بھی قبول کئے جائیں گے۔ (۶) صحیح حل میں نشان سلسلہ اور تعداد حروف کا حسب ذیل طریقہ پر اندراج کیا جائے۔

۱ .... (۷) حرفی　　　(۴) .... (۱۰) حرفی

۲ .... (۸) 〃　　　(۵) .... (۱۱) 〃

۳ .... (۹) 〃

(۷) مشکوک اور مشتبہ حل قبول نہ کئے جائیں گے۔ (۸) اپنا پورا نام و پتہ صاف اور خوش خط تحریر فرمائیے۔

سید مراد علی طالع

طالب علم

"سریش" کی عمر نو سال کی تھی، اس کا باپ زمیندار تھا۔ اس کا باپ چونکہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر قدرت نے تو اس کے رگ و ریشہ میں کنجوسی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ اس لئے اس نے سریش کو ان نو سالوں کے عرصہ میں صرف "اردو کی پہلی کتاب" ختم کروائی۔ گو سریش ذہین اور علم حاصل کرنے کا شوق رکھتا تھا۔ مگر جب کبھی سریش اپنے آپ سے کہتا کہ "پتا جی میں ایک زمیندار کا لڑکا ہوں مجھے اس قدر تعلیم پانا چاہیئے کہ اس گاؤں میں کوئی مجھ پر سبقت نہ لے جائے"۔ لیکن باپ کہتا "بیٹا تم کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے ہمارے پاس اس قدر دولت ہے کہ ہم مرتے دم تک آرام سے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں" باپ کے اس طرح کہنے پر سریش خاموش تو ہو جاتا مگر اس کے دماغ میں یہی دھن سمائی رہتی کہ مجھ کو کسی طرح علم حاصل کرنا چاہیئے۔ ایک دن حسبِ معمول وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ تمام ساتھی آپس میں اپنے امتحانات کی تیاریوں سے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ کوئی کہتا کہ "جغرافیہ میں ہندوستان کی قدرتی تقسیم کا سوال ضرور آئے گا اور کوئی کہتا کہ تاریخ میں "چندر گپت بکرماجیت" کے متعلق ایک سوال تو ضرور آنا چاہیئے۔ سریش کے لئے ہندوستان کی قدرتی تقسیم "چندر گپت بکرماجیت" یہ الفاظ بالکل نئے تھے۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کرکے پوچھا "بھئی رمیش یہ تو بتاؤ کہ چندر گپت بکرماجیت آخر ہے کیا چیز" رمیش خوب خوب (ایک دوسرے ساتھی کو اپنی طرف مخاطب کرتے ہوئے) اے بھیا "ہمیش" ہمارے زمیندار صاحب کے فرزند کوئی چیز پوچھ رہے ہیں ذرا ادھر آؤ تو ہمیش بتاؤ تو کیا چیز...... رمیش ہمارے سریش بابو پوچھ رہے ہیں کہ چندر گپت بکرماجیت ہے کیا چیز۔ ہمیش (مسکراتے ہوئے) "ہنستے سریش بابو" اما یار تم کو یہ تک نہیں معلوم! اجی بابو صاحب "چندر گپت بکرماجیت" کوئی چیز نہیں ہے بلکہ انسان ہے انسان یہ ایک بہادر اور مشہور راجا گزرا ہے۔ آپ زمیندار صاحب کے لڑکے...... کاش اگر میرے باپ کی آمدنی آپ کی آمدنی کا نصف حصہ بھی ہوتی تو آج میں کم از کم بارھویں جماعت کا طالب علم ہوتا مگر...... اب تو سریش بے حد شرمندہ ہوا فوراً گھر لوٹا اور اپنے کمرے میں تنہا بیٹھ گیا۔ رات ہو گئی کھانے کا وقت آگیا لیکن سریش اسی سوچ میں بیٹھا رہا کہ آخر میں علم کو کس طرح

حاصل کروں۔ اپنے باپ سے کہتا ہوں تو وہ اپنی دولت پر بھروسہ دلاتے ہیں۔ بس اسی سوچ میں وہ بغیر کھانا کھائے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح جگدیش (سریش کا باپ) نے آکر سریش سے کھانا نہ کھانے کی وجہ دریافت کی۔ سریش نے جواباً کہا کہ "اگر آپ مجھے تعلیم دلانے کا وعدہ کرتے ہیں تو میں کھانا کھاؤں گا اور اس مکان میں رہوں گا ورنہ ..... ! جگدیش پھر وہی اپنی ضد۔ بیٹا دیکھتے نہیں میں ایک ان پڑھ ہی ہوں مگر بڑے بڑے لوگ میری عزت کرتے ہیں، نذریں دیتے ہیں اور میری سفارش کے محتاج رہتے ہیں" شاید تجھے اپنی آئندہ زندگی کا خیال ہو رہا ہوگا" تو اطمینان رکھ کہ تیرا باپ جگدیش تیرے لئے کافی سرمایہ چھوڑ کر مرے گا۔ سریش لیکن اس سرمایہ سے مجھے تعلیم دلوائی جائے تو ..... ! اب جگدیش صاحب کچھ تیز سے ہو گئے اور کہا کہ "آخر تو تعلیم پاکر کرے گا کیا تجھے نوکری کرنا تو نہیں ہے"۔ نکال دے اس خیال کو اپنے دماغ سے، بار بار سمجھاتا ہوں لیکن پھر وہی اپنی ضد۔ کیا تیرے سر پر کم بخت علم کا بھوت سوار ہے؟ اب تو سریش کو یقین ہو گیا کہ اس کا باپ ہرگز اس کو علم سیکھنے نہ دے گا۔ اس روز تو بڑی مشکل سے دن گزار ہی لیا اور جب رات ہو گئی تو کھانا کھانے کے بعد کوئی رات کے بارہ بجے چپکے سے وہ اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لیے ایک دوسرے شہر "چندر نگر" کی راہ لی جو اس کے گاؤں سے بہت دور واقع تھا۔

وہاں پہنچ کر اس نے ایک کپڑے کی دکان میں ماہانہ دس روپے تنخواہ پر ملازمت کر لی۔ اب ادھر مسٹر جگدیش کا قصہ سنئے چونکہ رات کے ۱۲ بجے سریش اپنے گھر سے نکل چکا تھا اور کواڑ کھلا ہوا تھا اور ادھر بہت دن سے چند ڈاکو موقع کی تلاش میں تھے، اب ان کو جو موقع ہاتھ آیا تو بس سریش کے کمرہ سے اندر پہنچ ہی گئے اور جتنی دولت جگدیش نے کنجوسی سے جمع کر رکھی تھی لے کر چمپت ہو گئے۔ صبح جب زمیندار صاحب جاگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مکان کے دروازے کھلے پڑے ہیں۔ ان کا روزانہ معمول تھا کہ صبح اٹھتے ہی وہ اپنے سرمایہ کو دیکھ لیا کرتے اس لئے حسب معمول جب وہ اپنی تجوری کے پاس پہنچے تو اپنی پوری کی پوری دولت غائب پائی۔ جب اپنے لڑکے کے کمرہ میں پہنچے تو وہ بھی غائب۔ اب جو ایک ہاتھ سے سر پیٹ رہے تھے لگے دونوں ہاتھوں سر پیٹنے۔ بہت تلاش کروائی۔ مگر ڈاکو ڈاکو ہی ہوتے ہیں کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ اب زمیندار صاحب کے لئے سوائے اپنی زمینات بیچ کر پیٹ بھرنے کے

دوسرا چارا ہی نہیں تھا۔ ان کو اپنی زمینات فروخت ہی کر دینی پڑیں اور جب کچھ بھی باقی نہ رہا تو آخر کار رہنا مکان بھی فروخت کر دیا۔ اب زمیندار صاحب کی حالت ایک زمین چھننے والے کی سی ہو گئی۔ محنت مزدوری کے عادی تو نہ تھے اب کرتے کیا سوائے بھیک مانگنے کے۔ اُن کو اپنے کندھے پر جھولی ڈال لینی پڑی اور انھوں نے بھی چندر نگر کا راستہ اختیار کیا کیونکہ یہی ایک مقام ان کے گاؤں سے بہت دور واقع تھا۔ اُن کے اپنے گاؤں سے دور جانے کی وجہ تو خیر آپ لوگ خود سمجھ سکتے ہیں۔

سرینش دکان پر ملازم تھا۔ اپنے مالک کے لڑکوں سے کچھ علم و لیاقت میں اضافہ کر لیا۔ وہ اب اس قابل ہو گیا کہ ساتویں جماعت میں اچھی طرح تعلیم پا سکے اور کافی رقم بھی جمع کر لی تھی۔ اس لئے مدرسہ میں جا کر جماعت ہفتم میں شریک ہو گیا چونکہ یہ نہایت ذہین اور صحیح معنوں میں علم کا طالب تھا اس لئے ہر سال برابر کامیاب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ... وہ میٹرک جماعت پاس کر کے کالج میں شریک ہو گیا اور بی اے کے امتحان میں اس نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور ایک اچھے عہدہ پر مامور کیا گیا۔

سرینش کو ماں باپ کی یاد نے ستائی اس کو رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا کہ میرے یہاں آنے سے ان کی کیا حالت ہو گئی ہوگی اور کس قدر میری ماں آنسو بہا رہی ہو گی۔ وہ اپنے گاؤں جانا چاہتا تھا۔ لیکن کسی سے اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کے والدین "چندر نگر" میں بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ یہ سن کر سرینش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کیونکہ یہ بات اس کے ذہن میں بھی نہ آئی ہو گی کہ ایک زمیندار در بھیک مانگے۔ اگر یاد رکھو کہ "خدا جسے چاہے فقیر بنا دیتا ہے اور جسے چاہے امیر" غرض کہ سرینش اپنے والدین کی تلاش کر ہی لی۔ وہ بھی اپنے لڑکے سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اپنی دردبھری داستان سنائی۔ جگدیش صاحب کی آنکھ اب کھلی کہ واقعی دولت پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ آج ایک شخص کے پاس تو کل دوسرے کے پاس۔ لیکن علم ہی ایک ایسی دولت ہے کہ جس کو کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا۔ عزیز بھائیو! کبھی دولت پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ہمیشہ ساتھ دینے والی چیز نہیں۔ علم ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ اس کو حاصل کرنے میں کوشش کریں۔

احمد حسین

عیار کانے کی کہانی

کہانیاں تو تم نے بہت سی سنی ہوں گی، "سات شہزادے" "سبز پری" "اڑن کھٹولا" اور سات پریوں کی کہانیاں تو تم نے خوب مزے لے لے کر پڑھی ہوں گی۔ جادو کے واقعات، عجیب و غریب انسانوں کے حلیے، جن، دیو، پری وغیرہ سے تم خوب واقف ہوئے۔ لطف تو تم نے ضرور اٹھایا ہوگا کہ وہ "ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑا دی" کے اندر ہوگا۔ آؤ آج ہم تمہیں ایسی کہانی سنائیں گے جو تم کو عمر بھر یاد رہے گی۔

لو سنو! "ایک کانا تھا جو بہت ہی چالاک اور ہوشیار مشہور تھا اور کانا عیبی ہوتا ہے یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ بیانے کانے کو ایک بار روپے کی سخت ضرورت پڑی۔ تھا بڑا ہوشیار، گھر میں ایک بکری تھی اسی کو بیچنے کی ٹھانی۔ اپنے لڑکے کو بکری بیچنے کے لئے گاؤں بھیج دیا۔

گاؤں میں دس ٹھگ رہا کرتے تھے، ٹھگوں کا کام ہی کیا ہوتا ہے، بھولے بھالے سیدھے سادھے آدمی کو دیکھا اور اپنا الو گانٹھنے کی ٹھانی۔ کانے کا لڑکا گاؤں میں جا داخل ہوا، ٹھگوں نے دیکھ کر فوراً سارا معاملہ تاڑ لیا اور ایک نے پوچھا "یہ کتا کتنے میں بیچو گے؟" لڑکا ہنس کر بولا۔ چ، غ، د اور نرے ہی احمق ہو ایک بکری اور کتے کو نہیں پہچانتے؟" ٹھگ نے مکاری سے جواب دیا "اگر تم اپنا کتا میرے ہاتھ نہیں بیچنا چاہتے ہو تو کوئی دوسرا خریدار تلاش کرو۔ قصبہ میں جی بھر کے گھومو اور تھکو، لیکن کوئی بھی تمہارے کتے کو مجھ سے زیادہ داموں میں نہ خریدے گا اور اگر تم پریشان ہی ہونا چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکتا۔ اگر میرا بزرگانہ مشورہ مانو تو یہ کتا میرے ہاتھ بیچ دو۔" لڑکے نے سنی ان سنی کر دی اور بکری لے کر آگے چل دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اسے دوسرا ٹھگ مل گیا۔ اس نے بھی پہلے ٹھگ کی طرح پوچھا "یہ کتا کتنے میں بیچو گے"۔

قصہ کوتاہ تیسرا، چوتھا غرضیکہ نو ٹھگ اسے ملے اور سب نے وہی پرانا سوال کیا۔ "یہ کتا کتنے میں بیچو گے؟" لڑکے نے سوچا کہ اتنے تمام آدمی اس بکری کو کتا کہہ رہے ہیں لیکن میرے والد نے اسے بکری سمجھ کر مجھے بیچنے کو بھیجا ہے تو ابا جان کو غلط فہمی ہوگئی ہوگی اور انھوں نے کتے کو بکری سمجھ لیا ہوگا۔ لڑکے کو بالکل یقین ہوگیا کہ یہ کتا ہے بکری نہیں۔ جب دسواں ٹھگ اسے ملا تو اس نے بھی پہلے کی طرح سوال کیا اور لڑکے نے دو روپے میں اپنی بکری کو ٹھگ کے ہاتھ بیچ دیا۔

لڑکا دو روپے لے کر اپنے گھر روانہ ہوا۔ جب گھر پہونچا اور اس کے باپ (کانے) کو معلوم ہوا کہ لڑکے نے بکری دو روپے میں بیچ ڈالی ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور گرج کر بولا "ایک بکری کے دام دو روپے۔ ہرگز نہیں ہوسکتا ضرور تم نے خرچ کر ڈالے ہیں، جلد بتاؤ ورنہ ابھی تمہاری مرمت کروں گا۔" لڑکا خوف سے کانپنے لگا اور اس نے ساری روئداد باپ کو سنا دی۔ کانا جو کہ تمام ٹھگوں کا بھی گرو گھنٹال تھا بولا "میں ان ٹھگوں سے ضرور بدلہ لوں گا ان کو اس بدمعاشی کا ضرور مزہ چکھاؤں گا۔"

دوسرے دن کانے نے اپنا گدھا لیا اور بدلا لینے کو روانہ ہوگیا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا جب کہ وہ اس مکان پر پہونچا جہاں پر تمام ٹھگ اکٹھے ہوئے تھے اور صلاح و مشورہ کے بعد رات بھر کے لئے علحدہ ہوجاتے تھے اور لوگوں کو ٹھگتے پھرتے تھے۔ کانا مکان میں داخل ہوکر بولا۔

"دوستو! السلام علیکم۔ میں گاؤں میں کچھ خرید و فروخت کرنے آیا تھا کہ رات ہوگئی میں اس گاؤں میں اجنبی ہوں اور کسی کو نہیں جانتا، اس لئے آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اور میرے گدھے کے لئے

صرف کھانے اور سونے کا انتظام کردیں گے۔"

ٹھگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے بتا رہے تھے کہ یہ اجنبی ہے اور اس کا گدھا ضرور لوٹنا چاہئے۔ سردار نے جواب دیا "دوست آپ سب انتظام ہو جائے گا۔"

ٹھگ گدھے کو کھلانے کے لئے کانے پر بہت مہربان ہوئے۔ کچھ دوڑ کر گدھے کے لئے چارے اور پانی کا انتظام کرنے لگے اور کچھ کانے کے لئے بھی کھانا لے آئے۔ کانے نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر گدھے کے منہ میں دو روپے ڈال دئے۔ گدھا چارہ اور پانی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اپنی مخصوص "ڈھینچوں" "ڈھینچوں" کا راگ الاپنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانے نے دو روپے جو اس کے منہ میں ڈال دئے تھے وہ گدھے نے اگل دئے اور وہ فرش پر کھنکھناتے ہوئے جا گرے۔ کانے نے روپے اٹھالئے اور گدھے کو ٹھوکر مار کر بولا —

"آج تو نے مجھے صرف دو روپے دئے؟ کیا تو نہیں جانتا ہے کہ آج مجھے لڑکی کی شادی کے لئے سامان خریدنا ہے اور مجھے زیادہ روپے کی ضرورت ہے۔" ٹھگ بہت متعجب ہوئے اور انھوں نے ایسا مفید گدھا خریدنے کا ارادہ کرلیا۔ ٹھگوں نے کانے سے کہا "آپ یہ گدھا ہم لوگوں کے ہاتھ بیچ دیجئے، آپ جتنی بھی قیمت لینا چاہیں ہم تیار ہیں اور اسے ضرور لیں گے۔" کانے کا داؤں چل گیا لیکن اس نے رنگ جمانے کے لئے پہلے تو انکار کیا اور کہا "یہ میری روزی کا ذریعہ ہے اس کو میں کسی صورت سے بھی اپنے سے علحدہ نہیں کرسکتا۔ روپے تو جلد ختم ہو جاتے ہیں لیکن میرا گدھا ایسی مشین ہے جو ہمیشہ نئے روپے پیدا کرتی ہے۔ تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد کانے نے اپنا گدھا سات سو روپے میں بیچ دیا۔

دوسرے دن جانے سے پہلے کانے نے ٹھگوں سے کہا "یہ گدھا دوسرے کے پاس فوراً روپے نہیں اگلنا شروع کرتا، بلکہ پہلے آپ اسے خوب کھلائیے اور ایک مہینے کے لئے اسے کمرے میں بند کردیجئے تب کہیں یہ روزانہ روپے اگلنے کے قابل ہوسکے گا۔" ٹھگوں نے ایک کمرہ میں گھاس اور پانی بھر کر رکھ دیا اور گدھے کو اس میں بند کردیا، تیسویں دن وہ بڑے امیدوں کے ساتھ گدھے کو نکالنے پہونچے، کمرہ کا دروازہ جب آسانی سے نہ کھل سکا تو ایک ٹھگ بولا "گدھے نے شائد اتنے زیادہ روپے اگلے ہیں کہ کمرہ بھر گیا ہے اور اسی لئے دروازہ نہیں کھل رہا ہے۔"

بڑی کوششوں کے بعد جب وہ دروازہ توڑ کر اندر گھسے تو ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی، انھوں نے دیکھا کہ گدھا مرا پڑا ہے اور کمرہ میں ایک بھی روپیہ نہیں ہے، گدھے نے تمام پانی اور چارہ ایک دم سے کھا لیا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا اس طرح اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ ایک نے دوسرے سے کہا "اس بدمعاش نے ہم کو دھوکا دیا ہے، ہمیں بھی اس کو سبق دینا چاہئے۔

اب کانے کی سنئے، جب وہ گھر پہونچا تو اس نے اندازہ لگایا کہ ٹھگ اس سے ضرور بدلہ لیں گے اور پیش بندی کے طور پر اس نے بیوی کو پڑھانا شروع کیا۔ "ایک بھیڑ کی کھال لے لو اور اس کو بھیڑ کے خون سے بھر کر اپنے جسم کے چاروں طرف باندھ لو۔ جب میں تم سے ناشتہ لانے کے لئے کہوں تو تم کچھ بعد دیگرے کچھ پھل لانا، تب میں غصہ ہو جاؤں گا اور اپنے چاقو سے بھیڑ کی کھال جو کہ تمہارے پیٹ کے چاروں طرف ہو گی چھید ڈالوں گا۔ تب تم گر پڑنا اور مردہ بن جانا۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہیں ایک بوٹی سنگھاؤں گا اور تم چھینک کر

کھڑی ہو جانا۔"

اسی دن ٹھگ اس کے پاس آئے اور وہ سخت غصہ میں تھے۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو کانے نے انھیں خوش آمدید کہا اور بیٹھنے کی درخواست کی اور کہا "پہلے آپ لوگ ناشتہ کھا لیجئے پھر باتیں ہوں گی۔"

ٹھگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ناشتہ کرنے میں کچھ نقصان نہیں اور اس کو ناشتہ کے بعد مار ڈالیں گے۔ کانے نے اپنی بیوی سے ناشتہ لانے کو کہا۔ اس نے جس طرح شوہر نے بتایا تھا اسی پر عمل کیا۔ یکے بعد دیگرے وہ کئی پھل لائی لیکن سب کچے تھے۔ کانا خفا ہو گیا اور اس نے چاقو بیوی کے پیٹ میں بھونک دیا۔ وہ گر پڑی، خون کا فوارہ اس کے جسم سے نکل پڑا، وہ تھوڑی دیر تڑپی پھر خاموش ہو گئی گویا مر گئی ہے۔ ٹھگ یہ دیکھ کر چلائے۔ "اس نے اپنی بیوی کو مار ڈالا ہے ہمیں بھاگ جانا چاہئے ورنہ ہم بھی قاتل شمار کئے جائیں گے۔" مکار کانا سنجیدگی سے بولا "مت گھبراؤ، جب میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو میں اسے دوبارہ زندہ کر لوں گا، ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب کانے کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اس میں جڑی بوٹیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک نکال کر اس نے اپنی بیوی کو سنگھانا شروع کیا۔ اس کو ایک چھینک آئی اور وہ زندہ ہو گئی۔ ٹھگ بوٹی کی اس تعجب خیز تاثیر سے بہت متعجب ہوئے انھوں نے ایک دوسرے سے کہا "ہم کو اسے ضرور خریدنا چاہئے۔"

ٹھگوں نے کہا "دوست! گدھے نے ہم کو جیسے کہ تم نے کہا تھا ایک بھی روپیہ نہیں اگلا۔ ہم آج اس لئے آئے تھے کہ یا تو اپنا روپیہ لیں گے یا تمہیں مار ڈالیں گے۔ لیکن اگر تم یہ بوٹی ہمارے ہاتھ بیچ دو گے تو ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔"

کانے نے پہلے تو انکار کیا اور کہا "میں نے یہ بوٹی بڑی دشواریوں سے حاصل کی ہے، میں اسے نہیں دے سکتا" لیکن آخرکار ٹھگوں نے دباؤ ڈال کر دو سو میں بوٹی خرید لی۔ ٹھگوں نے بوٹی خرید کر اپنے گھر کی راہ لی اور وہاں پہونچ کر بوٹی کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ بوٹی کی حیرت انگیز تاثیر کو آزمانے کے لئے ٹھگوں نے اپنی بیویوں کو رات میں مار ڈالا۔ انھوں نے اپنی بیویوں کی ناکوں میں بوٹیاں ٹھونس ٹھونس دیں لیکن وہ زندہ نہ ہو سکیں۔ انھیں خوف ہوا کہ کہیں اپنی بیویوں کے قتل کے جرم میں انھیں پھانسی نہ ہو جائے۔ اس لئے انھوں نے اپنی بیویوں کو اپنے گھروں میں دفن کر دیا اور گاؤں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

(ترجمہ)

غلام رسول ریاض حکیم
(مسلم کالج کانپور)

صحیح حل معمۂ طالع نمبر ۱۳

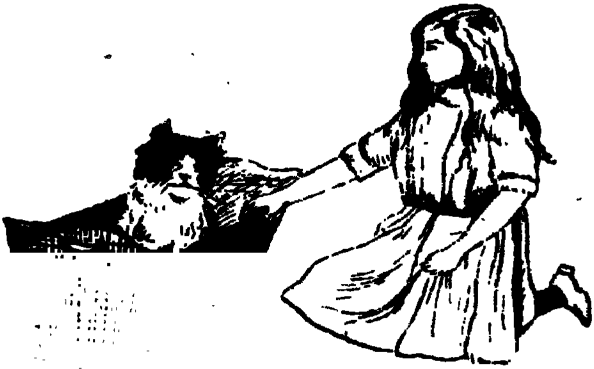
یہ لکڑی کے دستے ہیں

اصل لفظ "دستے ہیں" ہے۔ معمہ بنانے کے لئے ہم نے صرف "تے" کی دس دفعہ تکرار کی۔

حسب ذیل سب رسی بھائیوں اور بہنوں نے صحیح حل بھیجے۔ قرعہ اندازی کے بعد افتخار احمد اقبال انعام کے مستحق قرار پائے۔

(۱) افتخار احمد اقبال (۲) سید علی (بھونگیر) (۳) افتخار الدین (نلگنڈہ) (۴) سردار بیگم (حیدرآباد)

سید رازعلی ...



مُنّی کی بِلّی

مُنّی نے اک بِلّی پالی — بِلّی تھی وہ دِلّی والی
رنگ تھا اُس کا کالا کالا — کالا کالا سب سے نرالا
آنکھیں تھیں نیلی پیلی سی — نیلی پیلی چمکیلی سی !!
گھر گھر پھرنے جاتی تھی وہ — دودھ مَلائی کھاتی تھی وہ
گوشت کی بوٹی کھا لیتی تھی — سالن روٹی کھا لیتی تھی
چوہیا کو وہ دیکھ جو پاتی — جھٹ پٹ اس کو چٹ کر جاتی
کتے سے گھبراتی تھی وہ — اس کے پاس نہ جاتی تھی وہ
نام تھا اس بلی کا موتی — موتی نام سے وہ خوش ہوتی
کرتی رہتی میاؤں میاؤں — کہتی میں آؤں میں آؤں
منی جب موتی کو بلاتی — موتی دوڑی دوڑی آتی

منی اور موتی کی کہانی
خوب رہی نیّر کی زبانی

محمد شفیع الدین نیّر
جامعہ نگر دہلی

لالچ بری بلا ہے

کسی زمانہ میں ایک فقیر رہتا تھا جس کے پھٹے پرانے کپڑے اور کمزور ہاتھ پاؤں اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ اُسے بہت کم خیرات ملتی ہے۔ ایک دن وہ بھیک مانگتا گلی گلی کوچہ کوچہ پھر رہا تھا پھرتے پھرتے وہ ایک لکھ پتی سیٹھ کی دکان پر آیا جس کا منشی کچھ لکھ رہا تھا۔ سیٹھ کا عالی شان مکان بھی دکان کے بازو ہی تھا۔ مکان سے باہر ایک عمدہ موٹر کھڑی تھی۔ فقیر نے سوال کیا۔



سیٹھ جی! بہت بھوکا ہوں ......

لیکن منشی نے قلم روک کر غصے سے اس کی طرف دیکھا پھر قلم ہی سے سر کھجا کر کہا "اس وقت سیٹھ صاحب ضروری کام میں مصروف ہیں کل آؤ" اور پھر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں سیٹھ مکان سے نکلا اور جونہی موٹر میں بیٹھا، موٹر فراٹے بھرتی چلی گئی اور فقیر صرف دھول کے ایک چکر کھاتے ہوئے بگولے کو تکنے لگا جو موٹر کی تیز رفتاری سے پیدا ہوا تھا۔

وہ مایوس ہو کر وہاں سے چل دیا۔ پُرشور سڑک پر سے گزرتے ہوئے اس نے زیر لب کہا "اگر مجھے .... اس امیر سیٹھ کی دولت کا تھوڑا سا حصہ مل جائے تو میں صبر و شکر سے زندگی گزاروں۔"

اب وہ ایک سنسان رستے پر آگیا تھا جو قریب کے ایک قبرستان کو جاتا تھا۔ یکایک وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے سامنے ایک عجیب و غریب شخص کھڑا تھا۔ اس شخص کی ٹوپی میں ایک خوبصورت سفید پر لگا ہوا تھا اور ہاتھ میں ایک بڑی سی تھیلی تھی۔ اس نے کہا "میں دولت کا فرشتہ ہوں۔ تم نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ اگر تمہیں کچھ روپیہ مل جائے تو تم صبر و شکر سے بسر کرو گے؟"

فقیر نے حیرت سے کہا "ہاں ......" دولت کے فرشتہ نے کہا "اپنی چادر پھیلاؤ میں تمہیں روپیہ دیتا ہوں"۔



چنانچہ فقیر نے اپنی پھٹی پرانی چادر پھیلادی اور دولت کے فرشتے نے روپے ڈالنے شروع کئے۔ جب بہت سے روپے چادر میں گرا چکا تو اس نے پوچھا "بس ؟"

فقیر کی آنکھوں میں لالچ کا پردہ پڑگیا تھا اس نے کہا "نہیں ...... اور ڈالو" —

دولت کا فرشتہ ڈالتا ہی رہا اور فقیر بھی کہتا ہی رہا کہ "اور ڈالو"

ایک ہی دفعہ چادر پھٹی اور سارے روپے چھن چھناتے زمین پر گر پڑے ......

فقیر نے گھبرا کر دونوں ہاتھ زمین پہ ڈالے مگر وہاں مٹی کے سوائے کچھ نہ تھا۔ اس نے ...... اِدھر اُدھر دیکھا۔ دولت کا فرشتہ کبھی کا غائب ہوچکا تھا۔ وہ ہاتھ ملتا ہی رہ گیا ...... اور اب بھی گلی گلی کوچہ کوچہ بھیک مانگتا پھرتا ہے لیکن اسے کچھ نہیں ملتا۔ یہ ہے لالچ کا پھل۔

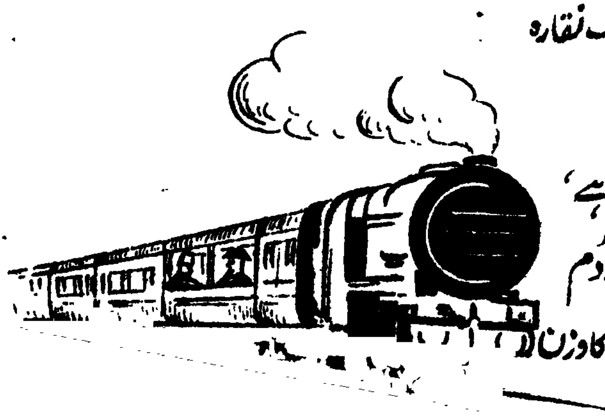
یہ چھوٹی سی کہانی میں نے ایک بوڑھے ماہی گیر سے سنی تھی جو ندی کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہم سب بچوں کو کہانیاں سناتا تھا۔

افتخار احمد اقبال

عرب اور عربستان۔ شعبۂ ادبیات اطفال کی طرف سے یہ نئی باتصویر کتاب شائع کی گئی ہے۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت دلچسپ سلیس انداز میں مرتب کیا ہے۔ تقریباً ہر صفحہ پر تصویر دی گئی ہے۔ صفحات ۵۶ قیمت صرف ۱۰/

گپ شپ

ایک مشرقی ملک کا آدمی مغربی خطے کی انوکھی چیزوں کو دیکھنے کی غرض سے مغربی ملکوں کے طویل سفر پر روانہ ہوا اُسے راستے میں ایک مغربی ملا جو مشرق کی عجیب چیزوں کے مطالعہ کے لئے مشرق جانا چاہتا تھا دونوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے سفر اور اپنے ملک کے حالات ایک دوسرے کو سنائیں تاکہ سفر کی تکلیف اٹھانی نہ پڑے۔ چنانچہ مغربی نے گفتگو شروع کی۔



مغربی۔ ہمارے ملک کے ایک گرجے میں ایک نقارہ رکھا ہوا ہے جس کی گولائی ۱۰ میل ہے۔

مشرقی۔ ہمارے ملک میں بھی ایک گائے ہے، جس کا منہ شمال کے سمندر میں ہے اور دُم جنوب کے سمندر میں اور اس کی ٹانگوں کا وزن دس ہزار ٹن ہے۔

مغربی۔ یہ تو بالکل ناممکن ہے۔

مشرقی۔ کیوں ناممکن ہے؟ اگر ایسی گائے نہ ہو گی تو کس طرح آپ اپنے نقارے کے لئے کھال حاصل کر سکتے؟

مغربی۔ خیر ہمارے ملک میں ایک ایسا پہاڑ ہے جس پر کھڑے رہ کر کوئی گفتگو نہ کرنے کے باوجود گونج کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

مشرقی۔ یہ تو بالکل معمولی چیز ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایک ایسا پہاڑ ہے جو ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ اگر ہم السلام علیکم کہیں تو وہ نہ صرف وعلیکم السلام کہے گا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مزاج کا حال بھی دریافت کرے گا۔

مغربی - میں نے سنا ہے کہ آپ کے خطے میں بہت بڑی جسامت کے آلو پیدا ہوتے ہیں کیا آپ مجھے ان کی نسبت کچھ معلومات دے سکیں گے؟

مشرقی - ہاں کیوں نہیں ضرور۔ کیا اس سے پہلے آپ اپنے ملک کے پلوں (Bridges) کے متعلق واقف کرائیں گے؟ میں نے سنا ہے کہ وہ پل پہاڑوں سے بھی اونچے ہیں۔

مغربی - ہاں ہاں وہ پل بہت بلند ہیں۔ گزشتہ سال ایک آدمی ان میں کے ایک پل پر سے پھسل پڑا تھا اور ابھی تک وہ پانی تک پہنچ نہیں سکا بلکہ اس وقت تک وہ گر ہی رہا ہے۔ اس ایک مثال سے آپ اُن پلوں کی بلندی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مشرقی حقیقتاً بہت بلند پل ہیں۔ ہمارے خطے کے آلوؤں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور نہ آپ کو ان کو دیکھنے کے لئے سفر کی تکالیف برداشت کر کے مشرق آنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان کی جسامت میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس طرح وہ جلد ہی مغرب تک پھیل جائیں گے اور آپ ان کو مغرب میں رہتے ہوئے ہی دیکھنے کے قابل ہو سکیں گے۔

(ترجمہ) **مسعود انصاری**

نظام الملک آصف جاہ اول - مولوی سید مراد علی طالعؔ اردو فاضل نے بانیٔ سلطنت آصفیہ کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ زندگی عوام اور طلبہ کے لئے سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے تھے ان کو ادارہ نے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ صفحات (۴۰) مع تصویر نظام الملک آصف جاہ۔ قیمت ۴؍

نظام علی خاں آصف جاہ ثانی - ادارۂ ادبیات اردو نے سلاطین آصفیہ کے سوانح کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کی دوسری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "نظام الملک آصف جاہ اول" اتنی مقبول ہوئی کہ ایک سال کے اندر اس کا دوسرا ایڈیشن چھپوانا پڑا۔ اس باتصویر کتاب میں مولوی مراد علی صاحب طالعؔ نے تاریخی واقعات کو طالب علموں اور عوام کے لئے نہایت دلچسپ اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔ صفحات ۳۲ قیمت ۴؍

کاش میں ہوتا ایک پرندہ



کاش میں ہوتا ایک پرندہ
کاش میں ہوتا ایک پرندہ

جگہ جگہ کی سیر کو جاتا   سب ملکوں کی خبر بھی لاتا
جب تھک جاتا تب میں گاتا   گانے گاتے میں سو جاتا
کاش میں ہوتا ایک پرندہ

کالے بادل جب چھا جاتے   گڑ گڑ گڑ گڑ کرتے آتے
پانی کا پیغام سناتے   تب میں میٹھی تان اڑاتا
کاش میں ہوتا ایک پرندہ

اپنے کو آزاد میں پا کر   دانہ دنکا سب کچھ کھا کر
نیلے سے آکاش میں جا کر   دھیرے دھیرے میں منڈلاتا
کاش میں ہوتا ایک پرندہ

گڑ گڑ گڑ گڑ بادل آتے !   رم جھم رم جھم برسا لاتے
عمدہ سا اک ساز ملاتے   تب میں گیت سہانا گاتا
کاش میں ہوتا ایک پرندہ

نام دھنک یا قوس قزح میں   پرتھوی سے آکاش کی راہ میں
جھولا جو ہے ایک فضا میں   کوکب اس میں جھولنے جاتا
کاش میں ہوتا ایک پرندہ

کوکب (دہلی)

تاروں کی محفل



اندھیری رات میں تاروں بھرا آسمان کس قدر سہانا، دلکش اور نظر فریب منظر پیش کرتا ہے۔ جدھر دیکھو آسمان پر تارے ہی تارے نظر آتے ہیں۔ اگر ان کو احتیاط سے گن جائے تو صرف ڈھائی یا تین ہزار تارے گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب دوربینوں کو استعمال کیا جاتا ہے تو ان کی تعداد اس قدر بے انتہا بڑھ جاتی ہے کہ ان کو گننا مشکل ہو جاتا ہے۔

دیکھنے پر تو یہ چمکدار بجلی کے گولوں اور چمکتے ہوئے چراغوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اصل میں واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ بہت بڑے بڑے جلتے ہوئے گیس کے گرتے رگولے میں جن سے ہروقت روشنی خارج ہوتی رہتی ہے اور اسی لئے وہ ہروقت روشن رہتے ہیں۔ جب سورج غروب ہوتا ہے اور شام ہونے لگتی ہے تو ان کی چمک بھی آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور ٹھیک آدھی رات کے وقت تو ان کی چمک بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ان کے نکلنے کی وجہ اندھیرے کی کمی کے ساتھ ساتھ ان کی چمک بھی کم ہوتی جاتی ہے اور جب سورج نکل پڑتا ہے تو یہ آسمان سے بالکل غائب معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح سارا آسمان تاروں سے خالی نظر آتا ہے۔ ان کا حال بس ایک جگنو کا سا ہے جو صرف رات میں چمکتا ہے اور دن میں چمکنے کے باوجود چمکتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

یہ تارے دیکھنے پر تو بہت ہی چھوٹے چھوٹے اور ننھے منّے سے معلوم ہوتے ہیں مگر یہ اتنے چھوٹے نہیں جتنا کہ وہ ہمیں دکھائی دیتے ہیں بلکہ یہ ہماری زمین تو زمین سورج سے بھی کئی گنا بڑے ہیں۔ مگر یہ ہم سے اس قدر دور فاصلے پر واقع ہیں کہ ان سے آنے والی روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار (۱۸۶۰۰۰) میل فی سکنڈ ہوتی ہے۔ کئی سال کے مسلسل سفر کے بعد ہم تک پہنچتی ہے اور اسی لئے وہ ہمیں بے حد چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔

ان میں سے بعض تارے جیسا کہ خود ہماری زمین کا حال ہے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خود بخود روشن نہیں ہوتے بلکہ یہ سورج کی روشنی کو آئینہ کی طرح منعکس کرکے روشن ہو جاتے ہیں۔ ان کو تاروں کے نام سے نہیں بلکہ سیاروں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب تک صرف نو سیارے معلوم کئے گئے ہیں اور ہماری زمین

انھیں تو بے شمار ہوتی ہے۔ اگر اس کو ان تاروں کے قریب جا کر دیکھا جائے تو یہ بھی ان تاروں کی طرح چھوٹی، روشن اور چمکتی ہوئی دکھائی دے گی۔ ہر سیارے کے اطراف چاند گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہماری زمین کے اطراف تو ایک چاند گردش کرتا ہے مگر بعض سیارے ایسے ہیں کہ ان کے اطراف ایک سے زائد چاند گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہ چاند بھی دراصل چھوٹے چھوٹے سیارے ہیں۔ سورج بھی ایک تارہ ہے، جو دوسرے تاروں کی طرح مختلف دھاتوں کے جلتے ہوئے بخارات سے بنا ہوا ہے۔ یہ ہماری زمین کا ایک قریب ترین تارہ ہے۔ لیکن پھر بھی یہ اس قدر دور واقع ہے کہ اس کی روشنی ۸ منٹ میں زمین تک پہونچتی ہے۔

آسمان پر ایسے بہت سے تارے موجود ہیں جو سورج سے کئی گنا بڑے ہیں۔ لیکن وہ زمین سے بہت دور فاصلے پر واقع ہیں جس کی وجہ وہ سورج سے بھی چھوٹے نظر آتے ہیں۔ ایک سفید رنگ کا تارہ جس کو "شعرائے یمانی" کہتے ہیں دیکھنے پر تو بہت ہی چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ سورج سے کئی گنا بڑا ہے۔ لیکن وہ زمین سے اس قدر دور واقع ہے کہ اس کی روشنی آٹھ سال میں زمین پر پہونچتی ہے اور اسی لئے وہ بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ یہ تارہ اس قدر گرم ہے کہ اگر اس کو سورج کی بجائے رکھ دیا جائے تو زمین اس قدر گرم ہو جائے گی کہ دریاؤں اور سمندروں کا پانی اُبل اُبل کر بھاپ میں تبدیل ہو جائے گا اور زمین پر کی ساری مخلوق فنا ہو جائے گی۔

سورج اور یہ تمام تارے چونکہ ہر وقت روشن رہتے ہیں اس لئے ان کا مادہ ہر وقت روشنی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سورج ہر سکنڈ میں اپنا ۴۰ لاکھ ٹن وزن کا مادہ روشنی کی شکل میں خارج کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج کا وزن ہر ایک سکنڈ میں ۴۰ لاکھ ٹن کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح برابر روشنی خارج کرتے کرتے سورج اور یہ تمام تارے بالکل ٹھنڈے ہو جائیں گے اور اس طرح روشنی کے نہ ہونے کی وجہ دنیا کی ساری مخلوق انسان، حیوان، درخت وغیرہ سب کے سب فنا ہو جائیں گے۔ شاید یہی وہ دن ہوگا جس کو مذہب نے قیامت کا نام دیا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
شاہد صدیقی
سکینہ بیگم

ان نمبر آصفیہ ۱۵۳
نات نمبر برطانیہ ایم ۲۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
ون کا سبیہ فی ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد ۹ — بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۶ء — شمارہ ۲

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شائع ہوا

کچھ سب رس کے متعلق

[illegible] دنیا [illegible] بخوبی واقف ہے کہ سب رس گزشتہ [illegible] اپنی بساط کے مطابق [illegible] ادبی ذوق [illegible] [illegible] کر [illegible] [illegible] کے اپنے لکھنے والوں [illegible] [illegible] ہیں جو [illegible] پروان چڑھ رہے [illegible] مستقبل قریب [illegible] کو شمار بھی اچھے [illegible] ہو سکیں گے۔

[illegible] سب رس [illegible] رسالے نہیں [illegible] اہل [illegible] معیار [illegible] ان کا یہ [illegible] ایک حد تک صحیح ہے لیکن عرض [illegible] [illegible] مقصد علمی [illegible] [illegible] کا ذوق [illegible] مذاق کے [illegible] ادب کا [illegible] پڑھنے کا [illegible] خود ان کے مذاق کا معیار [illegible] بھی اونچا ہو جائے گا۔

یہ [illegible] حقیقت ہے کہ [illegible] لکھنے والوں اور ان زیادہ پڑھنے والوں سے بے حد شکایت ہے جن لوگوں کو اچھے لکھنے والوں [illegible] اور کلام بھیجنے میں کوتاہی کرتے ہیں بار بار [illegible] توجہ نہیں فرماتے جس کی وجہ سے اچھے [illegible] مضامین اور نظموں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پڑھنے والوں سے شکایت ہے کہ وہ اپنا چندہ دینے میں تاخیر کرتے ہیں اگر زیادہ [illegible] کیا جائے تو رسالہ بند کر دینے کی دھمکی دی جاتی ہے۔

[illegible] رسالوں کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ان کے خریداروں کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ اردو والے اپنے رسالوں کی دل کھول کر سرپرستی نہیں کرتے [illegible] کا رسالہ پڑھ کر اپنے ذوق ادب کی تشفی کر لیتے ہیں۔ سالانہ چندہ ادا کرنا ایک بار گراں معلوم ہوتا ہے [illegible] اچھے سے اچھے رسالہ کے خریداروں کی تعداد [illegible] اور یہ رسالے [illegible] [illegible] سب رس بھی [illegible] [illegible] رسالوں کا [illegible] ترجمان کی حیثیت سے [illegible]

رہے جب تک اہل ملک اپنے رسالوں کی قلمی اور رقمی اعانت نہ [illegible] ان کا عرصہ دراز تک جاری رہنا ممکن نہیں۔

سب رس کے اجرا کے وقت بطور خاص یہ تجویز [illegible] پیش نظر تھی کہ سب رس کی آمدنی سے اخراجات کی [illegible] کے بعد جو رقم بچے وہ قلمی معاونین کی خدمت [illegible] [illegible] کی گنجائش [illegible] افسوس کے ساتھ [illegible] ہم اب تک [illegible] نہ ہو سکے [illegible] قلمی معاونین [illegible] [illegible] خدمت [illegible] جواب [illegible]

[illegible] شکایت [illegible] وقت پر شائع نہیں [illegible] ہم ان قارئین [illegible] اور رسالہ [illegible] [illegible] ہم [illegible] کہ سب رس کا [illegible] [illegible] ادارہ [illegible] [illegible] ہمیشہ [illegible] نے کئی سال [illegible] کسی [illegible] کی طباعت کا [illegible] ہی [illegible] رہا۔ توقع تھی کہ پریس کا تعاون [illegible] کی کثرت نے پریس کو تعاون [illegible] جاری نہ رکھنے [illegible] کی صورت پیش آئی۔ حیدرآباد میں [illegible] ہی اچھے [illegible] وہاں بھی کام کی کثرت ہے اور وہ [illegible] کاتبوں اور [illegible] کا اچانک غائب ہو جانے کی وجہ [illegible] ہیں اس کا اندازہ وہی اصحاب [illegible] بہت تجربہ ہے۔ غرض [illegible] واقعات کا سامنا کرنا [illegible] کوشش کے باوجود رسالہ [illegible] [illegible] اور اس کا [illegible]

[illegible]

تحقیقی اور تطبیقی مطالعہ

[illegible]

[illegible] جاتی ہے۔

حضرت امیر خسرو کی مثال یہاں کافی ہوگی جو سلطان علاء الدین خلجی کے دربار کے امیر تھے۔ یہ نہ صرف ماہر فن موسیقی ہی تھے بلکہ اچھے شاعر بھی اور سیاستداں بھی۔ اسی وجہ سے متواتر دو تین خلجی کے عہد حکومت میں عہدہ وزارت پر فائز رہے۔ آپ کا تبحر علمی اور شاعری سے جیسا کچھ لگاؤ تھا وہ ہر کس و ناکس پر عیاں ہے۔ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا سے آپ کو جیسی کچھ عقیدت تھی وہ بھی عیاں رہا ہے۔ مرشد قبلہ نے بہت [illegible] آپ ایرانی النسل [illegible] تھے اور ایرانی موسیقی سے خوب واقف تھے۔ [illegible] ہندی گانا سنتے تھے، آپ کو بہت پسند آیا اور اسے [illegible] سے سیکھنے کی خواہش آپ میں پیدا ہوگئی۔ اور [illegible] ہندی موسیقی پر عبور حاصل کر لیا۔ اور وہ کمال پیدا کیا کہ آپ اپنے وقت کے نایک مانے جانے لگے۔ چنانچہ [illegible] وجیانگر کے گوپال نایک نے بھی آپ کی شاگردی [illegible]

[illegible] کہتے ہیں جس نے علم حاصل [illegible] ہو اور [illegible] کو بھی اچھی طرح سمجھا کر پڑھا سکے۔ کل راگ راگنیوں سے واقف ہو اور انہیں ویسے ہی گا سکتا ہو اور دوسروں کو بھی اچھی طرح گانا سکھا سکے۔ استادان سلف کی بہت سی چیزیں ان کی [illegible] سے یاد ہوں اور ان پر [illegible] طرح رکھ سکتا ہو۔ نہایت تجربہ کار ہو۔ اس کے شاگرد بھی نامی گرامی ہوں اور فن میں اجتہاد کر سکتا ہو۔ حضرت امیر خسرو نے اسی معیار کے مطابق اجتہاد سے کام لیا۔ ایرانی اور ہندی موسیقی کی موزوں ترکیب سے کئی راگ راگنیاں اختراع کیں۔

اس موقع پر [illegible] یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت امیر خسرو ایرانی موسیقی سے واقفیت رکھتے تھے تو [illegible] ہندی موسیقی سیکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ ہندوستانی موسیقی [illegible] کون سی ایسی قدر [illegible] کرنے لگے؟ ان سوالات کا حل دریافت کرنے سے پہلے ایرانی موسیقی پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے ورنہ بات صاف طور پر سمجھ میں نہ آئے گی۔

ایرانی موسیقی کی بنیاد علم نجوم پر رکھی گئی ہے۔ بارہ برج کے لحاظ سے (۱۲) مقام قرار دیے گئے ہیں۔ یہی ایرانی راگ ہیں۔ راگنی کو فارسی میں شعبہ کہتے ہیں۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں کے اعتبار سے بارہ مقام کے (۲۴) شعبے وضع کئے گئے اور ہر شعبے میں چند نغمے ہوتے ہیں۔ ہر مقام یعنی راگ کے (۴) پتر ہوتے ہیں، جن کو گوشے یا گوشہ کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے (۱۲) راگوں کے (۴۸) گوشے ہوئے۔ ہندی موسیقی میں بھی (۴۸) پتر ہوتے ہیں۔ ان دونوں تقسیموں میں فرق ہے تو صرف اسی قدر کہ ایرانی موسیقی میں (۱۲) راگوں کے (۴۸) پتر ہوتے ہیں اور ہندی میں (۶) راگوں کے۔ اس لئے کہ ہندی موسیقی ہر راگ میں (۸) پتر بتلاتی ہے۔ اس کے علاوہ (۶) آوازے ہوتے ہیں جو (۶) اصل ہندی راگ کے مانند سمجھے جاتے ہیں۔ ایرانی موسیقی میں (۱۷) تالیں ہوتی ہیں لیکن ہندی موسیقی کے مانند (۱۵) تالیں ہی زیادہ معروف و مستعمل ہیں۔ انہیں بحر یا ضرب کہتے ہیں۔ اس خلاصے اور تقابل سے ہندی اور ایرانی فن موسیقی کی مماثلت اور قربت واضح ہے۔ ان بارہ مقامات کے نام بھی درج ذیل ہیں۔

(۱) راست (۲) اصفہانک (۳) عراق (۴) کوچک (۵) بزرگ (۶) حجاز (۷) بوسلیک (۸) عشاق (۹) حسینی (۱۰) زنگولہ (۱۱) نوا (۱۲) رہاوی۔ باقی تقسیم کو بخوف طوالت حذف کیا جاتا ہے۔

بعض ایرانی راگ راگنیوں میں بڑی حد تک ہندی راگ راگنیوں کی سی مشابہت اور کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ

(۱) مقام راست کو نٹ نارائن۔ مقام عراق کو بھیروں

کوچند کو کلیان، بزرگ کو ایمن شاہد۔ زنگولہ کو گوند سے قریبی نسبت ہے۔

(ب) اسی طرح شعبوں میں مخالفت کو۔ رام کلی، منگلا، بیبھاس، اشیرال، آسیت سری اور دھناسری، چارگاہ، گوا ساوری، نوروز کو جیسے جے ونتی اور للت سے قریبی تعلق ہے۔

(ج) ایسے ہی گوشوں میں۔ زیادہ تر کو کانہڑا، ترشمہ کو بہاگرا، یک بنگس کو ...، نیریز کو سورٹھ، زابیت کو کیدارا۔ نوروز شمس کو ٹوڑی راگنی سے قریبی تعلق ہے۔ اور لطف یہ کہ نوروز میں مخالف دھار کا لگایا جائے تو مالکوس کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

بس یہی مماثلت تھی جس کی وجہ سے ہندی گانا سنتے ہی حضرت امیر خسرو نے اسے پسند کیا اور اس کی تکمیل فن کی طرف توجہ فرمائی۔ اس فن میں اختراع پردازی اور جودت طبع دکھلانے کے وسیع امکانات انھیں نظر آئے۔ مماثلت و مشابہت کی وجہ سے بھی سیکھنے میں بہت سہولت معلوم ہوئی۔ طرفہ یہ کہ طبیعت بھی بڑی رسا پائی تھی۔ فوراً تکمیل فن کر کے دونوں فنون کو ایک دوسرے میں سمونے لگے۔ اس میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی جو ان سے پیشتر کسی نایک کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان کی نایکی کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجنے لگا۔ کئی جدید راگ راگنیاں ایجاد کر کے ہندی موسیقی کی حدود کو وسیع کیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندی موسیقی ہندوستان کی چار دیواری کے اندر ہی مقید و محصور نہ رہے بلکہ ایران اور دیگر ممالک میں بھی پھیل جائے۔ جدید اختراع کے سبب سے اس میں جو لطف پیدا ہو گیا ہے، وہ قریبی مماثلت کی وجہ سے ایرانیوں کے لئے سہل الفہم اور سہل الحصول بن جائے۔ اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی۔ مگر افسوس کہ ہندوستان کے جمود اور قدامت پسندی کو یہ کہاں گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے علوم کو ملک کے باہر قدم رکھنے دیتی۔

ہندوستان کے باشندوں نے ذرا تامل کر کے نہیں دیکھا کہ دونوں ملکوں کے فنون میں اس قدر مشابہت اور قریبی تعلق کیوں پایا جاتا ہے؟ ذرا تاریخ کی ورق گردانی کرتے تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ایران میں بھی آریا ہی آباد تھے۔ یہ وہی راگ راگنیاں تھیں جو وسط ایشیا سے گھوم کر ایران سے ہوتے ہوئے پھر ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں۔ البتہ گمشدہ چیز ذرا رنگ بدل کر ہاتھ آئی ہے۔ شکل وہی، روپ وہی، صرف رنگ ذرا سفید ہو گیا تو کہہ دیا کہ یہ وہ چیز نہیں دوسری ہے۔ یہ نہ دیکھا کہ خد و خال وہی، سر وہی، لے وہی، تان وہی ہے۔ اس نکتہ کو حضرت امیر خسرو نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی پہچان لیا اور دونوں کو بڑی سہولت کے ساتھ کامیاب طریقہ پر ہم آہنگ کر دکھایا۔ خیال، ترانہ اور قوالی کی طرزیں ایجاد کیں۔ سرگم کے مانند، کشتی رانوں، کہاروں، ڈولی برداروں کے لئے ترویٹ، اور منڈی راگوں جیسے ان پڑھوں کے لئے تالا کی طرزیں بنائیں۔ بین میں اصلاح کر کے ستار ایجاد کیا۔ ان کی ایجاد کی ہوئی چند راگنیوں کی تفصیل درج ذیل ہے، جو ایرانی راگنیوں کی رہین منت ہیں۔

(۱) پوربی، گورا، گنکلی اور ایک ایرانی راگ کو ملا کر سازگری بنائی
(۲) ہنڈول کے ساتھ گوشہ نیریز کو اکٹھا کر کے یمن ترتیب دیا
(۳) سارنگ اور بسنت کو مقام نوا کے ساتھ مخلوط کر کے عشاق بنایا
(۴) ٹوڈی، مالوی، نغمہ دوگاہ اور حسینی کو ملا کر موافق
(۵) پوربی میں تھوڑی سی ترمیم کر کے اس کا نام غنم رکھا
(۶) گورا اور ایک ایرانی راگ کی آمیزش سے مجیر ایجاد کی
(۷) شہناز آواز سے کو کنٹ راگ سے ملا کر زیلف بنایا
(۸) گنکلی اور گورا کو ایک دوسرے میں سمو کر فرغانہ یا فرغنہ ترتیب کیا
(۹) سارنگ، بلاول اور مقام راست کی آمیزش سے سرپردہ اختراع کی
(۱۰) دیس، نار اور ایک ایرانی راگ کو جوڑ کر باخرز یا باخزیر بنائی
(۱۱) کانہڑا، پوربی، گوری اور ایک ایرانی راگ کی آمیزش فرودست ہے
(۱۲) کلیان کے ساتھ ایک ایرانی راگ کی آمیزش کر کے اس کا نام صنم رکھا

"... درپن" کے مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ ساز گری، قرار، عشاق، وغیرہ خوب ہیں، حضرت امیر خسرو نے بڑا کمال دکھایا ہے۔ قول، ترانہ، نقش، نگار، بسیط، ترانہ، سہلا وغیرہ بھی حضرت امیر خسرو ہی کی تیز رسا کی ایجادات ہیں۔

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے تطبیقی مطالعہ کی مدد سے ہندی موسیقی میں بڑی وسعت اور ترقی کے ساتھ جدت بھی پیدا کر دی۔ ہر طبقے میں موسیقی کا مذاق پیدا کیا اور اسے ہر دلعزیز بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس موقع پر یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان لوگوں امتزاج کی بدولت غیر شعوری طور پر ہندی موسیقی میں عربی موسیقی کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔ چنانچہ عراق، حجاز، عشاق، حسینی، عشیران، نگار وغیرہ (۲۷) راگ، راگنیاں عربی الاصل ہیں، جو ایرانی موسیقی میں پہلے ہی سے شامل تھیں اور اختلاط کی وجہ سے ان کے جز بھی ہندی موسیقی کا جزو بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی موسیقی کے بعض ٹکڑوں کو سننے سے ہندی مطرب کو اس لئے دلچسپی ہوتی ہے کہ پہلے ہی سے اس کے کان ان ٹکڑوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

اب ہم ہندی موسیقی کی اثر پذیری کی داستان کو ختم کرتے ہوئے اس کی اس اثر آفرین قوت پر نظر ڈالتے ہیں جو عربی اور فارسی عناصر کی آمیزش سے اس میں پیدا ہوئی تھی۔ اس اثر آفرینی کے ثبوت میں ہم نواب نظام الدولہ مردان علی خاں رئیس مراد آباد (جو اس فن کے ماہر اور مصنف بھی ہیں) کا قول نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو یوں رقمطراز ہیں کہ:-

"بعض ایرانی اور افغانستانی گانے بجانے والے جو سنتے گئے ہیں، انھوں نے ہندوستانی راگ راگنیوں سے استنباط کر کے بعض بعض اپنے ملکی و فارسی مقام کو مرکب کر کے نئے طور پر خوشگوار آہنگ بنا لیا ہے۔ ایران میں بھی ان کے باجوں میں بھی اکثر حرکات مثل نغمۂ ہندوستان کے اور بعض نون (ہندوستانی) آ ... ہندی راگنیوں سے اخذ کر کے بنائی گئی ہیں۔ غرض ان طرز ایجاد اور رواج ہوتا چلا آیا ہے۔"

بیان بالا سے ظاہر ہے کہ تطبیقی مطالعہ سے اپنے اور دوسرے علوم کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔ علوم کی ترقی کے لئے ایسا مطالعہ بے حد ضروری چیز ہے۔ امیر خسرو کو دوسرے نائکوں پر اس لئے بھی فوقیت حاصل ہے کہ یہ دونوں فنون سے واقف تھے جس کی بدولت ان کی ذات سے ہندوستانی موسیقی میں نہ صرف مستقل وسعت اور ترقی ہوئی، بلکہ دوسرے ممالک کی موسیقی پر اثر انداز ہونے کی قابلیت و صلاحیت بھی اس میں پیدا ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ بعد میں اس طرف کسی نے توجہ نہ کی اور نہ ان کی خدمات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا۔

اب رہا اہل فرنگ کی موسیقی کا ہندی رنگ پکڑنا، یہ بھی ان کے علماء و محققین کے تطبیقی مطالعہ ہی کا نتیجہ ہے۔ یہاں بھی دوبارہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ اہل فرنگ بھی تو آریائی نسل سے ہونے کی وجہ سے ہماری برادری میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے ہر دو اقوام کی قدیم ثقافتی روایات و فنون کی باقیات آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ اور وہیں سے تطبیقی مطالعہ و تحقیقات کی بنا پڑتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں ہمارے علوم سے استفادہ کرنے میں ذرا بھی عار نہیں ہوتا تو ہمیں کیوں ہونا چاہئے؟ علم و فن کا معاملہ کلیتاً نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس خصوص میں تعصب و تنگ نظری فضول ہے۔

ایسے ہی موسیقی میں پوربی راگ، چین اور چین ہندی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ چینی اور منگولیوں کی آمد سے ہندی موسیقی ضرور متاثر ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ اثر بہت زیادہ نہ ہوا ہو مگر ہوا ضرور ہے۔

اسی طرح سکندر اعظم کی آمد اور متعلقہ یونانی حکومت کا اثر بھی ہندوستانی موسیقی پر ضرور پڑا۔ سلیوکس یونانی کی لڑکی

چندر گپت کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہاں ہوی کی راگ رنگیوں میں بھی جوگ ہو کر پتر و بھار جائیں (جیسے ہو) پیدا ہوئے ہو رہے ہوں گے۔ کیونکہ میگاس تھنیز اس کے دربار میں عرصہ دراز تک سفیر رہا، جس کی وجہ سے پاٹلی پتر میں اکثر یونانیوں کی آمد و رفت اور بود و باش بھی رہا کرتی تھی۔ تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں یونانی اثرات علانیہ طور پر نمایاں ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ موسیقی اس اثر سے محفوظ رہی ہو، البتہ یہ امر کہ کس حد تک متاثر ہوئی تھی، اس کا پتہ چلانا ماہرانِ فن کے ذمہ ہے۔ فیثاغورث یونانی موسیقی کا موجد ہے۔ اس نے مثل تان سین کے یونانیوں کے لئے ایک موسیقی کا نظام مرتب کیا تھا۔ ہندی موسیقی میں ۲۲ سرتیاں شمار ہوتی تھیں لیکن یونانیوں کے ہاں ۲۴ اور تیس (ڈی ٹیسس Enharmonic - نمبر ۱۶) اور ڈووں: [illegible]) سرگم ہندوستانی سرگم سے بہت مشابہ تھے۔

امجد علی

فتراک[1] دیکھ کر

افکارِ نو میں تاباں، اندازِ محرمانہ
اسلوبِ "ج نقوی" ہے سازِ جاودانہ

بے ساختہ تاثر، بیتاب سی نگاہیں
جیسے سکوتِ گل سے پیدا ہو سرد آہیں

تصنیفِ تازہ یعنی "فتراک" سامنے ہے
گویا کسی کا قلبِ صد چاک سامنے ہے

حسنِ نظر سفینۂ فطرت کا کھے رہا ہے
دل، وارداتِ دل کی تصویر لے رہا ہے

بیتابیٔ مسلسل مصروفِ جستجو ہے
فکر و نظر کی دنیا سرگرمِ آرزو ہے

سوزِ حیات دل کا مطلوب بن گیا ہے
فطرت کا ذوقِ شعری اسلوب بن گیا ہے

ایجاز کاریاں ہیں، یا دل کی داستاں ہے
محسوس ہو رہا ہے جذبات کی زباں ہے

کیا نذر دوں میں آخر اے جذبۂ تلافی
تاریخ طبع کہہ دے "فتراکِ شعر بافی"
۱۳ ۵ ۶ ۴

بشیر النساء بیگم بشیر

[1] محترمہ جہاں بانو بیگم صبا نقوی کے مضامین کا مجموعہ۔

تعارف

(کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی کامیاب نظم)

میں اک ترقی پسند شاعر ہوں اور میرا امتیاز یہ ہے
کہ مجھ کو اوروں کی طرح آتا نہیں حقائق سے منہ چھپانا

مرا تخیل فلک سے اونچا، مری نظر عرش سے بھی آگے
مگر مرے واسطے ہے مشکل زمین والوں کو بھول جانا

لیا ہے فطرت سے درس میں نے، جو دل میں [?] ہوگا
مجھے کسی نے نہیں سکھایا خوشی میں بھی غم کے گیت گانا

وطن کا چہرہ اداس دیکھا ہے میں نے اور اب فغاں بھی
مری زباں پر نہ آسکے گا مسرتوں کا کوئی ترانا

میں واقعات چمن کا نباض ہوں گوارا نہیں ہے مجھ کو
خیال میں آشیاں بنانا، خیال کی بجلیاں گرانا

یہ خدمت فن، یہ شوق تحسیں نہیں ہے منزل نہیں ہے میری
تھکے ہوئے ساتھیوں سے کہہ دو مجھے تو ہے اور دور جانا

مرے بزرگوں کی مصلحت نے حیات کو لوریاں سنائیں
مگر مرے نغمہ ہائے مستی سے جاگ اٹھنے کو ہے زمانا

جن آرزوؤں کو یاد ماضی تھپک تھپک کر سلا چکی تھی
اب ان کو بیدار کر رہا ہے نئے حوادث کا تازیانا

مری محبت کی پرورش زندگی کی آغوش میں ہوئی ہے
میں جانتا ہوں [?] ہے مری محبت کا ہار جانا

ہنسی میں ہے درد میرے آنسوؤں میں یہ حقیقت سمجھ چکا ہوں
کہ جذبۂ سرخوشی کی توہین ہے غلاموں کا مسکرانا

جو دیکھتا ہوں وہ کہہ رہا ہوں مجھے غرورِ بیاں نہیں ہے
مرا سخن شرحِ زندگی ہے، سنی ہوئی داستاں نہیں ہے

شاہد صدیقی

اردو میں سائنسی ادب

رسالہ مساحت متعلق و علم مثلث

تقطیع ۹ × ۱۲، [illegible] صفحات، [illegible] سنہ طباعت [illegible]

ترجمہ پنڈت اجودھیا پرشاد۔ اس رسالے میں علم مساحت، علم مثلث، علم تراش مخروطات و نقشہ جیب مستوی کی مساوات کو بیان کیا گیا ہے۔ جب کتاب کا یہ ترجمہ ہے اس کا نام کہیں بھی درج نہیں۔ سرورق پر انگریزی اور اردو میں کتاب کا عنوان اور مترجم کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب مولوی محمد باقر صاحب کے دہلی اردو اخبار پریس میں [illegible] موتی لال [illegible] کے اہتمام سے مطبع ہوئی۔ "فہرست مطالب" [illegible] کے تحت دیباچہ اور حدود کے علاوہ [illegible] گئے ہیں۔ کتاب کے خاتمہ پر "تتمہ" کی سرخی کے تحت دو صفحات میں خط منصف [illegible] تمام کرنے یا دریافت کرنے اور کسی زمین کا نقشہ [illegible] غرض میں کمی یا زیادتی کر کے کاغذ پر بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہے اور ایک صفحہ پر ایک ہی زمین کے چھوٹے بڑے دو نقشے دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری (۱۵) صفحات میں جیب مستوی کی جدول شامل ہے۔

مترجم نے دیباچہ میں کتاب کی غرض و غایت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"مطلب اس کتاب سے یہ ہے کہ وہ اشخاص جنہوں نے کہ علم ریاضی تحصیل نہیں کیا ہے اس کے چند فوائد سے مطلع ہو جاویں ...... صرف چند فوائد علم ریاضی اور نقشہ ملحقہ کے بنانے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے باوجود یہ نقشہ جیب مستوی وغیرہ کا جو اس کتاب کے آخر میں لگایا گیا ہے، تاہم ہے جو بھی یہ نقشہ بہ طریق استعمال میں لانے نقشہ جیب مستوی وغیرہ بنانے کے لئے کافی ہے۔" رسالہ کے شروع میں "حدود" کی سرخی کے تحت کسور اعشاریہ اور ان علامات کو سمجھایا گیا ہے جو جبر و مقابلہ میں استعمال ہوتی ہیں مثلاً

— منہائی کی علامت ہے۔

+ ایزادی " "

. اعشاریہ " " وغیرہ وغیرہ

علم مساحت کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:

"علم مساحت کار آمدنی ایک ترکیب مرتسم کرنے اشکال علم ریاضی کے ہے رول یا پرکار یا کسی اور آلہ سے جو کہ اس مطلب کے واسطے ہو، تعیین کرنے ابعاد ثلاثہ کے لئے کام آتی ہیں۔" باب اول میں اشکال کی سطح سے بحث کی گئی ہے اور سطح مستوی، زاویہ، دائرہ، مثلث اور مستطیل وغیرہ کی تعریفیں

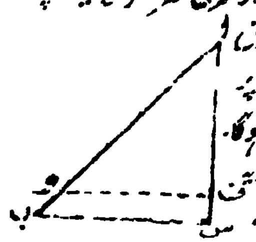
دہلی کالج کی خدمات (سلسلہ گزشتہ)

بیان کرنے ان کو اشکال کے ذریعہ سے سمجھایا گیا ہے۔ بعض عمل کے طریقے بتائے گئے ہیں مثلاً

"بتاتے ہیں کہ خط [illegible] مفروض [illegible] کو تنصیف کریں:
نقطہ الف اور ب کو مرکز گردان کر کسی فاصلہ پر جو کہ نصف اب سے بڑا ہو دو قوسیں کھینچو اس طرح سے کہ وہ [illegible] اور م پر تقاطع کریں۔ درمیان ان [illegible] کو ملا کر [illegible] نقطہ ت جہاں کہ وہ خط اب [illegible] کو ملتا ہے بیچ میں خط اب کے ہوگا۔"

دوسرے باب میں مثلثوں کے خواص بیان کئے [illegible] مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ "مسئلہ دوم" کی عبارت [illegible] کی جاتی ہے:

"بتاتے ہیں کہ ایک اونچے مینار کی بلندی زمین پر سے پیمائش کریں مثلاً مینار [illegible] اس کی ترکیب اس کی پیمائش کی یہ ہے کہ خط ب س کو پیمائش کرو اور جگہ ایک قطب دائرہ [illegible] مقابل [illegible] نقطہ ب سے دوسری [illegible] اس طرح سے کہ زاویہ ب پیمائش ہو سکے۔ اور چونکہ و س زمین پر عمود ہے تو زاویہ س قائمہ ہوگا۔ اس صورت میں بعد پیمائش زاویہ [illegible] ب کے ایک خط اور دو زاویے ب اور س متصل اس کے معلوم ہوئے ......"



تیسرے باب میں مستطیل، مثلث، منحرف، کثیر الاضلاع اور دائرے کی سطح معلوم کرنے کے قاعدے [illegible] مثالیں [illegible] سطح دریافت کرنے کے سلسلے میں [illegible] گیا ہے۔

چوتھا سوال [illegible] ۱۰۰ [illegible]

[illegible] شراب سے بھری ہوئی ہے [illegible] صرف ایک چھوٹا سا [illegible] تمام [illegible] پانی کھری ہے تو وہ [illegible]

اسی سبب سے جبکہ نلی کے پیچے کا رخ ہموار مقام پر ہے تو پانی کا سطح اس کے ہموار ہوگا اور اس وقت ہوا کا بلبلہ وسط نلی میں ہوگا۔"

چوتھے باب میں مجسم اشکال مثلاً متوازی۔ مشور۔ مخروط، اور کرہ وغیرہ کی تعریفیں اور ان کی جسامت معلوم کرنے کے طریقے مثالوں کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

باب پنجم میں علم مثلث سے بحث کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں خطوط منحنی اور ساتویں باب میں تراش مخروط کو وضاحت اور تفصیل سے سمجھایا گیا ہے۔

کتاب کے ختم پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے :-

"جس شخص کو کہ فرصت تحصیل کرنے علم ریاضی کی نہیں ہے اور نہ ان کی طبع اس کی تحصیل کی طرف راغب ان کے واسطے اس رسالہ میں خیالات مشہور درباب علم مساحت کا ر آمد نکے اور علم پیمایش اور علم ہمواری کے لکھے ہیں ۔ ۔ ۔ جو شخص کہ خاص تحصیل علم مساحت و پیمایش کی کیا چاہتے ہیں ان کو لازم ہے کہ بلی ڈ صاحب کی اور ریونی کیسل صاحب کی کتاب کو درباب ان علوم کے تحصیل کریں"

اس رسالہ میں ایسے کئی الفاظ ملتے ہیں جو اب ہماری زبان میں متروک ہو چکے ہیں۔ مثلاً

ناپنا (ناپو) نقصان کرنا (تفریق کرنا) کیا چاہو (چاہو) وغیرہ

بعض الفاظ کا املا اس طرح لکھا گیا ہے :-

سفر (صفر) پونچھ (پہونچ) بیان نے (جانئے) خوان، کثر (کسر) وغیرہ

یا محدود اور بے انتہا کو "بے محارود اور لا انتہا"۔ "دونوں اور تینوں" کو بغیر "ن" کے اور "بیان کی ہے" کی بجائے "بیان کیں ہیں" لکھا ہے۔ "ضرور" بمعنی ضروری اور "شبہ" بمعنی مشابہ استعمال ہوا ہے۔

ریاضی کی بعض انگریزی اصطلاحوں کو اردو میں جوں کا توں لکھا گیا ہے۔ مثلاً

سپرٹ لیول۔ پیریلل۔ اور ڈایی نیٹ۔ پاپر بولا۔

یہ کتاب بھی کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے جس کا نمبر (۱۰۱۵) ہے۔

رسالہ درباب پیمایش انگریزی بوسیلہ تھیوڈولائٹ کے

تقطیع ۸/۱ ۱/۲ ۵ صفحات حصہ اول (۴۸) حصہ دوم (۴۴) سنہ طباعت ۱۸۴۸ء۔

مولفہ ہرویوسنگ لائبریرین دہلی کالج مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی قیمت ایک روپیہ۔

اس رسالہ میں زمین کی پیمایش کرنے کے اصول اور طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ سرورق پر رسالہ۔ مولف اور مطبع وغیرہ کے نام اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج ہیں۔ ہرویوسنگ نے سید قادر علی پنیر اسکالر فرسٹ عربک کلاس کی مدد سے اردو میں تالیف کیا اور سید اشرف علی کے اہتمام سے مطبع العلوم دہلی میں چھپا۔ زیر نظر نسخہ اس رسالہ کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس سے قبل ایک ایڈیشن شائع ہو چکا تھا لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ کتنے عرصہ پہلے شایع ہوا تھا۔ رسالہ کے آغاز میں فہرست اور دیباچہ نہیں ہے۔ صفحہ (۱) سے اصل کتاب شروع ہو گئی ہے۔

ابتدا میں ان آلوں کا ذکر ہے جن سے زمین کی پیمایش میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً تھیوڈولائٹ۔ جریب۔ کراس اسٹاف۔ اوف سٹ شاف اور کمپاس یا قطب نما۔

تھیوڈولائٹ علم ریاضی کا ایک آلہ ہے جو دریا۔ جھیل جنگل۔ راستے۔ گاؤں اور شہر کی پیمایش میں کام آتا ہے۔ اس آلے کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس کے بعد پیمایش اور نقشہ بنانے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔ نقشہ بنانے والے کو حسب ذیل امور کا بطور خاص خیال رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۱) جس مقام کی پیمایش کرنی مقصود ہو اول اس کا نام لکھ لیا جائے۔

(۲) گرد و نواح کی جاگیر یا جاگیر داروں کے نام خسرہ میں لکھنا۔

(۳) بڑی بڑی سڑکیں جو اس زمین میں سے گزرتی ہیں

اور ان شہروں کے نام جہاں سے وہ آتی ہیں۔

(۴) پرانے رستوں کے نام

(۵) ایک ایسے آدمی کو اپنے ساتھ رکھنا جو وہاں کی سرحد سے واقف ہو۔

(۶) اکثر اوقات ایک جاگیردار کی زمین کا کچھ حصہ دوسرے کی جاگیر میں مل جاتا ہے اس کو بھی نقشہ میں درج کرنا ضروری ہے اور نقشہ بناتے وقت اس کا ایک الگ نقشہ بنانا

(۷) جریب کا روز آنہ امتحان کرنا۔

دو صفحات میں انگریزی پیمائش کے شجرہ کا خاکہ دیا گیا ہے۔ پھر شجرہ کی مدد سے نقشہ تیار کرنے کی ترکیب سمجھائی گئی ہے جس زمین کا نقشہ بنایا جاتا ہے اس کی عمارتوں اور دوسرے قطعات کو نقشے میں واضح کرنے کے لئے خاص خاص علامتیں اور نشانات متعین کر دیئے گئے ہیں۔ آبادی۔ تالاب۔ سرحد۔ کنوؤں۔ سڑک۔ دریا۔ مسجد۔ شوالہ۔ باغ اور ریل وغیرہ کو مختلف علامتوں سے دکھلایا گیا ہے۔ دریا کا پاٹ معلوم کرنے کا طریقہ مع مثال سمجھایا گیا ہے۔ راستوں۔ دریاؤں اور نہروں کی پیمائش اور مختلف شکلوں کے کھیتوں کی پیمائش دریافت کرنے کے طریقے مثالوں کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں۔ منحرف اور کثیر الاضلاع اشکال کا رقبہ دریافت کرنے کے لیے حسب ذیل طریقہ بتلایا گیا ہے:

"ہر شکل تین ضلع سے زیادہ کی منقسم ہو سکتی ہے مثلثوں میں چاہیے مثلثوں میں تقسیم کر کے بموجب اس قاعدہ کے جو مساحت مثلث میں بیان کیا گیا ہے مثلثوں کی پیمائش کریں اور سب مثلثوں کے مساحت کو جمع کرنے سے اس شکل کی مساحت حاصل ہو جائے گی اگر کوئی شکل مساوی الاضلاع ہو وے مثلث نہ ہووے یا مربع یا مخمس یا مسدس بارہ ضلع تک تو اس کے ایک ضلع کے مربع کو ان اعداد میں جو اس فہرست اس کے مقابل لکھی ہوئی ہیں ضرب کرو۔ حاصل ضرب رقبہ اس شکل کا ہوگا۔"

تعداد اضلاع اشکال کی	نام شکلوں کے	تعداد اعداد مضروب فیہ کی
۳	مثلث	۰.۴۳۳۰۱۳
۴	مربع	۱.۰۰۰۰۰
۵	پانچ ضلعی شکل	۱.۷۲۰۴۷۷
۶	چھ -	۲.۵۹۸۰۷۶

اسی طرح بارہ ضلع کی شکل تک نمبر دیئے گئے ہیں۔ دائرے کا رقبہ معلوم کرنے کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں مثلاً دائرہ کا فقط نصف قطر معلوم ہو تو قطر کے مربع کو ... میں ضرب کرنے سے رقبہ حاصل ہوگا مستطیل معین اور منحرف کے رقبہ کے مساوی مربع بنانے اور منحرف و مخمس کے رقبہ کے برابر مثلث تیار کرنے کے قاعدے بیان کر کے متفرق سوالات حل کر کے سمجھائے گئے ہیں۔

"عمل علم مثلث کا" کی سرخی کے تحت حسب ذیل اصطلاحات کی فہرست درج ہے۔

جس	واسطے جیب مستوی کے
جم	واسطے جیب التمام کے
مس	واسطے مماس کے
مم	واسطے مماس التمام کے
نق	واسطے نصف قطر کے
لوگ	واسطے لوگارثم کے

حصہ اول کے ختم پر ۹ صفحات میں مختلف آلات کے نقشے لیتھو میں چھاپے گئے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:- پیری للی رولر۔ پروٹریکٹر۔ سکیل یعنی مقیاس تھیوڈولائٹ وغیرہ۔

حصۂ دوم میں حصہ اول کے صفحہ (۴۶) پر جو نقشہ دیا گیا ہے اس کے بنانے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے اور کئی ضمنی نقشے وضاحت کے لئے دیئے گئے ہیں۔ چھوٹے نقشوں سے بڑے نقشے تیار کرنے کی

زیریں بلندی قائم... پھر پہاڑ اور مینار کی بلندی دریافت کرنے کا بیان لکھا ہے۔ اور وضاحت کے لیے مثالیں اور نقشے دیے گئے ہیں۔ آخر میں حرارت کی زمین کی پیمائش اور اس کا نقشہ بنانے میں جن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب کی زبان قدیم اردو کا نمونہ ہے جو اس زمانے میں دہلی میں بولی یا لکھی جاتی تھی اس کا اسلوب بیان ویسا ہی ہے جیسا کہ علمی مضامین کا ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت اور ترکیب کے چند نمونے یہ ہیں:-

"وقت کھو لینے جریب کے"

"چاہتے ہیں ہم کہ مستطیل کے برابر ایک مربع بنائیں"

"کہاں کو جاوے گا — جہاز کو جاتی ہے"

بعض ہندی الفاظ کی فارسی ترکیب پر صفت بنائی گئی ہے جیسے محبت دار وغیرہ۔

پانی کو پاتی اور جس سے کو جستی لکھا ہے۔

مکسک تیسرا اسم ہونی چاہیے لیکن جمع الجمع الاکوں بنائی گئی ہے۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا ایک نسخہ نمبر (۵۱۱۶۹) پر موجود ہے۔

اصول قواعد مایعات

تقطیع ۸، صفحات (۲۴۵) سنہ طباعت ۱۸۵۵ء لیتھو میں چھپی ہے۔

یہ ٹامس ویبسٹر ایم اے کی کتاب دی پرنسپلز آف ہیڈرو سٹاٹکس کا ترجمہ ہے جسے پنڈت اجودھیا پرشاد مدرس سائنس مدرسہ دہلی نے کیا اور محمد حسین پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے ۱۸۴۶ء میں دہلی اردو اخبار پریس سے شائع ہوا۔ کتاب کے اندرونی اور بیرونی سرورق پر انگریزی و اردو میں کتاب، مصنف، مترجم اور مطبع وغیرہ کے نام اور سنہ طباعت درج ہیں۔ اجودھیا پرشاد کے نام کے نیچے "مدرسہ دہلی" لکھا ہے لیکن اس کی کہیں بھی وضاحت نہیں کہ آیا یہ کتاب دہلی کالج کی مطبوعات کے سلسلہ کی ہے یا انفرادی طور پر شائع کرائی گئی تھی۔ البتہ کتاب کی سائز چھاپ اور طرز تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہوگی۔

مترجم نے دیباچہ کے بغیر اصل کتاب شروع کردی ہے۔ یہ کتاب (۱) ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے تحت ذیلی سرخیاں قائم کر کے متعلقہ مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ پہلے باب میں "خواص اجسام سیال" کو (۱۹) ذیلی سرخیوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلی سرخی میں موضوع سے متعلق لکھا ہے کہ:-

"اس رسالہ میں آئین حرکت مایعات اور گیز بیان ہوں گے یعنی جن شرائط کے موافق مایعات اور جمیع اقسام ہوا ساکن یا متحرک ہوتی ہیں ان کو اس میں درج کریں گے اور طریق استعمال ان شرائط کا دریافت کرنے اور تیرنے اجسام اور مختلف آلات اور کلوں میں کہ موقوف مایعات کی حرکت اور معدلت پر ہیں مذکور ہوگا"

اس باب میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:-

"سیال کی تعریف۔ مایع اور مجسم کا فرق۔ مایع اور گیس کا فرق۔ حرارت کا اثر مجسم، مایع اور گیس پر۔ انجماد اشتداد اجسام سیال۔ مقدار کشش۔ لچک" وغیرہ وغیرہ

مایع اور گیس کی تعریف مترجم کے الفاظ میں یہ ہے:-

"اجسام سیال مایع اور گیز پر منقسم ہیں۔ فرق عظیم دونوں میں یہ ہے کہ مایع میں کشش اتصال تھوڑی سی پائی جاتی ہے........ لیکن اجزاء گیز میں بجائے کشش اتصال کے زور مدافعت پایا جاتا ہے اور اس باعث سے گیز جسامت میں زیادہ ہوتا ہے........ اس صورت میں تعریف مایع کی یہ ہوسکتی ہے کہ اس میں خود بخود پھیلنے کا نہیں مگر گیز میں یہ بات پائی جاتی ہے........"

جسم سیال میں داب اور لچک کی قابلیت کے بارے میں کینٹن صاحب اور پرکن صاحب کے تجربوں کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں "معدلت سیال" کی سرخی کے تحت

ان کے خواص حرکت کی تشریح کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں [illegible] سیال پر کشش ثقل کے اثر کو بتلایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) ٹھیرے ہوئے پانی کی سطح کے ہر نقطہ پر دباؤ مساوی ہوگا۔

(۲) ٹھیرے ہوئے سیال کی سطح ہمیشہ ہموار ہوگی۔

(۳) شہروں میں آبرسانی کے لئے چشمہ [illegible] جو سب سے بلند ہو۔ ان تمام بیانات کو مثالوں اور [illegible] سے واضح کیا گیا ہے۔

باب چہارم [illegible] مساوات سیال [illegible] مرکز [illegible] میں تیرنے والے اجسام کی معدلت کا بیان ہے۔ باب [illegible] میں مائعات کے مخصوص اوزان بتائے گئے ہیں اور ہائڈرومیٹر کے آلے سے وزن دریافت کرنے کا طریقہ اور اس آلے کی بناوٹ کی ترکیب سمجھائی گئی ہے۔ سایک صاحب اور نکلسن صاحب کے ہائڈرومیٹر کی ساخت اور ان کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔

باب ہشتم میں [illegible]

[illegible] ایئر پمپ [illegible] ساخت [illegible] صاحب کا ایئر پمپ [illegible] اور ہوائی بندوق وغیرہ کی ساخت اور ان کے اعمال کی تشریح شکلوں اور نقشوں سے کی گئی ہے۔

باب نہم میں ہوائے محیط زمین پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور بتلایا ہے کہ تمام سطح [illegible] اس ضمن میں توریسلی اور پاسکل صاحب کے تجربات پیش کئے گئے ہیں۔ بیرومیٹر بنانے کی ترکیب اور اس کے اعمال کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پیمانہ دار بیرومیٹر کے سلسلے میں لکھا ہے کہ حال موسم کا دریافت کرتے ہوئے اکثر کام آتا ہے [illegible] تبدیلی موسم کے پارہ کی بلندی میں کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے۔

دسویں باب میں کلوں کے ذریعہ سے پانی کو اوپر چڑھانے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ [illegible] کا پمپ [illegible] اٹھانے کا پمپ، فورس پمپ [illegible] پمپ کے اشکال دے کر [illegible] بلندی پر چڑھانے اور گہری کانوں سے پانی کو [illegible] سمجھائے گئے ہیں۔ اسی سلسلے [illegible] اور تجربات [illegible] پمپ کو بھی سمجھایا گیا ہے۔ [illegible] قاطعی [illegible] لکھا ہے اور غلط [illegible] بھی [illegible] گئی ہے۔ [illegible] باب [illegible] سیال [illegible] مقدار [illegible] دریافت کرنے [illegible] صاحب کا [illegible] بیان ہے جو کسی [illegible] کی ترتیب بھی بتادی گئی ہے۔ [illegible] آتا ہے [illegible] ہوتے [illegible] کی مضبوطی [illegible] طاقت دریافت کرنے [illegible] عورتوں کو اٹھانے کے لئے جو زمین [illegible] ہوتی ہیں۔

تیرہویں باب میں حرارت کے اثر اور گرمی کی مقدار معلوم کرنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں پارے کے [illegible] اور [illegible] کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

چودھویں باب میں [illegible] تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پندرھویں باب میں بخارات کا بیان ہے۔ اس ضمن میں برف جمانے کی ترکیب بتائی گئی ہے یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس قدر پانی خاص درجہ حرارت میں بخارات بنتا ہے۔ سولھویں باب میں ہوا کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اس ضمن میں طوفان ہوائے تجارتی اور موسموں کی تبدیلی کا حال درج ہے۔

آخری باب میں سالموں کی کشش پر بحث کی گئی ہے۔ کشش اتصال اجزائے مائع اور کشش انصال مابین اجزائے مائع اور نلی وغیرہ کو سمجھایا گیا ہے۔ لاپلاس اور دوسرے سائنس دانوں کے تجربوں کے اختلافات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے ختم پر نقشہ وزن مخصوص، نقشہ زور لچک دخان اور نقشہ زور لچک بخارات دیے گئے ہیں۔

عبارت کے نمونے کے لئے بارہویں باب کے آغاز کے جملے یہاں درج کئے جاتے ہیں :-

" مائعات مثل مجسمات کے مطیع قوانین کشش کے ہیں اور حرکت مائعات کی بروقت گرنے کے زمین پر بعینہٖ موافق حرکت مجسمات کے متزاید ہوتی ہے اور صدمہ اس کا مساوی ہوتا ہے حاصل ضرب وزن اور اس کی رفتار کے .... "

مترجم نے سائنس کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ جوں کا توں ان کو اردو میں منتقل کر لیا۔ پوری کتاب میں صرف دو ترجمے ملتے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

ہیڈروسٹاٹکس ۔ مائعات

سپرٹ ۔ الکوہل

بقیہ اصطلاحیں مثلاً فیدم ۔ کاربونک ایسڈ ۔ سون سون ۔ ہاڈر الک یم ۔ اکسیجن گیز ۔ نائٹروجن گیز وغیرہ انگریزی تلفظ کے مطابق اردو میں لکھ دی گئی ہیں ۔

" غوطہ خور " بمعنی غوطہ زن اور تکرار بمعنی اختلاف استعمال ہوا ہے ۔

طویل جملے ۔ فارسی ترکیبیں اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں ۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر (۲۲/۱۰۹) پر یہ کتاب مل سکتی ہے ۔

جبر و مقابلہ

تقطیع ۱۱/۱/۲ ، صفحات (۴۹۰) سنہ طباعت ۱۸۵۲ء مؤلفہ مولوی کریم بخش مدرس سوم فارسی مدرسہ دہلی ۔

یہ کتاب بھی دہلی کالج کی مطبوعات کی ایک کڑی ہے جو مطبع العلوم سے شایع ہوئی ۔ ابتدا میں " فہرست مطالب " کی سرخی کے تحت جبر و مقابلہ کے جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان کی ایک طویل فہرست دو صفحات میں دی گئی ہے ۔ مولف نے اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں حمد و نعت کے بعد یہ لکھا ہے کہ

" اس سے پہلے ایک جبر و مقابلہ مولفہ استادی مخدومی مکرمی جناب ماسٹر رامچندر صاحب کا چھپا تھا چونکہ اس میں مطالب بہت مفید اور دلچسپ تھے اس سبب سے لوگوں کو اس کے پڑھنے سے اس فن کی طرف بہت رغبت ہوئی اور جس قدر نسخے جبر و مقابلہ کے چھپے تھے سب بک گئے اکثر آدمی اس کے مشتاق تھے اس واسطے جناب ماسٹر صاحب نے مجھ کمترین کو کہ نام میرا کریم بخش ہے اور میں ادنیٰ ترین ان کے شاگردوں میں سے ہوں ارشاد فرمایا کہ ایک جبر و مقابلہ مرتب کرنا چاہیئے ۔ ...... اس واسطے اس کمترین نے یہ جبر و مقابلہ مرتب کیا اور جو مطالب مفیدہ تھے جناب ماسٹر صاحب کی صلاح سے اس میں داخل کئے ...... اور اس جبر و مقابلہ میں مطالب ان کتابوں سے جمع کئے ہیں ، وڈ صاحب کا جبر و مقابلہ بلینڈ صاحب کا جبر و مقابلہ بیج الجبرا بولز الجبرا اور اور کتابیں اس فن کی جو انگریزی زبان میں مشہور ہیں "

کتاب کو (۵) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں ۔

" باب اول بیان حدود کا " اس میں چار فصلیں ہیں جن میں جمع ۔ تفریق ۔ ضرب ۔ تقسیم کے قاعدے مثالوں کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں ۔ دوسرے باب میں کسور کا بیان ہے جو آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے ۔ تحویل کسور کی جمع ۔ تفریق ۔ ضرب ۔ تقسیم جذر اور کعب نکالنے کے قاعدے مثالوں کے ساتھ درج کئے گئے ہیں ۔ تیسرا باب مساوات کے لئے وقف ہے ۔ اس میں (۶) فصلیں اور کئی ذیلی سرخیاں ہیں ۔ چوتھے باب میں مختلف ریاضی کے مسائل کو سمجھایا گیا ہے ۔ مثلاً نیوٹن کا نظریہ لوگارتم وغیرہ ۔ پانچویں باب میں سوالات غیر منفصل کا بیان ہے ۔ صفحات (۴۶۱ تا ۴۹۰) میں سوالات کی ایک طویل فہرست درج ہے جو وڈ صاحب کے جبر و مقابلہ سے نقل کی گئی ہے ۔

یہ کتاب غالباً نصابی ضروریات کے تحت لکھی گئی تھی تاکہ طلبہ اردو میں جبر و مقابلہ کی تحصیل کریں ۔ اس میں بعض اعلیٰ ریاضی دانوں کے مختلف نظریوں کو بھی بیان کیا گیا ہے اور ہندسی اشکال دیکر جبر و مقابلہ سے حل کرنے کے طریقے سمجھائے

گئے ہیں جو اصطلاحیں اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں وہ آج بھی استعمال ہوتی ہیں۔ جملوں کی ترکیب اور ساخت کا اندازہ مندرجۂ ذیل جملوں سے ہو سکتا ہے:-

"قاعدہ جمع کرنے کسور کا"

"چاہئے ہم کو ثابت کرنا اس امر کا"

"پیمیہ شراب کا واسطے ۴۸ روپے کے"

صفحہ (۱۵۹) سے اول درجہ کی مساوات کا ایک سوال ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

"ایک شخص قاصد کہ ۶۰ میل ایک روز میں چلتا ہے ایک جانب روانہ کیا گیا تھا لیکن بعد پانچ روز کے ایک اور قاصد واسطے اس کے بلانے کے بھیجا گیا اور قاصد دوم ۷۵ کوس روز چلتا ہے تو بتاؤ کتنے روز میں قاصد اول کو پکڑے گا"

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر ۱۲ ج پر یہ کتاب موجود ہے۔

ہندسہ بالجبر | تقطیع ... صفحات (۳۴۴) یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی (Algebraical Geometry) کا اردو ترجمہ ہے جس کو ماسٹر رامچندر اور رادھا کشن سکالر اعلیٰ دہلی کالج نے کیا تھا۔ کتاب میں کہیں بھی سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ البتہ سرورق پر حسب ذیل قلمی عبارت درج ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ ۱۸۵۲ء سے قبل طبع ہو چکا تھا:-

"ہندسہ بالجبر تمام صفحہ ۳۴۴ اصل کے اور ایک ورق اول میں فہرست کا اور ۱۰ صفحہ آخر میں غلط نامہ کے تاریخ ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۵۲ء

دلشید نہال"

سرورق پر انگریزی اور اردو میں کتاب مصنف مترجمین اور مطبع وغیرہ کے نام درج ہیں۔ یہ کتاب مولوی محمد حسین آزاد کے اہتمام سے مطبع دہلی اردو اخبار سے شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر جو انگریزی اردو عبارت ہے اس کے دو ترجمے قابل غور ہیں مثلاً

"علوم انگریزی (European Sciences)

دہلی مدرسہ (Delhie College)"

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں (۱۴) اور دوسرے حصے میں (۹) ابواب ہیں۔ باب اول میں "آغاز" کی سرخی کے تحت جو عبارت درج ہے اس کا اقتباس یہ ہے:-

"اس رسالہ کی تالیف سے یہ غرض ہے کہ حل کریں ہم اشکال اور شکلوں ہندسی کو جبر و مقابلہ کے ذریعہ سے واضح ہو کہ جس وقت میں جبر و مقابلہ نے ملک یورپ میں رواج پایا اس کے تھوڑی مدت بعد اکثر سوالات ہندسی بذریعہ جبر و مقابلہ کے حل کئے گئے اس طرح سے کہ بجائے خطوط کے حروف فرض کر کے عمل جبر و مقابلہ کے جاری کئے گئے لیکن اس طریقہ کے حل کرنے سے کچھ فائدہ عظیم وقوع میں نہیں آیا اس واسطے کہ موافق اس طریق کے ہر سوال میں نئی نئی ترکیبیں واسطے حل کرنے ہر سوال کے نکالنے پڑتے ہیں اور اسی واسطے کوئی قاعدہ کلیہ اس طریق سے نہ نکلا۔ سوائے اس طریقہ عام کا سی کے ذریعہ سے جبر و مقابلہ کی مدد سے سب قسم کے سوالات ہندسی حل ہو سکتے ہیں۔ مہندس ڈیکارٹ نے نکالا اس نے دو مقداریں مجہول لا اور ع فرض کیں اور بعد نکالنے ایک ایسی مساوات کے جس میں سے وہ مقداریں مجہول پائی جاتی تھیں ان سے یہ بات ثابت کر دی کہ یہ مساوات متعلق ہے ایک سلسلہ نقاط سے جن کے یہ خطوط وتر ہیں یعنی یہ مساوات تعلق رکھتے ہیں ایک خط منحنی سے جو مرکب ہے ان سب نقاط سے اور اس خط منحنی کو لوکس مساوات مذکور کی کہتے ہیں۔"

اس کتاب میں ہندسی مسائل کو جبر و مقابلہ سے حل کرنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ جگہ جگہ ہندسی اشکال کھینچ کر جبر و مقابلہ کی مدد سے ان کو حل کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:-

نقطہ اور خط مستقیم۔ دائرہ۔ تحویل مساوات درجہ دوم

مساوات عضوی. بعید العضوی. تراش ہائے مخروطی ۔ خطوط منحنی وغیرہ۔

حصہ دوم کے بعض مسائل یہ ہیں:۔

[illegible] اور [illegible] مجہات جو گروش منحنی سے پیدا ہوتے ہیں. سطوح منحنی استوانہ مخروط وغیرہ ۔ اس کتاب میں ریاضی کے ایسے مسائل بھی لئے گئے ہیں جو اعلی جماعتوں کے نصاب میں داخل ہوتے ہیں. مر [illegible] کو نہایت تفصیل اور تشریح کے ساتھ سمجھایا گیا ہے [illegible] ریاضی دانوں کے نام اور حوالے بھی دیے گئے ہیں [illegible] علم ریاضی میں کوئی نیا طریقہ یا آلہ ایجاد [illegible] تراش ہائے مخروطی [illegible] نقل کی جاتی ہے:

[illegible] اور بیان ان کا اکثر ریاضی دانوں نے افلاطون کے وقت سے کیا ہے اور یہ خطوط منحنی افلاطون کے مدرسہ میں دریافت کئے گئے تھے اور جب کہ اس کے شاگردوں کو اکثر خواص ان خطوط منحنی کے معلوم ہوئے تو بعضوں نے خوبی ان کا امتحان کر کے [illegible] کتابیں [illegible] پایہ میں چھوڑیں ان کتابوں میں سے وہ کتاب جو اپولونیس پاسشندہ [illegible] کی تصنیف ہے [illegible] اس کے آٹھ باب ہیں چار آسان اور چار مشکل ......

ریاضی کی جو اردو اصطلاحیں مستعمل ہوئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

اوتار. المتمام الکل. قریب العضوی. بعید العضوی. نقطہ انثنی. قطبی مساوات. خط متعنو الملاقات وغیرہ۔

بعض انگریزی اصطلاحوں کے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

ذاتی رابطہ [illegible] خط منحنی"

اس کتاب کی زبان اور [illegible] جیسے عام طور پر علمی [illegible] زبان کی [illegible] یہ انگریزی کتاب کا ترجمہ [illegible]

پایا جاتا. عربی الفاظ اور فارسی ترکیبیں عبارت میں جگہ جگہ ملتی ہیں. جملوں کی ساخت کے چند نمونے یہ ہیں۔

"قبل از تمام کرنے اس باب کے"

"بیشتر [illegible] سلسلہ شروع اس علم کے ہے"

کتاب کے آخر میں (۱۰) صفحات کا غلط نامہ شرکت ہے۔

(کتاب خانہ جامعہ عثمانیہ نمبر کتاب ۱۶ م)

رسالہ علم طب یہ رسالہ سید اشرف علی کے اہتمام سے ۱۸۴۳ء میں مطبع [illegible]

دہلی میں چھپا [illegible] اردو اور انگریزی دونوں [illegible] میں [illegible] درج ہے۔ اردو عبارت یہ ہے

"رسالہ علم طب [illegible]

از [illegible] ترجمہ کیا گیا حصہ اول

(۱۷۴ صفحہ)"

اصل کتاب کے مصنف اور مترجم کا نام کہیں بھی درج نہیں اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ کونسی انگریزی کتاب سے کس نے ترجمہ کیا تھا۔ درام کشن ہوا ابتدا میں "کلیات [illegible]" کی سرخی کے تحت یہ بیان کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر شے تغیر [illegible] ہے اور موت سے پہلے ہر ذی حیات کو مختلف آفات اور [illegible] کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امور خارجیہ مثلاً غذا اور حرارت [illegible] افراط تفریط سے انسان کے مزاج میں خلل واقع ہوتا ہے اور جب کوئی چیز حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو وہی مرض کا باعث بنتی ہے۔ بعض انسان پیدائشی کمزور ہوتے ہیں اور یہ کمزوری ان اعضا کی حرکات اور ان کے افعال [illegible] میں ایسا خلل ڈال دیتی ہے کہ وہ مرض کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ علم الامراض (Pathology) اور علم افعال (Physiology) میں مرض کی وجہ دریافت کی جاتی ہے۔

امراض کی دو اقسام بتائی گئی ہیں ایک افعالی جس کو عضوی بھی کہتے ہیں اور دوسری ترکیبی. اس کے بعد اسباب امراض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علم الامراض کے تحت علم الامراض [illegible]

کی تعریف۔ علامات مرض، اسباب مرض اور معالجہ مرض کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مرض کا لاحق ہونا بیشتر طبیعت پر موقوف ہے۔

"علم علامات الامراض" کی سرخی کے تحت مرض معلوم کرنے کے طریقوں کو وضاحت سے سمجھایا گیا ہے اور تشخیص مرض کو سب سے اہم قرار دیا ہے چونکہ تشخیص مرض میں چہرہ، نبض، قلب، سینہ اور پیٹ سے بڑی مدد ملتی ہے اس لئے ان سب کے متعلق ضروری معلومات درج کر دی گئی ہیں۔

"معالجات عامہ" کی سرخی کے تحت یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اکثر امراض قدرت ایزدی سے خود بخود رفع ہو جاتے ہیں کیونکہ جسم کے اندر مدافعت مرض کی ایک قوت موجود ہے جو "قوۃ طبیعہ" کہلاتی ہے۔ لیکن ہر مرض میں قدرت ایزدی پر اعتماد کر کے علاج سے غافل رہنا بعض دفعہ مضر اثرات پیدا کرتا ہے اس لئے علاج کی طرف توجہ کرنی ضروری ہے۔ علاج کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرض کو دفع کر دیا جائے یا کم از کم اس کے زور کو گھٹا دیا جائے۔

اس کے بعد "جریان خون اور اخراج خون" پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ "کلیات استسقاء" کی تمام ضروری باتوں کو بیان کر کے "معالجہ استسقاء" کو سمجھایا گیا ہے۔ اس کے بعد علن۔ اقسام علن اور اس کی تشخیص کے متعلق ضروری امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں خواب آور دواؤں کا ذکر درج ہے۔

علم طب مغربی پر غالباً اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں علم الامراض اور علم افعال سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اس لئے عبارت میں روانی اور بے ساختہ پن نہیں ہے۔ اس کی زبان ویسی ہی ہے جو عام طور پر کیمیائی مضامین کی ہوتی ہے۔ آج جب کہ اردو زبان کافی ترقی کر چکی ہے اس میں طب مغربی کی کتابوں کی کمی ہے چنانچہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں انگریزی کتابوں ہی کی مدد سے تعلیم دی جاتی ہے اس لئے تقریباً سو برس پہلے طب مغربی کو اردو میں منتقل کرنے کی یہ کوشش ایک مبارک اقدام کہلائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اکثر انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کئے گئے تھے جن میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

حاد مزمن (Acute)
مزمن (Chronic)
امراض ریحیہ (Rheumatism)
علم المداوی (Therapeia)
عضو (Organ)
امراض العام (Epidemic)
مرض متعدی (Contagious)
تشخیص مرض (Diagnosis)

جن انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ نہ ہو سکا ان کو اردو میں تلفظ کے تغیر کے ساتھ منتقل کر لیا گیا تھا مثلاً

اسٹمک پمپ (Stomach Pump)
ہیسٹریا (Hysteria)

جملوں کی ساخت اور ترکیب میں قدامت پائی جاتی ہے مثال کے طور پر چند پیش کئے جاتے ہیں۔
"ظہور علامات کا" "ہمیشہ رہنا ان کا" "باعث نہ پایا جانے بعضے امور" وغیرہ۔

عبارت کا نمونہ:-

"استصاص جو ایک صورت جذب مذکور کی ہے تمام غشاؤں جسم سے کہ وہ کیسے ہی مختلف درجوں میں ہوتے تعلق رکھتا ہے یعنی بعض غشا بہ نسبت بعض کے زیادہ طاقت چوسنے کی رکھتے ہیں۔ تیزی استصاص کی اور بھی سمت اس کی بلحاظ لچک دار پوشش ایک رگ کے جو رطوبت سے گھری ہوئی ہو اور جس میں رطوبت ایک درجہ خاص غلظت پر موجود ہو بموجب مختلف مراتب تحدید رگ مذکور کے مختلف ہوگی۔ . . ."

اس رسالہ کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔

(۱۲۹)

طب ڈاکٹری

رسالۂ اعمال جراحی

تقطیع [illegible] صفحات (۱۱۹)
سنہ طباعت ۱۸۴۲ء

یہ رسالہ [illegible] رسالہ طب کی سائز پر سید اشرف علی کے اہتمام سے طبع [illegible] ڈاکٹر جیمس ہنری بٹلر [illegible] کتاب [illegible] ترجمہ کیا [illegible] انگریزی [illegible] دونوں [illegible] مصنف اور مترجم [illegible]

رسالہ [illegible] بیان اعمال جراحی [illegible]

یہ اعمال فن جراحی [illegible] ڈاکٹر جیمس ہنری بٹلر صاحب نے زبان اردو میں ترجمہ [illegible]

یہ رسالہ فن جراحی پر اردو میں دوسرا رسالہ ہے کیونکہ اس سے پہلے ۱۸۳۶ء میں ڈاکٹر جیمس مونٹ کے انگریزی رسالے کا ترجمہ "معین الجراحین" کے نام سے باتصویر شائع ہوا ہے۔ اس رسالے [illegible] اور دوسرے صفحہ پر اس کا ترجمہ ہے۔ [illegible] پر اردو زبان میں یہ قدیم رسالہ ہے جو [illegible] کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ رسالے کے آغاز میں فہرست نہیں ہے اور مترجم نے دیباچہ کے بغیر اصل کتاب شروع کر دی ہے۔ ابتدا میں اعمال فن جراحی سے متعلق (۱۰) قاعدوں کا ذکر ہے جس کا آپریشن سے پہلے خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد کھوپڑی اور رسولی کے آپریشن کے متعلق ضروری ہدایات قلمبند کر دی گئی ہیں۔ آلات جراحی کی بھی تفصیل دی گئی ہے اس کے بعد جسم کے مختلف اعضا مثلاً آنکھ، جبڑہ، سینہ وغیرہ کے آپریشن کرنے کے طریقے مندرج ہیں۔

مترجم نے اردو رسم الخط میں انگریزی اصطلاحات کثرت سے استعمال کی ہیں اور کتاب کے نیچے حاشیہ پر ان اصطلاحات کو انگریزی میں لکھا گیا ہے۔ بعض جگہ انگریزی اصطلاح کے ساتھ اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ جملوں کی ساخت اور ترکیب میں قدامت پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں متروک الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ عبارت کے نمونے ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

"مثلاً وسط پیشانی میں [illegible] سبب [illegible] شاخ [illegible] نیچے دو جوں [illegible] خار کے سے طریقین لگانے کو اچھی جگہ نہیں۔ اور اگر لگتا ہے تو [illegible] میتر کو دندانوں سے نقصان ہوتا ہے لیکن اگر کسی جگہ دست کاری کرنی ہو تو جراح کو لازم ہے جب گول ہڈی جدی ہونے کے قریب ہو تو ایلیویٹر سے کام نکالے۔

Infontes Duramatre Elevator

صفحہ (۲۹) کی ایک عبارت کا اقتباس یہ ہے:-

"عمل پہلا جب کہ بیماری الوبولاری پروسس یعنی خانہ دندان میں ہووے اور زیادہ سرایت نہ کی ہو تو اول [illegible] رسولی کو قطع کرے اور جہاں سے رسولی کٹی ہے اس کے وسط میں ایک زخم سیدھا چھری کرے اور زخم پر ایک گدی خشک کپڑے کی باندھے اور اگر خون بہت جاری ہو تو گدی کپڑے کو تنچر فری میور میٹر میں کہ یہ عرق لوہے کا ہوتا ہے تر کرکے زخم پر باندھے۔"

(۱۳۰) کتب خانہ آصفیہ)

طب ڈاکٹری

خواجہ حمید الدین

اعلان:- خریدار اصحاب سے نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم چندہ سالانہ جلد روانہ فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔ سب رس تقسیم کرانے والے مطبوعہ [illegible] سے چندہ وصول کیا جا سکتا ہے۔

روس اور مذہب

روس میں عیسائی مذہب کی اشاعت کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے جس میں ایک غور طلب صداقت کا پہلو پوشیدہ ہے۔ ایک قدیم تاریخی تذکرے کے مطابق شہزادہ ولادیمیر نے جو دسویں صدی کے آخر میں کیوف کا حکمران تھا، عمائدین سے مشورہ اور سوچ بچار کے بعد دس عقلمند افراد کو پڑوسی ممالک میں روانہ کیا تاکہ وہ پتہ لگائیں کہ کونسا مذہب پڑوس کے متداول مذاہب میں سب سے بہتر ہے۔ اس زمانے میں نواحات روس کے مروجہ مذاہب میں یونانیوں کی "راسخ الاعتقادی" (Orthodox) جرمنی اور جزیرہ نمائے اسکنڈے نیویا کی لاطینی عیسائیت "عرب کا اسلام اور دریائے والگا و ڈان کے ساتھ ساتھ اسٹیپ میں پھیلے ہوئے خزاروں کی یہودیت" شامل تھے۔ ان تمام مذاہب کے مطالعے کے بعد وفد نے واپس آکر بیک زبان یونانیوں کی "راسخ الاعتقادی" کی حمایت کی۔ انھوں نے کہا کہ "مقدس عشائے ربانی" قسطنطنیہ کے سنٹ صوفیا میں اس حسن و اہتمام کے ساتھ منایا گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے انہیں اس کا بھی ہوش نہ رہا کہ آیا وہ زمین پر ہیں یا ملاء اعلیٰ کی رفعتوں میں پہنچا دیے گئے ہیں۔

اس قصے میں صداقت کا یہ پہلو مضمر ہے کہ اس سے حسن کے متعلق روسیوں کے عمیق احساس کا پتہ چلتا ہے جب کہ اس کی سطوت اور اعجاز انگیزی میں مذہب سے متعلق ہونے کے بعد اضافہ ہو گیا ہو۔ روسی دیہاتیوں کے مذہبی جوش و اعتقاد کی بتدریج نشو و نما اسی مذہب "راسخ الاعتقادی" کے زیر سایہ ہوئی۔ سرزمین یورپ میں عظیم تغیرات برپا کرنے والی افکار جدید کی لہریں —— مذہب ملائیت، نشاۃ ثانیہ، سولھویں صدی کی اصلاح دین مسیحیت (جس سے پروٹسٹنٹ مذہب کی بنا پڑی) اور اس کا ردِ عمل —— روس تک کبھی نہ پہنچ سکیں۔ اور روس کی مذہبی زندگی تمام بیرونی اثرات سے عری صدیوں تک قوت و ترقی کی جانب مائل رہی۔

۱۹۱۷ء کا بولشویک انقلاب روس کی مذہبی زندگی کے لئے زبردست مزاحمت ثابت ہوا۔ قائدین انقلاب ایک خالص مادی حکومت کا خاکہ تیار کر چکے تھے ۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کے قانون کی رو سے کلیسا اور حکومت دو علیحدہ چیزیں قرار پائیں اور قدیم روسی کلیسا جو روس کا قومی کلیسا نہ رہا۔

مارکسی [illegible] کا مذہب کے متعلق رجحان جس پر ہم آگے چل کر [illegible] دشمنی پائیں گے یہ تھا کہ کسی طرح روس [illegible] کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے۔ اس [illegible] وہ اپنی جگہ مکمل اور موثر تھیں۔ اشتراکیوں کو کوئی وجہ نظر نہ آئی کہ کیوں کلیسائی جائداد اور دوسری املاک [illegible]۔ لہذا کلیسا کی تمام جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ [illegible] کو معاشی کاموں مثلاً امداد باہمی او خیرات [illegible] رکھنے یا ان کا انتظام کرنے سے سختی سے باز رکھا گیا۔ کلیسا کے خلاف ان اقدامات سے مقصود یہ تھا کہ معتقدین مذہب کو اعانت کے علاوہ آمدنی کے دوسرے ذرائع سے ان کو محروم کر دیا جائے۔ مدارس کو کلیساؤں سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔

ارباب کلیسا پر جنھوں نے اس کی مخالفت کی مقدمے چلائے گئے [illegible] کی پاداش میں سخت سزائیں دی گئیں۔ گو حکومت کی کلیسا دشمنی کا نتیجہ تھا کہ روس کے چار بڑے مذہبی مراکز جو کیوف ماسکو [illegible] میں تھے بند ہو گئے۔ لیکن [illegible] سے بیشتر [illegible] مذہبی تعلیم پر کوئی پابندی نہیں عائد کی۔ مگر ۱۸ مئی ۱۹۲۹ء کو اشتراکی کانگریس نے ایک دستوری تبدیلی کی۔ ابتدا میں حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ "ہر شہری کو مذہب کی موافقت یا مخالفت میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے"۔ تبدیل شدہ دستور میں یہ فقرہ تھا۔ "مذہبی معتقدات اور مخالف مذہب پروپگنڈے کو پوری آزادی دی جاتی ہے"۔ اس طرح سے منظور شدہ مذہب صرف عبادت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ عوام کو مذہبی مسائل پر مخاطب کرنا منع تھا۔

مگر لامذہب عقلیئین کو اپنے پروپگنڈے کے لیے پوری آزادی حاصل تھی جس کا استعمال وہ اپنے قائد "یار وسلافسکی" کے تحت پورے زور و شور سے "ملحد جماعت" کی طاقت اور اقتدار بڑھانے کے لیے کرتے رہے۔ اس طرح مذہب کے خلاف عظیم اقدامات اخباروں، رسالوں اور ادبی گروہوں کے ذریعے جاری رہے۔ اور اتحاد کے پرستاروں کو اس مخالفت کے لیے خاص مشق و تربیت حاصل ہوتی رہی۔ اس پس منظر کو پیش نظر رکھنے کے بعد سوویٹ حکومت کی مذہب کے متعلق تبدیل شدہ حکمت عملی کو بالکل وقتی کہا جا سکتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجوہات کا تجزیہ کرنے سے قبل بہتر ہے کہ ہم روس میں مذہب کی موجودہ صورت حال کا سرسری مطالعہ کریں۔ ماسکو اور روس کے دوسرے تمام علاقوں میں عہدۂ بطریق کا پھر سے احیاء کیا گیا ہے۔ ملحدوں کی انجمن کو توڑ دیا گیا ہے۔ پادریوں کو حق رائے دہی عطا کیا گیا ہے۔ اتوار کو تعطیل دیکر عیسائی ہفتے کو پھر سے اختیار کر لیا گیا ہے۔ عمالی تنظیم میں کچھ آسانی پیدا کی گئی ہے تاکہ دہقان و مزدور بڑے تہوار منا سکیں۔ مخالف مذہب امتحانات جو گریجویٹ فوجی اور سیول عہدہ داروں کے لیے ضروری تھے ختم کر دیے گئے ہیں۔ درسی کتابوں کے اس حصے کو خارج کر دیا گیا ہے جو معتقدین مذہب کی دل آزاری کا باعث تھا۔

عمرانی نظریات کا جب سائنٹفک نظریات سے مقابلہ کیا جائے تو ضرور ان میں ایک خامی نظر آئے گی۔ سائنٹفک نظریات کا ثبوت آسانی سے ایک تجربہ خانہ میں دیا جا سکتا ہے لیکن ان کے برعکس عمرانی نظریوں کو جن کا تعلق ایک عظیم انسانی گروہ سے ہے اول الذکر کی طرح آسان تجربوں سے ثابت کرنا مشکل ہے۔ بہر حال روسی قائدین انقلاب نے اپنے نظریۂ مذہب کے موافق حسب خوبی سے کام انجام دے کر اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے و حقیقت دنیا کے عظیم پیمانے کے عمرانی تجربوں کے سلسلے میں ایک قیمتی کوشش ہے۔

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ان "مفروضات" پر ایک نظر ڈال لیں جن کو پیش نظر رکھ کر یہ تجربے کیے گئے۔

انقلابی تحریک کے مفکرین مارکس اور اینگلز اور روسی انقلاب کے رہنما مثلاً لینن در اصل سائنٹفک مادیت پرست تھے۔ لینن کے نزدیک تصوری فلسفہ کی وہ تمام تعلیمات جو مادیت کے مقابلہ میں مذہب کی نا صحت کے طور پر پیش کی گئی بالکل غلط تھیں۔ اینگلز نے دعویٰ کیا کہ مذہب کی اصلیت کچھ بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف عوام کے دلوں پر ان بیرونی قوتوں کے اثرات کی ایک پرچھائیں ہے جو روزمرہ زندگی میں ان پر مسلط ہیں یہ وہ اثرات ہیں جن کی بدولت دنیاوی قوتیں مافوق الفطرت ہستیوں کا بھیس اختیار کر گئی ہیں۔ عہد قدیم کا انسان اس خدا کی عبادت کرتا تھا جو اس کے نزدیک ایک برق جہاں سوز کے پردے میں ظاہر ہوتا تھا۔ موجودہ دور کے انسان نے سرمایہ داری کی لائی ہوئی بدبختی اور پریشان حالی سے بھاگ کر خدا اور حیات بعد الممات کے پردے میں پناہ لی ہے جو اس کی نظر میں دنیاوی زندگی کو تاہیوں کی تلافی کر دیں گے۔ اسی دور میں منظم مذہبی تحریک حکمران طبقوں کے زیر اثر آ گئی۔ جنھوں نے اس کی مدد سے اپنے ضمیر کی تسلی کی خاطر برائے نام خیرات کی تائید کی۔ اور دوسری طرف کام کرنے والے نچلے طبقے کے حیات بعد الممات پر اعتقاد کو تقویت پہنچانی شروع کی۔

حالات کے اس تجزیہ کے پیش نظر ضروری ہے کہ منظم مذہب کے طریق کار کو ختم کر دینا چاہیئے۔ جب پیدائش دولت کے ذرائع مزدور طبقے کے ہاتھ میں آ جائیں گے تو آدمی اپنی قسمت کا مالک ہو جائے گا اور مذہبی رجحان خود بخود حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ غرض یہ تھی اینگلز کی منطق مذہب کے خلاف۔

روس میں موجودہ مذہبی رجحان کے احیاء کی تحریک کو مندرجہ بالا نظریے کی تکذیب سمجھنا غیر دانشمندی پر محمول ہوگا۔ مذہبی اداروں پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں ان میں صداقت کے بعض اہم پہلو مضمر ہیں۔ روسی کلیسا کی آزادی جس کی بدولت ملک سولھویں صدی عیسوی کے رہبانی دور

گرنے کے بعد امن و سکون سے ہمکنار ہو گیا تھا پیٹر اعظم کے دور حکومت میں سلب کر لی گئی۔ پیٹر اعظم کسی دوسری قوت کو اپنی رقابت پر آمادہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے بطریقیت کی جگہ کے تبدل کے حالات پیدا کر دیے پھر کلیسا کو ایک سیول عہدہ دار کی نگرانی میں کر دیا جس کو وہ معتمد خاص طور پر زار کی آنکھ کہتا تھا۔ انقلاب تک روس میں مذہب کی سماجی جڑیں ناکارہ ہو چکی تھیں۔ اور اس کی حالت ایک زائد محکمہ پولیس کی سی ہو گئی تھی۔ پادریوں سے ہمیشہ اس چیز کا خدشہ رہتا کہ وہ اپنے حلقے کی رعایا کی باتوں کو پولیس تک پہنچا دیں گے۔ بعض اوقات پادری کو حکومت سے سنسر شدہ خطبے پڑھنے پڑتے تھے۔ آزاد خیال پادریوں پر سختی کی جاتی اور بعض دفعہ قید کی سزا بھی دی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب کی مخالفت تحریک نے منظم مذہب کی بہت سی خرابیوں کو دور کرنے میں بڑی مدد کی۔ اس کے ساتھ ساتھ

اس نے اس کا بھی پرچار کیا کہ مذہب اور توہمات میں بہت بڑا فرق ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کی خود شعاری کو بیدار کرنا ہے جو بلند ہمتی اور انسانیت پرستی کی تشویق کرتی ہے۔ ۱۹۲۸ء تک جبکہ مخالف مذہب کے شدید صورت اختیار کر گئے تھے مخالفت کے بانی یمونا کارسکی وزیر تعلیمات کو ماننا پڑا کہ مذہب ایک کیل ہے جتنی شدید ضرب تم اس پر لگاؤ گے اتنی ہی گہرائی میں وہ گھستی جائے گی:

"ڈاسکوپر" کی ایک درگاہ میں جہاں پہلے کنواری آمیریا کی تصویر تھی انقلابی لیڈروں نے ایک تختی مارکس کا یہ جملہ کندہ کر کے لٹکا دیا تھا "مذہب عوام کی افیون ہے۔" اب اس تختی کو وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے اور کنواری آمیریا کی تصویر وہاں دوبارہ آویزاں کی گئی ہے۔ روس میں ہم آہنگ معتدل عقلیت پسندی اور مذہبی رجحان کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔

احسان اللہ باؔ

مشرق کا ستارۂ سحری

نیری آبادی سے کوسوں دور ہے
مضمحل خاموش جیسے چور رہے
روح ہے لیکن بہت مجبور ہے
ایک تازہ رات کے پچھلے پہر

حسن کی دنیا میں مجھ سے آ ملا
عالم امکاں میں صدیوں گم رہا
زندگی کی راہ میں کھویا ہوا
بجھ رہی ہے اس کی قندیل حیات

میں نکل آیا جہانِ خاک میں
رہ گیا یہ منزلِ افلاک میں
اشک بن کر دیدۂ غمناک میں
اس میں ہے آمیزشِ خونِ جگر

اب یہ ڈوبا جا رہا ہے کیا کروں
پھر اندھیرا چھا رہا ہے کیا کروں
جی مرا گھبرا رہا ہے کیا کروں
آ کہاں ہے اے سکونِ کائنات

دیکھ سوزِ زندگی دیتا ہوں میں
تجھ کو اپنی روشنی دیتا ہوں میں
زیست کی تابندگی دیتا ہوں میں
ہاں ابھر اے نقشِ ہستی پھر ابھر

پی۔ پیام

دو غزلیں

ٹکرا نہ سکے کہساروں سے اور چاک گریباں کر نہ سکے
ہم خود بھی پشیماں ہو نہ سکے ان کو بھی پشیماں کر نہ سکے

اک تم جو شبِ تنہائی میں تسکین کا ساماں کر نہ سکے
کیوں ایسی بھیانک راتوں میں تارے بھی چراغاں کر نہ سکے

وہ فصلِ بہاراں کی آمد پر سیرِ بہاراں کر نہ سکے
جو اپنے لہو کی بوندوں سے زنداں کو گلستاں کر نہ سکے

یہ وقت کی طوفانی لہریں لڑتی ہی رہیں کشتی ہی رہیں
ساحل پہ جو عیش بداماں تھے اندازۂ طوفاں کر نہ سکے

ہنسنے کا طریقہ یاد نہیں رونے کا سلیقہ بھول گئے
اے دردِ جنوں ہو خیر تری ہم جانے کیا کیا بھول گئے

سانسوں میں کسک سینے میں کھٹک آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہے
انجامِ تمنا سامنے ہے آغازِ تمنا بھول گئے

یہ صحنِ قفس پہ شکستہ پری یہ دردِ اسیری کیا کہیے
صیاد! دعا دیتے ہیں تجھے ہم لطفِ چمن کا بھول گئے

دکھ درد کے پھندے کٹ نہ سکے وہ بزمِ تصور میں ہی رہے
ہم بھولنے کو بھولے ہیں انہیں پر دل سے بھلانا بھول گئے

وہ میرے تصور میں آئے کچھ کہہ بھی گئے کچھ سن بھی گئے
اب اس کی خبر کس کو نازش کیا یاد رہا کیا بھول گئے

نازش پرتاب گڑھی

چاندنی رات

جب میں سینما سے رات کے ایک بجے واپس ہو رہا تھا تو کوئی سڑک کے بیچوں بیچ لیٹا ہوا نظر آیا۔ موٹر روک کر ٹارچ کی مدد سے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ انسانی جسم لیکن ہڈیوں کے پنجرے سے بدتر۔ کچھ ہی دیر پہلے سینما ہال میں زندگی ایک مجسم رنگینی ایک مسلسل قہقہہ تھی۔ اور سینما ہال سے باہر افلاس کی چیختی گالیاں۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنی موٹر میں بٹھا لیا۔ وہ دیوانہ۔ قسمت کی نیرنگیوں پر آنسو بہاتے بہاتے نہ تھکنے والا اب زندگی کی پرچھائیں سے بھی گھبراتا تھا۔ میں نے اس کے زخم کی مرہم پٹی کی۔ پر اس گھاؤ کا علاج کس کے پاس تھا جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ایک دن میں نے اس کی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ بڑے اصرار کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

ایک رات ہم سب دوستوں نے ایک چمن میں چاندنی رات منائی۔ کچھ ہی دیر بعد چمن کے جنوبی حصہ سے ایک بہت ہی پیاری اور سریلی آواز آئی۔ کوئی بڑی میٹھی لے میں گا رہا تھا۔ ہم اس طرف چلے۔ حسین اور نوجوان لڑکیوں کا ایک چمن سا کھل رہا تھا۔ ان میں کی ایک جس کی خمار آلود آنکھیں چاند کو ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں، گا رہی تھی۔ مستانہ وار! کیا کہہ نہیں سکتا۔ اس ایک نظر نے کیا غضب ڈھایا۔ دوسرے ہی دن میں نے پتہ لگا لیا کہ وہ ایک امیر گھرانہ کی لڑکی ہے۔ کلیہ طبیہ میں اس کی تعلیم کا پہلا سال ہے اور اس کا بھائی یوسف ہمارے ہی کالج میں ہے۔ میں نے یوسف سے دوستی کر لی۔ کیوں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہاں میں۔ کہاں وہ۔

دو ہفتے بعد میں یوسف کے بنگلہ پر پہونچا لیکن اس وقت یوسف کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ ــــ گنگناتی ہوئی باہر آئی۔ میری طرف دیکھا۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور گھبرا کر بولا "جی میں سلمان ہوں۔ بی۔ اے۔ یوسف کا دوست!!" اس نے جواب دیا۔ "جی واقعی؟" اور چلی گئی۔ مجھے اپنی حماقت پر بیحد غصہ آیا۔ بھلا کون پوچھتا تھا مجھ سے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ بہت شرمندہ ہوا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ یوسف نے بارہا اصرار کیا کہ میں اس کے گھر آؤں لیکن ہمت نہ پڑی۔ آخر دو مہینے بعد وہ مجھے زبردستی لے گیا۔ بہت خاطر مدارات کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی عزیز بہن سے میرا تعارف بھی کروایا۔ اس وقت محمودہ نے مسکرا کر کہا "آپ مسٹر سلمان بی۔ اے یوسف کے دوست۔" یوسف نے سمجھا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اس دن سے میری زندگی میں ایک تغیر برپا ہو گیا۔ ہر وقت اسی کا خیال۔ پڑھائی کے اوقات اسی کے سہانے تصور میں گزرنے لگے۔ اور میں یہ بھی سمجھا ہوا تھا کہ میری طرح محمودہ بھی محبت کی آگ میں جل رہی ہے۔ لیکن وہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ جدید تہذیب و تمدن کی فضا میں سانس لینے والی لڑکی کے لئے مجھ جیسے ان گنت پجاری تھے۔ اسے میری محبت تو کجا شکل بھی یاد نہ تھی۔

میری تعلیم کا خاتمہ ہو گیا۔ پے در پے ناکامیوں نے میری کمر توڑ دی لیکن دل پر زیادہ اثر نہ ہو سکا کیونکہ وہ تو محمودہ کی شاندار کامیابیوں پر مسرور اور نازاں تھا۔ کالج میں وہ ایک ممتاز حیثیت کی مالک ہو گئی۔ میرے لئے اس کی کامیابی اور نیک نامی ایک بیش بہا دولت تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں اس سے بے لوث اور بے غرض محبت کرتا تھا۔ میری محبت کا صلہ مجھے منظور نہ تھا۔ اس لئے میں نے کبھی اظہار کی جرأت نہ کی۔

وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اپنے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ وہ کہنے لگا "ہاں تو میں نے اپنی محبت کا اظہار کبھی نہ کیا کبھی بھی نہیں!!" وہ اب ڈاکٹر محمودہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہو گئی تھی۔ خوشی سے میں پھولوں نہ سماتا تھا۔ مجھے

یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں امتحان میں ناکام رہا ہوں۔ اسی اثناء میں والد کے انتقال کی خبر ملی۔ دیہات میں سارے معاملات طے کر کے شہر آیا تو معلوم ہوا کہ اس نے باضابطہ پریکٹس شروع کر دی ہے اور اپنے دواخانہ کا نام "سلمان ہسپتال" رکھا ہے۔ میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تصور کرنے لگا۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بھی میری طرح محبت کی آگ میں جل رہی ہے ورنہ کیوں وہ میرا نام منتخب کرتی؟ فرطِ انبساط سے جھومتا ہوا اس کے ہسپتال پر پہونچا۔ برسات کے ابتدائی دن تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ سورج کی کرنیں بھی نم تھیں۔ میں نے اس کے کمرۂ خاص میں اس کا انتظار کیا جب وہ چند مریضوں کو دیکھ چکی تو میرے پاس آئی۔ سادہ سوتی لباس لیکن پھر بھی لاکھوں فتنوں کو نیچا دکھاتے ہوئے وہ مسکرا کر کہنے لگی "کہیے جناب کیسے تشریف لائے آپ؟" میں نے کہا "آپ کو مبارکباد دینے"۔ "اوہ شکریہ"۔ "ہسپتال کا نام نہیں سنا آپ نے؟" میں نے شرارتاً کہا۔ "جی نہیں" اور اس کی نگاہوں میں کچھ ڈھونڈنے لگا لیکن وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آسکی۔ "آپ کو معلوم ہے اتنا اچھا نام میں نے کہاں سے پایا؟" "نہیں تو" لیکن ابھی محویت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ کہنے لگی: "اچھا سنیئے میرے بھائی کے ایک دوست تھے ان کا نام تھا سلمان۔ میرے بھائی ان کو بہت پیار کرتے تھے۔ میں بھی ان کی کافی عزت کرتی تھی۔ مگر نہ معلوم بیچارے کدھر غائب ہوئے کہ چار یا پانچ سال سے صورت نہ دکھائی۔ ممکن ہے کہ بھائی ان سے ملتے بھی ہوں لیکن میں نے اپنی مصروفیت کی بنا پر ایک عرصہ سے انھیں نہیں دیکھا۔ بھیا ہی کے مشورے سے میں نے اپنے ہسپتال کا یہ نام رکھا۔ میرے ہوش و حواس کہاں قائم تھے جو اس کی باتوں کا کوئی جواب دیتا۔ اتنے میں باہر سے گھنٹی بجی اور وہ مریض کو دیکھنے چلی گئی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ غلط فہمی کا تصور ایک دیوتا کی طرح میری ساری ہستی کو زیر و زبر کر رہا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہہ دیا اور ایک ضلع کے مدرسے میں استاد ہو گیا میری آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصہ اخباروں و رسائل کی نذر ہو جاتا کیوں کہ ان کے صفحوں پر میں اپنے دل کے ٹکڑوں کو بکھیرتا تھا۔ ایک دن میں نے اخبار میں دیکھا کہ مخمور کی منگنی ڈاکٹر شیرازی سے ہو گئی! میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ غریب اور ذلیل انسان۔ مجھے نہ دل تھا نہ دل میں کوئی تمنا۔ مجھے تو برباد ہی ہونا تھا۔ چند ہفتوں بعد اخبار میں آیا۔ مخمور کی شادی بھی ہو گئی۔ میں بھی آخر انسان تھا۔ پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتا تھا۔ کب تک صبر کرتا۔ میری شرافت، صبر اور ایثار کا پیمانہ چھلک گیا۔ میں رات کے تھکے گھر سے نکل گیا۔ میرا کام گشت لگانا تھا اور میں گشت لگاتا تھا آگے بڑھتا تھا اور بڑھتا جاتا تھا۔ میری حالت اس مسافر کی تھی جس کی منزل ہی خود بھٹک گئی ہو۔ اس دن سے لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے۔ بچے مجھ پر پتھر پھینکتے۔ جوان مضحکہ اڑاتے اور بوڑھے مجذوب تصور کرتے۔ آہ دنیا والے مجبور و بیکس انسان کے دل کا حال کیا جانیں؟۔ ایک رات میں بھٹکتا ہوا ایک چمن میں گھس گیا۔ چاندنی رات تھی!۔ یکایک کسی کے گانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں ٹھٹکا۔ آج سے پانچ سال پہلے کا سماں میری آنکھوں میں کھنچ گیا۔ یا خدا! یہ مخمور ہی تو تھی جو اپنے شوہر کے آگے بیٹھی۔ وہی راگ الاپ رہی تھی جس نے میری زندگی کو پھونک ڈالا تھا۔ آج کی رات اور وہ رات دونوں میں کتنا فرق تھا۔ زمین و آسمان کا فرق۔ میں دوڑ کر ان کے سامنے پہونچا اور کہنے لگا "بند کرو اپنا گانا۔ مخمور!! بند کرو اپنا گانا۔" اس کے تیسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو سلمان ہسپتال میں پڑا پایا۔ میری پیشانی پر زخم آیا تھا۔ کیونکہ میں بیہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ یہ زخم کبھی اچھا نہ ہوگا۔ میری حالت وحشیوں کی طرح بدتر تھی۔ مجھے کیسے پہچان سکتی تھی؟ نہ پہچانا اچھا ہی ہوا مجھے ہوش آنے کے ایک گھنٹہ بعد رات کے وقت میں چوری سے بھاگ نکلا۔ اور پھر وہی آوارہ گردی۔ [illegible] کہ آپ مجھے پکڑ لائیں۔ میں آپ جیسی خاتون کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا اور سچ تو یہ ہے کہ اسی احسان کی وجہ سے میں اپنے

اپنے دل کا راز آپ سے کہہ دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن وہ مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں۔ دوسری صبح اس کے دل کی حرکت یکایک بند ہو گئی۔ مرنے کے بعد بھی اس کی نیم وا آنکھوں میں [illegible] شکریہ کا اظہار [illegible]

میں نے مخمور کو اطلاع کروائی۔ [illegible] کے یکایک چل بسنے سے پریشان تھی۔ اس خبر کو سن کر اپنے شوہر اور بھائی کے ساتھ [illegible]

[illegible]

انقلاب

شام کا سہانا وقت تھا۔ فضا خوشگوار تھی [illegible]

[illegible] کی طرف [illegible] جیسے [illegible] زندگی [illegible]

[illegible]

باقاعدہ [illegible]

تجمی اس دلکش نظارہ میں بالکل کھو سا گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے گزشتہ زندگی کے واقعات ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے غربت کی زندگی۔ کتنا نازک زمانہ ہوتا ہے وہ جب [illegible] کہیں جگہ نہیں ہوتی [illegible] موجودگی میں بھی دربدری تھا [illegible] ایسے وقت [illegible] ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں!

یکایک اس کی نگاہ [illegible] ایک لاش [illegible] ان کے خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے "خدا کی پناہ" کہتا ہوا [illegible] لاش کے پاس گیا۔ لاش [illegible] محسوس ہوا [illegible]

اتنی دور لاش کے ساتھ [illegible] بڑھتا گیا۔ ساحل پر آ کر اس نے [illegible]

حسین دوشیزہ ——— [illegible] آنکھیں، خمدار ابرو ——— [illegible] میں کھو گیا۔ یکایک وہ چونکا ——— [illegible] بڑے ہسپتال کی طرف چل [illegible] ڈاکٹر [illegible]

پریشانی [illegible]

[illegible]

تجمی نے سلام کیا اور ڈاکٹر نے جواب [illegible] آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ جوڑ [illegible] ڈاکٹر صاحب [illegible]

[illegible] کے لئے لے جائیے۔ ایک لاش کا معائنہ کر لیجئے۔ بڑا کرم ہو گا۔

[illegible] ڈاکٹر صاحب!

[illegible] اس وقت تم کو [illegible] کیا وہ ان بھر [illegible]

[illegible] حالت کو دیکھ [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر [illegible]

ڈاکٹر نیازی نے لڑکی کو [illegible] تمام [illegible] کرنے لگے۔ تجمی [illegible] حیران و [illegible] وقت اور [illegible] کو بغور دیکھ رہا تھا!

[illegible] زندگی کی کچھ امید ہے!

تجمی [illegible]

ایک گھنٹہ [illegible] کوشش کے بعد لڑکی نے حرکت کی اور آنکھ کھولی۔ دوا کی ایک خوراک [illegible] اور وہ [illegible] دوسری خوراک دینے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ [illegible] دوسری خوراک دی اور تمام رات بیٹھے گزار دی!

صبح ڈاکٹر نیازی نے آ کر مریضہ کو دیکھا دوسری دوا تجویز [illegible] دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ [illegible]

[illegible] ہفتہ میں نسرین بالکل تندرست ہو گئی۔ وہ آج [illegible] تجمی نے دریافت کیا کہو نسرین مزاج کیسا ہے؟ [illegible] سوکھے ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ [illegible] کیا ہو گا۔ ایک بار موت کے منہ سے نکل آئی ہوں! [illegible] تجربہ کار انسان ہی کامیاب ہوتے ہیں یہ تو تمہاری [illegible] موت کا بھی تجربہ کر لیا!

[illegible] میں آپ کے متعلق چند باتیں دریافت کر سکتی ہوں؟

[illegible] کیا تم مجھے بتا سکو گی تم نے سمندر کی [illegible] پسند کیا ——— ؟

[illegible] میں کس طرح [illegible]

بات پوشیدہ رکھوں [illegible] آج سے چھ سال قبل جب کہ میں دس سال کی تھی اپنے والدین کے ساتھ [illegible] جا رہی تھی۔ دورانِ سفر میں ایک حادثہ پیش [illegible] چند بدمعاش گھس آئے اور کئی عورتوں کے [illegible] ریل [illegible] چلتی ٹرین سے کود کہیں [illegible] کچھ دیر بعد ایک چھوٹا سا اسٹیشن آیا۔ ٹرین وہاں [illegible] رہی [illegible] تھا۔ ایک دوسری [illegible] لگی ٹرین [illegible] میں ایک [illegible] مجھے اپنے ساتھ لیکر [illegible] وہ بہت اچھی [illegible] سمجھ [illegible] اور اپنے ساتھ ٹرین میں [illegible] سمجھتی تھی کہ [illegible] مجھے والدین [illegible] ان لوگوں [illegible] ایک [illegible] لیکن باوجود ان کے ظالم ہونے کے میری امیدوں کا [illegible] مسمار کر دیتے۔ اسی امید میں پانچ سال گزر گئے۔ میں اپنی [illegible] کو خالہ کہتی تھی وہ مجھے بیحد پیار کرتی تھیں۔ انھوں نے مجھے گھر پر اتالیق رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کی چار لڑکیاں تھیں [illegible] شادی شدہ تھیں اور دو زیر تعلیم تھیں۔ گرمی کی چھٹیوں میں ہم لوگ سیر کو نکلے۔ ارادہ تھا کہ بمبئی آئیں گے اور یہاں کی خوب سیر کریں گے۔ اس لئے ہم لوگ پہلے پونہ سے [illegible] سورت [illegible] قیام [illegible] ہم نے چاندنی رات میں کشتی کی سیر کا پروگرام بنایا اور چار کشتی ڈلوا ہم سب اپنی اپنی کشتی پر روانہ ہو گئے۔ کچھ دور گئے تھے کہ ہوا زور سے چلنے لگی۔ بڑی باجی نے کہا کہ "اب واپس ہونا چاہیے کہیں ہم لوگ مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔" منجھلی باجی نے بھی تائید کی لیکن چھوٹی باجی نے کہا "تم لوگ اتنی ہوا سے گھبرائیں، کتنی بزدل ہو" پھر وہ مجھ سے بولیں "چلو نسرین ہم لوگ آگے چلیں گے۔ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ میں نے اپنی کشتی کو آگے کر دیا۔ بہت دیر تک ہم دونوں کا مقابلہ ہوتا رہا۔ چھوٹی باجی مجھ سے آدھ میل پیچھے رہ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کشتی واپس جا رہی ہیں اور مجھے سب ہاتھ سے [illegible]

واپس جا رہی تھیں۔ میری کشتی بیچ منجدھار میں تھی کہ وہی تیز ہوا خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ میرے کان پانی کے شور و غل سے بہرے ہو چلے تھے آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ ہر طرف پانی ——— اور پھر طوفان۔ میرے دماغ کا توازن بھی درست نہیں رہا کہ میں کچھ سوچ سکتی۔ بالآخر تھک کر کشتی میں بیٹھ گئی کچھ دیر بعد ایک دھکا سا لگا اور میری کشتی حیات غرقِ سمندر ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم پھر کیا ہوا ——— "

اس نے اپنا افسانہ غم ختم کر کے نجمی کے چہرہ پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ نجمی کے رخسار پر آنسو ڈھلک رہے ہیں۔ وہ بولی "مجھے اس بات کی حد سے زیادہ خوشی ہے کہ آپ جیسے نیک اور ہمدرد انسان نے مجھے بچایا۔ میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہوگا۔" نجمی اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "شاید تم کو میرے ساتھ خوشی حاصل نہ ہو سکے کیونکہ میں ایک غریب انسان ہوں!" نسرین نے کہا "خدا نہ کرے میں اتنی احسان فراموش نہیں ہوں جو اپنی خوشی کا خیال کروں اور آپ کا کچھ بھی نہیں!"

ابھی نجمی نے کچھ بھی جواب نہیں دیا تھا کہ بمبئی کے رئیس اور سب سے بڑے تاجر شوکت حیدری کا ملازم کار لے کر آ گیا اور اس نے بتایا کہ شوکت صاحب نے انھیں یاد فرمایا ہے۔ نجمی فوراً ملازم کے ساتھ "شوکت منزل" روانہ ہو گیا۔ شوکت صاحب نجمی سے بہت محبت سے ملے۔ وہ نجمی کے حسنِ اخلاق اور لیاقت سے بہت خوش تھے اور نجمی کو بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ نجمی کو دیکھ کر فرمانے لگے۔ "بیٹا طبیعت بہت گھبرا رہی تھی اور تم سے کچھ کام بھی تھا اس لئے بلایا۔ تم کو معلوم ہے کہ میرا بائیس سالہ اکلوتا لڑکا لندن سے واپس آتے ہوئے حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے مر گیا۔ اب تو صرف خورشید میری زندگی کا سہارا ہے۔ وہ یورپ سے واپس آ چکی ہے لیکن سیر کی غرض سے کشمیر گئی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی جائداد کا کچھ حصہ تمھارے نام لکھ دوں ——— " نجمی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "لیکن ——— لیکن کیا میں اس قابل ہوں ——— ؟" شوکت صاحب نے افسوسناک لہجہ میں کہا۔ "نجمی میں تم کو ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح چاہا۔ تم ایک حسین خوش اخلاق

اعلیٰ تعلیم یافتہ تم میں وہ خوبیاں ہیں جو آج کل کے نوجوانوں میں نام کو نہیں ہیں۔ مجھے خبر ملی کہ میرا اکلوتا بیٹا اس دنیا سے چل بسا تو میں نے تمہیں دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ تم کو میں ہمیشہ کی طرح اب بھی چاہتا ہوں۔ میں نے اور تمہاری خالہ بیگم شوکت نے قطعی طور پر ارادہ کر لیا ہے کہ دو کوٹھیاں تمہارے نام لکھ دیں۔ آج سے تم ان کے مالک ہو گئے اور باقی دو اپنی لڑکی خورشید کے نام۔ میرے بعد وہ ان دونوں کی مالک ہوگی۔ تمہاری کیا رائے ہے؟" نجمی نے سر جھکا کر ادب کے ساتھ کہا "آپ کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا میرا فرض ہے۔"

شوکت: "تم یہ نہ سوچو کہ اگر تم کو میری رائے سے اتفاق نہیں ہوا تو میری محبت میں کمی آ جائے گی!"

نجمی: "آپ میرے بزرگ ہیں اور ہر کام سوچ کر میری بھلائی کے لئے کریں گے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ——؟"

شوکت صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا "ہاں بولو۔ رک کیوں گئے، شرماؤ نہیں بیٹا ——" نجمی شرم سے سر جھکائے بولا "میرا مطلب خورشید سے ہے ان کی رائے بھی تو جاننا ضروری ہے!" شوکت صاحب اس کے دل سے شک نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "تم اس کی طرف سے مطمئن رہو۔ اس نے کبھی میرے کسی حکم کو نہیں ٹالا ہے۔ وہ زیادہ تر یورپ میں رہی لیکن مشرقی خاتون کا وقار اب تک اس کے دل میں قائم ہے وہ بہت نیک، خدمت گزار، خوش طبع اور باوفا بیوی ثابت ہوگی!" نجمی نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا "میری خوش نصیبی ہے۔ میں آپ کا ممنون احسان ہوں!" شوکت صاحب نے کہا "اچھا اب تم جا کر آرام کرو۔ ضرورت ہوگی تو پھر بلاؤں گا۔" نجمی نے سلام کیا اور دعاؤں کے ساتھ گھر واپس چلا گیا!

موسم ابر آلود تھا۔ صبح کا سہانا وقت بہت ہی دلفریب و دل آویز تھا۔ نجمی اور نسرین ساحل کی طرف سے سیر سے واپس آ کر ناشتہ کے لئے میز پر بیٹھے تھے کہ ایک کار آ گئی۔ "ڈاکٹر" کہہ کر نجمی میز پر سے اٹھ گیا۔ نجمی نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا اور اندر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کی مزاج پرسی کی۔ پھر نجمی سے کہنے لگے۔ "مسٹر نجمی! مجھے افسوس ہے کہ ہم اتنے قریب رہتے ہوئے بھی اب تک ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی نجمی ہیں جن کے [illegible] بیگم شوکت حمید [illegible] کی ہے!"

نجمی نے کہا "جی ہاں آپ کا خیال صحیح ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہ عنایات مجھ تنہا انسان کے [illegible]" ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا "تنہا ——؟ کیا آپ کے [illegible] کوئی نہیں سوائے نسرین کے ——؟"

نجمی نے اپنا غم چھپاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب بدنصیبوں کا دنیا میں کوئی نہیں [illegible] رشتے ہیں وہ بھی غیر [illegible] نصیب کم حیثیت انسان [illegible] سمجھتے ہیں" ڈاکٹر صاحب نے اصرار کے ساتھ کہا "کیا آپ اپنے متعلق کچھ بتانے کی تکلیف کریں گے؟"

نجمی نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "آپ کے اصرار سے مجبور ہوں ورنہ میں نہیں چاہتا کہ اپنا افسانۂ غم کسی کو سنا کر اپنے غم میں شریک کروں۔ سنئے سنئے۔ میری عمر بارہ سال کی تھی اس وقت میں انگریزی کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرے والد صاحب بہت بڑے رئیس تھے ان کی تین کوٹھیاں تھیں اور بھی بہت بڑی جائداد کے مالک تھے۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ مسرت کے گہوارہ میں بسر ہوتا گزرتا تھا۔ ہمارے شہر میں اس وقت ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی والدین کو میں اکلوتا تھا اس لئے انہوں نے مجھے پاس کے ایک گاؤں میں اپنے قریبی رشتہ دار کے پاس بھیج دیا تھا۔ لیکن موت کے ظالم پنجہ سے وہ نہیں بچ سکے اور دونوں [illegible] اس کے بعد ہی ہمارے چچا، ماموں وغیرہ جائداد پر قابض ہو گئے۔ اب میرا دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا میں [illegible] مجھے اور رشتہ دار اذیت پہنچاتے تھے۔ لیکن جن کے گھر میں میں تھا وہ بہت نیک دل بزرگ تھے۔ حالانکہ ان کے صاحبزادے وغیرہ مجھ سے حسد کرتے تھے۔ تاہم اس نیک خصلت بزرگ نے مجھے میٹرک اور میٹرک کے بعد ایف اے کروا دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہوں لیکن میں اب زیادہ تکالیف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس لئے ایک دن بمبئی کی راہ لی۔ یہاں مجھے چند روز [illegible] میرے گھر والوں [illegible] ٹیوشن کا کام مل گیا جس کے ذریعہ [illegible] کمانے لگا۔ میں نے پرائیویٹ طور پر بی اے کیا اور پھر کالج [illegible] آگرا لیا۔ حالانکہ مجھے ٹیوشن کرنا بالکل پسند نہ تھا لیکن مجبوراً اعلیٰ تعلیم کے شوق نے یہ بھی کیا۔ پھر میں نے [illegible] بند کر دیا۔ اگر آپ جانیں کہ زندگی اگر یک محو ہو جائے تو [illegible] بے پناہ بڑھ جاتی ہے۔ کاریگراں بسیار بے قاعدہ زندگی [illegible] کا سبب وافر [illegible] مشغولیت ہوتی ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ [illegible] نوجوان اس لئے خودکشی کر بیٹھتے ہیں کہ گوناگوں مصروفیات سے تنگ آ جاتے ہیں۔ فطرت خاص اصول پر کاربند ہے۔ [illegible] بہار و خزاں، روز و شب، شباب و شیب —— سب میں نظام ہے۔ انسانی زندگی میں انضباط کا فقدان ہمارے [illegible] کے لئے [illegible] سے ہم آہنگ نہ ہو سکے، زندگی دنیا میں اجنبیت محسوس کرتی ہے۔ [illegible] بدلنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس کوشش میں خود کو مٹا بیٹھتی ہے۔ میں چند روز تلاش معاش میں [illegible] پریشان حال رہا۔ آخر خدا کو میری بھلائی منظور تھی۔ مجھے شوکت صاحب کی کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ مل گئی پھر مجھے ترقی ہوئی اور اب منیجر ہوں ——!

ڈاکٹر: ”آپ کو یہاں آئے کتنے سال ہوئے ——؟“

نجمی: ”نو سال ہو گئے!“ ڈاکٹر: ”واقعی جب والدین کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے تو عزیز بھی منہ موڑ لیتے ہیں!“

نجمی: ”ڈاکٹر صاحب [illegible] مجھے [illegible] کی پرواہ نہیں تھی لیکن وہ لوگ [illegible] جانتے تھے۔ خدا کسی دشمن کو بھی [illegible] خود غرض عزیز نہ دے!“

ڈاکٹر صاحب نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے دریافت کیا: ”کیا آپ محترمہ نسرین صاحبہ کے متعلق کچھ بتائیں گے کہ وہ آپ کی کون ہیں [illegible] ہاں۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم شریف کیا تھا ——؟“

نجمی: ”والد مرحوم کا نام علی حیدر تھا۔ نسرین —— [illegible]“

[illegible] ہے۔ جس [illegible] نے اپنے [illegible] کر دیا۔ [illegible] کے تمام [illegible] صاحب کو [illegible] ڈاکٹر صاحب کا چہرہ [illegible] مسرت [illegible] ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ انہوں نے [illegible] اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے [illegible] بیٹی [illegible] اور تم نے جس [illegible] تمہاری [illegible] میری بیٹی ہے اسے جلدی بلاؤ!“

[illegible] متعلق معلوم ہوا تو وہ [illegible] کی پیشانی [illegible] لگے!

[illegible] بیگم [illegible]

[illegible] نسرین [illegible] رخصت لے کے [illegible] اس نے بتایا کہ شوکت صاحب کی لڑکی سے [illegible] شادی طے ہو چکی ہے۔ یہ سن کر چچا چچی پر اوس پڑ گئی۔ نسرین دل و جان سے نجمی کو چاہتی تھی۔ لیکن نجمی اسے ایک بہن کی طرح چاہتا تھا۔ نسرین کے والدین تو سمجھ رہے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کا خیال غلط نکلا!

خورشید کشمیر سے واپس آ گئی تھی اور شوکت صاحب اس کی شادی کی تیاری میں [illegible] نجمی کو [illegible]

[illegible] عزیز [illegible] لوگ [illegible] ہوں میں شریک تھے [illegible] آئی۔ اور نہایت مسرت، عزت و احترام [illegible] استقبال کیا [illegible] دوسرے دن نکاح ہو گیا اور [illegible] بیگم شوکت نے سب کا تعارف ایک

دوسرے سہیگر دادو جس وقت انھوں نے نئی نویلی بیگم سے ملنے کے ڈپٹی کمشنر کی بیگم اور لڑکیوں سے تعارف کروایا، نسرین متعجب نگاہوں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ وہ بار بار تعجب سی ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ یکایک اپنی جگہ سے اٹھ کر "باجی" کہتی ہوئی ایک حسین لڑکی سے جا لپٹی "ارے نسرین تم ——؟" کہتی ہوئی بڑی اور منجھلی باجی اور خالہ جان قریب آگئیں۔ اور سب بہت خوش ہوئیں ساتھ ہی کیا۔ نسرین نے تمام واقعہ سنایا اور کہا کہ جس نیک ہستی نے مجھے بچایا اسی کی تقریب شادی میں آج ہم سب شریک ہیں!"

دوسرے روز شوکت صاحب نے اعلیٰ پیمانہ پر ٹی پارٹی دی۔ دل کھول کر خوشیاں منائی گئیں پھر بیگم نیازی نے بیگم حمید کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے دن اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ بیگم شوکت اور دیگر بیگمات کو نسرین نے بچپن کا اور والدین سے ملنے کا واقعہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور سب نے بیگم نیازی کو مبارکباد دی اور رخصت ہوئیں۔ پھر نجمی اپنی حسین بیگم خورشید کو ساتھ لیکر اپنی کوٹھی واپس آگیا —— اب وہ منچلا نہیں بلکہ وہ مجنوں کا تماشا تھا اور رحیم نظم کا داماد تھا۔ وہ اکثر [illegible] اب زندگی پر سوچا کرتا —— !

کے۔ سلطان بیگم جوہر

غزل

ہر بار ناز حسن تو جلووں کو وا کرے　　مانگو دعا کہ عشق بھی وعدہ وفا کرے

اس لیے وفا کو رحم تو آتا ہے عشق پر　　آخر غریب گرمی انداز کیا کرے؟

تسخیر ہفت چرخ بھی کیا کچھ محال ہے　　یہ شوق آرزو بھی کہیں اکتفا کرے؟

کتنے ہی دشت و در ابھی ہوتے ہیں لالہ زار　　کچھ صبر بھی تو بلبل رنگیں نوا کرے

خوں نابہ بار اشک کی پرسش نہیں وہاں　　یوں چاہتا ہے رنگ و نور کا دریا بہا کرے

کیا صدمہ ہائے ہجر کی مر کر ملے گی داد؟　　یا جب کہ دل کی تیز خلش انتہا کرے

تنگ آ گیا ہوں کثرت امید و بیم سے
اس کشمکش میں حشر چھپا ہو خدا کرے

حرماں خیرآبادی

قانون کی ابتدا

"وین پاؤنڈ" کے الفاظ میں قانون دراصل اس معاشرتی دباؤ یا سوشل کنٹرول کا نام ہے جو ایک منظم سیاسی معاشرے کے ذریعہ باقاعدہ طور پر عمل کرتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو قانون کا دائرہ عمل متعین قانونی تہدیدوں ہی سے عبارت ہے۔ جس معاشرے میں قانونی تہدیدیں نہیں ہوتیں وہاں افراد پر جو پابندیاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ قانون کی نہیں، بلکہ رسم و رواج کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ سادہ معاشروں میں قانون نہیں ہوتا گو کم و بیش تمام معاشروں میں رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے اور ان کے پیچھے کچھ تہدیدیں بھی ہوتی ہیں۔

موجودہ زمانے کے قانون میں دیوانی اور فوجداری کا جو امتیاز کیا جاتا ہے اسے قدیم ان پڑھ سماج کے مطالعہ میں پیش نظر رکھنا مشکل ہے۔ قدیم اور ابتدائی قانون کو دراصل عام جنایات اور خانگی یا خاص جنایات کے لحاظ سے دیکھنا چاہئیے۔ بات یہ ہے کہ کوئی فعل اس وقت عام جنایت سمجھا جاتا ہے جبکہ اس کی وجہ سے پوری قوم یا سماجی اقتدار کے مستقل نمائندوں کی جانب سے کوئی باقاعدہ اور مستقل ضابطہ متعین ہو جائے اور اسی ضابطہ کے ذریعہ قوم کسی فرد پر کوئی ذمہ داری یا وجوب عاید ہو سکے۔ اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو تو قوم یا اس کے نمائندے خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے سکیں یہ ضابطے تعزیری تہدید کہا جا سکتا ہے۔ دراصل اس قوم کی طرف سے خاطی فرد کے خلاف ایک رد عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ ایک قوی اور معین اخلاقی جذبے کو ٹھیس لگاتا اور اسی طرح سماج کو دکھ پہنچاتا ہے۔ اس کا فوری اثر تو یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی طور پر "اخلاقی غصہ" کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح سماج کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور اس کا آخری اثر یہ ہوتا ہے کہ اس اخلاقی جذبے کو قوم کے تمام افراد کے دلوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

ماقبل تحریر زمانے کے معاشروں میں تعزیری تہدید کا کم پتہ چلتا ہے ابتدائی قسم کے سادہ معاشروں میں وہ فعلیں جو عام جنایات کے تحت آتی تھیں زیادہ تر عورت مرد کے ناجائز تعلقات پر مشتمل تھیں۔ سحر یا سفلی جادو، قبائلی رسوم کا سلسلہ توڑا جانا، اور متبرک اور پاک چیزوں کی چوری اور اسی طرح کے بعض افعال قابل سزا سمجھے جاتے تھے۔ لیکن غور کیا جائے تو تعزیری تہدیدیں صرف انہی صورتوں کے لئے یعنی جبکہ عام متبرک رسم کے خلاف کوئی حرکت کی جائے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ تہدید کو بھی مذہبی یا اخلاقی تقدس حاصل رہے۔ مذہبی یا رسمی تہدید کی ابتدا غالباً اس طرح ہوئی کہ بعض افعال کی وجہ سے کسی فرد یا جماعت کو مذہبی یا ذہنی طور پر ناپاک اور اچھوت قرار دیا جاتا اور اس ناپاکی کو دور کرنے کے لیے پرائشچت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ تصور یہ ہے کہ کسی فرد کے فعل قبیح سے پوری قوم متاثر ہو جاتی ہے بعد میں جب سیاسی یا عائلانہ اقتدار کسی شخص یا جماعت کو حاصل ہو گیا خواہ وہ سادہ شکل ہی میں تھا تو اس کے اقتدار سے انحراف یا اس کے احکام کی خلاف ورزی بھی عام جنایت ہو گئی۔ اور اگر اس مقتدر ہستی کی ذات کے خلاف کوئی فعل ہو تو اس کے لئے بھی تعزیری تہدید تھی۔ نیز ایسا فعل بھی جو عموماً خانگی جنایت کی حد تک پہنچتا تھا، اس سردار کے خلاف کئے جانے پر عام جنایت تصور کیا جانے لگا۔

خانگی یا خاص جنایات کی صورت میں جب کوئی فرد یا جماعت کسی ضرر، نقصان یا ہرجے سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے جائز حقوق پر ضرب پڑتی ہے تو وہ عدلیہ کی مقتدر ہستی کے روبرو چارہ کار کے لئے درخواست کرتی ہے۔ یہ مقتدر ہستی اسی قوم کے کسی دوسرے فرد یا جماعت کو مورد الزام ٹھیرانی اور حکم دیتی ہے کہ مدعی علیہ مدعی کے نقصان کی خاطر خواہ تلافی کرے۔ اور یہ تلافی اکثر و بیشتر تاوان یا ہرجہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، خانگی جنایت ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے "بازدہی" یا "پھیراؤ" (Restitution)

کی تہدید ہوتی ہے۔ اور اسی لئے ماقبل تحریر زمانے کے خانگی جنایات کے قانون کو موجودہ قانون ملک یا سیول لا کے مماثل سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں دراصل اہم فرق بھی ہے۔ موجودہ قانون کے لحاظ سے سیول لا کے تحت صرف ایسے ہی افعال آسکتے ہیں جن کے لئے ہرجانہ دیا جاسکے البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان افعال کو پوری قوم کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

گو دیوانی یا سیول قسم کی تہدیدوں سے مدعی علیہ ہرجانہ ادا کرتا اور رقمی لحاظ سے نقصان اٹھاتا ہے تاہم اس کے لئے یہ تادیبی سزا نہیں ہوتی۔ موجودہ سیول لا میں بھی خاص صورتوں میں حاکم عدالت تادیبی سزائیں دے سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جو مضرت پہنچائی گئی وہ پوری قوم کے خیال میں جسیم ہونی چاہیے۔ موجودہ قانون میں جب کوئی فعل اخلاق کے خلاف سرزد ہو اور ساتھ ساتھ مضرت بھی پہنچے تو ایسے فعل کے خلاف دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے چارۂ کار ہیں۔ چوری یا قتل کے لئے جو سزا دی جاتی ہے اس میں زیادہ زور اس چیز پر دیا جاتا ہے کہ وہ پوری قوم کے خلاف ایک جرم ہے۔ نہ اس پر کہ اس فعل کی وجہ سے جن اشخاص کو تکلیف یا مضرت پہنچی ان کو اس کا بدل دیا جائے۔

ماقبل تحریر زمانے کے معاشروں میں خانگی یا خاص جنایات عام طور پر چار یا پانچ چیزوں پر مشتمل تھے۔ جان سے مارنا، زخمی کرنا، چوری، زنا، قرضہ ادا نہ کرنا۔ ان افعال کے متعلق ایک تصور یہ ہے کہ یہ قوم کے کسی فرد کے خلاف سرزد ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ خلاف معاشرہ افعال بھی سمجھے جاتے ہیں جو اخلاق عامہ کو ٹھیس لگا سکتے ہیں۔

ایسے افعال کے خلاف بازدہی اور دباؤ دونوں تہدیدیں ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایک طرف تو متضرر کے نقصان کی تلافی کا خیال ہوتا ہے اور دوسری طرف اس شخص کی سزا کا جس نے ضرر پہنچایا۔ مثال کے طور پر کئی افریقی قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کا مال چرا لے تو مسروقہ شے کی دوگنی قیمت مالک کو واپس کرنی پڑتی ہے۔ اگر خود

دیکھا جائے تو خانگی جنایات کا قانون دراصل ایک ضابطہ ہے جس کے ذریعہ معاشرہ یا قوم کے اندرونی جھگڑوں سے پیدا ہونے والے "معاشرتی مرض" (Dysphoria) کا علاج کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی فرد نے دوسرے فرد کے خلاف کوئی فعل کیا ہو اور اس سے اس دوسرے فرد کو محسوس ہو کہ اسے مضرت پہنچی تو اس سے عام معاشری زندگی میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور جب تک متضرر کے نقصان کی تلافی نہ کی جائے یہ دور نہیں ہوتا۔ اسی لئے دیکھئے کہ قانون [illegible] جب تک حاکم عدالت تمام متعلقہ فریقوں کی تشفی نہ کرے اس وقت تک اس کا فیصلہ خلاف انصاف سمجھا جاتا ہے۔

عام قومی جنایات اور خانگی یا خاص جنایات کے فرق [illegible] پتہ چلتا ہے کہ قانون کی ابتدا ایک نقطے سے نہیں ہوئی۔ [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ وہ فعل جو قوم کے کسی فرد کے خلاف عمل میں آئے اور جس کی وجہ سے قوم کا اخلاقی جذبہ متاثر ہو اس کے پیچھے تین تہدیدیں ہوتی ہیں۔ عام یا اخلاقی تہدید جس کی وجہ سے قوم خاطی کی ہر طرح مخالفت کرتی ہے اور اسے خطاوار سمجھتی ہے۔ دوسرے رسمی یا مذہبی تہدید جس کی وجہ سے خاطی کے اندر مذہبی ناپاکی یا اچھوت پن کی ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ خود اس کے لئے اور پھر ان سب کے لئے جن سے اس کا تعلق رہتا ہے بڑا خطرہ رہتا ہے۔ ایسی صورت میں [illegible] مطابق مذہبی طریقوں سے اس کو پاک کیا جاتا ہے۔ یعنی پاپ کا پرائسچت ہوتا ہے۔ اگر یہ کفارہ ادا نہ ہو تو خیال یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ کی وجہ سے وہ بیمار ہو جائے گا یا مر جائے گا۔ تیسرے تعزیری تہدید ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم بعض اشخاص کے ذریعہ جن کو وہ عدلیانہ اختیار عطا کرتی ہے خطاکار کو سزا دیتی ہے اور اس سزا کو یا تو اس فعل ناجائز کے خلاف عام اور اجتماعی طور پر اخلاقی غصہ کا مظہر سمجھا جاتا ہے یا اس [illegible] کو رد کرنے یا اسے دور کرنے کا ایک ذریعہ۔ یا تیسرا دونوں

اس کے خلاف اگر کسی فعل کا اثر یہ ہو کہ کسی شخص یا مجموعہ

اشخاص کے حقوق متاثر ہوں تو متضرر مواخذہ یا جزا کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور جب رسم بھی ایسے مواخذہ اور بدلے کو جائز تصور کرے اور اس کے لئے چارۂ کار بھی مہیا کرے تو ظاہر ہے کہ مواخذہ بھی تہدید کا اثر رکھے گا۔ ماقبل تحریر معاشرہ میں جنگ کے لئے ہی ایسی تہدید تھی چنانچہ بعض قوموں میں جنگ کو ہی مواخذہ سمجھا جاتا تھا جسے ایک فریق دوسرے خاطی فریق کے خلاف اختیار کرتا ہے۔ اس کے لئے چند رسوم بھی ضابطے کے طور پر رائج تھے جو موجودہ قانون بین الاقوام کے مشابہ ہیں۔ چنانچہ آسٹریلیا کے بعض قبیلوں میں جنگ کے متعلق آج تک یہی تصور ہے۔ باضابطہ اور منظم طور پر بدلہ لینے کا طریقہ بھی اسی "مواخذہ" کی تہدید کی ایک مثال ہے۔ اگر کوئی آدمی جان سے مارا جائے خواہ وہ ارادی طور پر ہو یا حادثہ ہو تو اس سے اس کے خاندان، قبیلہ یا فرقے کو جو ضرر پہنچتا ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔ یہ متضرر گروہ کا حق سمجھا جاتا ہے کہ "بدلہ" لے بلکہ اکثر و بیشتر تو یہ اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مواخذہ کو رسم کی طرف سے جواز ملتا تھا۔ بعد میں (Lex Talionis) "قانون مواخذہ" کے لحاظ سے یہ اصول بن گیا کہ جس قدر ضرر پہنچائی جاتی ہے اس کی پوری تلافی ہونی چاہیے اور اجتماعی ذمہ داری کے اصول کے لحاظ سے تو بدلہ لینے والوں کے لئے یہ بھی کافی ہوگیا کہ خود قاتل کی بجائے کسی اور کو قتل کردیں مثلاً اس کے بھائی کو یا بعض صورتوں میں قبیلے کے کسی فرد کو۔ جب "بدلہ" کا یہ ادارہ بہت منظم ہوگیا تو ایک قاتل گروہ اپنے کسی فرد کی موت کو بدلے میں گوارا کرنے لگا کیونکہ اس کے بعد مزید مواخذہ کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مواخذہ کی تہدید اس صورت میں بھی استعمال ہوتی ہے جبکہ ایک شخص دوسرے کو کوئی ضرر پہنچاتا ہے چنانچہ خاص حالات میں ایک شخص کو حق ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کو دوئل لڑنے کی دعوت دے۔ آسٹریلیا کے قبیلوں میں جب کوئی فرد کسی دوسرے کو [illegible] ضرر پہنچاتا ہے تو متضرر کا یہ حق

ہے کہ بزرگوں کی اجازت کے بعد ضرر پہنچانے والے سے مماثل قسم کا بدلہ لے لے۔ مثلاً اس پر برچھی یا بھالا پھینک دے یا جسم کے ایسے حصہ پر جو جان لیوا نہ ہو، مثلاً ران پر برچھی چبھو دے۔ مواخذہ کی تہدید کی تمام مثالوں میں رسم کا ایک ضابطہ معلوم ہوتا ہے کہ متضرر کے نقصان کی تلافی کی جائے اور اس کے لئے عام طور پر ضرر رساں شخص کو مماثل قسم کا ضرر پہنچایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق پر حملہ ہو تو اس کی تلافی کی جاتی ہے اور متضرر شخص کے ذہن سے یہ بات نکال دی جاتی ہے کہ اسے ضرر پہنچایا گیا ہے کہ اسے بدلہ لینا ہے۔ بہت سے معاشروں میں مواخذہ کی بجائے تاوان کی قرارداد کا بھی ایک طریقہ کار ملتا ہے یعنی ضرر پہنچانے والے اشخاص متضرر فریق کو چند قیمتی اشیاء دیتے اور اس کو نقصان کی حد تک مطمئن کردیتے ہیں۔ اس طریقہ پر متضرر کی اطمینان دہی ماقبل تحریر معاشروں میں کافی رائج معلوم ہوتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان سے آج تک کوئی نظام قانون نمو نہ پا سکا۔

قانون کی ابتدا اور اس کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان قدیم قبیلوں کا مطالعہ بہت دلچسپ اور مفید ہو سکتا ہے جو آج بھی اپنی قدیم روایتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی کیلیفورنیا کے بعض شکاری قبیلے جو "یوروک" کے نام سے مشہور ہیں اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بستے ہیں اور ان کی کوئی سیاسی تنظیم نہیں۔ قوم کے خلاف کوئی فعل یا جرم سرزد ہو جائے تو اس کے لئے ان کے ہاں کوئی ضابطہ مقرر نہیں اور اسی لئے ان کے ہاں عام [illegible] کا کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ اگر ایک سے دوسرے کو ضرر پہنچے یا ایک شخص دوسرے پر حملہ کرے تو عام رسم کے مطابق [illegible] تاوان کی قرارداد [illegible] کا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی جاندار [illegible] پر حملہ [illegible] صورت میں مماثل تاوان سے پابجائی کی جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کو [illegible] جائے تو تاوان یا خون بہا مقتول کے [illegible] ادا کیا جاتا ہے۔ اگر آپس میں جنگ ہو جائے تو [illegible] کا فرض ہوتا ہے کہ دوسرے

فریق کے مقتول لوگوں کا خون بہا ادا کرے۔ صرف امر واقعہ اور ہرجانہ کی رقم دیکھی جاتی ہے اور نیت' ارادے' کینہ' غفلت یا عداوت پر غور نہیں ہوتا۔ اگر ایک مرتبہ تاوان قبول کرلیا جائے تو متضرر شخص اسی ضرر کی بابت مزید شکایت کا مجاز نہیں۔ چونکہ "تاوان" متعلقہ اشخاص کے مابین مصالحت کی بنا، پر طے ہوتے ہیں اور کسی عدلیہ کے حاکم کے پاس معاملہ نہیں جاتا اس لئے یہاں صحیح معنوں میں خانگی جنایات کا وجود نہیں۔ ٹھیک اسی طرح فلپائن کے بعض قبیلوں کی حالت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ شمالی لوزان (Luzon) کے پہاڑی علاقوں میں اناج بونے والے لوگ جن کو "افوگاؤ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سیاسی لحاظ سے پست قوم ہیں اور ان میں خاندانوں یا قبیلوں کا بھی کوئی نظام نہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ مضرتوں کی صورت میں معاشرہ کوئی سزا تجویز نہیں کرتا بلکہ رائے عامہ ہی سزا کا کام کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے ہاں عام جنایات کا کوئی قانون نہیں پایا جاتا۔ اور کوئی حقیقی تعزیری تہدید بھی موجود نہیں۔ تاہم بعض اصول قابل ذکر ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنے خاندان کے کسی فرد پر جادو کردے تو اسے خاندان والے موت کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن بھائی بہن سے فعل بد کا مرتکب ہو تو یہ کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔ پدر کشی یا برادر کشی کی صورت میں بھی کوئی سزا نہیں دی جاتی گو ممکن ہے کہ ان افعال کی روک تھام کے لئے اہم مذہبی تہدیدیں موجود ہوں۔ اگر ایک شخص دوسرے پر حملہ کردے یا ایک دوسرے کے حق کو متاثر کرے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دونوں افراد کے خاندان ایک دوسرے کے حق کو متاثر کرے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دونوں افراد کے خاندان ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور ان میں ماں اور باپ دونوں طرف کے تین درجوں تک کے رشتہ دار تو لازمی طور پر فریق بن جاتے ہیں۔ قتل، زنا، قرضہ اور تاوان کی ادائی وغیرہ کی صورت میں مواخذہ یہی ہے کہ خاطی یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ دوسرے افعال کے لئے تاوان کی ادائی کافی سمجھی جاتی ہے۔ ان قبیلوں میں عدلیہ کی کوئی ایسی ہستی موجود نہ تھی جس کے روبرو نزاعات لائے جاسکیں۔ عام طور پر تصفیے ایسے بزرگ کے ذریعہ ہوتے ہیں جن کو متعلقہ فریقین سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بعض اشخاص اپنی دیانت داری اور غیر جانبداری کے باعث شہرت بھی رکھتے ہیں اور انہی کے پاس بہت سی نزاعات فیصلے کے لئے آتی ہیں لیکن یہ اشخاص کسی طرح مقتدر نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ پوری قوم کی کسی طرح نمائندگی کرتے ہیں۔ تنازعہ کے دوران میں دونوں فریق اس لحاظ سے ایک دوسرے کے مخالف تصور کئے جاتے ہیں لیکن جب باعث نزاع دور ہوجائے یا باہمی تصفیہ ہوجائے تو پھر صلح ایک خاص رسم کے ساتھ ہوتی ہے۔ تصفیوں کے لئے رسم و رواج ہی کوئی معیار مقرر کرتا ہے۔ اور خاص صورتوں میں تو اشخاص کی حیثیت کے لحاظ سے یہ معیار بدلتا بھی رہتا ہے۔ مثلاً مالدار کے لئے ایک اوسط طبقہ کے لئے ایک اور غریب کے لئے ایک ہی افوگاؤ کی عدل گستری نظام کا رہے اس سے کوئی نظم قانون ترتیب نہ پاسکا کیونکہ کسی عدلیانہ اقتدار کا وجود ہی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جب مسلمہ ثالث یا حاکم عدالت موجود ہوں اور وہ شہادت کی جانچ پڑتال کے بعد جرمانہ یا ہرجانہ کی بابت فیصلہ کریں تو اس سے ایک نظام قانون کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ البتہ ایسی صورت میں صرف اس عاقلانہ اقتدار کی کمی ہوتی ہے جو ان فیصلوں کی پابندی کروا سکے۔ اگر غور کیا جائے تو بعض معاشروں میں خانگی یا خاص جنایات کے تصفیوں کے ذریعہ ہی کوئی نظام قانون نشو و نما پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تصفیے ثالثوں کے سامنے آتے ہیں اور ثالث رسم کے بنائے ہوئے قواعد عمل کا اعلان کرتے ہیں اور پیش شدہ معاملہ پر اس کو منطبق کرتے ہیں۔ ثالثوں کی یہی عدالتیں رفتہ رفتہ باقاعدہ قانونی عدالتیں بن جاتی ہیں اور پھر معاشرے

میں ایک مخصوص ضابطہ بھی نظر آتا ہے جس کے ذریعہ فیصلوں کی تعمیل کروائی جاتی ہے۔

مشرقی افریقہ کے بعض قبیلوں کا بھی مطالعہ کیا جائے تو قانون کا نشوونما اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اکمبا، کِکویا، تھرکا اور باتو لوگوں کے [illegible] جو ماؤنٹ کینیا کے جنوب اور جنوب مشرق میں رہتے ہیں اس سلسلے میں دلچسپ ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں، مویشی اور بکریاں پالتے اور اناج بوتے ہیں۔ ان میں کوئی سردار یا بزرگ خاندان نہیں ہوتا اور یہ لوگ عمر کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں منقسم ہیں۔ ان میں ایک طبقہ معمر اور بزرگ لوگوں پر بھی مشتمل ہے جو مذہبی پیشوائی اور [illegible] کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جب کسی شخص [illegible] وجہ ہو کہ کسی دوسرے نے اسے کسی قسم کا نقصان پہنچایا ہے یا اس کے حقوق متاثر ہوئے ہیں تو ضرر پہنچانے والے اور متضرر دونوں فریقوں کی طرف سے [illegible] ضلع کے جہاں وہ رہتے ہیں، تمام بزرگ بلوائے جاتے ہیں اور اس طرح اس عدالت کے روبرو معاملہ پیش ہوتا ہے۔ یہ عدالت ابتدا میں تو صرف ثالثی کے طور پر کام کرتی ہے اور عام رسم کے قائم کردہ اصول انصاف کے مطابق تصفیہ کرتی ہے اور تصفیہ کے بعد اپنے فیصلہ کی تعمیل کروائے بغیر معاملہ کو خود متضرر فریق کے سپرد کرتی ہے کہ وہ خود اپنے حریف سے نمٹ لے۔ البتہ بعض خاص اور سنگین معاملوں میں جب کہ کسی حملہ یا فعل سے پورا فرقہ یا قوم متاثر ہوتی ہے، یا جب کہ ملزم کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہے یا یہ کہ قوم کے لئے اس کا وجود خطرناک ہے اور اس طرح اس ایک فرد کے فعل کو پوری قوم کے خلاف سمجھا جاسکتا ہے تو پھر بزرگوں کی یہ جماعت عاملانہ اقتدار استعمال کرتی اور خود اپنے فیصلے کی تعمیل کرواتی ہے۔ یہ بزرگ دراصل اپنے مذہبی اقتدار سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ان کے فیصلے کو ماننے سے انکار کرے تو اس پر لعنت یا پھٹکار بھیجتے ہیں جس سے ان کے عقیدے کے مطابق مافوق فطرت سزا اتر آتی ہے۔ ایک خاندان کے کسی فرد کو دوسرے خاندان کا کوئی فرد جان سے مار دے، خواہ ارادی طور پر یا حادثے میں، تو "بزرگوں کی عدالت" اس فعل کو خانگی یا خاص جنایت سمجھتی ہے اور مقتول کے رشتہ داروں کو تاوان دے کر مصالحت کرتی ہے اور یہ تاوان قاتل یا اس کے رشتہ داروں سے دلوایا جاتا ہے۔ عام جنایات سے متعلق بھی ان بزرگوں کو ایک ضابطہ کے تحت اختیارات ہوتے ہیں جسے کنگال یا موتاں (Kingolle or [illegible]) کہا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص پر جادو کا الزام ہو یا وہ عادی مجرم ہو اور اس طرح اس کا وجود عوام کے لئے خطرناک ہو تو بزرگوں کو اختیار ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو موت کی سزا دیں یا اس کے گھر بار کو تباہ کرکے اسے اپنے ضلع سے باہر کردیں۔ لیکن ایسی سخت سزا سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ دور دور کے تمام بزرگ اکٹھے ہو کر اس کا فیصلہ کریں۔ نیز خاطی کے اہل خاندان کا بھی اس پر رضامند ہونا ضروری ہے۔

اکمبا لوگوں کے برخلاف مغربی افریقہ کے اشانتی فرقہ میں عام جنایات کا ایک منظم قانون ملتا ہے جو مقامی زبان میں ایک خاص لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں "امور جو قبیلے میں نفرت سے دیکھے جاتے ہیں"۔ ان میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ یعنی قتل، خودکشی، نسلی یا ازدواجی رشتوں میں بعض جنسی تعلقات، خاص قسم کی گالی گفتار، جان پر حملہ، چوری، کسی سردار پر پھٹکار بھیجنا، بغاوت، بزدلی، جادوگری، مسلمہ قبائلی رسم و رواج کی خلاف ورزی اور مرکزی اقتدار کے حکم کی خلاف ورزی۔ اشانتی تصور قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام افعال دراصل مقدس یا مافوق فطری طاقتوں کے خلاف سرزد ہوتے ہیں اور ان ہی طاقتوں پر پوری قوم کی بقا ہے اور جب تک ان ناجائز افعال کو خاطی کی سزا کے ذریعہ روکا نہ جائے، پورا قبیلہ مبتلائے آلام رہے گا۔ عدلیانہ اقتدار کے متعلق تصور یہ ہے کہ یہ بادشاہ یا سردار کو حاصل ہوتا ہے

ایک مقدس تخت یا چوکی پر انصاف کرنے بیٹھتا ہے۔ اسی کے سامنے خاطی کو سزا سنائی جاتی ہے۔ زیادہ سنگین افعال کی صورت میں سر کاٹنا ہی ایک سزا ہے تو بعض صورتوں میں خاطی اور اس کے رشتہ دار خاطی [illegible] خرید سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جرمانہ یا نقصان ادا کر کے اس کی جان بچائی جاتی ہے۔ بزرگوں کی عدالتیں خانگی یا خاص جنایات کی صورت میں کوئی قوت استعمال نہیں کرتیں بلکہ یہ صرف "نزاعات" ہیں جن کے تصفیے یا تو خاندان کے صدر کرتے ہیں یا آپس کے سمجھوتے سے نزاع ختم کی جاتی ہے۔ خانگی جنایات سے متعلق بھی کوئی نزاع سردار کے سامنے لائی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی متعلقہ فریق نے قسم اٹھائی ہو تو وہ عام جنایات میں داخل ہے اور اسی لئے سردار کے روبرو یہ معاملہ پیش کیا جاتا ہے۔

بہرحال ان قبیلوں کے مطالعہ سے بعض کام کی باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں۔ اگر کمبا کے بزرگ خانگی جنایات سے تعلق رکھتے ہیں تو اشانتی کے سردار عام جنایات کی صورت میں اپنا اقتدار استعمال کرتے ہیں۔ افریقہ اور دوسرے ملکوں میں بعض قبیلے اور فرقے ایسے بھی بستے ہیں جن کے سردار یا بادشاہ ان دونوں قسم کے قوانین پر اقتدار رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مرکزی اقتدار خانگی اور عام جنایات دونوں پر قابو رکھتا ہے۔ ان مختلف فرقوں میں ضابطہ کے لحاظ سے فرق بھی کیا جا سکتا ہے۔ خانگی جنایات کے قانون میں اشخاص یا اشخاص کے گروہوں کے مابین تنازعوں کی صورت میں قانون عدالت کے روبرو معاملہ لایا جاتا ہے۔ عام جنایات کے قانون کے لحاظ سے خود مرکزی اقتدار کی جانب سے اقدام ہوتا ہے اور خود اپنی طرف سے مرکزی مقتدر ہستی ملزم کے خلاف چارہ کار اختیار کرتی ہے۔

راست طور پر جو وہ تعزیری [illegible] دیوانی قوانین علی الترتیب عام جنایات اور خانگی جنایات کے قوانین سے ماخوذ ہیں۔ [illegible] یہ ہے کہ [illegible] افعال آج عام جنایات کے تحت آتے ہیں [illegible] چوری [illegible] افعال [illegible] خانگی جنایات کے [illegible] اور [illegible] جنایات [illegible] اور بدکاری [illegible] شامل تھی۔

[illegible] کی منزلوں میں [illegible] اور مذہب [illegible] سزا [illegible] اور قانونی [illegible] اسی لئے [illegible] سمجھنے کے لئے معاشری [illegible] مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

اس مضمون کی تیاری میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

(۱) ایمیل ڈرک ہائیم — [illegible] پیرس ۱۸۹۳ء

(۲) البرٹ کوکورک [illegible] — ایولیوشن آف لا، ۳ جلد، بوسٹن ۱۹۱۵ء

(۳) سڈنی ہارٹ لینڈ — پریمیٹو لا، لندن ۱۹۲۴ء

(۴) مالی نوسکی — کرائم اینڈ کسٹم ان سیویج سوسائٹی، نیویارک ۱۹۲۶ء

(۵) [illegible] ہیلر — دی ٹرائب اینڈ انٹر ٹرائبل ریلیشنز ان آسٹریلیا (لندن ۱۹۱۰ء)

(۶) ہابلی — بانتو بیلیفز اینڈ میجک (لندن ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۹ء)

(۷) آر ایس رٹرے — اشانتی لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن (آکسفورڈ [illegible])

(۸) ایل [illegible] — افریکن ریسس (لندن ۱۹۳۰ء)

عبدالحفیظ صدیقی

میٹھے ٹھگ

کر دی جنھوں نے ظاہر اپنوں سے بے نیازی   وہ بھی جتا رہے ہیں اب اپنی پاک بازی
عصرِ جدید کیا ہے؟ عہدِ ریا طرازی   ہے فن کی حیثیت سے رائج زمانہ سازی
اُن دہریوں سے کرتا کیونکر نہ میں کنارا
مہر و وفا کی رسمیں ہیں جن کو ناگوارا

داتا۔ شریف داتا۔ کہتے چلے ہیں جھٹ پٹ   آقا۔ عزیز آقا۔ ہر آن ہے یہی رٹ
کیوں کھیلتی نہ ان کے چہروں پہ مسکراہٹ   ہے جلبِ منفعت کا راز ان کی ہر بناوٹ
دلواتی ہے انھیں زر ان کی زمانہ سازی
ہیں خوگرِ خوشامد مصروفِ دل نوازی

ظالم دکھا رہے ہیں اس شان کا تحمّل   غیظ و غضب سے گویا ناآشنا ہیں بالکل
بیجا خوشامدوں سے دیتے نہیں کسے جُل   جُل دے کے ڈھونڈتے ہیں یہ حلقۂ گل و مُل
سامانِ عیش و عشرت کرتے ہیں یوں فراہم
طومار باندھتے ہیں کذب و ریا کا باہم

بے سود پیش کرتے کیوں شکل اعتراضی   مفتی ہے ان کے بس میں ان کے اثر میں قاضی
حال ان سے بن رہا ہے جیتیو کا عہدِ ماضی   ہر شخص کو یہ میٹھے ٹھگ کر رہے ہیں راضی
غمخوار بن کے جن کو دیتے رہے دلاسے
لیتے ہیں جان اسی کی عبرت فزا ادا سے

علی منظور

کالج کی لاری

ذکیہ کالج کی لاری کا انتظار کرتی ہوئی پارک میں ٹہل رہی تھی۔ ہم بھی اسی طرف نکل پڑے۔ ہم کو دیکھتے ہی ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ہم ان کے قریب پہنچے۔ ذکیہ ادھر دیکھو۔ ہماری طرف ——— ان کا چہرہ اور بھی سرخ ہوگیا۔ تیز لہجہ میں انھوں نے کہا ——— ہم آپ سے ناراض ہیں۔ سخت ناراض۔ آپ کی حرکت ہمیں پسند نہیں۔ کیوں آپ نے ہماری سہیلیوں کو چھپ چھپ کر دیکھا؟ اوہو اتنی سی بات۔ خوب اتنی سی بات انھوں نے ملتز کی۔ ہم ہنس پڑے۔ توبہ توبہ ہم سے بڑی بھول ہوئی۔ خدا بچائے ان لڑکیوں سے، انھیں دیکھ کر میری آنکھیں دکھنے لگیں ——— مس قریہ، انھیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہاتھی جھوم رہا ہے۔ مس فیشن! وہ تو سوسائٹی کا عجیب نمونہ تھی۔ ان کے وہ ترشے ہوئے بال، تھپا ہوا پوڈر، پینٹ کئے ہوئے ناخن، ان کا لنگڑا کر چلنا، بات بات پر قہقہے، ہر قہقہہ پر بل کھانا۔ انھیں دیکھ کر مجھے ہول ہونے لگی ——— بس کیجئے۔ اب میں نہیں سن سکتی ——— بیزاری کے لہجہ میں انھوں نے کہا۔

ارے صاحب اور سنیئے، وہ آپ کی مس فلسفہ! ان کی وہ دھنسی ہوئی آنکھیں لمبوترا چہرہ، چڑھی ہوئی عینک پچکے ہوئے گال، بغل میں موٹی موٹی کتابیں، مطالعہ کا غیر معمولی شوق۔ اف بچاری خدا جانے وہ زندہ کیسے ہے۔ ارے وہ آپ کی مس شاعرہ! انھیں تو میں بھول ہی گیا مجھے وہ تو کسی بیسویں صدی کی شاعر کی نانی، دادی جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ نہ کپڑے، ان کا سلیقہ اور نہ اٹھنے بیٹھنے کا تمیز ——— غیر شاعرانہ انداز کرخت آواز۔ بے ڈھب لہجہ، غیر قافیہ کلام، بے معنی فضول ان کا اکڑ اکڑ کر پڑھنا۔ واہ واہ پر جھومنا ——— میں نے تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ سچ کہتا ہوں ذکیہ تمھاری سہیلیوں کو دیکھ کر بجائے مسرت کے سخت تکلیف ہوئی۔

بتا دیجئے، میں اپنی سہیلیوں کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ ہیں کون ان کی برائیاں گنانے والے۔ کبھی اپنے دوستوں پر بھی غور کیا ہے ——— مجنون نما لڑکے سنکائے ہوئے بدن، پھٹے ہوئے لباس۔ لڑکیوں جیسے بال، اترے ہوئے چہرے، پتلی پتلی گردنیں، دھنسی ہوئی آنکھیں۔ ہونٹوں میں سگریٹ، زبان پر ہر وقت لڑکیوں کے تذکرے ——— ہم نے قہقہہ لگایا۔

ثریا ادھر آنکلی ——— کیا ہو رہا ہے۔ آیا گاڑی ابھی تک نہیں آئی ——— دیکھا ثریا یہ میری سہیلیوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کی برائیاں گناتے ہیں۔ ثریا ہنس پڑی۔ بھائی صاحب بتائیے تو صحیح، ان میں سے آپ نے کونسی لڑکی پسند کی ——— ہم بتائیں ——— ہم نے شاہانہ مسرت سے کہا۔ وہ لڑکی جس کی انگلی میں انگوٹھی ہے ... ذکیہ شرماگئی۔ ثریا، ذکیہ کو گدگدانے لگی ——— لاری کی کرخت آواز سنائی دی۔ دونوں آواز کی طرف دوڑ گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ساری خوشیاں ان کے ساتھ چلی گئیں، میں لاری کو دیکھتا رہا۔

سید محی الدین احمد

ایک شام

دور ——— کہیں دور سے مغرب کی اذان رات کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ خاموش فضا میں اس دلفریب آواز کو سن کر درخت گویا جھوم اٹھے اور اپنا سر اس مالکِ حقیقی کے سامنے جھکا دیا تھا۔ میں بھی قدرت کی یہ معبودیت دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر میں اوپر بالاخانے پہ چلی آئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی...... ایک حسین خاموشی میں بھی کتنی دلفریبیاں پوشیدہ ہوتی ہیں...... اسی خاموشی کی بدولت ہر چیز آج دو گنی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ پارک کی طرف سے ایک مدھم موسیقی کی لہر اس خاموشی کو چیرتی مگر اس کے حسن کو دوبالا کرتی گزر رہی.... شاید کسی نے ریڈیو لگایا تھا۔ شام کے وقت قدرت کتنی حسین اور معصوم ہوتی ہے.... غم، رنج، موت، بے کسی، آنسو، مسکراہٹ، ہر ایک سے بے نیاز قدرت ہمیشہ حسین رہتی ہے۔ وہاں دور ساحل کے اونچے اونچے درخت، موسیقی کی لے کے ساتھ جھومتے ہوئے کتنے دلکش معلوم ہوتے ہیں اور ابھی شاید پندرہ دن بھی نہیں گزرے جبکہ یہاں یہیں تو آگ کے شعلے بلند تھے..... اُف.... وہ خوفناک شعلے! جنھوں نے گویا عہد کر لیا تھا کہ جب تک ہر چیز کو جلا کر بھسم نہ کر دیں گے چین نہ لیں گے..... یا اللہ وہ دن جبکہ قدرت کو اپنے پورے قہر و غضب کی حالت میں ہم نے دیکھا تھا اور اس کے سامنے کتنی ہی خوبصورت اور عالی شان عمارتوں نے سر جھکا دیا تھا...... آج بھی وہ منظر یاد آ گیا تو روح لرز گئی..... کتنا دل ہلا دینے والا نظارہ تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی تمام عمر کی پونجی جل رہی تھی۔ خاک ہو رہی تھی اور غریب لوگ چیخنے چلانے کے سوا کچھ کر نہیں سکتے تھے...... اور اس ہیبت ناک ڈرامے کو دیکھنے کی خاطر ہمارے بھی ہمسائے اسی بالاخانے پر جمع ہو گئے تھے۔ سائنس بھی جس پر کمزور انسانوں کو بہت ناز ہے تھوڑی دیر کے لئے ہمت ہار گئی تھی۔ پہلے ایک پھر دو، تین...... پورے سات مشین ایک ساتھ کام کر رہے تھے اور آگ کے شعلوں کو یہ انجنوں کا پانی گویا سمندِ ناز پر تازیانہ تھا..... اور آج کتنی خاموشی چھائی ہوئی ہے...... لیکن اس قیامت خیز دن وہ ہنگامہ جبکہ ستون آگ کی تاب نہ لا کر دھماکے سے گرتے تھے اور اس دھماکے سے ہم اتنی دور کھڑے ہوئے بھی لرز جاتے...... کیسے کیسے تناور درخت جل کر بیٹھ رہے تھے.... اے آر پی والوں کا ہجوم...... ریڈ کراس کی لاریاں...... زخمیوں کی چیخ پکار، گھر کے مالکوں کے دلدوز نعرے...... ماؤں کا اپنے بچوں کے لئے تڑپ جانا..... رعنا تو چیخیں مار مار کر رونے لگی تھی...... اور پروین ہر درخت کے گرنے پر ایک ہائے کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتی تھی..... میرے خدا..... نہ جانے کیسے بے حس ہیں وہ لوگ جو ایسے منظر کو دیکھتے ہوئے بھی ہنس سکتے ہیں......

رعنا۔ وہ شگفتی تو آئی نے بھانے کی کوشش کی.... مگر بیگم طاہرہ ہنسا پڑیں۔ میں حیرت سے منہ تکنے لگی تھی "اری دیوانی تم کیوں رو رہی ہو۔ تمھارا گھر تو جلا نہیں جا رہا ہے...... کیسی چھوٹی بچی بنتی ہو" اور یہ سب ہنس ہنس کر..... میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی ان کو ایک طمانچہ لگا دے.... مگر میں نے سوائے انتہائی نفرت سے منہ پھیر لینے کے اور کچھ نہ کہا اور پھر ان شعلوں کو تکنے لگی تھی...... اُف! وہ خون سے زیادہ لال اور تلوار سے زیادہ تیز شعلے کس کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے... اور اس کڑکتی دھوپ میں ہم نے خدا کے دربار میں ہاتھ اٹھا دیئے تھے کہ یا اللہ اپنے ان بندوں پر رحم کر اور پھر دیوانہ وار آسمان پر ابر کو تلاش کرنے لگے مگر وہاں ابر کا نام و نشان نہ تھا..... اور آگ برابر بڑھتی گئی اور بیگم طاہرہ مسکراتی رہیں......

آخر عارف نے چیخ مار کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس امید موہوم پر تیز بھاگے کہ شاید ان بے کسوں کی کچھ مدد کر سکیں۔

مگر بیگم طاہرہ تو مسکراتی ہی رہیں اور "کتنا خوبصورت منظر ہے" کے سوا اور کچھ نہ کہا ...... اور یقیناً ایسا ہی تو تھا. مگر انسانوں کی مصیبت نے اس خوبصورتی کو دیکھنے کی فرصت نہ دی تھی۔

اور اتنا جلد ہی پھر سکون اور اطمینان چھا گیا ہے. فطرت پھر مسکرانے لگی ہے...... اس حسین و پرکیف ماحول میں وہ سب ایک پریشان سا خواب معلوم ہوتا ہے...... کاش کہ وہ سچ مچ ہی خواب ہو سکتا مگر وہ تو حقیقت ہے ایک تلخ اور ہوشربا حقیقت...... اب بھی جبکہ فطرت اتنی جاذبِ نظر ہو کر گویا ان زخموں کا اندمال کرنا چاہ رہی ہے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جن کی زندگیاں صرف اس ایک دن میں تباہ ہو کر رہ گئیں. عارف ہی نے تو شام کو لوٹ کر بتایا تھا کہ رشید صاحب دلیری سے آگ میں کود کر اپنا "سیف" اٹھا لائے جس میں ہزاروں روپیوں کے نوٹ تھے. مگر جب تک وہ اندر گھس کر اپنا ایک اور صندوقچہ بھی اٹھا لائیں وہ نوٹ سارے کوئی اٹھا کر کھسک گیا...... اور اس دوہرے صدمے کی تاب نہ لا کر احمد میاں بیہوش ہو کر گر پڑے ...... اور عبدالصمد صاحب بڑی مشکل سے اپنا "سیف" باہر اٹھا لائے اور اب اسی پر بیٹھ گئے ہیں۔ کسی کو قریب بھی نہیں آنے دیتے تھے کہ کہیں یہ بھی چلا نہ جائے. کوئی ہمدردی ظاہر کرتا ہے تو صرف آنسو بہنے لگتے ہیں. آدمیوں کا ہجوم ہے. لوگ جلتے مکانوں سے سامان لا کر پھینکتے ہیں جو فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے

عارف کی آواز سے شوخی مفقود ہو چکی تھی' ان کا شریر اور مسکراتا ہوا چہرہ بیحد غمگین اور تھکا ہوا نظر آتا تھا۔

اور سچ مچ وہ مصیبت ...... !! کیا یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ سامنے ہزاروں انسانوں کی زندگیاں تباہ ہوتی رہیں' اور پھر بھی مسکرایا جائے ہاں اگر بیگم طاہرہ ایسی ہوں تو...... مگر یہ کیا! میں یہ کیا سوچنے لگی ...... یہ دلفریب اور خوشگوار شام ان رنجیدہ خیالوں کے لئے تو نہیں .... اور پھر بیگم طاہرہ کے نرم دل یا سخت دل ہونے سے آگ تو بجھی نہ تھی ...... میں نے سر کی ایک جنبش سے ان خیالوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور چونکہ اندھیرا ہونے لگا تھا اس اداسی کو دور کرنے کی خاطر جو ان غمگین خیالوں سے پیدا ہو گئی تھی ایک فلمی طرز نہایت ہی بے پرواہ انداز سے گاتی ہوئی نیچے اترنے لگی امی جان ابھی نماز سے فارغ نہ ہوئی تھیں. بنگلہ آج بہت خاموش نظر آ رہا تھا. ابا جان اور الطاف بھیا کسی کام پر صبح ہی سے گئے ہوئے تھے. رشید اور سلیم بھی انہیں کے ساتھ تھے اور در اصل ان دو شریروں کی غیر موجودگی ہی کے باعث آج اتنا سکون اور شاید افسردگی بھی چھائی ہوئی تھی. میں اپنے کمرے میں چلی آئی. گو قریب قریب اندھیرا ہونے لگا تھا مگر کھڑکی میں سے باہر قدرت کی لطافت اور نیرنگیاں نظر آ رہی تھیں...... ریڈیو کونے میں گویا زبانِ حال سے خاموشی پر ماتم کرتا نظر آ رہا تھا. مگر دل نے نہ چاہا کہ ریڈیو لگاؤں۔

شمیمہ اسمعیل شریف

رات کا بھولا اور دیگر افسانے :- پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔

طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

غزل!

ابھی محبت کی ابتدا ہے دلوں کے ارماں نکل رہے ہیں
ابھی ہے آغازِ مستیوں کا شراب کے دور چل رہے ہیں

عجیب برسات کا سماں ہے، نظر کو ہر وقت یہ گماں ہے
کہ حسن انگڑائی لے رہا ہے حسین کپڑے بدل رہے ہیں

ابھی جوانی پہ ہیں امنگیں، دلوں میں ہیں سیکڑوں ترنگیں
جو دو چراغ آج بجھ رہے ہیں تو دس چراغ اور جل رہے ہیں

خدا ہی جانے کہ رنگ بدلیں گے ولولے عہدِ نو کے کتنے
ابھی تو گہوارۂ تمدن میں دل کے ارمان پل رہے ہیں

وہ دیکھ! ماضی کے دوش پر ہیں ہزارہا ایسی داستانیں
جنہوں نے دل قوم کا جلایا وہ نارِ دوزخ میں جل رہے ہیں

نہ آمریت کے گا ترانے، یہ راگ اب ہو چکے پرانے
مذاقِ عالم بدل چکا ہے نظام سارے بدل رہے ہیں

قدم قدم پر تھا خوفِ طوفاں، جگہ جگہ تھا فنا کا ساماں
مگر زہے عشق تیری ہمت مرے ارادے اٹل رہے ہیں

تھے جن کے اسلاف عیش پرور، ہیں ان کے اخلاف اب گداگر
امیر زادوں کے دل کے ٹکڑے یتیم خانوں میں پل رہے ہیں

سلگ رہے ہیں ابھی ہمارے دلوں کے آتش کدے مسلسل
جلا چکے تھے ابھی جو ہم کو اب ان کی باری ہے جل رہے ہیں

نہیں زمانے سے کوئی شکوہ، گلہ ہمیں ہے تو صرف یہ ہے
تری نظر میں بھی ہم برنگِ شکایتِ بے محل رہے ہیں

ہوئی سحر ختم پر ہے محفل، اٹھو کہ افسر اچاٹ ہے دل
نہ حسن میں اب وہ دل کشی ہے نہ زلف میں اب بل رہے ہیں

افسر

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو پشاور)

خطبۂ صدارت

نواب ڈاکٹر سر امین جنگ بہادر

(جو اردو کتب خانۂ اسلامیات کے افتتاحی جلسہ منعقدہ ۶ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ کو پڑھا گیا)

یور اکسلنسی خواتین و حضرات!

مجھے اجازت دی جائے کہ میں سب سے اوّل اپنے کرم و محترم دوست عالی جناب ڈاکٹر سر سعید الملک بہادر بالقابہ کا شکریہ ادا کروں کہ یہاں تشریف فرما ہو کر اس کتب خانۂ اردو کے حامی و معاونین کی ہمت افزائی فرمائی۔ ثانیاً میں اپنے کرم فرما ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ صاحب کی کوشش کی تحسین کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک ولی اللہ کے مزار مبارک کی خانقاہ شریف کو فیض بخش منبع اور ہمیشہ کے آباد رکھنے کے لئے یہاں ایک اردو کتب خانۂ اسلامیات قائم کیا۔ اردو زبان میں علوم اسلامی کافی تعداد میں موجود ہیں اور ضرورت تھی کہ ایک ایسا مرکز قائم ہوتا جہاں اردو کی تمام اسلامی کتابیں محفوظ رہتیں۔ ثالثاً میں ان طلبہ اور اصحاب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کو مطالعہ و کتب بینی کے شوق نے کتابوں کے کیڑے کہے جانے کا مستحق بنا دیا ہے۔ ان کے واسطے میں خود اپنی نظیر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

اگر آپ حضرات ایک ہشتاد و چہار سالہ بوڑھے کی خودی یا خودستائی معاف کریں تو میں اپنے کتب خانہ کی مختصر کیفیت بیان کروں گا کہ کب اور کس طرح مجھے کتابوں سے محبت پیدا ہوئی اور میں کس طرح ان کے جمع کرنے کے شوق میں مبتلا رہا۔ ستّر سال قبل میرے مدرسے کے تقسیم انعامات کے جلسے میں کوئین وکٹوریہ کے چچا ڈیوک آف بکنگھم گورنر مدراس کے ہاتھ سے مجھ ۱۲، ۱۳ سالہ لڑکے کو ایک چھوٹی سی کتاب بطور انعام دوم ملی۔ اس جلسے اور کتاب کا میرے دل پر ایسا اور اس قدر اثر ہوا کہ میں نے اسی وقت اپنے دل میں ٹھان لی اور پکا ارادہ کرلیا کہ ہر سال ہر جماعت میں اور ہر امتحان میں پہلا یا دوسرا ہو کر کتابوں کا انعام لیتا رہوں گا۔ اس کے بعد چند ہی سالوں میں میرے ارادے کا ارتقاء ہوا۔ انعام کی کتابوں سے دو ایک صندوق یا الماری بھر دی جائے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کا فضل و کرم ایسا میرے حال میں شامل رہا کہ مجھے ہر سال ہر کلاس میں ہر امتحان میں بچوں کی جماعتوں سے شروع کرکے ایم اے کی جماعت تک مڈل اسکول کے امتحان سے شروع ہو کر ایم اے کے امتحان تک اول، دوم یا سوم درجے کے انعامات کتب کے علاوہ رقمی انعامات مثلاً کو بنگھم پرسری ماہانہ دس روپے کی، لمرس پرائز نقد سو روپے کا وغیرہ ملتے رہے۔ حتیٰ کہ مدراس یونیورسٹی کا بڑے سے بڑا (گورنرس اسکالرشپ) ماہانہ (۳۹) روپے کلدار کا بھی مسلسل چار سال تک ملتا رہا۔ میرے والد ماجد نے مجھے اجازت دیدی کہ میں اپنے اسکالرشپ کی رقم جیسا چاہوں خرچ کروں پھر کیا تھا کہ میں اس ماہانہ رقم کا نصف اپنے ساتھی غریب طالب علموں کے کتب اور فیس کے واسطے دے کر دو کر

نصف سے اپنی خواہش اور ضرورت کی کتابیں جمع کرتا رہا۔ اس زمانے سے اب تک پچاس سال سے زیادہ عرصے تک ماہانہ کم از کم پچاس روپے کے کتب خرید کر جمع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج میں ایک چھوٹا موٹا لیکن کارآمد اور مفید کتب خانے کا مالک ہونے کا ناز کرتا ہوں اور اپنے کتب خانے کو اپنا خزانہ کہتا ہوں۔ جس روز ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور کتب خانے کا ماجرا سن کر اسے دیکھنے آئے تھے تو ان سے میں نے انگریزی میں کہا کہ دنیا میں اس کتب خانے کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جس پر مجھے ناز ہو۔ میرا بڑا بیٹا کیمبرج کا آنرز ایم اے۔ خطیب محمود حسین مرحوم جو میری نجابت کا دم بھرتا تھا، اس کو میری بات ناگوار ہوئی تو اس نے فی الفور پوچھا کہ "باوا جان میں آپ کے ناز میں کہاں ہوں" میں نے جواب دیا کہ "بابا تم چیز نہ ہو آدمی ہو۔ دنیا میں تمہارے سوائے کوئی آدمی نہیں جس پر مجھے ناز ہو" رابندر ناتھ ٹیگور صاحب نے خوب ہنس کر ہم دونوں کو مبارک باد دی اور فرمایا "دونوں پر آپ کا ناز بالکل بجا ہے"

میرے کتب خانے میں عجیب، نادر یا قدیم کتب نہیں ہیں۔ اس قسم کے کتب جمع کرنے کا مجھے کوئی شوق نہ رہا۔ فقط کارآمد کتابیں جمع کی ہیں جن سے روزمرہ سیاسی، سماجی و معاشی مسائل کا جواب حل ہو سکے اور علمی و ادبی مشکلات حل ہو سکیں۔ میرے انعامی کتب فقط اتنے ہیں جتنے مستعار لے جانے والوں کی دستبرد سے بچ سکے۔ ان کے علاوہ مصنفین کے ہدیہ کے کتب ہیں۔ میں شکریے کے ساتھ معترف ہوں کہ جامعہ عثمانیہ نے تراجم و تالیفات جو مجھے تحفۃً دی جاتی ہیں اور ان کی دو الماریاں کتب خانے کو رونق بخشتی ہیں۔ مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی انجمن اردو کی بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ اس انجمن کا میں لائف ممبر کیا جا کر مدت الحیات اسیر احسان ہوں۔

ایک افسوس کے سوا اپنے کتب خانے سے مجھے خوشی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ افسوس یہ ہے کہ بہت سے احباب اور اشخاص میری کتابیں پڑھ کر ان کو واپس لا دینے کے وعدوں سے لے گئے مگر لا کر دینا بھول گئے یا لاپتہ ہو گئے۔ اگر اپنے آپ کو وعدے کے پکے ثابت کئے ہوتے تو میرے کتب خانے کا نصف حصہ جس میں علمی و ادبی کتابیں رکھی ہیں وہ آج دگنا ہوتا۔ ایسے اشخاص سے آئندہ بچنے کے واسطے میں نے اپنی کتابوں پر انگریزی قطعہ کا ترجمہ چسپاں کر رکھا ہے جس کا ترجمہ میرے لئے ڈاکٹر زور صاحب نے یوں کیا ہے جس کو میں اپنی اردو، عربی، فارسی کتابوں پر لگا کر رکھوں گا۔

"اے کتاب تو خوش آئند ثابت ہوگی اگر میرے دوست تجھ سے مستعار لے کر تجھے پڑھے، تجھے واپس کرے نہ کہ کسی اور کو مستعار دے"

غرض مجھے اطمینان اور شکر اس بات کا ہے کہ اللہ نے میری بچپن کی خواہش کو پورا کیا [illegible] میرے اس بڑھاپے میں میرے اوقات بسر ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر اپنا وقت گراں نہیں گزرتا امید ہے میرے دوست و احباب مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں کہوں کہ ان کا یہ خیال کہ [illegible] نے معمول سے زیادہ اردو کے کتب پڑھے ہیں) غلو و مبالغہ سے خالی نہیں۔ میں اتنا

(کتب پڑھنے والا نہیں ہوں جتنا کہ (کتب جمع کرنے والا) ہوں۔ مجھے پڑھنے کے شوق سے زیادہ کتابوں کی مناسب تقسیم کرکے ان کو جوڑ کر موقع و محل پر رکھنے کا شوق رہا ہے۔ میں اپنے وطن وانمباڑی کا موروثی خطیب ہوں۔ خطبہ خوانی میرا آبائی پیشہ ہے۔ اب تک میں نے خودستائی سے آپ کی مغز خراشی جو کی ہے وہ محض تشبیب ہے اس قصیدہ یا خطبہ خوانی کی کہ —

(۱) مدرسوں میں تقسیم انعامات کے جلسے بے جا و بے کار نہیں ہوتے بلکہ ان کا اثر بچوں کے دلوں پر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے جیسا کہ مجھ پر ہوا۔

(۲) آدمی کا مصمم ارادہ ذرّے کو بھی پہاڑ بنا دیتا ہے جیسا کہ انعامات لینے کا ارادہ امتحانوں میں کامیاب کرکے مجھ ناچیز کو ایک چیز بنا دیا۔

(۳) معمولی آمدنی والے، اوسط درجے کے اشخاص بھی تھوڑی سی کوشش سے اپنے گھروں میں ایک مختصر کتب خانہ اپنے اور اپنے بچوں کے واسطے مہیا کرکے اس کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوسکتے ہیں۔

(۴) انفرادی و خانگی کتب خانوں کے کتابوں کی ترتیب جمع، تفریق، تقسیم، ارتقا کے اصول پر کیسے کی جاسکتی ہے۔ میں پہلے تین باتوں کی "قصیدہ یا خطبہ خوانی" یعنی تعریف و توصیف و ترغیب میرے عزیز و معزز دوست جو اس کتب خانے کے نائب صدر ہیں نواب لیاقت جنگ بہادر کے واسطے چھوڑ دیتا ہوں۔ فقط چوتھی بات کی قصیدہ خوانی سے یعنی کتب کی مناسب و سہل ترتیب کے تذکرے سے جو میرے سالہاسال کے تجربوں پر مبنی ہے اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

کتب خانہ آصفیہ جیسے بڑے شاندار کتب خانوں کی ہزارہا کتابوں کی تجمیع، تفریق و ترتیب کے طریقے جو اہم و پیچیدہ ہیں ان کی تقلید معمولی اور خانگی کتب خانوں کے لئے مناسب نہیں ہوسکتی۔ ایسے کتب خانوں کے واسطے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو کتابوں کی تقسیم ان کے مضمون کے لحاظ سے بہت کم شعبے اور شاخوں میں ہو اور جملہ کتب اس طور سے الماریوں میں رکھی جائیں کہ جس سے ایک اجنبی بھی سہل طور سے اپنی خواہش کی کتاب دو تین منٹ میں نکال کر پڑھ سکے۔ پچاس سالہ تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ فقہ اور قانون کے کتب، ڈکشنریاں، سائیکلو پیڈیا وغیرہ جیسے فقط "حوالے کی کتابیں" ایک طرف الگ کردے کر دوسرے تمام "مطالعے کی کتابیں" محض دو (الف) و (ب) شعبوں میں تفریق کردے کر اور ہر شعبے کو تین شاخوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں (حوالے کے کتب) (متفرقات) کے نام سے الگ رکھ دے کر باقی جملہ

مطالعے کے کتب کے
دو شعبے شعبۂ علم و شعبۂ ادب

- (الف) شعبۂ علم کی تین شاخیں
  - ایک (مذہب و فلسفہ)
  - دوسری (ہیئت و ہندسہ)
  - دونوں کے بیچ میں (سائنس و فنون)
- (ب) شعبۂ ادب کی تین شاخیں
  - ایک (شعر و سخن)
  - دوسری (قصص و افسانے)
  - دونوں کے بیچ میں تاریخ و سوانح و سیاحت

اگر ذرا غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ادھر ادھر کبھی کبھی پڑھنے کے قابل کتب، لغت و دوائر المعارف جن کا نام میں نے (حوالے کے کتب) رکھا ہے ان کو ایک طرف رکھ دے کر شروع سے آخیر تک یکساں مطالعہ کرنے کے قابل کتابیں جن کا نام میں نے (مطالعہ کے کتب) رکھا ہے، یہ سب کی سب چھے شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ پہلا (الف) شعبۂ علم کی تین شاخوں میں ایک (مذہب و فلسفہ) دوسری (ہیئت و ہندسہ) اور تیسری شاخ یعنی بیچ کی شاخ (سائنس و فنون) کی ہوگی۔ یہ جملہ مطالعہ کی کتابیں مصنفوں کے نام کے سرحرف کے سلسلے سے تین یا چھے صندوقوں یا الماریوں میں رکھی جا سکتی ہیں تاکہ ایک اجنبی بھی اپنے مطلب کی کتاب دو تین منٹ میں چن کر اٹھا سکے۔

اور اسی طرح دوسرا (ب) شعبۂ ادب کی تین شاخیں ہیں اس کی پہلی شاخ (شعر و سخن) کی ہوگی اس میں کلیات دواوین، تبصرہ و تنقید کی کتابیں رکھی جا سکتی ہیں۔ شعرا و مصنفین کے تذکرے اور مشاہیر کے سوانح تو تیسری یعنے بیچ کی شاخ (تاریخ و سوانح و سیاحت) میں ہوں گے۔ شعبۂ ادب کی دوسری شاخ میں ہر قسم کے ناول و قصص اور کہانیاں ہوں گی اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے فقہ، قانون، نقشے وغیرہ ایک جداگانہ ساتویں شاخ (متفرقات) کے نام سے رکھے جا سکتے ہیں۔

القصہ آج میرا اصل مقصد اسی قدر ہے کہ اس کتب خانے کی افتتاح کی رسم کی ادائی کے وقت کتابوں کی ترتیب، تقسیم و تفریق کا ایک سہل طریقہ بتا دوں۔ اس کو میں نے بقول شخصے جیسا سد و بھائی اپنا کان بتلاتے ہیں ویسا ایک ٹیڑھے، ترچھے گھماتے طور سے بتا دیا۔ اس سے اگر میں نے اس جلسے کا وقت ضائع کیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں، میرا بوڑھاپا ہے۔ اس ذمہ داری میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا بھی بڑا حصہ ہے جنھوں نے اس تقویم پارینہ کو مخلصانہ اصرار سے صدارت کے لئے آمادہ کیا۔ اب میں عالی جناب صدر اعظم باب حکومت سے ملتمس ہوں کہ اپنے دست مبارک سے اس اردو کتب خانۂ اسلامیات کا افتتاح فرما کر حامیانِ کتب خانہ کو ممنون اور حاضرین جلسہ کو مسرور فرمائیں اور میرا دلی شکریہ دوبارہ قبول فرمائیں۔

•

میر محمد مومن ۔ عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرۂ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عا/

حضرت شاہ ابوالبرکات رفاعی

حضرت حافظ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعمؔ قدس سرہ سادات کاظمیہ تھے۔ آپ کے اجداد میں حضرت سید احمد کبیر معشوق اللہ رفاعیؒ اور حضرت سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسانؒ بہت مشہور و معروف گزرے ہیں۔ موخرالذکر کی درگاہ قندھار شریف ضلع ناندیڑ میں زیارت گاہِ خواص و عام ہے اور انہی کی اولاد و احفاد اور اعزہ آج تک ممالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع اور دیہات میں قاضی، خطیب، مفتی اور محتسب جیسی دینی خدمات پر فائز ہے جس کے تذکرے تاریخ قندھار دکن اور تاریخ مشاہیر قندھار میں شایع ہو چکے ہیں۔

حضرت شاہ ابوالبرکات کے دادا مولنا سید شاہ بدیع الدین رفاعی حضرت مولنا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ علیہ الرحمۃ کے استاد تھے اور والد حضرت صاحب عالم حاجی سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہید ایک صاحب باطن بزرگ اور حضرت پیر الٰہی بخش قدس سرہ کے رفیق طریق تھے۔ ان کے حالات زندگی اور کشف و کرامات کا تذکرہ دکن کے مشہور مورخ منشی شمس الدین امیر حمزہ مرحوم نے ایک کتاب روضۂ شہید زاہد غزلیق میں لکھ کر مطبع مفید دکن سے ۱۳۲۷ھ میں شایع کیا تھا۔

حضرت شاہ ابوالبرکات ۵ محرم ۱۲۹۵ھ کو تولد ہوئے اور جب ان کے پھوپا قاضی محمد امیر الدین پونیری نے مدرسۂ نظامیہ کی بناء ڈالی تو اس میں مولنا محمد عبدالکریم افغانی سے تفسیر اور مولنا محمد یعقوب ہندی سے فقہ اور مولنا محمد عبدالوہاب محدث نقشبندی استاد حضرت سید نورالدین شاہ قادریؒ سے حدیث کی تعلیم پائی۔ عنفوانِ شباب میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا تو میر تراب علی زورؔ مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ چنانچہ زعمؔ تخلص انہی کا عطا کردہ ہے۔ شاعری کے علاوہ نیو الفریڈ کمپنی جیسی ناٹکوں کے لئے ڈرامے بھی لکھے۔ لیکن پچیس سال کی عمر میں قبرستان کی ایک آواز اور مولنا عبدالوہاب محدث کے فیض صحبت سے طبیعت نے یکایک پلٹا کھایا اور قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس کے بعد اپنے دیوان اور ڈراموں کو نذرِ آتش کر کے اور صدر محاسبی کی سرکاری ملازمت ترک کر کے ۱۳۲۳ھ میں وعظ و رشد و ہدایت کی خاطر حیدرآباد سے نکل کھڑے ہوئے۔

آپ کو اپنے والد ماجد سے سلسلہ رفاعیہ و قادریہ کی، مولنا عبدالوہاب محدث سے سلسلہ نقشبندیہ کی اور مولنا فضیلت جنگ سے سلسلۂ چشتیہ کی بیعت و خلافت حاصل تھی۔ جب آپ کے وعظ اور رشد و ہدایت سے خلق اللہ فیض یاب ہونے لگی اور لوگ جوق در جوق مرید ہوتے گئے اور بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تو آپ کے بعض احباب و معتقدین نے حضرت فضیلت جنگؒ سے کہہ کر آپ کو سرکاری واعظ مقرر کر کے تنخواہ روپے ماہوار دلانی چاہی مگر آپ نے اس قید و بند کو پسند نہ فرمایا اور اپنی خاندانی جاگیر اور زمینات کی مختصر آمدنی اور توکل پر اکتفا کیا اور اپنے جدِ امجد حضرت سانگڑے سلطانؒ کی طرح تمام عمر سیر و سیاحت اور رشد و ہدایت میں صرف کی۔ اسی مناسبت سے علاقہ مرہٹواڑی کے بعض معتقدین آپ کو سانگڑے سلطان ثانی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت نہایت نیک باطن تھے۔ ہر شخص سے سادگی اور خلوص سے ملتے اور بڑے سے بڑے دنیا دار کے آگے بھی صاف گوئی اور پند و موعظت سے دریغ نہ کرتے تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ کبھی دنیاداری اور شان و شوکت کو پسند نہ کیا اور نہ اصحاب جاہ و ثروت کو خاطر میں لائے۔ ہمیشہ خوش پوشاک اور خوش خوراک رہے۔ انتہ سرخ و سفید اور وجیہہ تھے کہ ۱۹۱۶ء کے جنگ عظیم کے دوران میں جب شہر مدراس میں آپ کی مجالس وعظ میں سارا شہر ٹوٹ پڑنے لگا تو انگریز عہدہ داروں کو شبہ ہوا کہ آپ ترک ہیں اور سلطان ترکی نے جاسوسی اور ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا مؤید بنانے کے لئے آپ کو ہندوستان روانہ کیا ہے۔ اس لئے آپ کو نظر بند کر دیا گیا تھا لیکن جب مولانا فضیلت جنگؒ نے حکومت مدراس کو یقین دلایا کہ حضرت ان کے عزیز ہیں اور حیدرآبادی ہیں تو نظربندی سے رہائی پائی۔

حضرت شاہ ابوالبرکات ہمیشہ نماز باجماعت ادا کرتے اور رات میں بہت کم سوتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ آدھی رات کے بعد کی عبادت اور دعا خدا کے پاس بہت مقبول ہوتی ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد آپ مسجد ہی میں دیر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہ کر بڑی رات کو گھر واپس ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹے آرام کر کے تہجد و اشراق کے لئے پھر مسجد تشریف لے جاتے۔ جب کبھی حیدرآباد میں ہوتے تو عصر کی نماز سے مغرب کی نماز کے بعد تک اپنے والد حضرت صاحب عالم شہیدؒ کی طرح چوک کی مسجد ہی میں تشریف رکھتے۔ سواری کے مقابلہ میں پیدل چلنے کو پسند فرماتے اور جہاں کہیں سفر پر تشریف لے جاتے تو امیروں اور عہدہ داروں کے مقابلے میں غریبوں کے یہاں قیام کرنے کو ترجیح دیتے۔

حضرت کی آواز میں خاص درد اور اثر تھا اور طرز بیان اتنا با اثر ہوتا تھا کہ آپ کی مجلس وعظ میں سامعین پر بے اختیار رقت طاری رہتی تھی۔ چونکہ حافظ قرآن ہونے کے سوا حضرت اعلیٰ پائے کے قاری بھی تھے اس لئے ہر رمضان میں آپ کے معتقدین تراویح کے لئے دور دور سے بلاتے اور آگرہ لے جاتے تھے۔

دور دراز کے دیہات اور دشوار گذار مقامات تک پہنچ کر رشد و ہدایت کرنے میں حضرت نے جو زحمتیں اٹھائیں اور ہزارہا مسلمانوں کو جو اصلاح حال کی طرف راغب کیا اور سیکڑوں کو حلقۂ اسلام میں شامل کیا ان سب کی تفصیلات حضرت کے خود نوشتہ سوانح حیات میں درج ہیں جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور حضرت کے فرزند ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

حضرت کی یہ آپ بیتی چالیس پچاس سال قبل کے مذہبی و معاشرتی حالات کا ایک آئینہ ہے کیونکہ اس میں ہر مقام کی تفصیلی خصوصیات اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت نے نہ صرف ممالک محروسہ ہی کے اضلاع اور دیہات کو اپنے مواعظ حسنہ سے فیض یاب کیا بلکہ سندھ سے آسام اور صوبۂ سرحد سے لنکا تک کے طویل دورے کئے۔ برما اور جزائر شرق الہند میں بھی اپنا فیض پہنچایا۔ یوں تو ہر شہر اور قصبے میں آپ کے مرید و معتقد موجود ہیں لیکن مدراس، میسور، ترچناپلی، بمبئی، پونا، ناگپور، کلکتہ، کراچی، بیدر، گلبرگہ اور اورنگ آباد میں آپ کے مریدین کثیر تعداد میں ہیں۔

غرض حضرت شاہ ابوالبرکات نے مسلسل چالیس سال سیر و سیاحت اور پند و موعظت میں گزار دیئے۔ کبھی چندروز کے لئے حیدرآباد تشریف لاتے تو یہاں بھی مختلف محلوں میں مجالس وعظ کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اور

جب کبھی عید وطن میں ہوتی تو حضرت پرانی عیدگاہ قطب شاہی میں وہاں کے متوفی شاہ عبدالعزیز مرحوم کے مزار پر نماز پڑھاتے ۔ یہ سلسلہ حضرت کی علالت اور وفات تک برابر جاری رہا ۔ آخر کار ۸ ارصفر ۱۳۶۱ھ کو حضرت کا وصال ہوا اور مسلم جنگ پل کے محاذی حضرت کی نشان دادہ جگہ پر تدفین عمل میں آئی جس پر ایک گنبد تعمیر ہو چکا ہے ۔ حضرت کا عرس ہر سال ۵، ۶ اور ۷ ربیع الاول شریف کو ہوتا ہے ۔

حضرت شاہ ابوالبرکات قدس سرہٗ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے نبیرہ سید شاہ تقی الدین احمد صاحب قادری ابن ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو سجادہ مقرر فرمادیا تھا ۔ ان کو اپنے والد حضرت سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہیدؒ کے نام پر " عنایت پاشاہ " سے مخاطب فرماتے تھے اور وصیت تھی کہ میاں ابھی خورد سال ہیں ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے ۔

استاد العلما علامہ حضرت مولانا مولوی محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی حسرت سابق صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ مدظلہ العالی ۱۳۶۲ھ کے عرس شریف میں تشریف فرما ہوئے ۔ تو میاں عنایت پاشاہ صاحب ممدوح کو طلب فرماکر اپنے دست مبارک سے سجادگی کی تلمیں فرمائی ۔ اس موقع پر علماء و مشائخین اور عمائد شہر مثلاً حضرت مولانا سید محمد بادشاہ حسینی صاحب معتمد مجلس علماء دکن، مولانا سید شاہ ولی اللہ حسینی صاحب معتمد انجمن پیشوایان مذاہب، مولانا پیر محمود مجددی صاحب جناب سجادہ صاحب انگرحوض، نواب عزیز نواز جنگ بہادر صدر المہام صرف خاص مبارک، نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات، مولوی قاضی محمد زین العابدین صاحب ناظم آبکاری، مولانا سید احمد حسین صاحب امجد، مولوی سید محمد حسین صاحب آزاد، مولوی محمد منیر الدین صاحب قاضی پرچھی درگاہ شریف میں شریک مجلس تھے ۔

شفا مجددی

مشاہیر قندہار دکن

اس تذکرہ میں مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب ایم اے نے دکن کے مشہور و معروف اور مردم خیز خطۂ قندہار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال و مایہ ناز افراد کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ کا بصیرت افروز مقدمہ اس کے ساتھ شایع ہوا ہے ۔

قندہار شریف دکن کا باگرام سمجھا جاتا ہے اور محمد تغلق کے زمانے سے آج تک وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیا و علماء، شعرا اور مشاہیر پیدا ہوتے رہے ہیں دکن کے مختلف شہروں اور قصبوں میں قاضیوں، خطیبوں، محتسبوں اور دیگر اہل خدمات شرعیہ کے جو خاندان آباد ہیں ۔ ان میں سے اکثروں کا تعلق قندہار شریف ہی کے بزرگوں سے ہے اس لئے یہ کتاب دکن کے شرفا اور بزرگوں کا ایک مستند اور مبسوط تذکرہ سمجھی جا سکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہاں کی علمی و ادبی چہل پہل کا اندازہ ہوسکتا ہے (قیمت عہ)

احساس

وہ مرے واسطے بے تاب و پریشاں ہوگی

بزمِ تنہائی میں وہ سربگریباں ہوگی
میری فرقت میں محبت سے پشیماں ہوگی
اس کو رہ رہ کے مری یاد ستاتی ہوگی
دلِ معصوم پہ بجلی سی گراتی ہوگی
خوفِ دنیا اُسے رونے بھی نہ دیتا ہوگا
دردِ دل راتوں کو سونے بھی نہ دیتا ہوگا

شکوہ وہ کاتبِ تقدیر سے کرتی ہوگی
چھپ کے باتیں مری تصویر سے کرتی ہوگی

کسی پہلو بھی اُسے چین نہ آتا ہوگا
سوزِ فرقت دلِ مضطر کو جلاتا ہوگا
راز ہمجولیوں سے کہہ بھی نہ سکتی ہوگی
وہ بغیر آہ و فغاں رہ بھی نہ سکتی ہوگی
چاند کے سینے میں ظلمت نظر آئی ہے مجھے
بے قراری مرے دل کی یہ بتاتی ہے مجھے

وہ مرے واسطے بیتاب و پریشاں ہوگی

جبریل

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
ملکہ بیگم

نشان ٹپہ آصفیہ ۴۵۱
نشان ٹپہ برطانیہ یم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۹ — بابت مارچ و اپریل ۱۹۴۶ء — شمارہ ۳ و ۴

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں چھپکر رفعت منزل خیرت آباد سے شائع ہوا۔

زندگی — غالب کی نظر میں

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ شاعر کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہماری ہی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی طبیعت عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوتی ہے اور اس میں فطری طور پر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر اسے شعر کے سانچے میں ڈھالے۔ اسی لئے وہ ہر اس جذبہ کو جو انسانی دل میں پیدا ہو سکتا ہے صحیح طور پر پیش کرتا ہے۔ ورنہ ہر انسان کے دل میں وہی جذبات پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جو شاعر کے قلب و دماغ کو دعوتِ سخن دیتے ہیں لیکن صرف محسوس کرنا ایک بات ہے اور محسوس کرنے کے بعد ان کا اظہار ایک علیحدہ چیز ہے۔

ہر بڑے شاعر کے کلام کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس کی پوری شاعری میں ایک مرکزی خیال ملے گا اور اسی ایک مرکز یا محور کے اطراف اس کی شاعری گھومتی ہوئی نظر آئے گی، کہیں وہ زندگی کے متعلق تاثرات بیان کرے گا چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے۔ اور کہیں زندگی کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھے گا۔ اور ان زاویوں کی مدد سے چند حقایق و واقعاتِ زندگی کو پیش کرے گا۔ چونکہ انسان کے دل میں اس کی زندگی کی مختلف منزلوں میں متضاد جذبے پیدا ہوتے ہیں اس لئے شاعر کا کلام بھی متضاد خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کہیں وہ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو لگاتار محنت سے سلجھاتا ہوا پایا جائے گا اور کہیں اس دنیا سے تنگ آ کر اپنے تخیل کی مدد سے ایک نئی دنیا بساتا ہوا نظر آئے گا۔ کبھی وہ کشمکشِ زندگی میں پیہم مشکلات اور ناکامیوں سے دوچار ہو کر انسان کی مجبوری اور ان مجبوریوں کے خاتمے کا ذریعہ موت کو ٹھیرائے گا۔ کبھی اس کی نظر میں دنیا ایک بازیچۂ اطفال نظر آئے گی اور ہنسی خوشی سے زندگی گزارنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل نظر آئے گا۔ اگر کسی موقع پر وہ مصائب کی زندگی سے تنگ آ کر ایک آخری "بلا" یعنی مرگ ناگہانی کا منتظر رہے گا تو کبھی اس سازِ ہستی کے ایک نہ ایک دن "بے صدا" ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد اپنے دل کو یہ مشورہ دے گا کہ "نغمہائے غم کو غنیمت جانو"۔ کبھی وہ ہستی کی رونق بڑھانے اور "زیست کا مزہ" پانے کیلئے "عشق خانہ ویراں ساز کا دامن تھامنے کی تعلیم دیگا اور کبھی آلام و مصائب سے گھبرا کر اور تنگ آ کر کاروبارِ شوق کے لئے فرصت اور نظارۂ جمال کے ذوق کا فقدان محسوس کرے گا۔ کبھی فکرِ دنیا میں سر کھپانا اس کے لئے وبال ہو جائے گا اور جینے کا مزا موت کے لازم ہونے میں محسوس کرے گا جہاں وہ اپنی زندگی مشکلات میں بسر کرنے کے سبب یہ کہہ اٹھے گا کہ ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہیں زندگی جیسی گراں قدر شئے کو بارگاہ ایزدی میں پیش کرتے ہوئے یہ کہے گا۔ ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مختصر یہ کہ شاعر زندگی و موت کے مسائل، انسانی جذبات کی ترجمانی اور اپنے تجربات زندگی کو شاعری کا موضوع بناتا ہے۔ درحقیقت وہی شاعر ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کا مستحق ہے اور وہی شاعر ادبی دنیا میں اپنا مقام آپ پیدا کر لیتا ہے جس کی شاعری کا محور زندگی اور واقعاتِ زندگی ہوا کرتے ہیں۔ ان ہی شاعروں نے اپنے نتائجِ فکر سے دنیا والوں کو ایک پیام دیا ہے۔ زندگی کی دکھتی رگ پکڑنا یا زندگی کے نشیب و فراز کو ہماری نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کرنا اور

ان سے بچائے نیز دگر یزرگی پامردی سے راہ زندگی کو طے کرنے کی تعلیم دینا ایسے ہی شاعروں کا مطمع نظر ہوا کرتا ہے۔

مذکورۂ بالا تمام خصوصیات دنیائے شاعری کی جس عظیم المرتبت اور لائق فخر ہستی میں جمع ہوگئی تھیں وہ اسداللہ خاں غالب ہے جس نے تمام شعرائے متقدمین کی راہ سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ انتخاب کی۔ وہ اپنے رنگ کا پہلا اور آخری شاعر تھا۔ اس کے کلام کو دیکھنے کے بعد تخیل کی بلندی کا مفہوم ہمارے ذہن نشین ہوتا ہے۔ تب ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اندازِ بیان کی خوبی کسے کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام اردو شاعری کی متانت و سنجیدگی سمٹ سمٹا کر اس کی شاعری میں جمع ہوگئی ہے۔ اس کے کلام میں اردو شاعری ایک شرمیلی چلبلی دوشیزہ کی طرح نہیں بلکہ ایک باوقار شائستہ اور متین عورت کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے جسے اپنی شخصیت و ذمہ داری کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس نے دنیا کے سامنے اپنا مخصوص پیام اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا جو یقیناً قابل قدر ہے۔ اس کا کلام حیات جاوید حاصل کر چکا۔ وہ باقی رہے گا کیونکہ اس میں چند حقائق ہیں اور حق کبھی مٹ نہیں سکتا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔

غالب کی ابتدائی زندگی نہایت عیش و عشرت اور بے فکری میں گزری لیکن اس کے بعد انھیں اپنی بقیہ طویل زندگی میں اطمینان و مسرت سے کہیں زیادہ پریشانی و غم سے سابقہ رہا۔ مصیبت کے ان دنوں میں وہ عیشِ رفتہ کو یاد کرتے ہیں اور پھر اپنی اس حرکت پر عجیب طرح سے نکتہ چینی بھی کرتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ایک اور مقام پر وہ اس خیال کو کہ جب مشکلات نے انہیں گھیرا تھا اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی اور اب جبکہ پریشانی کا سامنا ہے کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

ہندوستان کے مسلمانوں کی عظمت کے اظہار کا واحد ذریعہ یعنی رہی سہی سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا متاعِ آزادی لوٹ لی گئی اور بدبخت کارواں کے دل سے "احساسِ زیاں" بھی جاتا رہا۔ مصیبت ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ سایہ کی طرح پھرتی تھی۔ ان تمام ناخوشگوار حالات سے غالب کا دل بھی بیٹھ گیا۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے مایوس سا ہوگیا تھا۔ کہتا ہے ؎

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

آخر عمر میں وہ فقدانِ راحت سے گھبرا اٹھے تھے کیونکہ اس وقت نہ ذریعۂ معاش باقی رہا تھا اور نہ صحتِ جسمانی اور دراصل یہی دو بنیادی ضرورتیں ہیں جن سے انسان کو بڑی حد تک سکونِ قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہی سرپرستی کے زمانے میں بھی وہ کبھی فارغ البالی سے گزر بسر نہ کر سکے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان پریشانیوں نے انھیں غم و مصیبت کو اپنا موضوعِ فکر بنانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں غمِ ہستی کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ اور کہیں کہیں اندازِ بیان سے حسرت و یاس جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انسان کی زندگی اپنے اختتام کو پہنچنے تک نشیب و فراز اور مصیبت و غم سے گزرتی ہے۔ اس غم ہستی کا واحد علاج موت ہے۔ اور غالب کے خیال کے مطابق موت ہی وہ "سحر" ہے جس کے طلوع ہونے کے بعد شمع حیات گل ہو جاتی ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسی خیال کو ذوق نے بھی باندھا ہے اور خوب باندھا ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

حکیم آغا جان عیش نے اسی خیال کو یوں نظم کیا ہے ؎

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

جب تک انسان زندہ ہے غم و اندوہ بھی اس کے ساتھ ہیں۔ موت ہی غم و رنج کا خاتمہ کر سکتی ہے ورنہ زندگی و غم ایک دوسرے سے وابستہ ہی رہتے ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں		موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن غالب چونکہ بلند مرتبہ شاعر ہے اور جہاں وہ غم سے متاثر ہوتا ہے وہیں اس کی دور رس نگاہ چند حقائق پر بھی پڑتی ہے جہاں تک معمولی نظریں نہیں پہونچ سکتیں۔ اس لئے وہ ایک بار غم کو بھی غنیمت سمجھتا ہے کیونکہ جب یہ ساز ہستی ختم ہو جائے گا تو پھر نغمہائے غم بھی سنے نہ جا سکیں گے ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے		بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

جب ہماری زندگی کی رونق، ہماہمی اور دھوم یا ہنگامہ پر موقوف ہے اور مسرت ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی تو پھر نوحۂ غم ہی غنیمت ہے ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

انسان کی زندگی بہت مختصر ہے اس لئے اسے غفلت میں نہیں گزارنا چاہیے۔ زندگی کے مختصر ہونے کی غالب نے ایک انوکھی تشبیہ دی ہے ؎

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

صوفیا کے ایک گروہ کے خیال کے مطابق دنیا ایک فریب ہے اور کچھ نہیں۔ غالب نے بھی اس خیال کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی		ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد		عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاعر کو ہستی یا زندگی کیوں فریب نظر معلوم ہوتے ہیں اور وہ اسے کیوں دامِ خیال سمجھتا ہے۔ محض اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس زندگی پر بظاہر انسان کا کوئی قابو نظر نہیں آتا۔ مشکلات و مصائب سدِ راہ بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناکامیاں ہمت پست کئے دیتی ہیں۔ اسی سبب سے وہ سمجھتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس کی مجبوری کی مثال کو غالبؔ نے اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

جب اس نے زندگی کے متعلق ایسا نظریہ قائم کیا تو پھر دنیا کو وہ بیکار چیز سمجھنے لگتا ہے۔ اور انسان کے عقل و دانش کے دعوے اسے غلط معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دنیا و دین کو انسان کے لیے غفلت میں ڈالنے والی چیزیں سمجھتا ہے ؎

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم　　دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

اسی لیے وہ زندگی کو ایک تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور ہستیٔ اشیاء کو ہمارا وہم قرار دیتا ہے کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "عالم" محض نام ہی نام ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور　　جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

جہاں زندگی مصائب و آلام سے بے مزہ ہوتی ہے اور جہاں انسان اس سے بددل ہو جاتا ہے۔ وہیں رونقِ ہستی کے لئے شاعر ایک لازوال شئے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس شئے کے بغیر زندگی واقعی فضول ہے ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زندگی اور عشق میں گہرا تعلق ہے۔ انسان کے لئے عشق ایک ایسا بلند مقام ہے جہاں سے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے پہاڑ نشیب میں نظر آنے لگتے ہیں اور رنج و غم کے بندھن ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اس دنیا کو عشق کے سہارے ایک قدم میں پار کر لیا جا سکتا ہے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب　　ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہی عشق ہے جو انسان کو مصائب و آلام کی شدت کے باوجود اپنے حقیقی منصب یا فرض سے غافل نہیں ہونے دیتا اور اس کشمکشِ حیات میں بھی اپنے آپ کو ایک قابلِ پرستش ہستی سے وابستہ رکھتا ہے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

انسان کی زندگی کا کمال یہ ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی میں اپنی ہستی کو فنا کر دے ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اگر انسان کے لئے کسی نہ کسی دن مرنا لازمی نہ ہوتا تو زندگی بے لطف ہو جاتی۔ زندگی کا لطف موت میں پنہاں ہے کیونکہ اس حقیقت سے واقف ہو کر کہ ایک دن مادی زندگی کا ختم ہو جانا ضروری ہے انسان کے دل میں کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اپنے بلند ارادوں کی تکمیل کرے تاکہ پھر فرشتۂ اجل اسے اپنے ارادوں کو نامکمل چھوڑ دینے پر مجبور نہ کرے۔ اگر موت لازمی نہ ہوتی تو انسان بے پروا ہو کر اپنے ہر کام کو "فردا" پر ڈال دیتا اور زندگی جس کا مزا اس مصروف رہنے میں ہے بے مزہ ہو جاتی ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مقصد میں کامیابی کیلئے نتیجہ کی فکر کئے بغیر اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے کیونکہ بالآخر وہی ہوگا جو فکر کرنے کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ مصیبت سے گھبرانا باہمت انسان کا شیوہ نہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اگر قوت برداشت ہو تو مصیبت بھی راحت سے بدل سکتی ہے۔ رنج و مصیبت کی کثرت انسان کو بے پروا بنا دیتی ہے اور وہ ان کا خوگر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کہتا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

زندگی کے ہر شعبے میں اور انسان کے ہر فعل میں نیت و ارادہ اور خلوص کو دیکھنا چاہیے۔ اور اگر مقصد پورا ہو جاتا ہے تو سطحی باتوں کو موضوعِ بحث و تکرار نہ بنانا چاہیے ؎

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اگر کوئی ہمیں برا کہے تو اس پر دھیان نہ دینا چاہیے۔ اگر کسی کو غلط راستے پر چلتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کی رہبری کرنا تقاضۂ انسانیت ہے۔ اور چونکہ خطا و قصور ہر شخص سے سرزد ہونے کا امکان ہے اس لئے عفو و درگزر اچھی صفت ہے۔ دنیا میں ہر شخص کو احتیاجات ہیں اس لئے کوئی کسی کی ضروریات کہاں تک پوری کر سکتا ہے۔ ان خیالات کو غالب کی زبانی سنیے ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

چاہے حوادث کی کتنی ہی کثرت کیوں نہ ہو ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہی حوادث ہمیں سبق دیتے ہیں۔ ان ہی سے ہم تجربات حاصل کرتے ہیں اور آئندہ کے لئے احتیاط سے کام لیتے ہیں ؎

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

مرد میدان وہی ہے جو خطرات کو آواز دے کہ وہ آئیں اور اس کے عزم و ارادہ اور پامردی کا امتحان لیں۔ موانعات رخشِ ترقی کے لئے تازیانے کا کام کرتے ہیں اور مشکلات میں گھر کر انسان خوش ہوتا ہے کہ اسے اپنی ہمت کے مظاہرے کا موقع مل گیا ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

بعض لوگ بہت جلد مایوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر مقصد کے حاصل کرنے میں انتظار ہی کرنا پڑے تو اس زحمت کو بھی گوارا کر لینا چاہیئے ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

غالبؔ کا خیال ہے کہ عبادت عبودیت کے اظہار کی خاطر کی جانی چاہیئے۔ جنت کی خاطر عبادت کرنا عبودیت کی شان نہیں۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے تاکہ لوگ صرف اللہ کے لئے عبادت کریں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

غالبؔ کے نظریۂ حیات اور لافانی پیام کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کے سنوارنے میں عشق کا بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ وہی رونقِ ہستی ہے اور اسی سے دنیا قائم ہے۔ ہر چند انسان بے بس اور عمرِ برق خرام کا مالک ہے لیکن اگر وہ چاہے تو اس فرصتِ زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے۔ عشق ہی کی بدولت دشتِ امکان ایک نقشِ پا نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رنج و غم سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے لیکن اگر عزم و ارادہ ہو اور دل کی تربیت کی گئی ہو تو یہ آلام و مصائب راحت و آرام سے بدل سکتے ہیں۔ انسان کی معراجِ کمال یہی ہے کہ وہ اس ذات میں فنا ہو جائے جس کا ایک پرتو ساری دنیا اور وہ خود بھی ہے۔ مختصر یہ کہ اگر زندگی میں رنج و غم نہ ہوتے تو زندگی کا مزا حاصل نہ ہوتا۔ رکاوٹیں نہ ہوتیں تو انسان کو سعیِ پیہم کا خیال نہ آتا اور موت لازم نہ ہوتی تو دنیا میں یہ گرماگرمی اور چہل پہل نظر نہ آتی۔

محمد منظور احمد

محبت کی چھاؤں :- مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحاتِ فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

احساسِ مجبور

وہ چنگاری کہ جس کی آگ سے خرمن بھڑک اٹھیں   وہ دل جس کے دھڑکتے ہی ہزاروں دل دھڑک اٹھیں
ترے ہاتھوں فروزاں ہو تو کجلا بھی نہیں سکتا!

مرے لب کے تبسم کتنے ہونٹوں پر بکھرتے ہیں   مرے نغموں کے نشے کتنے سینوں میں اترتے ہیں
میں اپنے دل کو لیکن آپ بہلا بھی نہیں سکتا!

دھواں شاداب سینوں سے اٹھا سکتا ہوں محفل میں   ہزاروں تیر میں پیوست کر سکتا ہوں ہر دل میں
ترے ہی زخم لیکن تجھ کو دکھلا بھی نہیں سکتا

فضا میرے فسانوں سے فسانہ ساز ہوتی ہے   مرے نغموں سے فطرت گوش برآواز ہوتی ہے
ترے ہی گیت تیرے سامنے گا بھی نہیں سکتا

مرے ہی اشک میری آنکھ چھلکا بھی نہیں سکتی   مرے ہونٹوں پہ خود میری ہنسی آ بھی نہیں سکتی
ترے آگے ترا افسانہ دہرا بھی نہیں سکتا

حرم سے دور جانا، بتکدے سے دور تر جانا   بہت آساں ہے مجھ کو ان دیاروں سے گزر جانا
مگر تیری وفاؤں کے محل ڈھا بھی نہیں سکتا

تری دنیا کہ ہے نغمات میں نغمات کی دنیا   مری صبحوں کی دنیا ہے نہ میری رات کی دنیا
مگر میں ہوں کہ اس دنیا کو ٹھکرا بھی نہیں سکتا

ترے نزدیک اگر چاہوں تو خود آ بھی نہیں سکتا   تجھی سے دور تجھ کو چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا
تجھے کھو بھی نہیں سکتا، تجھے پا بھی نہیں سکتا

شور

ادبی رجحانات کا تجزیہ

ادب زندگی کی تصویر ہے اور اس کے ہر پہلو کی عکاسی ادیب کا فرض ہے مگر مخالفین کے اعتراضات اور موافقین کے رجحانات نے ترقی پسند ادب کو گورکھ دھندا سا بنا دیا ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر ادب کے شاندار مستقبل سے امید رکھنا بیکار ہے مخالفین کا یہ خیال غلط ہے کہ ترقی پسندی موجودہ دور کی پیداوار ہے۔ دراصل ترقی پسندی کوئی جدید چیز نہیں۔ عام نقطۂ نگاہ سے یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ ایسے ادب کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی کیونکہ ہر زمانے اور ہر دور میں ادب میں ترقی ہوتی رہی۔ ابتدا میں کہانیوں کی بنیادیں کھوکھلی تھیں۔ ان کا مقصد زندگی کی عکاسی کرنا نہیں تھا چاہے وہ اس زمانے کی کتابیں "سحر البیان" "گلزار نسیم" وغیرہ جن کے افراد کی فوق البشر اور محیر العقول قوتیں ہیں اور وہ روزمرہ کے انسان ہونے کی بجائے دیوتاؤں اور عجیب و غریب انسانوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کی مشکلات کو غیب سے آتے ہوئے مقدس انسان یا دیو پری حل کر دیتے ہیں۔

مگر زمانے کے ساتھ ساتھ تخیل اور ادب دونوں میں تبدیلی ہوتی گئی اور اردو نثر میں بھی انقلاب آیا اور رفتہ رفتہ کے اسی شاندار بہاؤ کا نتیجہ حال اور مستقبل ہے۔ ہمیں ان ادیبوں کا مطالعہ بیحد ضروری ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں ہماری زبان کی مشاطگی میں صرف کر دی تھیں۔

اردو کی خدمت غالب نے زیادہ کی ہے، غالب اردو زبان کا بہت بڑا معمار ہے کیونکہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوا جبکہ مغلیہ سلطنت اپنے زوال کے آخری مراحل طے کر رہی تھی اور ہندی شمع گل ہو رہی تھی۔ پرانا دور ختم اور نیا دور شروع ہو رہا تھا۔

"غالب کا زمانہ ایک ایسا دور ہے جس میں غدر ختم ہوتے ہوئے دور کی آخری شکست تھی اور نئی شہنشاہیت کی آخری شکست۔ یہی وہ درمیانی زمانہ ہے جس کے بعد اردو ادب میں انقلاب پیدا ہوا۔ اسی دور میں دو مشہور ہستیاں معروف کار نظر آتی ہیں جو ہم عصر ہوتے ہوئے بھی دو مختلف رجحانات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ذوق اور غالب۔ اختلاط اور احتیاج میں جو فرق ہے وہی ذوق و غالب میں ہے۔"

ذوق پرانے ادبی دور کا آخری آنسو ہے۔ اور غالب کی شاعری نئے دور کی پیغامبر۔ اسی دور کی کڑی ہے پیامی حالی، سرسید، پریم چند اور اقبال ہیں۔

غالب کی حیثیت غزل میں محصور رہنے کے باوجود ہر طرح آزاد ہے۔ ان کے اشعار ان کا تصوف، موعظت، طنز، مذاق، غرض ان کی ہر چیز میں ذوق نمو اور حرکت حیات ہے جو اس سے صدہا سال پہلے کے سکون کو ختم کرتی ہے

اس انقلاب کی تکمیل سرسید نے کی۔ یہ سرسید ہی کی کوششیں تھیں جنہوں نے اردو کے اسالیب بیان کا رخ بدل دیا اور زبان میں آزادی، روانی اور سادگی پیدا کر دی۔ سرسید کا ساتھ حالی نے دیا اور یہی وہ انشا پرداز ہے جس نے زمانے کے تقاضا سے واقف ہو کر اردو نثر نگاری کی طرف توجہ کی اور زبان کی اہمیت ہمیشہ قائم رکھی۔

کم و بیش اسی زمانے میں پریم چند پیدا ہوا جو حقیقتاً اردو میں مختصر افسانہ نگاری کا موجد ہے پریم چند کی فن کاری کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسی نے اپنے فن کی بنیادیں کچھ اس طرح رکھیں کہ سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا کہ وہ مغربی افسانہ نگاری سے متاثر ہوا۔ پریم چند کی تکنیک کئی رنگوں کی آمیزش سے بنی ہے۔ اس کی افسانہ نگاری فنی حیثیت سے اردو میں ایک نئی چیز ہے کیونکہ اس سے قبل کے افسانوں کا انداز کچھ اور تھا ان میں سوائے خیالی باتوں کے ایسی چیزیں مقصود تھیں جن کا تعلق زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقت سے ہو۔ پریم چند نے ہماری زندگی کو اپنا فن بنایا اور اردو ادب میں واقعیت نگاری کو رواج دیا جو

باکمال شاعر تھی۔ وہ زندگی کے ہر پہلو، ہر رخ اور ہر سمت پر روشنی ڈالتا ہے اور ساتھ ہی پیغام بھی دیتا ہے۔ اصلاح کا پیغام۔

پریم چند نے اردو افسانوں میں کردار نگاری کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ بہت بڑی خدمت ہے مگر اس سے بھی بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں کچھ ایسی روایات کی بنیادیں ڈالیں جو دوسرے افسانہ نگاروں کے لئے خضر راہ بنیں۔

جس طرح پریم چند دو تمدنوں کو ملاتے ہیں اسی طرح اقبال کی شاعری بھی دو تمدنوں کو ملاتی ہے بلکہ اس میں ہر تمدن کا جوہر موجود ہے۔ ان کی شاعری ترقی پسند شاعری کی محرک بنی۔ ان کے ادب کا نظریہ ترقی پسند ادب کے نظریہ سے بہت زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آنیوالی نسل سے توقع کی ہے

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور اسی توقع پر انھوں نے مستقبل کے ارباب کا پہلے ہی سے خیر مقدم کیا ہے۔

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

اور آگے چل کر تو انھوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اقبال نے شعر و شاعری کے موضوع کے لئے مختلف تبدیلیاں تجویز کی ہیں۔

عشق اب پیرویِ عقل خدا داد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے

کیا بالکل یہی تصور ترقی پسند شاعری کا نہیں ——؟ تقریباً تمام صاحب عقل و فہم ترقی پسند شعرا اور ادیبوں نے اقبال کی رہنمائی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ زمانہ زوال کا ہے اس لئے فن کار کو مشرق اور مغرب سے ضرور سیکھنا چاہیے۔ اور اس امتزاج سے اگر زندگی کی سحر ہو سکتی ہے تو

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

چنانچہ اقبال نے ان رجحانات کو آگے بڑھایا جن کی ... ہم منزل کے اتنے قریب آ گئے ہیں ——

جب زندگی بدلتی ہے تو آرٹ بھی بدل جاتا ہے اسی کو انکار نہیں —— بے شک ترقی پسندوں نے نئی نسل کے افسانہ اور موضوع سخن نیا ہے لیکن اس پرانے رخ زیبا سے غافل نہیں —— ان کی داستانوں میں بھی موجود ہے۔ اس ساقی بدل گئے جام اور شراب؛ ہے لیکن یہ تو زندگی کا خاصہ ہے۔ فرق صرف اتنا۔ ادب کے "دلدادہ" اسی بدلتی زندگی کا ساتھ دینا [illegible] اور اسے ترقی کی طرف تیز گام ہونے کی بجائے اس کو ڈگر پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

نئے ادب کی شعری تخلیقات نے بلندی اور تر[illegible] سے مدارج کم عرصے میں طے کر لئے ہیں اور ان تمام تصورات کو ابھارا ہے جو عرصہ دراز سے قوم کے موجزن تھے جیسے ٹیگور، اقبال، جوش، اور نذرالاسلام نے عہد جدید کی زبان دی ہے اور جسے نئے ادب نئے نئے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے نثر اور نظم ہوتا آتے ہیں مگر جو وجدانی تاثر حسن بیان اور ندرت کی ظہور گاہ وہ دیگر اصناف ادب کے حصے میں کم آتی ہے۔ اس کی انقلابی نوعیت کے پیش نظر ترقی پسند فن کار اول اسلوب کو بھی ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے جو کہ کا ساتھ دے سکے۔ اسی شعری اسلوب کی تبدیلی نظم آزاد نظم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے اور اس اس قدر اعتراضات ہو رہے ہیں اور جو عرصے سے [illegible]

ے نقادوں کی شدید نکتہ چینی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

سب سے پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ شعرا [illegible] شاعری کی قابلیت نہیں۔ گویا شاعری فطری نہیں اکتسابی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے قافیہ و ردیف کی قیودوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ دوسرے طریقہ پر [illegible] جا سکتا ہے کہ چونکہ شاعری بغیر قافیہ ردیف کے [illegible] اور اس کے بغیر شاعری شاعری ہی نہیں اور موجودہ شعرا [illegible] بھی درست نہیں [illegible] نہیں [illegible] ہوں [illegible] آسانی کے لئے نظم معرا ایجاد کی [illegible] شاعر نقطہ [illegible] ہیں کیونکہ اس صنف شعر میں [illegible] ردیف کی قید [illegible] سے [illegible] نظم معرا شاعری کی قسم نہیں [illegible] شعری [illegible] ان بزرگوں کی خدمت میں عرض [illegible] آپ کی قابلیت مسلم لیکن آپ کا [illegible] غلط فہمی پر مبنی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس صنف نظم میں نہیں ترنم و ہم آہنگی نہیں نغمگی نہیں۔ [illegible] طرح تال [illegible] ضروری ہے اسی طرح قافیہ شاعری کی جان ہے مجھے [illegible] کے بارے میں اعتراض ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ تال کے [illegible] کیونکہ سنگیت کی [illegible] پابند اور [illegible] آزاد کو ہم "الاپ" بھی کہتے ہیں اور اہل فن [illegible] الاپ جس میں راگ کا مکمل شکوہ موجود ہوتا اپنے [illegible] تال کی ضرورت نہیں۔ ستار پر شروع میں جو "الاپ" [illegible] مدد کے ادا کیا جاتا ہے۔

اب ترنم کو لیجئے۔ صوتی اعتبار سے ہر لفظ میں ترنم [illegible] ہے اور ترنم کے لئے شعر یا نظم کی قید نہیں۔ چونکہ دونوں [illegible] ترنم ہوتا ہے اس سے دونوں [illegible] جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر آپ [illegible] موازنہ [illegible] کسی [illegible] کے حوالے کیجئے وہاں بھی [illegible] نظم معرا [illegible] شاعری کی بہترین شکل ہے۔

بعض کرم فرما یہ اعتراض [illegible] کہ آزاد نظم مغرب کی نقالی ہے [illegible] اس کی [illegible] نقالی کی [illegible] مغرب کی نقالی کا طعنہ [illegible] کا [illegible] نشانہ ہے [illegible] موضوعات [illegible] جو [illegible] یہ الزام بھی غلط [illegible]

[illegible]

اور یہ الزام بھی غلط ہے کہ آزاد [illegible] کی [illegible] کیونکہ نظم معرا مغربی ایجاد نہیں ہے بلکہ [illegible] ہندوستان کے [illegible] نظم معرا [illegible] ہندوستان ہی کی ایجاد ہے کیونکہ وید تو [illegible] نظم معرا کا [illegible] نمونہ ہے اسی طرح آریائی گیتوں [illegible] کی شاعری [illegible] شاعری ہے [illegible] طرح نظم معرا کو مغرب نے ہم سے مستعار لیا اور آج عظیم الشان روایت جو قومی ادبار کی بنا پر ٹوٹ چکی تھی پھر سے تازہ کی جا رہی ہے تو [illegible] کاوش کی داد دی جانے [illegible] آوازے کسے جاتے ہیں اور مغرب کی نقالی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

ترقی پسند شاعروں [illegible] غزل [illegible] باقی نہیں ہے بلکہ [illegible] ذہنی [illegible] سیاسی اور سماجی زندگی کا عکس اپنی نظموں میں پیش کر رہے ہیں اور جو [illegible] ساتھ [illegible] نظم [illegible] کی نشوونما [illegible]

[illegible] کی تخلیق کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

اب ترقی پسند ادیبوں پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ موجودہ دور کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی، سعادت حسن منٹو، عصمت، شاہد لطیف، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، حسن عسکری وغیرہ ہیں۔ ان سب کا انداز جداگانہ ہے لیکن ایک بات میں سب مشترک ہیں اور وہ یہ کہ سب زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تصویروں کو مختلف رنگوں کی آمیزش سے اجاگر کرتے ہیں۔

ان تمام ادیبوں میں کسی کا نام اس قدر تعریف و توصیف کا مستحق نہیں جتنا کہ کرشن چندر کا ہے۔ اس کی وجہ ان کی بے لوث، باخلوص انسانیت ہے جو ان کی ہر تحریر سے ظاہر ہے اور اسی بنا پر وہ ان کے تخیل کی بنیاد ہیں۔ ان کی تحریریں دل پر اثر نہیں کرتی وہ دلوں میں اتر کر اپنا کام کرتی ہے۔ اور تاثر دیتی ہے کرشن چندر کے یہاں زندگی اور ادب زندگی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ دونوں کو علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ ابتدا سے اب تک اردو کے کسی ادیب کو حاصل نہیں ہوئی۔

کرشن چندر نے افسانہ نگاری میں جو رنگ پیدا کیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے اور اس وقت کرشن سے زیادہ کامیاب افسانہ نگار اور کوئی نہیں۔ اس نے اردو افسانہ نگاری میں بالکل نئی راہ نکالی ہے جو زندگی سے بہت قریب ہے اور اس کی بہترین مثال ہے اس کا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" اتنے مختصر افسانے میں ساری انسانی زندگی پر اس سے بہتر طریقہ پر اور کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے ___؟ اس افسانہ کا ہر پہلو ہر اشارہ اپنے اندر بڑی وسعت اور گہرائی رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کا افسانہ "ان داتا" بنگال کے قحط کے زمانے کی سچی تصویر ہے۔

کرشن چندر کا اسلوب بیان اور طرز ادا دلکش ہے۔ انگریزی زبان اور شعر و ادب سے آشنا ہو کر پورا اسلوب

زبان اردو کے بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوا۔ کرشن کے آرٹ کی طرح اس کی منظر نگاری کا کمال بھی اس کے ناول "شکست" میں زیادہ نمایاں ہے۔ منظر نگاری میں اس کے افسانوں کا پس منظر بالعموم کشمیر کی حسین وادی ہی ہے۔ دلکش اور بہترین منظر نگاری آپ کو "گرجن کی ایک شام" اور "زندگی کے موڑ پر"، "بالکونی" میں نظر آئے گی۔ ان کی تحریروں کا امتیاز طنز ہے۔ طنز ___ جو دل کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے جسے پڑھ کر انسان اس کی چوٹ سے بے چین ہو جاتا ہے۔ تلملا جاتا ہے۔ اس کے طنز سے انسان کی غلط روی کا اظہار ہوتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے بے لوث واقعیت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ اس کا ماحول دیہاتی زندگی ہے۔ وہاں کے مسائل، گندی معاشرت کے بیان میں اور کوئی ترقی پسند ادیب اس کا مقابل نہیں۔

دیوندر ستیارتھی کو اس کی "خانہ بدوشی" نے افسانہ نگار بنایا ہے اسی لئے اس کے افسانوں میں "خانہ بدوشیت" زیادہ ہے۔ مگر خانہ بدوشی کے ساتھ ہی ساتھ وسعت اور لاابالی پن بھی وابستہ ہے۔ وہ اپنے موضوع کے لئے ایسی چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جس پر آج تک مستقل نہ اٹھایا گیا ہو۔ دیس دیس کے گیت جمع کرنا اور انھیں ترتیب اور سلیقہ سے پیش کرنا اور ان گیتوں کے ذریعے ہمیں وہاں کی تہذیب، تمدن، رسم و رواج وغیرہ سے روشناس کرانا اس کا مقصد ہے۔

بیدی کی طرح اوپندر ناتھ اشک بھی متوسط طبقے کی زندگی کا ترجمان ہے۔ متوسط طبقے کے ہندوؤں کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں اوپندر کے افسانوں کے علاوہ اتنی خوبصورتی کے ساتھ کہیں نہیں مل سکتیں۔ اس کے افسانوں میں کردار نگاری خصوصی چیز ہے۔

اختر انصاری اپنے افسانوں کے کرداروں کی حرکات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی حرکات ہی کا نہیں بلکہ ان کی دلی کیفیات، ان کی خواہشات، رنج و الم، ان کی ذہنی الجھنیں

ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کا خاص امتیاز جزئیات نگاری ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس کے فن میں سادگی اور معصومیت پائی جاتی ہے۔ دیہاتی دوشیزاؤں کے حسن کا بیان، دیہاتی نوجوانوں کے جذبات کی تصویر کشی اس کی افسانہ نگاری کو بہت دلکش بنائے ہوئے ہے۔

اب رہ گئے سعادت، عصمت اور حسن عسکری، تو انھوں نے افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا ہے اور سب کے سب جنسیات کے متعلق لکھتے ہیں۔ شاید ترقی پسند ادب کے کسی شعبے پر اتنا اعتراض نہیں کیا گیا ہے جتنا کہ جنسیات سے متعلق ادب پر کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض ایک حد تک ٹھیک بھی ہے مگر وسعت نظری سے کام لینے کے بعد ہمیں معلوم ہوگا کہ ادب میں عریانی آج کی چیز نہیں۔ پرانے شاعروں، پرانے نثر نگاروں اور پرانے ادیبوں نے جنسیات ہی سے متعلق لکھا ہے۔ دنیا کا بہترین ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کرشن چندر نے اسے وضاحت سے لکھا ہے "میں دنیا کے بہترین ادیبوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ شکسپیر سے لیکر روڈن تک، گوئٹے سے لیکر ٹیگور تک۔ پرانے آریائی گیتوں سے لیکر کالیداس تک، ولی دکنی سے لیکر جگر مرادآبادی تک ہمارے دنیا کے بہترین ادب کا محور و مرکز عورت کی ذات ہے، ہر غزل گو اپنی غزل کے ہر دوسرے تیسرے شعر میں شربت وصل کا پیاسا نظر آتا ہے۔" اس پر بھی لوگ ترقی پسند ادب پر عریانی کا الزام لگاتے ہیں۔ درحالیکہ ترقی پسند ادیبوں نے عورت کی اہمیت کو اپنے ادب میں پچاس فی صدی کم کر دیا ہے۔ وہ پرانے ادیبوں کی طرح شربت وصل کا رونا نہیں روتے، پانی، روٹی، دھوپ، ایک کھلا مکان، صاف ستھرے کارخانے اور شہروں سے لائے ہوئے تمدن، کلچر، انسانیت، محبت، اشتراک عمل سب کچھ چاہتے ہیں جن سے ایک نئی دنیا تعمیر ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے یہاں تو اعتراض کرنا مقصود ہے۔ سمجھنا اور سمجھ کر اعتراض کرنا رجعت پسندوں کی طبیعت میں داخل نہیں ——

غرض کہ ہماری افسانہ نگاری نے باوجود ہزار مشکلات کے بہت جلدی ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور اب ہر ملک کی افسانہ نگاری کے دوش بدوش کھڑی ہو سکتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس کا چراغ مغربی افسانہ نگاری سے روشن ہوا ہے لیکن بقول ندیم "ہم نے فن کی باریکیاں مغرب سے مستعار لی ہیں لیکن

"ہم نے فن کے خطوں میں ہندوستانی رنگوں کو سمایا ہے۔ ہم نے اپنے دیہاتیوں کی گلی سڑی لاشوں پر سے ریشمی کفن اتار دیئے ہیں۔ ہم گالیاں نہیں دیتے۔ سچائیاں بیان کرتے ہیں۔ ہم عریانی کے شیدا نہیں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سطح پر تیرنے کی بجائے تہوں تک جائیے۔ زندگی عمیق ہے اور صاف ستھری سطح پر تیرنے والوں کو یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے کہ تہوں میں بلائیں بھی ہیں اور وہ خوفناک روئیدگی بھی جس میں زندگی پھڑپھڑا رہی ہے ……"

بیشک اس میں زندگی کے آدھ سائز کی سی گہرائیاں ہیں۔ اس میں مچلتے ہوئے جذبات و احساسات کی سی بیتابی و تڑپ ہے غرض اس میں سب کچھ ہے۔

نئے ادب میں بلاشبہ ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے طربیہ عناصر۔ نئے ادب میں شاعری نشاطیہ نہیں۔ اس کے نثری کارنامے مسرت آگیں نہیں بلکہ غمناک ہیں۔ انسانیت کے اس جلتے سلگتے دور میں۔ بدبودار لاشوں اور کراہتے ہوئے ڈھانچوں کی زندگی کی تصویریں۔ ادبار و تیرگی کی طویل داستان۔ انسانی معاشرت کا اذیتناک تجزیہ۔ یہ ہیں نئے ادیبوں کے نثری کارنامے جنھیں پڑھکر بعض اوقات طبیعت اکتا جاتی ہے اور جب ایک نئی دنیا کی

کی تلاش میں ان تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ ادب اسے ہماری دنیا میں کھینچ لاتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ اپنے گرد و پیش کے مسئلوں پر غور کرے۔ بقول کرشن چندر:

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب تک دنیا کی خوشیاں اور مسرت کے آرام ایک مخصوص طبقے تک محدود رہیں گے اور انسانوں کی زیادہ بیشتر حصہ ان سے محروم رہے گا، نیا ادب اسی کمی کو محسوس کرتا رہے گا اور ہر لحظہ اس محرومی کی طرف آپ کی توجہ دلاتا رہے گا کیونکہ نیا ادب مرمریں محل کی پیداوار نہیں۔"

مگر نئے ادب کی آنکھ صرف حسرت و یاس کے مناظر نہیں دیکھتی۔ محض افلاس و ادبار کی خوفناک کالی گھٹاؤں کا نظارہ نہیں کرتی بلکہ ان ہولناک تاریک گھٹاؤں کے پرے اس تابناک روشن لکیر کو بھی دیکھ رہی ہے جو زندگی کے لئے ایک نئی مشعل راہ ہے جو انسانی دکھوں کا خاتمہ کر دیتی ہے اور کائنات میں اجتماعی مسرت کی بنیاد رکھتی ہے اور انسانی حیات کی تاریکی میں تاروں کی روشن لکیر کھینچ دیتی ہے —

نجمہ سمیع اللہ شاہ

یکے میں

میں عجلت عجلت سے رخصت ہوا اور جھپٹ کر یکے پر سوار ہو چل پڑا۔ چلتے یکے میں اکیلا بیٹھا سوچنے لگا: تم بھی آدمی ہو، وقت پر کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر سوچتے ہو کیوں نہیں کر سکے؟ بیٹھے سوچا کرو، کچھ نہیں تم کر سکتے ہو۔ ہاں تو سیدھا منہ اٹھا کے چلے آئے، بزرگوں کے چرن تو چھو لئے ہوتے۔

اب یکہ چل رہا تھا اور یکہ بان اپنے مریل گھوڑے کو ہانک ہانک کرتا چلا رہا تھا۔ گھوڑا مریل یکے کے بوجھ کو ذرا جلدی کھینچتا پھر اسی رفتار پر آ جاتا۔ اور بنارس کی سڑک اور گلی اس طرح پار ہوتی جا رہی تھی۔

سوچا۔ یہ کیا بات ہے جی کہ کہیں جاؤ اور پھر وہاں سے آ جاؤ۔ پہلے تو کہیں جاؤ ہی کیوں؟ اور اگر چل ہی پڑے اور پہنچ ہی گئے تو پھر وہاں سے آ جانا کیوں ضروری ہو جانا چاہیے؟ نہیں نہیں یہ سب گڑبڑ ہے...... یہ سب تماشا ہے۔" اور میں نے گرنے سے بچنے کے لئے ایک دم یکے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ کہا "ٹھیک سے کیوں نہیں چلاتا رے یکہ" بولا "بابو جی چنگی کی میونسپلٹی میں للچر ہوت ہے۔ اور سڑکن میں گڑھے پڑے جاتے ہیں۔" میں نے کہا "گاڑی کے لئے تھوڑا وقت ہے ذرا یکہ بڑھائے چل۔" اس نے کہا "ہو...... ٹک ٹک اور گھوڑے کے کھڑے دائیں کان پر چابک کا تسمہ بھی زور سے مارا۔ گھوڑا اگلے پیروں پر زور دے کر آگے بڑھا۔ دوڑا اور پھر پہلے کی طرح مدھم ہو گیا۔ میں پاس رکھے پلندے پر کہنی ٹیک کر اور ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھ کر دیکھنے لگا۔ یہ مقام مذہب کی جنم بھومی ہے۔ اس کے چاروں طرف کھیت ہیں اور باغیچے بھی۔ یہ لال تین منزلہ مکان کیسے خوبصورت ڈیزائن کا بنا ہے۔ اور یہ عورتیں روز سامنے کے اس تین منزلہ خوبصورت مکان کو دیکھتی ہیں، ہنس ہنس کر اپنی ٹوکریاں بنتی ہیں، گالیاں بکتی ہیں۔ اپنے مردوں کو لیکر اپنے بند گھروں کے اندر پھوس بچھا، گدڑ کو اوڑھنا بچھونا بنا کر سوتی ہیں اور رات کاٹ دیتی ہیں۔ اور پھر دن میں آ کر اس لال محل کی غراتی آنکھوں کے سامنے ہنستی اور چہل کرتی اپنا گوبر پاتھتی اور ٹوکریاں بنتی ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں محبت ــــ محبت کے ساتھ کہتے ہیں گلاب، بلبل، شراب، مخمل کے تکئے، کھڑے آئینے اور ــــ کہتے ہیں فراق، اشتیاق، آرزو، کسک، ٹیس، آہ، آنسو، آگ وغیرہ کہتے ہیں حسن، جمالیات اور آرٹ....... لیکن یہ عورتیں بچوں کو لیکر ان گنت بچے جنتی ہیں۔ گوبر پاتھتی ہیں اور ٹوکریاں بنتی ہیں۔ ہنستی ہیں اور لڑ جھگڑ کر رہتی ہیں گالی گلوچ کرتی رہتی ہیں...... اور یہ مقدس شہر ہے اور بارونق اور خوبصورت بھی تو ہے؟

میں نے کہا "کیوں رے یہ یکہ اور گھوڑا..... کیا اس لئے تو نے چلا چلا کر مجھے اپنے یکے پر بلا کر بٹھایا۔ گاڑی نہ ملی تو تجھے دھیلا بھی نہ ملے گا۔"

یکے والے نے چابک گھمایا اور ایک کس مارا۔ ایک فحش گالی دی، گھوڑے نے دولتی جھاڑی اور پھر دوڑنے لگا۔ یکہ والے نے کہا واہ میرے بیٹے ــــ اور اپنے بیٹے کے پٹھے پر پیار کے چار تھپکے دیئے۔

میں نے دیکھا چابک کی چوٹ پر گھوڑا ایک بار کھچ کر دولتی جھاڑتا ہے لیکن میں نے یہ بھی تو دیکھا کہ پیار کی تھپکیوں پر فوراً ہی اس کے بدن پر مسرت دوڑنے لگتی ہے، کھڑے کان کھڑے رونگٹوں کی طرح کانپتے ہیں اور اس کی چال میں تیزی آ جاتی ہے کیونکہ اس نے جو سن لیا ہے۔ واہ میرے بیٹے! وہ اچھلتا ہوا پیچھے یکہ کے بوجھ کو کھینچتا خوشی سے بھاگتا چلا جا رہا ہے۔

سوچا، چابک کی چوٹ کیا جھوٹ ہے؟ ورنہ کیا پھر پیار کی تھپکیاں جھوٹ نہیں؟ ایک ہی یکہ والا اپنے گھوڑے کو کوڑا مارتا ہے اور بیٹا کہہ کر پکارتا ہے، اس میں کونسی بات جھوٹ ہے اور کونسی سچ؟ کس بات میں وہ یکہ والا [illegible] واضح اور ظاہر

ہے۔ میں نے یکہ والے کو غور سے دیکھا چہرے پر کچھ شکن موجود تھے جن سے یہ جاننا مشکل تھا کہ کونسا شکن کیا ظاہر کرتی ہے۔ ماتھا کم تھا۔ بھاری بھویں تنی ہوئی آنکھوں پر چھجے کی طرح چھائی تھیں۔ اور ٹھوڑی کی نوک نکلتی جارہی تھی۔ میں نے کہا "کب سے بنارس میں رہتے ہو؟"

اس نے کہا "بابو دس ہوگئے۔ تب ہی سے یہ جناور جانور۔ میرے پاس ہے کبھو اس نے دگا (دغا) نہیں دی۔ وفادار جناور ہے" کہہ کر پھر گھوڑے کو جو دھیما ہو رہا تھا' گالی دیکر ایک کوڑا گھما کر جمایا۔ "ہٹ تیرے سالے ـــــ" پھر سے کہا "بابو پورے دس ہوئی گئے اور ہم یہاں پڑے دھرے رہت آوت رہیں......... یہ جناور بڑا مضبوط ہے" اور میں یکہ کے بیچ میں بیٹھا سڑک پار کرتا ہوا ریل کے اسٹیشن کے قریب کھنچا ہوا جارہا تھا۔

"کیوں جی یہ کیا ہے؟ ابھی بنارس اور ابھی ٹکٹ لیا؟ ریل میں بیٹھے اور کل دلی ـــــ کیوں کل دلی اور آج بنارس؟ کیوں ہر روز ایک ہی مقام پر نہیں۔ اور کیوں ہا پوری طرح چین اور سکون نہیں؟ مگر کس لئے ایک ہی جگہ مطمئن رہا جائے؟.... مطمئن ہی کیوں رہا جائے؟ کیوں نہ یہاں سے وہاں بھاگتے پھریں اور ایک دن آئے کہ جہاں ہوں وہیں ٹھنڈے ہوکر ڈھیر ہوجائیں۔ آخر یہی تو ہونا ہے پھر کیوں نہیں' اور کیا وہاں' ـــــ یہ ریل بھی تو عجب تماشا ہے چھک چھک کرتی ہوئی آکر کھڑی ہوجاتی ہے اور کہتی ہے "آؤ لوگو یہاں سے وہاں چلو" اور پانچ دس منٹ بیچاری چپ چاپ انتظار میں کھڑی رہتی ہے اور جو لوگ آتے رہیں انھیں اپنے پیٹ میں لے کر چھک چھک کرتی پھر چل پڑتی ہے اسے اس کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہر جگہ جا کر یہی کہتی ہے' یہاں سے چلو وہاں' اور لوگ اسی تبدیل مقام اور آؤ کہ جاؤ کو کہتے ہیں' ہم کام کر رہے ہیں' اسی کو توسط بنا کر کہتے ہیں ہم تجارت کر رہے ہیں' اصلاح کر رہے ہیں' تبلیغ کر رہے ہیں' پرچار کر رہے ہیں' احسان کر رہے ہیں تغیر و تبدیلی کر رہے ہیں ہم کام کر رہے ہیں۔

اب کے زور سے میرا سر بکس رکھے اپنے بستر کے پلندے میں لگا خیر ہوئی کہ ٹرنک میں نہیں لگا۔ خیال آیا۔ دنیا خیالی نہیں ہے۔ یہ تو بنارس کا یکہ ہے اور بنارس کی سڑک ہے اس لئے اگر خیالی جانور بن کر بیٹھوں گا تو سخت غلطی کا مرتکب ہوں گا۔

میں نے کہا "سنبھال کر کیوں نہیں چلاتا رے یکے" اور میں سنبھل سنبھال چوکنا ہو بیٹھا دیکھتا ہوں کہ سڑک کو پار ہونے کی جلدی نہیں ہے یکہ کے پیچھے سے گہرے جھک کے داغ لئے گرد ہونے والی یہ بڑھیا خالہ سڑک بڑی دھیمی دھیمی چال سے کھسک رہی ہے۔

میں نے کہا "یکہ بڑھاتا ہے کہ ریل نکل جانے کی دھن میں ہے.... ریل نکلی کہ پھر تو ہے اور میں" اس نے گھوڑے کی پونچھ کے پاس ہاتھ لگا کر کہا "ہو.... برٹک ..... ٹک..." مجھ سے کہا "بابو کہاں جاؤ؟"

میں نے خوشی سے کہا۔ دلی۔

"دلی"! اور وہ مجھے آنکھ پھاڑ کر دیکھنے لگا' "بابو دلی! اس نے سمجھا ہوگا سونے سے کیا کم قیمتی دھات دلی کی سڑکوں میں لگی ہوئی! لوگ پانی کی جگہ عطر پیتے ہوں گے! اس استعجاب کے بعد پوچھا' "بابو تمھارے ہاں کیا روجگار ہوت است"

میں نے کہا "چلو۔ چلو۔ یکہ چلاؤ ـــــ" یکہ چل رہا تھا۔ اور چل پڑا۔ "بابو دلی میں مغل کے بادشاہ رہت تھے۔ وہی دہلی۔ وہاں کلا اے؟"

میں نے کہا "ہاں وہی دہلی' وہاں قلعہ ہے اور چاندنی چوک بھی ہے۔"

"چاندنی چوک"؟

"خوب چوڑی...... پکی ہموار سڑک ہے' ٹرامیں چلتی ہیں بڑی رونق ہے۔ تم نے نہیں دیکھی؟"

"بابو ہمارے اچوک سے بھی بڑھیا اے؟"

"ارے دنیا میں ایک ہے"

"اچھا ـــــ" اور وہ اپنے گھوڑے کی طرف دیکھ کر بولا "چل' بیٹے شاباش"۔

اس اجنبی و جاہل شخص کے دل میں دلی کی اہمیت جگا کر

ہوئے انہوں نے اپنے بڑے [illegible] کی بات مجھ
[illegible] تحقیق [illegible] نہ ہوا ایک وصیت ہے
جس کی بنا پر میں [illegible] سمجھ [illegible] دل [illegible] ہمیشہ [illegible]
[illegible] سوچتا ہوں [illegible] کہ
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] بھی بات نہیں [illegible]
بلکہ شرم و احساس [illegible] باؤ [illegible] کہہ کر
وہ بچی نگاہ سے اپنے [illegible] کو دیکھا اور [illegible] لگا۔

"دیکھو جی۔ یہ بڑائی اور بزرگی تو کیا ہے؟ [illegible] تجھ
[illegible] سے بڑا [illegible] ختم نہیں ہوتی وہ چیزوں کو [illegible]
[illegible] الفاظ کو بھی ایک دوسرے کے سامنے اونچا چڑھا
[illegible] کوشش کرتی ہے۔ [illegible] میں ہوں اس لئے
تم سے بڑا ہوں اور اس لئے میرا فعل بھی تم سے اعلیٰ ہے ——
اسی لئے میری گالی بھی تم سے بڑی ہے ...... اس جھگڑا اور برائی
کی حد نہیں ...... برائی [illegible] ایک مصیبت ہے۔

[illegible] ایک عالی شان کوٹھی دکھائی دی [illegible]
[illegible] والے نے کہا "بابو یہ انڈین پریس ہے" میں نے دل میں دہرایا
انڈین پریس"

"بابو چھاپہ خانہ ہے —— کتابیں [illegible]"
مجھے اس کی یہ ذہنیت اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ [illegible]
[illegible] کو پریس کیا [illegible] ہے —— میں نے
کہا [illegible] جلدی [illegible] ہو رہی ہے۔
[illegible]
[illegible] علم و ادب [illegible]
[illegible]

[illegible] بجائے [illegible] بھری ہوئی [illegible]
[illegible] کا [illegible] آئی [illegible] ہونے کا [illegible]
[illegible] ہے [illegible]
[illegible] آج کے [illegible] نہ ہوگا
[illegible] —— [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سے نکل جاتی
ہے [illegible] اب نکلا [illegible] —— وہ
[illegible] مضمون مجھے [illegible]
[illegible]
[illegible] ہمیشہ [illegible] لکھا ہے
اور اس [illegible] کی ضرورت ہے۔ [illegible]
[illegible] کی کوٹھی پسند آئی ہے —— اسی لئے لکھواؤ
پڑھو ...... میں جانتا [illegible] انڈین پریس [illegible]
[illegible] کا کالج [illegible]
میں نے کہا [illegible] —— [illegible]
[illegible] بابوجی"
[illegible] مکان
[illegible] دکھائی دیئے
[illegible] —— [illegible] کام
کرتے [illegible] —— [illegible]
[illegible]
[illegible] افسانہ
[illegible]
[illegible]

[illegible] اور کچھ نہیں کرتا ہے وہ [illegible] پان [illegible] اور اسے سب کی سب کو [illegible] اور کچھ پانا نہیں رہے گا ۔ وہ [illegible] [illegible]

[illegible] ایک پان لئے [illegible]

[illegible] ایک پان تو لگا دیا۔

[illegible] پان لگانا شروع کر دیا [illegible] سی [illegible] کچھ [illegible] مسکرا رہی تھی۔

میں نے دیکھا [illegible] اور میں [illegible]

[illegible] کیا [illegible]

[illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible] اس کی گردن پر

[illegible] کو [illegible]

[illegible]

[illegible] روشنی کہ [illegible] کی [illegible] اور وہ [illegible] سکا [illegible] کان [illegible] کے سامنے اس [illegible] کا [illegible]

[illegible]

[illegible] کو [illegible]

آتا ہے۔ یا تم کہیں جا رہے ہو تو مجھے اس سے کیا؟ ـــــ وہ بے تحاشا ہنس پڑی اور نوجوان بھی زور سے ہنسا مجھے بھی زور سے ہنسی آئی مگر دل میں الجھا بھی تھا ـــــ دیکھو یہ آدمی کے بہانے تجھ سے اپنا تعلق جوڑ سکتی ہے اور بنا سکتی ہے۔ یوں گویا میں اس کے نزدیک ہوں [illegible] نہیں ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنا پان لیا [illegible] ـــــ اور [illegible] جلدی چلو ۔ ۔ ۔ جلدی [illegible] آئے گھر [illegible]۔

میں نے سوچا [illegible] کیا [illegible] جا [illegible] کہ مجھ سے [illegible] والے [illegible] [illegible] اور [illegible] ہو گیا۔ [illegible] اور [illegible] ہوں۔ [illegible] ساری دنیا پا لئے ہو۔ دوسرے مجھے اس کا احساس ہوتا ہے کہ تم دنیا کے سامنے ایک حقیر بلبلہ کی طرح بھی نہیں ـــــ یہ محدودیت اور لامحدودیت کیا ہے؟ وہ پان والی [illegible] نوجوان کے [illegible] اپنے کو [illegible] کچھ طور سے [illegible] سے پرسے [illegible] اس لئے ہی تو یہ ممکن ہوا کہ وہ مجھ پر [illegible] بے اختیاری اور [illegible] پروائی سے ہنس پڑی۔ یعنی [illegible] کا احساس [illegible] بھی اس کو نہ ہوا ـــــ اس کو [illegible] کا بھی خیال نہ رہا کہ میں مرد ہوں۔ [illegible] لیکن [illegible] کی [illegible] نہیں آئی۔

لیکن ہنسی ہونے کے لئے کیوں اتنی [illegible] ہے؟ جو [illegible] نہیں [illegible] کیا [illegible] کی؟ اس کا کیا جواب ہے؟ اس کے بیان [illegible] ـــــ تم نے اپنے کو کرشن کی [illegible] بنایا ـــــ کرشن سے وہ [illegible] قائم کیا جہاں رسم و رواج کے حدود ٹوٹ جاتے ہیں۔ جہاں قیود و حدود [illegible] باقی نہیں [illegible] کہ وہ اپنی زندگی جیسا اپنی زندگی [illegible] کسی [illegible] لوگ [illegible] اس [illegible]

[illegible]

یا اس کا کوئی بھی کچھ کیسے ہو سکتا ہے، کرشن کی تپسیا بن کر اپنا سب کچھ کرشن کا بنا کر اس نے گویا دنیا کی ان تمام کروہ حدود کو مٹا دیا .... مگر

ریل کا اسٹیشن کہاں ہے کتنی دور ہے —— میں نے کہا کیوں —— اسٹیشن نہیں آیا

بولا "بابو جی اسی موڑ پر اسٹیشن ہے۔"

میں نے دیکھا عیسائیوں کا مشن ہے۔ پودے شگفتہ ہیں کچھ سبز اور زرد ہیں۔ نیچے لوہے کی ایک دکان ہے جس میں ایک ہوا مونگ پھلی بیچ رہا ہے اس کا ایک لڑکے سے جھگڑا ہو رہا ہے —— ایک درزی کی دکان ہے —— ایک سوڈا واٹر کی دکان ہے اسی قطار میں کئی دکانیں ہیں۔ ایک جگہ پانچ سات کولی اکٹھے ہو کر سلفے کا ایک دم مار رہے ہیں۔ اور سڑک پر جو پانچ چھ عیسائی میں جا رہی ہیں انھیں دیکھتے جا رہے ہیں اور کچھ کالج کے لڑکے امریکن کالری ٹیم میں بیچوں پر بیٹھے ٹینس کھیل رہے ہیں اور ایک کے ہاتھ میں ٹینس کا بلا ہے دوسرے کے ہاتھ میں ریکٹ ——

اچھا اسٹیشن آ گیا۔

یکہ والے نے یکہ روک دیا —— بابو —— گوڈبائی۔

وہ تین کولی دوڑتے —— ایک نے بستر —— ایک نے بیگ اٹھا لیا اور ایک نے ٹرنک۔

بابو ذیوڑھی درجہ ——

میں نے دیکھا میں ان کی نیتوں کو بھانپ رہا ہوں —— کیا پوچھ رہے ہیں —— اس لئے میں تیسرے درجے کا ٹکٹ لوں —— ڈیوڑھے درجے کا —— appreciate —— نہیں —— کریں گے

میں نے کہا —— ڈیوڑھا —— ہاں —— اور جب تک میں ٹکٹ خرید کر آیا —— وہ ٹکٹ کی کھڑکی تک پہنچا ہوا دیکھتا ہوں۔ بکنگ آفس —— صاف صاف —— ہے۔

میں نے کہا —— چلو —— ٹھیک

جینیندر کمار

ترجمہ امجد یوسف زئی

مئے سہ آتشہ

حسن تھا تیری پراگندہ دلی افسانوں میں — لکھ لیا کس نے مرا نام غزل خوانوں میں
ڈھونڈتی ہیں مری نظریں انھیں ہر سو لیکن — وہ یگانوں میں نظر آئے نہ بیگانوں میں
میرے افسانۂ دل سے ہیں پریشاں اوراق — ذکر ہے ان کی بھی زلفوں کا پریشانوں میں
چوٹیاں جلوہ گہہ مست کی چھو لیں سب بھی — جان آتی ہے مرے مُردہ ارمانوں میں
وہ بڑے لوگ ہیں افسانہ جو بن کر رہ جائیں — ایسے دیسوں کا نہیں نام بھی افسانوں میں
ہائے ہم سوختہ دل کیوں ہیں ادھر آتی نگہیں — ایسی کیا بات ہے جلتے ہوئے پروانوں میں
کبھی اشعار کبھی پروین کبھی کچھ ہیں کبھی کچھ — رو سپید [illegible] پرستانوں میں
میری آنکھیں رہی ہیں حسن کے دیوانوں میں — میرا دل بھی ہے محبت کے نگہبانوں میں
ان کا ہمرنگ ہے ماحول گلستانوں کا — خود وہ کیسے رنگ جماتے ہیں گلستانوں میں
ماہ نو چھپ بھی گیا ہم نے ادھر رخ نہ کیا — ہائے یہ جذب حسینوں کے گریبانوں میں
ان کی ان سرکشیوں میں بھی ہے [illegible] — [illegible] گلستانوں میں
بہر گلگشت اگر سرو سہی آیا تو [illegible] — [illegible]
اُف پسینہ کے یہ قطرے یہ حیا وقتِ کرم — کیا ادا [illegible] احسانوں میں
میں ترے حسن کے معیار پہ جا پہنچا کیا — پھر وہ [illegible] پشیمانوں میں
حسن پردوں میں نقابوں میں شبستانوں میں — جگمگاتا ہے یہ عنواں کئی عنوانوں میں
نہ تکلم نہ تبسم نہ سزا ہے نہ جزا — وہ معصوم ہی معصوم ہے کچھ بھی نہیں [illegible] میں
خود وہ کہتے ہیں کہ مجھ سا کوئی ہشیار نہیں — عمر کہتی ہے کہ گنئے ابھی نادانوں میں
ان بتوں کا بھی نہیں ڈر نہیں اللہ اللہ — نام اللہ کا جپتے ہیں صنم خانوں میں
چپکے چپکے بت کافر کی بھی پوجا کر لی — کافرانہ اثر آتا ہے مسلمانوں میں
دائرہ انجمن کھیلے ہم پہ خدا جانے کب — مسجدوں سے ابھی اٹھ آئے ہیں بتخانوں میں
خوش زبانوں کی یہ نہیں بزم جناب منظور — سہم کر بیٹھے ہیں [illegible] انسانوں میں

علی منظور

عزیزی مدیر "سب رس"

(ایک خط)

بعد مدت مدید اور عرصۂ بعید کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ
دریافت کیا معنی کہ اس طویل عرصہ میں آپ کے خیال و تصور اور
آپ کی التفاتات نے مجھے خدا جانے کن کن صورتوں میں پیش
کیا ہوگا اور محسوس کرایا ہوگا۔ ممکن ہے کہ میری اس طویل غیر
حاضری کو جناب نے میری چار بیویوں کا دباؤ سمجھا ہو مگر
عزیز از جان مدیر "سب رس" یہ کچھ بھی نہ تھا بلکہ معاملہ یہ تھا
کہ مجھ میں یہ بات گورنمنٹ آف انڈیا نے کوٹ کوٹ کر بھر دی
ہے کہ جس کام کو ہاتھ میں لو اس کو حد ادب تک پہنچا کر چھوڑو
اسی لئے میں کم نہ زیادہ پورے تین کاموں میں دل لگا کر رکھ دو
منہمک رہا۔

پہلا کام یہ کیا کہ نا قدر دان قوم کے ہاتھوں سے جو مالی
نقصانات پہنچے ان کو پورا کرنے کے لئے اور غم سے نجات حاصل
کرنے کے لئے ایک "بکرا بکری ایسوسی ایشن" قائم کی اور ایک
"مرغا مرغی کلب"۔ "بکرا بکری ایسوسی ایشن" کا بنفس نفیس خود صدر بنا
اور ناظم بھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ یورپ میں بعض اوقات
وزیر اعظم ہی وزیر جنگ بھی ہوتا ہے چاہے وہ توپ تو توپ
کی جگہ پٹاخہ بھی قاعدہ سے نہ چلا سکتا ہو اور "مرغا مرغی کلب"
کا صدر بیوی نمبر ۴ کو اور ناظم بیوی نمبر ایک کو بنایا۔ امید تھی
کہ میں بکرا بکری ایسوسی ایشن سے اور بیویاں مرغا مرغی کلب
سے تین چار سال کا بجٹ عزت مآب سے درست کر لیں گی مگر
بیوی نمبر ۴ کے کلیۃً انگریزی داں ہونے سے یہ نقصان پہنچا کہ
اس غریب نے ہر کام میں یورپ والوں کے کاموں کی نقل
کی اور اس نقالی کا نام اس نے "ترقی" اور "روشن خیالی"
رکھا۔ آخر یہ میں نے ثابت کر دیا کہ دیکھو یورپ اپنی جس چیز کو
ایشیا اور آفریقہ والوں میں مقبول بنانا چاہتا ہے اس پر جیسے
"شاندار" اور "دلکش الفاظ" کا غلاف چڑھا دیتا ہے جیسا کہ
یورپ کی تعلیم پائے ہوؤں کو "اعلیٰ تعلیم یافتہ" کہتے ہیں
اور فی تمام تعلیموں کے ماہر کو "ادنیٰ تعلیم یافتہ" حالانکہ ابھی
تک ہندوستان میں مرغا مرغیوں کے کلب کو بھی یورپی
اصول پر چلایا تو انشاء اللہ تعالیٰ ناکام رہو گی۔ آخر کار
بیوی نمبر ۴ گریجویٹ ہیں تو اتنی مذاق تو تھیں نہیں بس بھائی
جہاں سے انشاء کی انگریزی داں بندی نے امریکہ اور انگلستان
تک کے تمام مرغا مرغیوں کے رسالے پمفلٹ کتابیں اور ضوابط
انگریزی اس کلب میں رائج فرمائے تو اب زیادہ کیا عرض
کروں بیوی نمبر ایک کے پاس تو دس پانچ دیسی مرغا مرغی رہیں
بھی لیکن بیوی نمبر ۴ کے پاس کلیۃً ایک ریڈیو ہے سو الحمد للہ
وہ بھی ابھی کے نیچے میں کیونکہ بفضل خدا آپ نے تو مجھے کل ہی
ناگپور میں دیکھا تھا۔ میں نے تو اپنے محلے تک میں یورپ کی
ایک چیز کو نہیں آنے دیا۔ اب رہی میری "بکرا بکری ایسوسی
ایشن" سو خدا کے فضل سے وہ برابر ترقی کر رہی ہے۔
تفصیل اب مجھے یہ سوجھتی ہے بکرا بکریوں کے فائدے اور
ترقی کی اور آپ جانتے ہیں قوم اور ادب کی ترقی کی اس لیے
میں سوچتا تو کیا در پیش کرتا دیکھا اور یہ آپ ہرگز برداشت
نہ کرتے کہ میں "سب رس" میں مضمون کے بجائے آپ کو ایک بڑے
بڑے سینگ کا بکرا بھیج دیتا!

دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ علم نجوم اور پامسٹری کو میں نے
اتنا گھیرا کہ یہ دونوں میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے
رہتے ہیں وہ تو اونٹ کے ذریعہ یورپ جانا اب تک ممکن نہیں
ہو سکا ورنہ ان علوم میں یورپ تک کے ناک کان کاٹ کر
آپ کو لا دیتا تب آپ فرماتے کہ بے شبہ ملا رموزی نہ تھا
مضمون نگار نہیں بلکہ صدر "بکرا بکری ایسوسی ایشن" اور
نجومی بھی ہے۔

تیسرا کام میں نے یہ کیا کہ عورت ذات پر میں نے
ایک ہی سانس میں یہاں سے لیکر لندن تک کے برابر طویل

تین کتابیں لکھ دیں گیا معنی کہ میں نے یورپ کی زبانوں سے ترجموں اور حوالوں سے نہیں بلکہ خود تحقیق کرکے اس راز کا پتہ چلا لیا کہ یہ آخر کار عورت کو مرد کے برابر ثابت کرنے اور مرد کی طرح سے کام لینے اور عہدے دینے کی چال سب سے پہلے کس نے چلی؟

امید کہ آں محترم بھی بخیریت ہوں گے نور دکلاں اور [illegible] حال کو [illegible]

دوم آنکہ

اگر جناب نور قادری صاحب بعد نماز جمعہ مل جایا کریں تو [illegible] مگر اس کو [illegible] سمجھ کر نیاز کا شرف عطا فرمائیے گا۔

سوم آنکہ

میں نے سنا ہے کہ دنیا میں سب کچھ علی حالہ پیدا ہونے پر بھی جو قحط پڑے گا اس سے آپ ضرور محفوظ رہیں گے تو اگر ایسا کوئی تعویذ جناب کے پاس ہو تو براہ کرم [illegible]

چہارم آنکہ

سنا ہے کہ اب ریل کے کرایہ سے زیادہ ہوائی جہاز کا کرایہ [illegible] پسند اگر ایسا ہو تو [illegible] کے لئے آپ [illegible] "ہوائی جہاز" بھی اگر [illegible] فرمائیں تو [illegible] بڑی نوازش ہوگی۔

پنجم آنکہ اگر کہیں [illegible] "رہبر دکن" کے [illegible] کا کٹ مل جائیں تو ان سے میرا دست بستہ آداب ضرور کہہ دیجئے گا زیادہ حد ادب۔

ششم آنکہ

"سب رس" مجھے عزیز ہے اس لئے کہ اس کا تعلق دکن سے ہے اور میرے عزیز بھائی نور قادری صاحب سے اس لئے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس میں لکھتا رہوں گا اور انشاءاللہ وہ لکھوں گا جو دوسروں کے سوچے ہوئے کا ترجمہ نہ ہو اور یہی بات آپ "سب رس" میں لکھنے والوں اور والیوں سے کہتے رہئے اور ان کو یاد دلاتے رہئے یہ بھی کہہ دیجئے کہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک کی اردو میں یہ تنہا ملا رموزی ہی ہے جو دوسروں کے پیش کئے ہوئے "مسلک ادب" کو قبول کرتا نہ "مسلک علم و سیاست" کو بلکہ وہ سب کچھ اپنا ہی غور کیا ہوا لکھتا ہے اور کہتا ہے اور بدبختی سے اردو کے ذخائر ابھی اپنے سوچے ہوئے اور اپنے پیدا کئے ہوئے سے محروم ہیں یقین نہ ہو تو اس کی جگہ کتب ادب و کتب علم کو ملاحظہ فرمائیے۔

امید کہ اس تھوڑے لکھے کو بہت جان کر آپ ایسے ادیب پیدا کریں گے جو دوسروں کے مسالک کے پیرو ہونے کے عوض بطور خود کسی "مسلک ادب کے خالق" و موجد ہوں گے۔

اور ہاں غلطی یہ تو فرمائیے کہ کیا آپ کی طرف بھی بارش ہوئی ہے میری طرف تو اتنی ہوئی ہے کہ آج مبلغ ۱۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو بھی صبح کے وقت میں چادر اوڑھ کر صبح کی نماز کے لئے اپنے محلہ کی مسجد میں گیا تھا زیادہ حد ادب۔

ملا رموزی

ہمارے قلمی معاونین سے

مندرجہ بالا خط کے آخری حصے میں حضرت ملا رموزی نے اپنے اچھوتے انفرادی انداز میں اردو کے لکھنے والوں کو اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ دوسروں کی نقالی اور پیروی کرنے کی بجائے خود کسی خاص مسلک ادب کے موجد و بانی بنیں۔ ملا صاحب کے اس مشورہ کی اہمیت اور افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنا ذاتی اسلوب پیدا کرنا بہت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن اگر کوئی اس بات کا پکا ارادہ کرلے اور مسلسل مشق کرے تو یقیناً وہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کسی زبان و ادب کی ترقی کے لئے تخلیقی ادیبوں اور فن کاروں کا پیدا ہونا ضروری ہے ورنہ اس ادب میں (Originality) کی بجائے صرف نقالی ہی نقالی رہے گی۔ شاہد

آثارِ اقبال

ہر ہائینس نازلی رفیعہ سلطان نواب بیگم صاحبہ جنجیرہ مس مفاخرہ سیدہ بیگم ... ۱۹۰۸ء میں انگلستان، فرانس، سوئزرلینڈ، قسطنطنیہ اور مصر کا سفر کیا تھا۔ یہ سفر اپریل سے اکتوبر تک جاری رہا۔ نازلی رفیعہ بیگم صاحبہ کی نواب محمد ... شیخی نے اپنی زبان کا روزنامچہ مرتب کیا اور لاہور سے ... ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا۔

جس زمانے میں نازلی رفیعہ صاحبہ لندن گئی ہوئی تھیں اسی زمانے میں حضرت اقبال بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ رفیعہ صاحبہ اپنے روزنامچے مورخہ ۲ ... ۱۹۰۸ء کو لکھتی ہیں:۔

"ڈاکٹر انصاری جو آپ کے بھائی کے دوست ہیں اور بہت لائق آدمی ہیں، بمبئی میں ہمیں (کذا) ملنے آئے۔ اور بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ آپ اصل میں لکھنؤ (کذا) کے رہنے والے ہیں۔ یہاں انھیں ہر ... نظر لوگوں کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے۔ سب امتحان پاس کر چکے ہیں۔ اور ... لندن میں انھیں کام مل گیا ہے۔ ... پونڈ (تیس سو روپے) ماہوار ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اقبال ایک دفعہ آئے تھے۔ مگر اس وقت ... (رفیعہ صاحبہ کے شوہر) تشریف نہیں رکھتے تھے۔ حضور کو ان سے ملنے کا شوق ہے مگر پھر نہیں آئے۔"

ص ۲۶ کتاب مذکور روزنامچہ سفرِ یورپ

" پیر ۲۵ ... ۱۹۰۸ء

...... اقبال بھی اسی شب کو آئے تھے۔ کہا ... کہ ... یہ بحر کی تاریخ اور فلسفہ کی گفتگو ہوتی رہی"

ص ۳۰

تیسری اور آخری مرتبہ اقبال کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

" ۱۰ جون ۱۹۰۸ء بدھ

...... جس نے اپنا ... اور ... ان کو ... کی وجہ سے ... کی ... سے فائدہ اٹھایا تھا ... شیخ محمد اقبال موجود تھے .... مختلفوں ... میں ... اور ... میں تھیں۔ مسٹر اقبال نے اس رات یہ شعر کہا۔ ... کتاب میں درج کر دیے گئے ہیں جو نقل کیے جاتے ہیں۔

اے کہ تیری ہے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیضِ آستاں بوسی گل برسر قمر

روشنی لیتا ہے تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے پھیلا کے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو تجھ سے ہے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ ہے ... اختر قمر

شمع بزمِ اہلِ ... را چراغِ طور کن
یعنی ظلمت خانۂ ما را ... پُر نور کن

سید ... اثر ...

غزل

دیکھا نہ کچھ مذاقِ تماشا کے باوجود
ہوں بے نگاہ دیدۂ بینا کے باوجود

غمگیں نہیں ہے دل غمِ دنیا کے باوجود
نشہ ہوا نہ تندیٔ صہبا کے باوجود

ہر پردۂ نظر سے ہوس جھانکتی رہی
تسکیں ملی نہ ترکِ تمنا کے باوجود

تقدیر کی شکست پہ ہے اک لطیفہ یہ
جینا تسلسلِ غمِ دنیا کے باوجود

ساحل سے ہے تعلقِ خاطر وہی مجھے
آغوشِ موج و دامنِ دریا کے باوجود

ہمدم نہیں رفیق نہیں مہرباں نہیں
تنہا ہے دل ہجومِ تمنا کے باوجود

پیرِ حرم سے پیرِ مغاں کے تعلقات
قائم ہیں پردۂ مے و مینا کے باوجود

جورِ زمانہ سے کبھی ڈرنا نہ چاہیے
مرنا نہ چاہیے غمِ دنیا کے باوجود

تم میری زندگی میں بہاراں نہ کر سکے
اپنے تبسمِ چمن آرا کے باوجود

بیتابیاں نگاہ کی فطرت نہ جا سکی
آوارگیٔ فکر و تمنا کے باوجود

عبدالعزیز فطرت

غزل

ترکِ الفت کا اگر اذن ہے ایسا ہی سہی
آرزوؤں کے تسلسل میں ابھی وقفہ ہی سہی

نہ سہی لطفِ کرم وعدۂ فردا ہی سہی
التفاتِ نگہِ ناز کا دھوکا ہی سہی

تیرا افسانۂ دل شکوۂ بے جا ہی سہی
آپ کے واسطے کچھ دیر تماشا ہی سہی

ڈھونڈھ لے گی نگہِ شوق تجھے حسنِ نہاں
راہ میں لاکھ حجابات کا پردہ ہی سہی

میں بھی گزرا ہوں محبت کے چمن زاروں سے
اب مرا جوششِ جنوں زینتِ صحرا ہی سہی

تجھ کو میں تیرے سوا دیکھوں گا آخر کب تک
یہ کرشمہ بھی تری جلوہ گری کا ہی سہی

اور بھڑکے گا بجھانے سے مرا شعلۂ دل
تیری مرضی ہے تو کچھ اور بہانہ ہی سہی

مجھ کو جینا ہے تو بس تیرے لئے جینا ہے
انقلاباتِ محبت کا سہارا ہی سہی

فاش کر رازِ جنوں بے خبری میں اشرف
پھر بہ عنوانِ دگر نغمۂ [illegible] ہی سہی

علی اشرف

اسلوبِ بیان

اسلوبِ بیان تحریر کی جان ہے۔ کسی مضمون کے مطالعہ کے وقت جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ کی طالب ہوتی ہے وہ اس کا طرزِ تحریر ہے۔ نفسِ مضمون کے دلچسپ اور غیر دلچسپ ہونے کا احساس بہت بعد کو ہوتا ہے۔ مضمون کا عنوان ہی درحقیقت مضمون سے نصف آگاہ کرتا ہے۔ اس نصف آگاہی کے بعد قاری اس کا منتظر نہیں رہتا کہ مضمون نگار کیا بات کہنا چاہتا ہے بلکہ غیر شعوری طور پر یہ معلوم کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے کہ وہ کونسا طریقۂ اظہار اختیار کرتا ہے۔ بہت سے ایسے مضامین جن کے مطالعہ کی افادیت کا ہمیں احساس ہوتا ہے صرف اس وجہ سے ہم پڑھنا نہیں چاہتے کہ ہم سے اس کا ایک صفحہ بھی پڑھا نہیں جاتا۔ برخلاف اس کے اکثر دفعہ ہم کوئی رسالہ یا کتاب اٹھا لیتے ہیں صرف عنوانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی خاطر۔ دفعتاً کسی عنوان کے تحت ایک جملہ ہماری توجہ کو جذب کر لیتا ہے پھر دوسرا پہلے سے زیادہ جاذبِ توجہ ہوتا ہے، اس طرح مضمون ختم کرنے تک ہمیں چین نہیں پڑتا۔

بنیَن "پلگرمز پروگریس" کی ابتدا بغیر کسی تمہید کے اس طرح کرتا ہے کہ پڑھنے والا دو چار جملوں کے بعد ہی اپنے آپ کو مصنف کے قابو میں پاتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ چھوٹے چھوٹے جملے ایک طلسمی اثر پیدا کر دیتے ہیں جس کی فضا کتاب کی آخری سطر تک برابر قائم رہتی ہے۔ بجنوری کا مشہور مقدمہ "محاسنِ کلامِ غالب" اٹھائیے۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں "مقدس وید" اور "دیوانِ غالب" لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں......"

یہ اچھوتی طرزِ تحریر ہمارے دل میں وہی جوش وہی عقیدت اور کلامِ غالب سے وہی محبت پیدا کرتی ہے جن کو بجنوری محسوس کرتے تھے۔

بہتر اسلوبِ بیان نہ صرف عبارت کو شگفتہ، دلچسپ اور جاذبِ توجہ بناتا ہے بلکہ نفسِ مضمون کی کمزوریوں کی بھی بڑی حد تک تلافی کر دیتا ہے۔ بجنوری کے "محاسنِ کلامِ غالب" میں ان کی غالب سے شدتِ عقیدت کی بنا پر جو مبالغہ کا عنصر بڑھ گیا ہے اور انھوں نے غالب کے خیالات کی جو توجیہیں اور اشعار کے نئے نئے مطالب نکالنے میں جو موشگافیاں کیں اس کے باوجود اس دلکش مقدمے کی مقبولیت کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ وہ حضرات بھی جنھوں نے اس پر سخت سست تنقیدیں کی ہیں اس کی دل پسند طرزِ تحریر اور رجحان دارِ اظہارِ بیان کا حظ اٹھانے کی خاطر اس کو بار بار پڑھتے ہیں۔ آبِ حیات کی اکثر روایتوں کو تاریخِ ادب میں استناد کا درجہ حاصل نہیں مگر آبِ حیات آج ہر ادب کے طالبِ علم کے لئے ایک تحفۂ نادر سے کم نہیں۔ "آزاد" کے جادو نگار قلم کی گلکاریاں پڑھنے والے پر ایک سحر سا کر دیتی ہیں اور اسے اس بات کی بالکل پرواہ نہیں رہتی کہ [illegible] واقعات میں سے اکثر حقیقت سے بعید تھا۔

داغ کی شاعری کا تجزیہ کیجئے: وہی چیزیں نکلیں گی۔ "زبان و بیان"۔ وہی باتیں جو آپ دن بھر سوچتے کرتے اور بولتے رہتے ہیں آپ کے سامنے آتی ہیں اور آپ چونک پڑتے ہیں منہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے:-

بغل میں داب کر تاب و تواں کو
کہاں کو اے دلِ ناداں کہاں کو

تو بھی کسی سے دل لگا، ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی
کبھی تڑپا کے دل پہ ہاتھ رکھنا، کبھی کہنا اسے یہ ہو گیا کیا

ہم تو مرتے ہیں ادا پر دلستاں ہو کوئی ہو
دوست دشمن مہرباں نامہرباں ہو کوئی ہو

غالب کی عظمت کا ایک بڑا راز اس کا انفرادی اندازِ بیان ہے۔ ایک لحاظ سے غالب کی شاعری گزشتہ پورے دورِ غزل گوئی کی روح ہے۔ غالب کی مضمون آفرینی اور اس کے فلسفیانہ نکات کو نظر انداز بھی کیجئے تو غزل گوئی کے

عام اور پامال موضوع گل و بلبل، سرو قمری، بہار، غم عشق، بے مہری حبیب وغیرہ پر جو اس نے شعر لکھے ہیں ندرت بیان اور تنوع اظہار کی ان سے بہتر بہت کم مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں:-

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں، شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

مندرجہ ذیل اشعار کا انداز بیان دیکھئے، اردو غزل میں واقعی ایک بے بہا اضافہ ہے:-

ہے کس قدر ہلاکِ فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں آگیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خیالات ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ہر انسان کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہے چاہے اس کے سوچنے کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ان خیالات کو نہاں خانۂ دل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا بہت مشکل ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایمرسن کہتا ہے "آدمی خود نصف ہے دوسرا نصف اس کا اظہار بیان ہے"۔ آپ کو دنیا میں آدھے آدمی بہت نظر آئیں گے اور مکمل انسان بہت کم ؎

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

لیکن خیالات کے اظہار ہی پر بات ختم نہیں ہوتی سب سے بڑا مشکل مرحلہ ان خیالات کو سلیقے سے ان کی تازگی کھوئے بغیر پیش کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم سوچ بہت لیتے ہیں مگر مافی الضمیر کے اظہار میں وہ دلچسپی رنگینی اور لطافت نہیں پیدا کر سکتے جس کو ہم سوچتے وقت محسوس کرتے ہیں۔

انگریزی میں کہا گیا ہے (Style is The man) اسٹائل آدمی کا جوہر خاص ہے ایک اور مثل (Style is The index of personality) ہے اسٹائل آدمی کی ذات کا آئینہ دار ہے۔ دراصل طبائع کے ساتھ طرز بیان بھی بدلتا جاتا ہے کسی کا لہجہ سست اور کسی کا چست کوئی نرم اور کوئی گرم ہوتا ہے کسی کا اسلوب بیان رواں دواں ہوتا ہے اور کسی کی طرز تحریر یہ بتلا دیتی ہے کہ لکھنے والا خود سوچ سوچ کر لکھ رہا ہے اور پڑھنے والوں سے بھی اسی غور و فکر کا طالب ہے بعض مصنف تحریر کی ابتدا ہی میں بتا دیتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور بعض کی طبیعت کا کھوج لگانا پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد بھی مشکل نظر آتا ہے۔

اسلوب بیان درحقیقت آدمی کی طبیعت کا آئینہ دار ہوتا ہے ہر ادیب اپنی زبان کو بالکل اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے طرز بیان ایک بالکل ذاتی خصوصیت ہے ایک کا اسلوب دوسرے سے بالکل جدا ہوتا ہے الفاظ کے انتخاب میں ترتیب محاورات جملوں کی ترکیب اور فقروں کی بندش میں ہر ایک اپنے انفرادی ذوق کا پابند ہوتا ہے۔ کارلائل کہتا ہے "اسلوب بیان انشا پرداز کا لباس نہیں پوست ہے" ایک اور مشہور ادیب کا کہنا ہے کہ "ادب زبان کے ذاتی استعمال کا دوسرا نام ہے"

اسلوب بیان کا غائر مطالعہ ہمیں انشا پرداز کی ذات سے بہت قریب کر دیتا ہے اس آئینہ میں ہم کو نہ صرف اس کی ذات کا عکس نظر آتا ہے بلکہ اس کی دماغی اور روحانی نشو و نما کا خاکہ بھی مل جاتا ہے اس کے ماحول کے وہ تمام اثرات جنھوں نے اس کی حیات کی تعمیر میں حصہ لیا ہے ضرور اس کے اسٹائل کی ترکیب میں بھی حصہ لیں گے بالفاظ دیگر اس کا اسلوب بیان اس کی تمام جسمانی اور ذہنی تجربات کا آئینہ دار ہوگا۔

مکالے کی "تاریخ انگلستان" لیجئے جس کی تاریخی اہمیت کم اور ادبی اہمیت زیادہ ہے۔ تاریخی واقعات اور کردار کے متعلق مکالے نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی سطحی ہے مکالے خود کوئی بڑا مصنف نہیں تھا مگر اس کی جدت طرازی واقعیت پسندی اپنے دور کی مادیت پرستی سے پُر جوش اعتقاد اور ہر چیز کو بدیہی سوچنے اور سمجھنے کا شوق یہی چیزیں اس کے انداز بیان کو متنوع روشن اور پُرزور بنا گئیں۔

مکالے ہر چیز کو واضح طور پر سوچنے اور کہنے کا قائل تھا اس کا خیال اس کی دلیل سے زیادہ واضح ہوتا تھا اس کے اسلوب بیان کے پرزور ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہر بات جس کو وہ کہتا اس پر پورا پورا اعتماد ہونا چاہیے اس کی صحت کے متعلق شبہ ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ رہتا ہے۔ "میں چاہتا ہوں کہ کسی چیز کے متعلق بھی مجھے ایسا یقین حاصل ہو جائے جیسا کہ مکالے کو ہر چیز کے متعلق ہے۔" ڈبلیو۔ ایچ رونا W. H. (R onae) نے مکالے کے اسٹائل کو پسٹل شاٹ اسٹائل (Pistol Shot Style) کہا ہے۔

برخلاف مکالے کے رسکن کی طبیعت کی نرمی حق پرستی روحانیت پر اعتقاد اور اپنے ماحول کی "مادیت پرستی" سے نفرت نے اس کے لہجہ کو بھی نرم اور پاکیزہ کر دیا، اس کی عبارت ان مصوروں کی تصاویر سے زیادہ رنگین اور دلکش ہے جن کے متعلق اس نے خامہ فرسائی کی ہے۔

حالی کی طبیعت کی متانت ان کی ہمیشہ محتاط رہنے کی عادت اور سنجیدگی ان کے انداز بیان میں ہر جگہ جھلکتی ہے۔ میر انیس کی طبیعت کی نفاست اور پاکیزگی مزاج کا ثبوت ان کے مراثی کے ہر شعر سے ملتا ہے جس طرح زندگی میں وہ سلیقہ اور نفاست کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے اسی طرح شعر کہتے وقت بلاغت و فصاحت سے کوئی مصرعہ باہر نہ ہونے دیتے۔ آزاد کی طبیعت کا بانکپن اٹھان، جوش و خروش اور ان کی نزاکت طبع کا شاہد "آب حیات" کا ایک ایک جملہ ہے ہر بات کو وہ ایک خاص انداز سے کہتے تھے رنگینی پیدا کئے بغیر انھیں کچھ کہنا شاید اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ تکلف و شوخی ان کی عبارت کی خاص خصوصیت ہے ایک جگہ جنگ کی تیاریوں کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:۔

"خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ ہنگامہ کے لئے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بندوبست ہو جاڑے کی آمد میں ہنگامہ خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم دم نہ لینے دو اڑجائیں اور چھری کٹاری ہو جائے کہ یہی بہار لہلہے فتح کے گلچین اور سلطنت کے باغباں نے کہا کہ ہاں یہی آہنگ ہے۔"

کلام ذوق کے متعلق آب حیات میں لکھتے ہیں:۔

"جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے تارے آسمان سے اتارے ہیں "ملک الشعراء" کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس پر یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔"

اسلوب بیان اور مضمون بالکل علٰحدہ چیزیں ہیں۔ اسلوب بیان کی اہمیت مضمون کے اختصار کے ساتھ بڑھ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ چھوٹے مضمون میں تفصیل کا موقع نہیں ملتا طویل بحث اور مباحثے اور دلائل کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ صاحب مضمون کو اختصار سے کام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ کہیں مضمون میں تشنگی نہ پیدا ہو جائے

یا کہیں اختصار مطلب سے عبارت خشک اور بے مزہ نہ ہو جائے۔ حسن نظامی طول اور خشک تمہید کے بغیر مضمون کو یکایک شروع کر دیتے ہیں۔ حسن نظامی صاحب کے مضمون میں کوئی اعلیٰ اور اچھوتے خیالات ہمیں نہیں ملتے نہ ہمیں کسی نئے انکشاف کا اس میں علم ہوتا ہے۔ پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد اگر ہم خاموشی سے غور کریں تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمیں کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی۔ مگر ہمارے لطف میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہماری حیرت بدستور قائم رہتی ہے کہ کس طرح بات میں سے بات نکلتی چلی گئی عبارت تھی کہ ایک جوئے شیر کا سرو و رواں۔

مگر یہ طرز تحریر طویل ناول افسانہ یا مضمون کے لئے جس میں اہم مسائل سے بحث کرنا ہو موزوں نہیں۔ کیونکہ اس وقت بیان کی سادگی اور عبارت کا سلجھاؤ بالکل کافی ہوتا ہے۔ اگر انشا پرداز انداز بیان میں لطف و رنگ پیدا کرنے میں محو ہو جائے تو اصل مطلب کے خبط ہو جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے جیسا کہ "آب حیات" میں آزاد نے کیا ہے۔ پریم چند کا انداز بیان انتہائی سادہ اور فطری ہے اگر ان کا مطلب سیدھے سادھے الفاظ میں ایک جملے میں ادا ہو جائے تو پھر وہ ایک لفظ کا اضافہ کئے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ سخن آرائی اور بات میں بات نکلنے کی فرصت ان کو کم ہوتی ہے ورنہ "گئو دان" اور "میدان عمل" جیسے معرکۃ الارا مسائلی ناول لکھنے کے وہ کبھی قابل نہ ہوتے اس کے برعکس سرشار کا "فسانۂ آزاد" لیجئے اکثر واقعات حقیقت سے کوسوں دور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار لطف بیان و زبان کے طلسم کو قائم رکھنے کے لئے قصے میں ہر قسم کی بے اعتدالی کرنے تیار ہے ہم آج "فسانۂ آزاد" کو قصے کے لطف اندوز ہونے کے لئے نہ اور زبان و طرز ادا سے محظوظ ہونے کے لئے زیادہ پڑھتے ہیں ظاہر ہے کہ اس طویل قصے کو صرف انداز بیان سے حظ اٹھانے کی خاطر ہم اس اضطراب اور ذوق و شوق سے نہیں پڑھتے جس کا اظہار ہم رینالڈس کے طویل ناول پڑھتے وقت کرتے ہیں بلکہ ہمیں "فسانۂ آزاد" کا مطالعہ وقفہ وقفہ سے کرنے میں لطف آتا ہے۔

ہر بڑے ادیب کی تحریر کے مخصوص خدوخال ہوتے ہیں اس کا انداز بیان طرز ادا اور اظہار جذبات کا طریقہ دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے ہر بڑے انشا پرداز یا شاعر کی عظمت کا یہی ثبوت نہیں کہ وہ اسلوب بیان کا ماہر ہو بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کے رنگ میں کہنے سے معذور ہے۔ جس طرح ہم آواز سن کر اشخاص کو پہچان لیتے ہیں اسی طرح طرز بیان کے مطالعہ سے ہم مصنف کو فوراً معلوم کر لیتے ہیں۔ شبلی کی تحریر دیکھ کر اسے ہم کبھی آزاد کی عبارت قرار نہیں دے سکتے۔ اور نہ ہم ابوالکلام کی نثر کو عبدالحق سے منسوب کر سکتے ہیں ایک ہی موضوع پر اگر غالب و ذوق طبع آزمائی کریں اور ان کے نتائج فکر ہمارے سامنے لائے جائیں تو ہم فوراً بول اٹھیں گے۔ یہ شعر ذوق کا ہے اور یہ غالب کا۔ ذوق صفائی، روانی اور بول چال کی چاشنی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں گے چاہے اس سے ان کے بیان میں سطحیت ہی کیوں نہ آئے۔ غالب تنوع ندرت اور جدت طرازی کے قائل ہیں۔ وہ مجدد شاعر ہے اور ادائے مطلب کی ضرورت پڑے تو وہ نئے الفاظ اور نئی ترکیب بآسانی تراش لیتا ہے معمولی بات کو بھی انوکھے انداز میں پیش کرنا اور اپنے مشاہدہ کے اظہار میں ژرف نگاہی کا ثبوت دینا اس کا خاص امتیاز ہے۔

ذوق کا شعر ہے :-

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ذوق نہ پایا یا بجھا ہوا

یہی مضمون غالب سے سنئے :-

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مضمون ہے "مے نوشی" ذوق اس مضمون کو لیکر لے لاگ محاورے کے استعمال سے بے تکلف شعر موزوں

کرسکتے ہیں گو بیان میں گہرائی نہیں۔

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

یہ غالب کا نتیجہ فکر ہے:۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کا
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

مومن کو دیکھئے اس کا ہر فقرہ شدت کا رنگ لئے ہوئے ہے معلوم ہوتا ہے گویا اس کے دل و دماغ میں آتش بھری ہوئی ہے اس کا انداز بیان بھی "شعلہ نوائی" سے کم نہیں ہر چیز کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ شدید احساس کی بو سننے والے کے دل و دماغ میں بس جائے۔

ذوق کہتے ہیں:۔

نہیں ہے کم زر خالص سے زردیٔ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

یہ مومن کا شعر ہے:۔

زرد رخ دکھلا دیا داغ جگر دکھلا دیا
آج اس کو ہم نے اپنا زور و زر دکھلا دیا

اچھے اسلوب بیان کی ہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی صحیح نقل نہیں کی جا سکتی۔ مرحوم سجاد نے "محشر خیال" میں ابوالکلام کی نثر کی طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس میں وہ شان و شوکت اثر انگیزی بلاغت اور روانی نہیں آ سکی جہاں عبارت بلیغ ہوگئی ہے، وہاں آورد کا احساس ہونے لگتا ہے جہاں عبارت میں روانی پیدا ہوگئی ہے وہاں شوکت لفظی دھیمی پڑ گئی ہے آزاد کے پوتے طاہر نے آزاد کے شوخ و رنگین انداز بیان کی نقل اڑانے کی کوشش کی تھی مگر کبھی ان کی عبارت ایک پھیکی نثر اور بے معنی کوشش سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ سرسید کی اردو انتہائی سلیس اور رواں ہے تکلف اور تصنع کا اس میں نام نہیں سرسید کبھی بات کو بڑھا چڑھا کر کہنے اور مترادف الفاظ کی بھرمار کرنے کے قائل نہیں۔ وہ ہمیشہ سیدھی بات سادے لفظوں میں ادا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں سرسید کا ہر پڑھنے والا شاید یہ سمجھتا ہوگا کہ ایسی آسان اردو وہ بھی بے تکلف لکھ سکتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ویسے دو چار جملے بھی لکھنا انتہائی مشکل معلوم ہوگا۔ سرسید کا ایک چھوٹا سا مضمون "بحث و تکرار" جو اکثر درسی کتابوں میں موجود ہے طنز و مزاح اور سلاست و بے تکلفی کا بے مثال مرقع ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے معمولی الفاظ رواں عبارت کہیں تصنع کا نام نہیں مگر ایسا انداز بیان اردو نثر میں اور کہیں نہیں ملتا انشاپردازی دراصل الفاظ کے صحیح استعمال کا دوسرا نام ہے لفظ کو اس کے صحیح معنی میں صحیح مقام پر استعمال کرنے سے اس میں جان پڑ جاتی ہے اسی طرح بہترین اسلوب بیان وہی ہے جو فطری ہو تصنع سے پاک ہو اور تکلف سے دور ہو عبارت میں سادگی اسی وقت پیدا ہو گی جب کہ الفاظ کا استعمال بے تکلف کیا جائے فطری انداز بیان وہی ہے جبکہ تحریر و تقریر میں کم فرق رکھا جائے۔ شگفتہ اسلوب بیان حاصل کرنے میں جو بہت سی مشکلیں پیش آتی ہیں وہ صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ انسان لکھنے سے پہلے یہ سوچ لے اگر ایسے ہی بات کسی سے کہی ہوتی تو کیسے کہتا۔ پس وہی طرز ادا و اختصار اور جامعیت کے ساتھ تحریر میں اختیار کرے تو وہ بہترین اظہار مطلب ہوگا۔ اختصار اور جامعیت اس لئے ضروری ہیں کہ ہماری گفتگو میں ہر جملے کا مکمل طور پر ادا ہونا ضروری نہیں۔ بہت سی باتیں جملۂ معترضہ کے طور پر ہمارے منہ سے نکل جاتی ہیں نیز گفتگو میں عام طور پر ایک ہی بات کو دہرانا اور بار بار کہنا اتنا معیوب نہیں ہوتا جتنا تحریر میں برا لگتا ہے۔

غالب کے خطوط کی نثر شگفتہ اور فطری اسلوب بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے غالب نے اپنے انوکھے انداز بیان سے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے وہ اردوئے معلیٰ کا بادشاہ ہے۔ اس کی زبان نرم شستہ اور فصیح ہے ایسی ٹکسالی اردو بہت کم لوگوں نے لکھی ہے غالب کے خطوط پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا غالب خود ہم سے محو گفتگو ہے یہ انداز بیان کا سب سے بڑا کمال ہے اس کی تحریر

مثلاً اشارے کنائے طنز و مزاح کے تمام پہلو بالکل اسی طرح موجود ہوتے ہیں جس طرح گفتگو میں۔ برہان قاطع کی مخالفت کے زمانہ میں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھتا ہے وہ لکھ دیا۔ نظامی یا سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں ایک گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔"

آخری جملے میں جو طنز کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اردو نثر اس سے بالکل پہلی بار روشناس ہو رہی ہے۔ برسات کے موسم میں ایک دوست کو خط لکھتے ہیں دیکھیے کوئی جملہ ۵ یا ۶ الفاظ سے زیادہ کا نہیں۔ نہ کوئی لفظ ایسا جو عام گفتگو میں نہ آتا ہو پھر بھی اسلوب بیان اتنا دلکش کہ پوری عبارت یاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ "دیوان خانے کا حال محلسرائے سے بدتر ہے، مرنے سے نہیں ڈرتا فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہو گئی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔" ایک خط میں دلی کی اجڑی ہوئی حالت کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں مخاطب نواب علاء الدین خاں ہیں :-

"کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے تحصیل علم کیا وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں......"

غالب کی یہی زبان ذرا نرم ہو کر حالی کے حصے میں آئی ہے سادہ بیانی وہی ہے۔ مگر ذرا اظہار کا طریقہ بدل گیا ہے۔ احتیاط حالی کے دل و دماغ کی خاص صفت ہے وہ کبھی خیالات کی رو میں بہہ نہیں جاتے غم و غصے کے وقت بھی جذبات میں اعتدال ہوتا ہے انداز تحریر نہ کبھی بہت تیز اور نہ کبھی بہت مدھم ہو جاتا ہے۔ اتار چڑھاؤ ضرور ہے مگر ایسا نہیں کہ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ حالی کبھی الفاظ سے نہیں کھیلتے وہ ایسے ہی لکھتے ہیں جیسے باتیں کرتے ہیں۔ بقول فراق گورکھپوری الفاظ ان کے مطلب کو نہیں چمکاتے ان کے مطالب سادہ الفاظ کو چمکا دیتے ہیں۔

اپنے دیوان کے دیباچہ میں اپنے زمانہ کے بگڑے ہوئے ذوق شاعری کی اصلاح سے متعلق لکھتے ہیں :-

"جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھوٹتا ہے مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے۔ اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔"

ایک جگہ یادگار غالب میں لکھتے ہیں :-

"اگرچہ اس لحاظ سے کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یوروپین سیولزیشن میں روز بروز قریب ہوتا جاتا ہے..........

اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا کہ بظاہر اس کے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی۔ یہ امید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آئندہ زمانے میں مقبول خاص و عام ہوگی مگر جو تو اَبر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر ان کی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک مرتفع نہیں ہوئے کیا عجب ہے کہ ہماری اور ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔"

دور حاضر کے سب سے اچھے صاحب طرز انشاء پرداز ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ہیں حالی کی تمام اچھی خصوصیات

بدرجۂ اتم موجود ہیں وہی سنجیدگی وہی خودداری وہی اعتدال پسندی وہی مبالغہ آمیزی سے احتراز اور وہی ہر بات کو احتیاط سے سپرد قلم کرنے کی عادت جو حالی کا طرۂ امتیاز ہے عبدالحق کے حصے میں آئی ہے مگر عبدالحق صاحب کا اسلوب حالی سے زیادہ شگفتہ اور سادہ ہے حالی اکثر جگہ مطلب کے اظہار کے لئے انگریزی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر عبدالحق ادق ترین انگریزی تراکیب اور الفاظ کو بڑی شگفتگی سے خالص اردو کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

عبدالحق کی اردو جتنی سادہ ہے اتنی ہی شیریں ہے ان کا یہ انداز بیان ہر قسم کے مطالب کے اظہار کے لئے نہایت موزوں ہے ان کے مقدمات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس آسانی سے معاشی، سیاسی اور سائنسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور تمام مشکل مسائل کو اپنے دل کش اور سادہ انداز بیان میں بہ تفصیل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔

کلام غالب کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"غالب کا کلام ایک لازوال نعمت ہے جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اس کی قدر اور بڑھتی جاتی ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کے زندہ رہنے میں کوئی کلام نہیں اگر یہ نہ بھی رہے تو بھی یہ کلام زندہ رہے گا کیونکہ اس کا کمال محض الفاظ اور زبان پر منحصر نہیں بلکہ ان قیود سے بالاو برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ سیکڑوں لکھی جائیں گی اور فاضل شارح اس کلام کے معانی میں اپنی جدت اور ذہانت کو دکھانے کے مواقع ڈھونڈ لیں گے۔"

مقدمۂ باغ و بہار میں میر امن دہلوی کی زبان کے متعلق لکھتے ہیں :-

"رہا زبان کا معاملہ تو اس کی فصاحت اور خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ جو بات دیکھنے کی ہے یہ کہ اس میں سیکڑوں محاورے اور الفاظ ایسے ملتے ہیں جو آج کل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے بعض تو ایسے ہیں جو متروک ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو جانے اور نہ جاننے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے۔ ہماری زبان کا دار و مدار ایک مدت تک شاعروں پر رہا اور شاعری کا میدان زیادہ تر غزل کے لئے وقف تھا وہ ایسا تنگ کہ اس میں زبان کی کہاں تک کھپت ہوتی"

ذیل کی عبارت جو ان کے خطبے سے ماخوذ ہے خاص طور پر قابل غور ہے اس میں ان کے طرز تحریر کی حالی کے اسلوب سے قریب ترین مشابہت کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل اسی موضوع پر حالی نے اپنے مشہور مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اگر وہ عبارت پیش نظر ہو تو اس عبارت سے اس کا مقابلہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ مثلاً عرب جاہلیت کے شعراء کو لیجئے شاعری ان کے رگ و پے میں پھیری ہوئی تھی۔ معمولی سا معمولی اور جزوی سا جزوی معاملہ بھی ان کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا اور تحریک شعر کے لئے کافی تھا۔ ان کی لڑائیاں ان کی فتح و شکست اور عشق و محبت (خیالی نہیں) خوف و خطر انتقام مہمان نوازی وغیرہ یہاں تک کہ ایک بچھیرے کی ولادت کا نقشہ ان کی نظموں میں زندہ موجود ہے"

اسلوب بیان کے متعلق اکثر دو مختلف نظریے پیش کئے جاتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک بالکل فطری چیز ہے جیسے شاعری۔ بعض کے نزدیک اسلوب بھی مضمون نگاری اور علم نقد کی طرح محنت اور مشق کا رہین ہے۔ لیکن غور کیا جائے اس کا جواب بھی حالی کے اس بیان سے ملتا جلتا ہے جو انھوں نے شعر کی آمد و آورد کے متعلق دیا ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ آمد اور آورد کا مفہوم جیسا کہ عام طور پر لیا جاتا ہے حقیقت سے بعید ہے۔ مثلاً کسی شعر میں بے ساختگی روانی اور زور ہو تو اسے آمد کا نتیجہ سمجھا جاتا۔ اور کمزور اور سست شعر کو آورد کی پیداوار۔ نیز برآں ہر اس شعر کو جس میں روانی اور زور ہو یا برجستگی اور بدیہہ گوئی کا نتیجہ خیال کیا جاتا۔ گویا جو شعر سوچ بچار کے بعد بڑی دیر میں صفحۂ قرطاس پر آتا اس میں آورد کا ہونا ضروری تھا۔

لیکن غور کیا جائے تو واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہی شعر جس پر زیادہ وقت صرف کیا جائے ہر نقطۂ نظر سے بہترین ہوگا۔ رہی برجستگی تو ہر برجستہ شعر کا اچھا ہونا ضروری نہیں۔ اسلوب بیان کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ میں نے اکثر اشخاص کو کہتے سنا ہے کہ فلاں شخص بڑا صاحب طرز ادیب ہے اور ایک خاص بے ساختہ اسلوب رکھتا ہے۔ ثبوت اس کا یوں دیا جاتا ہے کہ وہ قلم ہاتھ میں لیتے ہی بغیر دماغ پر زور ڈالے بیسیوں صفحے لکھ ڈالتا ہے۔ لیکن ہر اس شخص کا جو فی البدیہہ مضمون لکھ سکتا ہو صاحب طرز ہونا ضروری نہیں۔ اچھے اسلوب اور طرز بیان کے حصول پر غور کریں تو ہمیں چند نمایاں نکات نظر آئیں گے۔

ایک اچھے طرز کا مالک ہونے کے لئے زبان پر قابو از حد ضروری ہے۔ جب تک الفاظ پر محاوروں پر جملے کی ترکیب پر کسی کو پوری طرح قابو نہ ہو اسلوب قطعاً پیدا نہیں ہوتا۔ جس بات کو آپ کہنا چاہیں بے تکلف بیساختہ مختلف دلچسپ اندازمیں اسی وقت ادا کرسکتے ہیں جب کہ آپ کے پاس زبان کا وسیع ذخیرہ موجود ہو ورنہ آپ کے خیالات آپ کے محدود الفاظ کے تابع رہیں گے۔ اور آپ کا ذہنی رجحان جو صرف آپ کے خیالات کے برجستہ ادا ہونے میں باقی رہتا گا اس صورت میں غائب ہو جائے گا۔

دوسری چیز وسیع مطالعہ ہے۔ آپ کہیں گے ہمیں ایسے ادیب بھی نظر آتے ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں کسی قسم کی علمیت کی علامات نظر نہیں آتیں لیکن اسلوب کی شگفتگی اور رنگینی کی وجہ سے ہم انھیں پڑھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے یہ شگفتگی اور رنگینی بالکل عارضی اور سطحی ہے۔ اسلوب کو ایک مستقل رنگ دینے اور اس کو ہمیشہ باقی رہنے والی پختگی عطا کرنے کے لئے مطالعہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو اردو کے بہت سے ایسے ادیب نظر آئیں گے جو ابتداء میں اپنے طرز نگارش کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ لیکن فقدانِ مطالعہ نے ان کی تحریر سے وہ بات چھین لی اور ان کی تحریر کی دلکشی کی جگہ پیوست تکرار لفظی اور ایک اکتا دینے والے اسلوب نے لے لی ہے۔ اور وہ لوگ موجودہ زمانے سے بہت دور دکھائی دیتے ہیں۔ اچھے اسلوب نگارش کے لئے یہ بات سب سے ضروری ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچنے کا انداز بہت سلجھا ہوا ہو (clear Thinking) یا سلجھے ہوئے اندازِ فکر کے بغیر نہ تحریر میں خوش اسلوبی پیدا ہوگی نہ مافی الضمیر کا واضح اظہار ہوگا اور نہ لکھنے والے کی طبیعت کا وہ رنگ اس میں جھلکے گا جو انفرادیت کے حصول کے لئے ناگزیر ہے۔ (R. L. Stevenson) اسٹیونسن کہتا تھا میں ہر چیز پر لکھنے سے پہلے اتنا سوچ لیا کرتا ہوں کہ وہ بالکل میرے دماغ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھنے کے بعد ہر لفظ اور ہر جملے پر غور کرتا ہوں تاکہ اس سے موزوں اور بہتر کوئی طریقۂ اظہار نظر آئے تو اختیار کرلوں۔ میں اپنی تحریر پر اتنی محنت صرف کرنا چاہتا ہوں کہ میرے پڑھنے والے کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

محمد احسان اللہ

کھیل

دھرتی کا جو سینہ چیرے آخر منہ کی کھائے
زر کی خاطر خون بہائے، لیکن خاک نہ پائے
جگ کی جھولی بھرنے والا اور دامن پھیلائے
ہرے بھرے کھیتوں کا آقا اور فاقوں مر جائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

یہ کہساروں کی دیوی، یہ بے پروا چرواہی
جس کی ایک اداس نظر سے رستہ بھولیں راہی
دل کو ہلکورے سے دے جس کی مخمور نگاہی
اور اک دُور کا دولت والا اس کا مول چکائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

قدم قدم پر گاگر کو یہ چھلکاتی پنہاری
آنکھوں میں تاروں کی لو، سانسوں میں مٹی کی دھاری
اٹھی ہوئی باہوں کے خم میں اڑنے کی تیاری
اور اک "اپ ٹو ڈیٹ" شکاری اس کی تاک لگائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

گاؤں کے یہ البیلے، بانکے، مستانے، متوالے
بھولی بھالی دہقانی ماؤں کی گود کے پالے
جن کے ساتھی چیت کے جھونکے اور ساون کے جھالے
ان کو اک منحوس مہاجن ہتھکڑیاں پہنائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

زریں ٹیلے، مست کھجوریں، خاموشی، رعنائی
پھٹے پرانے خیمے، یعنی یہ قریے صحرائی
جب ان پر چھا جاتے ہیں تہذیبوں کے سودائی
دھرتی ماتا چلاتی ہے: "میں لٹتی ہوں، ہائے!"
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

مٹی کے معصوم گھروندے، حسن کی یہ درگاہیں
کھیتوں میں بل پر بل کھاتی پتلی پتلی راہیں
گھنے گھنے یہ جنگل جن میں بھٹکیں تیز نگاہیں
اور یہاں منعم مرمر کی محلسرا بنوائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

آزادی پر مرنا لیکن زنجیروں سے ڈرنا
بڑی بڑی تنخواہیں پانا اور من مانی کرنا
خود ہی آگ لگانا اور الزام کسی پر دھرنا
شاعر اور بھانڈوں کی طرح نوابوں کے گن گائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

احمد ندیم قاسمی

ماحول اور شخصیت

نفسیات کے جدید نظریوں نے اس پرانے خیال کی آج تردید کر دی ہے کہ ہر دور میں بعض نمایاں شخصیتوں نے اپنے ماحول کی تشکیل کی ہے۔ لیکن اس مکتب خیال کے حامی ابھی تک اپنی اس بات پر مصر بھی ہیں مثلاً ان کا یہ ادعا ہے کہ گزشتہ جنگ کے بعد جرمنی کی ناگفتہ بہ حالت میں ہٹلر ہی کی شخصیت تھی جس نے ہٹلر کو بام عروج پر پہونچایا۔ اور وہ ہٹلر کی شخصیت کا جائزہ لینے لگتے ہیں کہ اس کے کردار کی استقامت، راسخ عزم، مضبوط عقیدہ اور قوت ارادی نے اس کی شخصیت کی تشکیل کی اور وہ اس قابل ہو سکا کہ ہنڈنبرگ کے مقابلہ میں اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے سیاسی غلطیاں کیں جس کی وجہ سے اس کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہٹلر کی شخصیت فاشزم کی ذمہ دار نہیں ہے۔ جرمنی کی سیاسی اور معاشی تاریخ شاہد ہے کہ وہاں فاشزم کے ارتقاء و نمو کی ضرورت تھی۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ جرمنی کی قیادت ساری دنیا پر چھا جائے اس سے جرمن عوام اور باشندوں کا مفاد وابستہ تھا اور اس لئے ساری جرمن قوم نے ہٹلر کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ ہٹلر کی ترقی یا اس کی عظیم تر شخصیت کا نفسیاتی راز یہ ہے کہ اس نے جرمن قوم کی دلی خواہش کو جان لیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شخصیتوں کی تشکیل میں ہمیشہ ماحول کی کارفرمائیاں رہی ہیں۔ مثلاً چین کا ایک ممتاز فوجی جرنیل چوڑے (Chutuh) بچپن سے شباب تک ایک آوارہ و وارفتہ مزاج شخص تھا۔ اس کی یہ ابتدائی زندگی افیون نوشی اور عیش پسندی میں گزری۔ اس کم عمری میں اس نے نو شادیاں کیں اور تعیش پرستی میں وقت گزارتا رہا لیکن جب اس کے شباب کے زمانے میں ڈاکٹر سن یات سین کی کوششوں کی بدولت جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش ہونے لگیں، انقلابی تحریکات میں سارے چینی نوجوان حصہ لینے لگے اور چین کو بدیسی حکومت سے نجات دلانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کوششوں کا علم چوڑے کو بھی ہوا اس نے اپنی قدیم زندگی یک لخت ترک کر دی اور یہ جاہل نوجوان اس زمانے میں کچھ تحصیل علم کے بعد اس نئی تحریک میں شریک ہو گیا آج اس کا شمار چین کے گنتی کے چند مشاہیر میں ہے اور اس کو چین کا موسٹنگو کہا جاتا ہے۔ چینی موشنگو کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اس کے ماحول نے اسے جاہل اور افیونی سے ایک جرنیل بنا دیا۔

نفسیات کے جدید نظریات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اہم ترین عوامل اس دور کے مادی حالات ہیں۔ مثلاً انگلستان میں ابھی گوتم کی پیدائش کا تخیل نہیں کیا جا سکتا چونکہ انگلستان کسی دور میں بھی روحانیت اور تجلی غیب کا قائل نہیں رہا۔ مادی حالات وہ اہم ترین ذریعہ ہیں جو کسی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں اور مادی و معاشی حالات ہی کسی شخص کی سیرت و کردار کی تشکیل کا باعث ہوئے ہیں۔ اور یہ حالات شخص سے گزر کر قوم تک اپنا احاطہ کئے ہوئے رہتے ہیں۔ مثلاً افریقہ کے حبشی اپنی معاشی پستی و محکومی کے باعث آج تک کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے۔ حالانکہ کئی حبشیوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور متمدن ممالک میں بھی زندگی بسر کی لیکن انہیں کہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا نہ گیا۔ یہ ایک کھلی بات ہے کہ جس ملک کے معاشی حالات جیسے ہوں اس ملک کی معاشرت بھی ویسی ہوگی۔ مثال کے طور پر جس زمانہ میں جاگیری نظام رائج تھا تہذیب اور معاشرت کے جو اقدار تھے وہ سائنٹفک اقدار اس مشینی دور میں یکسر بدل گئے معاشرت کی اس تبدیلی سے انسان کا مزاج بھی بدلا۔ اس کا انداز فکر بھی تبدیل ہوا مزاج اور انداز فکر کی یہ تبدیلیاں شخصیت کی نشو و نما میں اہم ترین رتبہ رکھتی ہیں اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ماحول نے ہمیشہ شخصیتوں کو جنم دیا ہے۔ ثبوت کے طور پر یہ پیش کیا جانا مناسب ہوگا کہ آج چنگیز پیدا

نہیں ہو سکا آج چینی ساحر کا وجود ممکن نہیں اور اسی طرح آج سے ایک ہزار سال پیشتر یورپ میں کسی سویڈ یا پنی سلین کے دریافت کرنے والے کا وجود ممکن نہ تھا۔

یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ ماحول کی تبدیلی شخصیتوں کی اہمیت پر بھی بڑا اثر رکھتی ہے مثلاً جنگ کے آغاز سے قبل ہٹلر موسولینی کے متعلق بڑی خوش اعتقادی تھی اور ساری دنیا انہیں خراج عقیدت ادا کرتی تھی کہ ان دو شخصیتوں نے اپنے اپنے ممالک کو ترقی کی انتہا پر پہونچا دیا ہے۔ لیکن سات آٹھ سالوں کے اس عرصہ میں سارا ماحول بدل گیا۔ سارا جغرافیہ تبدیل ہو چکا اور دنیا کی سیاسی و معاشی تنظیموں میں بھی ایک تغیر رونما ہو گیا۔ یہی دو ممتاز شخصیتیں آج ایک بلا قرار دی جا رہی ہیں۔ اس موقع پر نپولین کی زندگی کو بھی میں پیش کرنا چاہتا ہوں ایک جرمن مصنف کی لکھی ہوئی سوانح کا میں نے ترجمہ پڑھا تھا جس میں اس نے نپولین کو دنیا کا ممتاز ترین فاتح قرار دیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایچ جی ویلز کی لکھی ہوئی تاریخ عالم پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کے مطالعہ سے پچھلی کتاب کا وہ تاثر باقی نہ رہا اور جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو روس نے یہ بتلایا کہ نپولین نے بھی روس کی فتح کے منصوبے باندھے تھے۔ اور وہ سٹالن گراڈ تک پہونچ چکا تھا لیکن اس کے ارادے کو ناکامی ہوئی اور یہی حشر جرمنی کا بھی ہوگا۔ جب یہ دعوے کئے جا رہے تھے تو نپولین کے متعلق یہ تصور برقرار نہ رہا جو پہلے پیدا ہوا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس ایک صدی میں فتح اور جہاں بانی کے وہ تصورات جو پہلے تھے اب بدل گئے اور ان بدلے ہوئے تصورات میں نپولین کی شخصیت بھی وہ برقرار نہ رہی جو پہلے تھی۔

شخصیت کی تشکیل میں جہاں خارجی حالات یا اجتماعی عوامل کی کارفرمائی ہے وہاں کسی شخص کی داخلی فطرت یا اس کے احساسات کا بھی بڑا دخل ہے۔ مثلاً حال میں میں نے ایک روسی کہانی پڑھی تھی کہ ایک روسی سپاہی نے ایک نازی کو گولی کا نشانہ بنایا اور جب وہ چیخ مارتا ہوا گر پڑا تو یہ روسی سپاہی رونے لگا۔ اور اس پر غشی طاری ہوگئی بعد کو یہ روسی سپاہی جو اپنی خواہش سے محاذ پر سے ہٹا اور نرسنگ (تیمارداری) کے ادارہ میں شریک ہو گیا۔ لیکن زخمیوں کی حالت کو وہ پھر بھی دیکھ نہ سکا اور آخر وہاں سے ہٹا کر ایک جنگی کارخانہ میں بھیج دیا گیا۔ اس کی نرم دلی اور رقیق القلبی نے مجبور کر دیا کہ وہ محاذ سے ہٹ جائے۔

کسی جیل خانے میں آپ کو کئی ایسے شخص ملیں گے جو کسی جرم کی پاداش میں سزا بھگت رہے ہوں لیکن ان کے ارادوں میں جرم کا کوئی شائبہ نہیں اور وہ پاک زندگی کا تصور رکھتے ہیں۔ پھر آپ کو ایسے مجرم بھی ملیں جنھیں سخت ترین سزائیں دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مکرر جرم کرنا چاہتے ہیں۔ ان تمام حالات میں انسان کی داخلی خواہشات کا بڑا کام ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے یعنی بعض فطرتیں نشو و نما پاکر اس کی شخصیت کا ایک اہم جزو بن جاتی ہیں اور ہمیشہ برقرار رہتی ہیں۔

نفسیات کے ماہرین کا ایک گروہ یہ بھی خیال رکھتا ہے کہ بعض اشخاص میں بے انتہا انفرادیت ہوتی ہے۔ اور یہی انفرادیت انھیں ممتاز بناتی ہے مثلاً مہاتما گاندھی ہیں وہ اس دور میں ہندوستانی سیاست میں داخل ہوئے جب کہ موتی لال نہرو اور تلک جیسے ممتاز سیاس تھے لیکن گاندھی جی کو ان کی زندگی ہی میں ایک اعزاز نصیب ہوا اور اس کی وجہ ان کا راسخ عقیدہ اور خود اعتقادی ہے وہ اس دور میں بھی اہنسا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں اور اسے اپنا مسلک ہی نہیں بلکہ اپنی جماعت کا بھی مسلک قرار دیتے ہیں اس دور میں اہنسا کی تحریک بجائے خود ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی شخص کی داخلی کیفیات بھی اس کی شخصیت میں ایک مقام رکھتی ہیں مثلاً مصطفی کمال کی شخصیت کے بنانے میں ان کی خودداری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انگریزی زبان کا پہلا اور شہرہ آفاق ناول ...... (Pilgrim's Progress) جسے جان بنین نے لکھا ہے۔ ہرگز نہ لکھا جاتا اگر بنین کو قید نہ ہوتی اور

وہ اس زندان میں غور و فکر کا عادی نہ ہوتا۔ بینن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تنہائی پسند اور خاموش تھا زندان نے اس کو یہ موقعہ دیا اور اس نے انگریزی زبان کا مشہور ترین ناول لکھا۔ حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے جواہر لال نہرو کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ان کی کتاب (My Auto - bio- graphy) پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ نہرو اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل اور اڑے رہتے ہیں لیکن ان کی اخباری تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رائے قائم کرنے میں جلد باز ہیں اور میری سابقہ رائے کی شاید وجہ یہ ہو کہ (My Auto - bio graphy) جواہر لال نہرو نے سکون و خاموشی میں لکھی ہے اور ان کی تقریریں ہنگاموں اور نعروں کے درمیان ہوئی ہیں۔

شخصیتوں کی تشکیل میں مادی حالات ہی کی کارفرمائیاں ہیں اور بسا اوقات کسی شخص کی داخلی کیفیات بھی اس کی شخصیت کو بنانے میں کام کرتی ہیں۔ اگر یہ بنی ہوئی شخصیتیں بگڑی بھی ہیں تو انہی معاشی مادی حالات اور سیرت و کردار کی تبدیلی کا اثر رہتا ہے۔ اس دور میں تشکیل و تخریب کا نفسیاتی جائزہ لیا جا رہا ہے اور اب یہ کہہ کر زندگی سے اور شخصیت سے گریز نہیں کیا جا سکتا کہ:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ۔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

عابد علی خاں

جلووں کے شرار

مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار
ناچتے ناچتے گل ہونے لگے، بجھنے لگے
چشمِ میگوں کی چھلکتی ہوئی صہبا کا خمار
حسنِ محبوب کی نوخیز بہار
اور الفت کا وہ احساسِ جمیل
چاندنی رات میں اک تازہ سحر بن کر
سارے ماحول پہ یلغار کرے
ہر طرف نور ہی نور

رنگ و نکہت کا فسوں خیز جہاں
وسعتِ ماضی میں بکھرے ہوئے رنگین نقوش
کتنے خوابوں کے سنہرے سائے
ظلمتِ شب سے ہم آغوش ہوئے
آج اک پرتوِ رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں
صبح دم ڈوبتے تاروں کی طرح
ایک بے جان تصور کے دیئے۔
مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار
ناچتے ناچتے گل ہونے لگے بجھنے لگے

سرار الہام

بیدر کی آبادی اور نام

شہر بیدر سطح سمندر سے (۲۱۰۰) فٹ اور حیدر آباد سے ۶۰۰ فٹ بلند اس وقت ایک فصیل کے اندر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم شہر اور دکن کا ابتدائی پایۂ تخت تھا۔ پرانی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے نام سے جب اس ملک میں آبادی ہوئی تھی اس کا دار الحکومت یہی شہر قرار پایا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جب دکن کے نام سے یہ ملک آباد ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ شہر مستقر حکومت تھا اس قدر پرانا اور تاریخی شہر یا آبادی کا حصہ دکن میں دوسرا نہیں ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ موجودہ آبادی ہی آیا اس زمانۂ قدیم میں شہر تھا یا اس کے قرب و جوار میں وہ حصۂ آبادی واقع تھا۔ انقلاب زمانہ سے قدیم آثار باقی نہیں رہے اور مسئلہ کا فیصلہ بآسانی اس وقت ہو سکتا ہے یہ بڑا پیچیدہ اور طول طویل مضمون ہے جو ہم انشاء اللہ تعالیٰ اپنی تاریخ بہمنیہ میں لکھیں گے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ موجودہ آبادی کا بانی اعظم السلاطین احمد شاہ ولی بہمنی ہے جس نے قلعہ ارک بنایا اس میں کسی مورخ اور کسی شخص کو انکار بھی نہیں۔ صاحب فرشتہ اور نیز دیگر مورخوں نے جو واقعات اس شہر کی آبادی کے متعلق لکھے ہیں وہ قرین قیاس ہیں کہ جب سلطنت بہمنیہ ممالک دکن و تلنگانہ میں وسیع ہو گئی اور اس کے حدود ایک طرف بحر ہند تک جا پہونچے اور دوسری طرف راس کماری سے بھی دور تک نکل گئے خلیج بنگالہ اور ملک اڑیسہ اس سلطنت میں داخل ہو گیا تو ایک مناسب مقام پر دار السلطنت کے قائم کرنے کی فکر ہوئی اگرچہ کہ گلبرگہ بلحاظ ابتدائی دار الحکومت اور خاندان بہمنیہ کے حق میں مبارک ہونے کے بیدر سے کچھ ایسا دور نہیں تھا۔ مگر اعظم السلاطین کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی مفید تر اور خوشنما مقام منتخب ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے گلبرگہ کے اطراف چار چار منزل تک دورہ کر کے چپہ چپہ زمین کے معائنہ کے بعد اس سے یہ حصہ زمین بہت پسند آیا اور اس نے اس میں قلعہ بنوا کر شہر آباد کیا۔ فی الحقیقت یہ امر واقعی معلوم ہوتا ہے اور جن دلائل پر مبنی ہے اس کا آج بھی ثبوت موجود ہے۔ بہ نسبت گلبرگہ کے بیدر کی آب و ہوا بلندی وسعت اور کشادہ میدانوں کے لحاظ سے نہایت خوشگوار ہے۔ بہ نسبت گلبرگہ کے بیدر کی زمین کی حالت بھی نہایت اچھی ہے۔ آبادی کی غرض سے ایسے دار السلطنت کے لئے جن زمینات کی ضرورت تھی وہ سب صفتیں بیدر کی زمین میں موجود ہیں۔ یہ نرم پتھر کی پہاڑی پر واقع ہے۔ مشہور ہے کہ اسی زمین میں زعفران اور اقسام نے ولایتی انگور وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ اب بھی افیون و چاول وغیرہ کی اچھی پیداوار ہو سکتی ہے مگر بہ حکم سرکار افیون کی کاشت بند ہو چکی ہے۔ اعظم السلاطین کی دانشمندی کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے سیاسی و سماجی غرض ہر پہلو سے اس خطہ کو منتخب کیا جو فی الحقیقت دکن بھر میں نظیر نہیں رکھتا تھا۔ یہ امتیاز صرف اسی ملک کو ہے کہ پچاس میل جنوب و مشرق میں سرخ زمین کی سطح و رقبہ ہے جو مسلسل بیدر تک چلی آئی ہے اور اسی طرح شمال و مغرب میں بھی پچاس میل تک جو ہر موسم میں اپنی خوبی کے لحاظ سے نہایت دلاویز معلوم ہوتی ہے۔ ایک زندہ دل شاعر اس کی سرخ مٹی سے متاثر ہو کر یوں اظہار خیال کرتا ہے ؎

از برائے ماندن عشاق منزل کردہ اند
خاک بیدر را بخون عاشقاں گل کردہ اند

یہ بات نہ گلبرگہ کے کسی خطہ اراضی پر مشتمل ہے نہ نانڈیڑ کے نہ تعلقات بیدر کے۔ غرض یہ کہ بیدر کی آبادی واقعی ایک نہایت خوشنما خطہ اور بلند تر مقام پر واقع ہوئی ہے اگرچہ کہ یہ مقام سطح سمندر سے ۲۱۰۰ فٹ گلبرگہ سے ۱۵۰۰ فٹ حیدر آباد سے ۶۰۰ فٹ نانڈیڑ سے ۱۵۰۰ فٹ میدک سے ۲۰۰۰ فٹ (جو اس شہر و ضلع کے اطراف کے مستقر اضلاع ہیں) بلند ہے تاہم کوئی شخص یہاں پہونچ کر دفعتاً ایسی بلندی کو محسوس نہیں کرتا

کیونکہ قدرتی طور پر بیدر کے اطراف میں درجہ بدرجہ متوازی گھاٹیاں ایسی واقع ہوئی ہیں کہ وہ کہیں ۳۰۰، ۴۰۰ اور کہیں ۵۰۰، ۶۰۰ فٹ کی بلندی سے زینہ بزینہ یکے بعد دیگرے واقع ہیں چنانچہ گلبرگہ سے آنیوالوں کو بیدر سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ایک گھاٹی ملتی جو ۶۰۰ فٹ بلند ہے اس سطح گھاٹی کا سلسلہ ۱۵۔۱۶ میل تک ایک ساتھ چلا آیا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ہم ایک گھاٹی پر چل رہے ہیں پھر اس کے بعد معلوم ہوگا کہ ۲۰۰ فٹ کی ایک اور گھاٹی سامنے موجود ہے اس کو طے کرنے پر یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ بیدر کے قرب وجوار میں ہیں یکایک سطح ارضی پر اس طرح بیدر کے مدرسے کے مینار اور شاہ علی برید وغیرہ کے گنبد ۲ میل سے اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ شمال کے آنیوالوں کو خانہ (خانان پور) سے ۲۰۰ فٹ کی گھاٹی سے بلندی کی سطح پر پہونچنا ہے اور مغرب کے آنے والوں کو ہمنی، آوراد، بالکی، بھالکی وغیرہ کے پاس اسی قسم کے بلندی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں میل یا دو میل تک مسطح زمین کے بعد ایسی گھاٹیوں کا سلسلہ ہے جو خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ بیدر کے قریب (فصیل کے باہر کے حصہ میں) اب تک ناہموار ہے لیکن کوئی حصہ اونچے مقام پر ہے تو کہیں اس کے برعکس کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں بیدر کا نام دورا بہا تھا جو مشہور راجہ بھیم سین کا پایہ تخت تھا جس کی بیٹی دلمن پر مالوہ کا راجہ نل عاشق ہو کر سلطنت سے دست بردار ہوگیا۔ انقلاب زمانہ سے جب اس خاندان کی سلطنت بھی ملیا میٹ ہوگئی تو قندھار تخت گاہ بنا اور جب اس میں کئی راج ہوگئے تو کلیان اور ورنگل کو یہ عزت حاصل ہوئی۔ پٹن چروا اور پٹن بھی دکن کے پرانے تخت گاہ کہلاتے ہیں اور اکثر قدیم آثار جو اس وقت تک برآمد ہوئے ہیں وہ اپنے بانیوں کی شہادت بن کر متحیر کر دیتے رہیں۔ خواہ کچھ ہی ہو، بیدر کے بعد قندھار، کلیان، ورنگل، پٹن چرود وغیرہ ہوئے ہوں لیکن قدامت اور عزت و شہرت اس خطہ زمین کو حاصل ہے۔ قدیم راجاؤں کے بھاٹ (مورخ) اور کتاب خوانوں (فسانہ خوانوں) نے اس کا نام دنیا بھر میں مشہور کر رکھا تھا یہ بات دکن میں کسی اور شہر یا پایہ تخت کو نصیب نہیں ہوئی۔

سلاطین بہمنیہ جو دکن میں حکومت حاصل کر کے عرصہ دراز تک کوس لمن الملکی بجاتے رہے ان کو یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ دورا بہا (بیدر) کے سوائے دوسرے شہر بھی تخت گاہ قدیم ہیں مگر ان کی نظروں کو سوائے اس حصہ کے دوسری آبادی پسند نہ آئی۔

اس بات کی مسلمہ شہادت موجود ہے کہ دورا بہا (بیدر) کی قدامت کے برابر سلاطین بہمنی دوسرے کو نہیں تصور کرتے تھے۔ اس کے سوا ہم ایک اور بات پر غور کرتے ہیں کہ بہمنیہ کے بعد پانچ سلطنتیں مسلمانوں کی قائم ہوئیں۔ سوائے بریدیہ سلطنت کے دوسری چاروں سلطنتیں تنظیم قوت کے ساتھ مشہور و معروف رہیں۔ ان چاروں سلطنتوں کی نگاہ بہمنیہ بیدر پر رہی جو شخص بیدر پر قابض ہوتا وہ فی الواقع دکن کا مالک اور سلطان کہلانے کا مستحق ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ بیدر قدیم پایہ تخت اور دارالحکومت تھا۔

حیدرآباد اور اورنگ آباد تو کبھی قدیم پایہ تخت تھے ہی نہیں اس لئے ہم ان پر کوئی بحث نہیں کرتے۔ دولت آباد (دیوگڈھ) کی نسبت بعض مورخین کا خیال ہے مگر یہ صریح غلطی ہوگی کہ دونوں اورنگ آباد اور دولت آباد کو ہم ایک ہی مقام سمجھیں۔ البتہ پٹن کو قدیم پایہ تخت کی عزت حاصل تھی۔

دکن کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو بڑے غور سے اس بات کی طرف اپنے ذہن کو منتقل کرنا چاہیے کہ اس کی وسعت کے لحاظ سے کتنے دارالحکومت یہاں ہو سکتے تھے اور کون کون سے ہوں گے۔ معمولی روایت یا قصہ کہانیوں پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بیدر کے نام کے متعلق ایک فارسی خواں مورخ کا یہ خیال ہے کہ راجہ بدر نے (جو اس مورخ کا عقیدہ ہے کہ یہاں کا راجہ تھا) اپنے نام سے آباد کیا۔ لوگوں کو حیرت میں ڈالنے کی غرض سے جب قلعہ میں کوئی سیاح یا مسافر جاتا ہے تو احشام کے راجپوت

وگ بدر کا دیول اور مکان بھی بنا دیتے ہیں۔ مگر بدر یادو ہر یا لوکیا خاندان کے حکمرانوں کا نام تھا۔ جو کلیانی اور ورنگل پر حکمران تھے۔ خاص وہ راجا (بیدر) کے اخیر راجاؤں میں کوئی یا لوکیا خاندان کا درجہ نہیں تھا۔ اس زمانہ کے ایک فارسی مورخ کی یہ رائے ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہاں بانس بن تھا اس کی وجہ سے اس آبادی کو بیدر کہتے ہیں حالانکہ سنسکرت میں بانس بن کو بدر نہیں کہتے۔

بہمن نامہ۔ سراج التواریخ۔ فرشتہ۔ تاریخ ہند

مولفہ خان بہادر اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ بیدر کی آبادی کے پاس پہلے ہی سے حصار بیدر موجود تھا (حصار بیدر کے الفاظ سے ان مورخین کا منشا کسی قلعہ یا چوکی سے ہو کیونکہ جنگی مقام کو قدیم محاورے میں حصار کہتے تھے) لیکن یہ واجب التعظیم مورخین بیدر کی وجہ تسمیہ پر غور نہیں فرماتے۔

مسلمانوں کی سلطنت جب ہندوستان میں قائم ہوئی تو انھوں نے اس شہر کا نام دہلی رکھ دیا۔ دہلی کے معنی آستانہ کے ہیں اور جیسا کہ اسلام میں رواج رہا کہ بلدہ یثرب کو مدینہ شریف کہہ دیا کرتے تھے۔ آج تک کے تمام مورخین مدینہ منورہ سے ہی اس آبادی کو تعبیر کرتے ہیں درآنحالیکہ مدینہ کے معنی شہر کے ہوتے ہیں اور صرف شہر کسی شہر کا نام نہیں ہو سکتا۔ مگر ادب و احترام کے مدنظر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ کے مقدس شہر کو اس کے اصلی نام سے نہیں پکارتے تھے بلکہ مدینہ طیبہ یا مدینہ منورہ زبان زد عام ہو گیا۔

یہی بات خلفائے عباسیہ کے پایۂ تخت بغداد سے متعلق ہے "کیونکہ عموماً بغداد کو عرب" دارالسلام" کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بغداد کبھی اپنے نام سے دنیائے اسلام میں مشہور نہ ہوا۔ اور سلاطین اسلام کے زمانہ میں دہلی کو تعظیماً حضرت دہلی سے یاد کیا جانے لگا اور پھر بعض سلاطین نے اس کو لفظ دارالسلام سے ملقب فرمایا۔ اسی طرح دولت آباد کو حضرت سلطان محمد تغلق شاہ نے دارالسلام کا خطاب عطا فرماکر سکہ میں بھی لقب کندہ کرایا ہے (ملاحظہ ہو فہرست سکہ جات مزنیہ عاصی)۔

جب عالی ذی شان سلاطین اسلام ہندوستان میں اپنا پایۂ تخت ہستناپور (اندرپت) کے قریب دہلی کے نام سے قائم کر لئے اس کی عزت و عظمت کے بڑھانے میں متوجہ ہوئے اور خلفائے عباسیہ کے نائب ہوکر خود ہی شیخ الاسلام، قاضی القضاۃ مقرر کرنے اور جمیت اسلام کی اجازت لے چکے تو اسی دہلی کو حضرت دہلی کے معزز لقب سے ملقب فرمایا گیا کہ امیر خسرو کا شعر موجود ہے۔ دولت عثمانیہ عموماً دنیائے اسلام میں اسلام بول اور یوروپ میں باب عالی سے مشہور ہوا حالانکہ اسلام بول قسطنطنیہ کا نام نہیں اور باب عالی وزیر کا محکمہ ہے۔

چونکہ سلاطین بہمنیہ بھی نائب خلفائے عباسیہ تھے وہ اپنے مستقر خلافت کو عزت سے یاد کیا کرتے تھے اس لئے اس کو ترکی لفظ بدر (آستانہ) سے موسوم کیا۔ شہر کا اصلی نام احمد آباد رکھا۔ جیسا دارالسلام بغداد کا نام تھا ایسا ہی بیدر کا نام احمد آباد سمجھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ یہ شہر جب تک سلطنت بہمنیہ کا پایۂ تخت تھا ارض اقدس کے نام سے بھی مشہور تھا۔ یہ نام اور مدارج محض اس شہر کی بزرگی نسبت اور خلافت اسلام کا تعلق ہونے سے بادشاہ۔ علماء، وزراء اور ادنیٰ طبقہ میں عام ہوگئے۔ اس شہر کے متعلق ہم کو ابھی اور غور کرنا باقی ہے۔ جبکہ دیوگڈھ[1] پر سلطان سکندر ثانی کا قبضہ ہو گیا تو اس نے اس کے اطراف کے اقطاع و جوانب میں اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اسی لحاظ سے اس وقت ۷۰۸ھ میں دور اجا تک مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا یہاں اس زمانہ میں کوئی راجہ نہیں تھا بلکہ دور اجا طوائف الملوکی سے

---

[1] دیوگڈھ۔ پٹن کے قریب قلعہ کی وجہ سے مشہور تھا جو دراصل شہر کا فوجی مقام ہے۔ پٹن کی آبادی زمانہ قدیم کے لحاظ سے آجکل کے بمبئی سے کم نہ تھی اس طرح ہم بآسانی اس کو سمجھتے ہیں کہ سلطان علاء الدین خلجی سکندر ثانی کے دکن میں آنے کی خبر ملتے ہی راجہ نے دیوگڈھ میں پناہ لی تھی اور وہیں لڑا تھا اس لئے تمام مورخین اصل شہر یا پایۂ تخت (پٹن) کو چھوڑ کر دیوگڈھ ہی کو سمجھتے رہے۔

کھنڈر ہوگیا تھا۔ مسلمانوں نے اس موقع کی قدامت اور حالات کو دیکھ کر اپنا تھانہ مقرر کرکے حصار بیدر سے منسوب کیا۔ اس میں ابھی تامل ہے کہ وہ حصار بیدر کیا یہی آبادی بیدر ہے؟ مگر جو لوگ موقعی حالت کو دیکھ چکے ہیں وہ ایسی رائے نہیں رکھتے البتہ یہ حصار بیدر موجودہ آبادی (بیدر) سے چودہ میل کے فاصلہ پر مغرب میں ہے جو ایک پہاڑ پر تنگ اس حصار کے کھنڈر۔ پچھوسال سے زیادہ اپنے بانی کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔

غرض موجودہ آبادی کے متعلق سوائے اس کے کہ اس کے قلعہ اور آبادی کا بانی اعظم السلاطین ایسا شخص ہے ہم اور کوئی دوسری رائے نہیں رکھتے۔ اس شہر کو اعظم السلاطین احمد شاہ ولی البہمنی نے ۸۲۵ھ میں آباد کرکے پایۂ تخت بنایا اور قلعہ کی بنیاد ڈالی۔

محمد سعید بیدری

غزل

ہجوم غم میں راحت کی جھلک معلوم ہوتی ہے
مجھے تاریکیوں میں کچھ چمک معلوم ہوتی ہے

مجھے اپنی محبت کا یقیں سا ہوتا جاتا ہے
کہ اب اشکوں میں کچھ خوں کی جھلک معلوم ہوتی ہے

محبت اصل میں شاید اسی کا نام ہے ہمدم
جو دل میں میٹھی میٹھی سی کسک معلوم ہوتی ہے

مجھے ڈر ہے یہی وجہ شکستِ دل نہ بن جائے
جو دل میں دائمی سی اک کھٹک معلوم ہوتی ہے

یہ کون آیا مریضِ عشق کی بیمار پرسی کو
یہ کس کو بات کرنے میں جھجک معلوم ہوتی ہے!

تری دنیا میں شاید غم سے کوئی دل نہیں خالی
دلِ ہر ذرہ میں غم کی کھلک معلوم ہوتی ہے

جمیلؔ اک خواب دیکھا تھا کبھی زلفوں کے سائے میں
چمک دل میں کچھ اس کی آج تک معلوم ہوتی ہے

جمیل ملک

قانون

(ڈیوڈ لایل (David Lyall) کے افسانوی واقعہ (According to Scots Law) کا ترجمہ ہے جس میں انسان کے بلند و لطیف نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔) مدیر

ایک دن صبح ہی صبح کہ دفتر ابھی ابھی کھلا تھا اور مسٹر جیمس ویڈربرن اپنے اجلاس پر پہنچے ہی تھے کہ ایک گاڑی کھڑکھڑ کرتی دروازے پر رکی۔ ایک نوعمر خاتون اتری تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دروازے پر پہنچی اور دفتر کے بیرونی حصے میں داخل ہوئی۔

"مجھے ان وکیل صاحب سے ملنا ہے۔" اس نے تیز اور باریک آواز میں کہا "جو اس کاروبار کے صدر ہیں ـــــ ابھی۔ فوراً"۔ اس غیر معمولی درخواست اور انوکھی طرز نے ہم سب کی توجہ اپنی طرف مائل کر لی اور سب کے سب اپنی میزوں سے نظر اٹھائے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بالکل نوجوان تھی۔ ۲۳-۲۲ برس کا سن ہوگا۔ دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سخت تردد میں مبتلا ہے۔ اس کا جنوبی انگلستان کا لہجہ بے حد شیریں تھا۔ بدن شمال کی بھدی لڑکیوں کے برعکس نازک تھا۔ کسی کلرک نے اس سے نام پوچھا مگر اس نے پورا جواب نہیں دیا۔

"تمہارے مسٹر ویڈربرن مجھے نہیں پہچانتے۔" اس نے کہا۔ "کہنا ایک مصیبت زدہ عورت ہوں"

اس پیام نے مسٹر ویڈربرن جیسے شخص کی مشہور سخت دلی کو بھی پگھلا دیا۔ وہ فوراً کمرہ میں بلا لی گئی اور دروازہ بند ہوگیا اور پھر ہم کچھ دیکھ یا سن نہیں سکے۔ میرے افسر نے اس ملاقات کے سارے واقعات مجھ سے بے کم و کاست بیان کر دیے۔ اب میں یہ واقعہ غائب کے صیغہ میں بیان کروں گا اور جہاں میرا اپنا تعلق ہوگا اس حصہ کو ترک کر جاؤں گا۔ مسٹر ویڈربرن کے پاس خانگی خطوط کا ایک طومار رہتا تھا اور وہ خط کھولنے کے بارے میں بڑے اولڈ فیشن واقع ہوئے تھے۔ ہر خط اپنے ہی ہاتھ سے کھولتے گرچہ خود زیادہ خطوط بازی کے عادی نہ تھے۔ جس وقت یہ مؤکلہ آئی ہے وہ خطوط کے ایک پلندے کو بیٹھے حیرت سے تک رہے تھے۔ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے انھوں نے ایک نصف دائرہ بنایا۔ سونے کے فریم والی عینک ناک پر درست کی اور نووارد لڑکی کو غور سے دیکھنے لگے۔

"گڈ مارننگ میڈم" انھوں نے اسی متین آواز میں کہا۔ "کیا میں آپ کا اسم شریف دریافت کر سکتا ہوں؟"

"میرا نام!" اس نے بے بسی کے انداز میں دہرایا۔ "میں اپنے نام ہی کے معاملہ میں آئی ہوں۔ آج صبح تک تو میں اپنے کو مسز ہیملٹن ویر کہتی آئی"

"اس نام سے تو میرے کان آشنا نہیں میڈم"۔ انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں آپ سخت مضطرب ہیں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"بس یہی کہ آپ میری پریشانی دور کر سکتے ہیں" اس نے کہا اور پھر جلدی جلدی دستانے اتارنے لگی۔ "میں سمجھتی ہوں پہلے مجھے کچھ اپنے متعلق بیان کرنا چاہیے: ماں اور باپ دونوں ہی داغ مفارقت دے گئے۔ میرا اپنا نام گرٹ رُوڈ کننگ تھا۔ میرے والد محکمہ مال کے ایک عہدہ دار تھے اور میری ماں اسکاچ تھیں۔

[illegible] مگر میں سکس میں گرنسٹڈ کے مقام پر پیدا ہوئی۔ [illegible] نے بھی رحلت کی اور [illegible] بمشکل ٹھنڈی چھاؤں نصیب ہوتی تھی [illegible] میں ایک [illegible] کا کام کرنے لگی۔"

[illegible] مگر بغیر کسی غیر معمولی عنصر کے۔ اچھا آگے چلیے۔"

[illegible] کے انتقال پر [illegible] تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کئے اور ایک کمرہ [illegible] نہ تھی اور اس سے زیادہ کی مجھ میں استطاعت [illegible] لیا جہاں اور بھی بہت سے لوگ رہتے [illegible]

[illegible] رک گئی اور سینہ پر ہاتھ رکھ لیا [illegible] کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی حالت سنبھلنے تک وکیل صاحب [illegible] رہے۔

[illegible] ایک عورت تھی۔ اس نے عشرت کے دن بھی دیکھے تھے اور اب قسمت کی [illegible] بہت کم ملتی تھی۔ بالکل اکیلی اور گنگی زندگی تھی میری — [illegible] اتفاقی طور پر شناسائی ہو گئی۔"

[illegible] پہلے ہی سمجھ لیا کہ اب آگے وہ کیا کہنے والی ہے۔

"[illegible] ضرورت نہیں" حیرت انگیز طریقے سے وہ اپنی طبیعت کو قابو میں [illegible] دوست ہو گئے اور آپس کے ربط ضبط سے خفیہ شادی کی [illegible] طالب علم تھا [illegible] اگرچہ وہ مجھ سے شائر میں بہت دور [illegible] جرأت نہیں کی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے ڈگری حاصل [illegible] نکاح کر لینا [illegible] کا باعث ہوگا اور مجھے اس سے اس درجہ عشق تھا کہ میں اپنے لیے [illegible] مجبور کیا۔ مگر وہ کب ماننے والا تھا۔ آخر ہمارا بیاہ ہو گیا۔ [illegible] بہت کچھ امکان تھا۔ گزشتہ تین ماہ تک تو وہ [illegible]

[illegible] ان اشارات میں ایک اور لفظ کا اضافہ کرتے ہوئے پوچھا [illegible]

"ہاں، مجھے [illegible] مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اس کی تعلیم پوری ہو جائے۔ میں نے [illegible] فیصلہ کر لیا تھا۔ گزشتہ ہفتے وہ گھر پہنچا اور آج صبح مجھے یہ خط ملا ہے۔ [illegible] سمجھ لیجیے کہ اس نے میری زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا اور بدنامی و رسوائی کی صورت الگ دکھائی۔"

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے خط گریبان سے نکالا۔ جب تک مسٹر وڈبرن خط کا مطالعہ کرتے رہے وہ آنکھیں بند کئے کرسی پر دراز رہی۔ جب انھوں نے خط میز پر پھینک دیا تو چونک کے اٹھ بیٹھی۔

"محترم خاتون!" انھوں نے کہا "اس [illegible] [illegible] والہجہ اسقدر ملائم نہیں ہوا تھا" ایک لمحے کا خفت [illegible] بندھنوں کو توڑ دینا چاہتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ کوئی [illegible] سرکاری یا دری نہیں تھا اور یہ کہ اب آپ اس پر کوئی دعویٰ نہیں [illegible] اچھا اب مجھے آپ سے کئی سوالات کرنے ہیں [illegible] جواب کے [illegible] ان کی صحت و صداقت پر ہے۔ فرمایئے یہ نکاح کب اور کہاں ہوا؟"

"مسٹر [illegible] کی ایک [illegible]

دیا اور اسی مختصر و جامع طریقے سے [illegible]

"[illegible] مسٹر [illegible]

[illegible] جانے کی آپ ابھی [illegible]

کرنے سے پہلے اسکاچستان کے قوانین [illegible]

واقف نہیں جسے خاتون کا [illegible]

کے مواجہ میں ایک دوسرے کو میاں بیوی [illegible]

وہ لمحہ بھر [illegible]

چہرے پر مردنی سی چھانے لگی۔ مسٹر ویڈربرن [illegible]

"[illegible] ہیں" [illegible]

کچھ دیر وہ ساکت بیٹھی [illegible]

میں نے بڑی [illegible]

کے ساتھ بولتی جاتی [illegible]

اب میں زیادہ [illegible] نہیں۔"

مسٹر ویڈربرن حیران [illegible]

اس قدر [illegible] بالکل روایت کے خلاف تھی۔

"پھر آپ کیا کریں گی میڈم! کیا آپ اس معاملے کو میرے سپرد کر کے میری ہدایات پر [illegible]؟"

"اوہ بسر و چشم۔ جو ہدایت آپ دیں گے [illegible]

میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اول تو یہ کہ [illegible]

واپس نہیں جاؤں گی۔ دوسرے میرا موقف [illegible] جائے۔"

"یقیناً ایسا ہی ہو گا مسٹر [illegible]

پڑیگا اور میں یہ سب [illegible]

میں نے [illegible]

مسٹر ویڈربرن نے مجھے اپنے کمرے [illegible]

بیان کی ہیں۔ انھوں نے بہت جلد اپنا نوٹش نامہ مکمل کر لیا اور بالآخر بتایا کہ مسز ہیملٹن ویرکے ساتھ انھیں جنوبی انگلستان میں ہیمپ شائر جانا ہے۔ یہ کہتے کہتے وہ مسکرادیے اور اس مسکراہٹ میں مجھے ایک عجیب لاابالی پن نظر آیا۔ اس مقدمے کے سوا میں نے کبھی ان کو کسی معاملے میں اس طرح تن من سے مصروف ہوجاتے نہیں دیکھا۔ وہ ہفتہ بھر غائب رہے۔ لندن میں چند ہم پیشہ دوستوں سے ملاقات بھی کی اور واپسی کے روز مجھے یہ ہدایت ملی کہ ہیربٹ روڈ میں ان کے گھر پر شام کے کھانے کے بعد منتظر رہوں تاکہ ان کے غائبانے کی ساری روداد سنا سکیں۔ میں نے دیکھا بہت بشاش نظر آتے تھے اور خوش قسمتی سے میری روداد میں کوئی ناخوشگوار عنصر بھی نہیں تھا اور جب ہم چند امور طے کر چکے تو وہ اپنے کتب خانے کی بڑی کرسی پر لیٹ گئے اور سگار کیس نکال کے میرے آگے کر دیا۔

"میٹھے جاؤ! لاابالی ونکواب میں اپنی روداد سناتا ہوں۔ یہ ان سب عجیب واقعات میں سے ہے جن سے مجھے سابقہ پڑا ہے۔ اور بالکل ایسا کیوں ہوتا ہے جیسے کسی ناول کا ایک باب ہے۔ شاید تم نے سوچا ہوگا کہ ان [illegible] ہمپ شائر جانے سے [illegible]"

"تب [illegible] کیا آپ ان کے سسرالیوں سے [illegible] حقیقت تسلیم کرانا چاہتے ہیں؟"

"بالکل۔ [illegible] ذلیل آدمی کو [illegible] جانے کا پروانہ بھی [illegible] تھا۔"

"اور [illegible] نے خیال کیا کہ وہ ان سارے بندھنوں سے آزاد ہو کر ایک نئی دنیا میں پہنچ جائیگا۔" میں نے پیش قیاسی کرتے ہوئے کہا اور مسٹر ویڈربرن سر ہلانے لگے۔

"اس لڑکی میں ایک بات تھی جس نے ابتداء ہی سے مجھے اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ اسکی بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو بالکل مخبوط ہوجاتی۔ اس نے شروع ہی سے ہمت دکھائی اور ویرکوٹ ہیملٹن نے بڑی مردانگی کا مظاہرہ کیا ——— کی مردانگی کا" میں دنگ رہ گیا۔ میں نے کبھی ان کو کسی شخص یا کسی چیز کی اسقدر بے دھڑک مدح سرائی کرتے نہیں سنا تھا۔

"وہ یقیناً آپ کے منشا کو پہنچ گئی ہوگی؟"

"ہاں ہاں۔ یقیناً۔ اجی وہ تو ایسی عورت ہے کہ جو صفت چاہو تم بلا تامل اس سے منسوب کرسکتے ہو۔ وہ بر وقت منشا پہچان جاتی ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ میں کہتا ہوں نا۔ اس کی تعریف کو مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ اگر مجھے ویسی ہی غلط فہمی ہوئی ہو تو خیر۔ ورنہ وہ ان میں اپنا مقام خود پیدا کرلیگی۔ اور یہ بڑی بات ہے۔"

اب میرے اشتیاق کا پیالہ لبریز ہوچلا گر میں جانتا تھا کہ مسٹر ویڈربرن سے جلد جلد کہلوانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ وہ اپنے اسی انداز اور سہولت سے بولتے جاتے تھے۔ "ہم ساتھ ساتھ لندن گئے۔ سمجھو —— گزشتہ پنجشنبہ کو۔ وہ رات سینٹ پنکراس ہوٹل میں مقیم رہی اور میں اپنے ایک قدیم دوست کی ملاقات کو کوئنس گیٹ چلا گیا۔ دوسرے دن حسب وعدہ ہم ناشتے کے وقت واٹرلو پر ملے وہاں سے پول پہنچے اور یہی شہر ویرکوٹ سے زیادہ قریب ہے۔"

"تو ایسے میں اسے کچھ اضطراب نہیں ہوا؟"

"اجی بہت ۔ مگر اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالے رکھا۔ غریب نے ایک لفظ بھی تو زبان سے نہیں نکالا۔ کہتی تھی ہر بات کا انحصار مجھ ہی پر ہے مگر میں خوب جانتا تھا اگرچہ میں نے کہا نہیں کہ آپ ہی پر ہر چیز کا دارومدار تھا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ویر کورٹ کوئی چھ میل پر ہے۔ اثنائے راہ میں میں نے اسے اچھی طرح سکھا پڑھا دیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے"

"وہ کیا" میں نے پوچھا۔ میرا اشتیاق ان کی چپ کو برداشت نہ کر سکا۔

"بس یہی کہ اس وقت تک کسی علیحدہ کمرے میں رہے جب تک کہ میں کرنل ویر یا ان کی بیوی سے خود مل لوں یا دونوں ہی سے اگر وہ گھر پر موجود ہوں۔ ہم اچھے وقت پہنچے۔ وہ دوپہر کے کھانے پر تھے اور کرنل صاحب کے فارغ ہونے تک ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ہم ایک چھوٹے سے صباحی کمرے (Morning Room) میں ٹھیرے رہے۔ پھر میں نے خانساماں کو سمجھایا کہ مجھے کرنل صاحب سے راز میں گفتگو کرنی ہے۔ اس نے مجھے کتب خانے میں لیجا بٹھایا اور میری موکلہ اسی کمرہ میں رہ گئی۔ جاتے ہوئے اس کے کان میں کہا "ہمت" گو اس کی مسکراہٹ پھیکی پھیکی تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ آخر تک اپنے کو سنبھالے رہیگی۔ ایسی عورت کی اعانت کرتے ہوئے دل میں مسرت و انبساط کے چشمے اُبلنے لگتے ہیں۔ سچ ہے۔ اللہ سچ ہے۔

میں کتب خانے میں بیٹھا ہی تھا کہ کرنل صاحب داخل ہوئے۔ میرے دیکھنے میں تو ایک باوقار فوجی نظر آتے تھے مگر کچھ روکھے پن کی آمیزش کے ساتھ۔ میں نے سلام کرتے میں فیصلہ کر لیا کہ جب تک مسز ویر نہ آئیں اپنے مطلب کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالونگا۔ لائل! معاملاتِ انسانی کے اس وسیع تجربہ نے مجھے بارہا دکھایا ہے کہ عورت کی ایک مسکراہٹ قانون کی لاکھوں فنون سازیوں پر حاوی ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں اپنی موکلہ کے قانونی موقف سے زیادہ مجھے "عورت کی گداز دلی" پر بھروسہ تھا اگرچہ ابھی مسز ویر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"جناب کو دن مسعود ہو" کرنل صاحب نے اسی روکھے پن سے کہا جو ایک انگلستانی سے ایک ایسے اجنبی سے ملاقات کے وقت ظاہر ہوتا ہے جس کی ملاقات کے مقصد سے وہ بالکل ناواقف ہے۔ ساتھ ہی میرے بھیجے ہوئے کارڈ کو وہ اس انداز سے دیکھنے لگے جیسے انھیں تعارف میں اس سے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔

"غالباً آپ میرے نام سے متعارف نہیں" میں نے کہا "میں ایک وکیل ہوں۔ اڈنبرا سے آرہا ہوں۔ میرا معاملہ آپ کے صاحبزادے کا ہے مگر یہ معاملہ ایسا ہے جسے سب سے پہلے ان کے والد اور والدہ کے آگے پیش ہو جانا چاہیے"

"اور والدہ کے آگے!" کرنل صاحب نے دہرایا۔ اور میں نے دیکھا ان کے چہرہ پر تشویش کا ایک ہلکا سا رنگ دوڑ گیا تھا۔

"اگر کوئی تکلیف دہ چیز ہو تو میرے خیال میں لیڈی ویر کو معاف ہی رکھیے تو بہتر ہے"

"میں کچھ سٹپٹا سا گیا۔ مجھے اقرار ہے۔ میری موکلہ نے خاندان کا نام نہیں بتایا تھا۔ مجھے ایسا

محسوس ہونے لگا جیسے معاملہ اُبھر نہیں سکتا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ لیڈی ویر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کا مطلع ہونا لازمی ہے" میں نے سہولت سے جواب دیا "مجھے ایک سوال کی اجازت دیجئے۔ کیا آپ کے فرزند ہندوستان روانہ ہو چکے ہیں ؟"

"ابھی نہیں۔ پیر کو روانگی ہے۔"

"پھر گھر میں ہیں ؟"

"گھر ہیں ہیں" کرنل صاحب نے دُہرایا اور ساتھ ہی گھنٹی بجا دی۔ "میں یقین کروں کہ آپ جو کچھ بیان کرینگے اس سے میری بیوی کو کوئی صدمہ نہیں پہنچیگا ؟" انھوں نے جلدی سے پوچھا۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نتیجہ لازمی ہے۔ بات صرف یہ ہے ـــــ کہ ـــــ آپ کے فرزند نے اسکاچستان میں ایک خفیہ نکاح کیا ہے اور میں یہاں مسز ہیملٹن ویر کی حمایت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"کرنل صاحب کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا اور انھوں نے اضطراری طور پر گھنٹی کو ایک اور جھٹکا دیا۔

"خفیہ نکاح !" انھوں نے دہرایا۔ "ہمیں معلوم تھا کہ وہاں اس کے کسی سے تعلقات ہیں۔ اس نے اپنی ماں سے یہ واقعہ بیان کیا اور معافی حاصل کر لی۔ میں نے اسے بیگم پر چھوڑ دیا تھا۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم آگے بڑھنے سے پہلے لیڈی ویر کا انتظار کر لیں۔" میں نے لینت سے کہا۔ یہ الفاظ بمشکل میری زبان سے ادا ہوئے ہونگے کہ وہ داخل ہوئیں۔ میں نے ان کے چہرہ کا جائزہ لیا۔ معاملہ سے تعلق رکھنے والی عورت ہی پر ہر چیز کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اپنی موکلہ کے بارے میں مجھے تشویش ہونے لگی جب میں نے لیڈی ویر کے چہرہ کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ ایک حسین چہرہ ـــ عورت جیسی عورت کا۔ جو "ماں" بھی اور سب حیثیتوں سے پہلے۔ ان کے انداز سلام میں اجنبیت جھلکتی تھی۔ ان کے میاں نے جو بے شبہ ان کے پرستار تھے فوراً کرسی پر بٹھا دیا۔

"یہ بچے کا قضیہ ہے بیگم" میں نے انھیں کھسیاتے ہوئے سنا۔ "ہمت سے کام لو" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ بیوی کی کرسی سے ٹیکے ٹکے اور ان کے شانہ پر ہاتھ رکھے ہوئے۔

"اچھا مسٹر ویڈر برن ہم آپ کی بات سننے کو منتظر ہیں"

"میں نے تفصیلی روداد سنا کر وقت ضائع نہیں کیا۔ اجمالی طور سے سچے سچے واقعات ان کے آگے رکھ دیئے مگر اسی میں اپنی ساری قوت استعمال کر لی۔ میں عدالت کے کٹہرے کے پاس بھی زور وکالت دکھا سکتا۔ مگر میں نے دیکھا میرے الفاظ نے میدان مار لیا تھا۔"

"آہ ـ فریڈرک !" لیڈی ویر نے ایک آہ کی "ہمارا جگر پارہ ! اس کے متعلق یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ایسے بہیمانہ سلوک اور دغا بازی کے گناہ میں آلودہ ہے کسقدر دردناک معلوم ہوتا ہے !"

"جب میں اپنی تقریر ختم کر چکا تو وہ اٹھیں۔ میں نے دیکھا انھیں سخت صدمہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی مجھ یہ بھی یقین تھا کہ ان کی بلند پایہ کیفیات، تحفظ وقار کا جبلی احساس اور عدل گستری اپنا کام کر کے رہینگے۔"

"اگر آپ نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے" وہ بولنے لگیں اور ان کی شیریں اور کھلی آواز کہیں بھی لغزش نہیں کھاتی تھی "تو ہمارے لیئے بس ایک ہی راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے بچے کی بیاہتی سے ہمارا تعارف

ضروری ہے۔ اُسے یہاں آنا چاہئے اور فوراً آنا چاہئے "۔

"میڈم !" میں خوشی سے چلا اُٹھا کیونکہ اسقدر فوری ظہورِ مطلب کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ "وہ یہاں موجود ہے اور بازو والے کمرہ میں ہے"۔

انھوں نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور دوسرے لمحہ وہ کمرہ سے باہر جا چکی تھیں۔ میں نے ان کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد منٹ بھر تک کمرہ پر خاموشی چھائی رہی۔

"کیا یہ حیرت کی بات نہیں ؟" آخر کرنل صاحب بول اٹھے۔ ان کے چہرے کی جلد کے نیچے کرب و آزار رگھٹ رہے تھے۔ "کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایسی عورت کا شکم زاد ایسی حرکت کرے جو میرے لڑکے گاڈفری نے کی ہے ؟ نظریۂ توارث کی ساری دلیلیں پاش پاش ہوئی دھری ہیں۔"

ہم کچھ دیر یوں ہی گفتگو کرتے رہے۔ مگر کرنل صاحب بری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ آخر انھوں نے جلدی سے معافی چاہی اور جھٹ سے کمرہ سے باہر نکل گئے۔ میں اپنے خیالات کے میدان میں شہسواری کرنے کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ دس منٹ بعد خانساماں آیا اور صباحی کمرہ سے بلا لایا۔ جب میں کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ان تینوں چیزوں نے اپنا اپنا اقتضاء پورا کر لیا تھا۔ "عدل، حق، اور عورت کی گداز دلی" اور باقی سے میری موکلہ کی پیاری صورت اور جادو نگار وجاہت نے بنٹ لیا تھا۔ مگر ابھی اس تجوبہ میں الم کی چاشنی پیدا ہوئی باقی تھی اور یہ اس وقت پیدا ہوئی جب گاڈفری وہ ایک مزید لاعلمی کے ساتھ طلبی کے امتثال میں بے اندیشہ منظر پر آگیا۔ میں اس کی وہ صورت کبھی نہیں بھولونگا۔ بس مردنی سی تو چھا گئی اس کے چہرہ پر۔ بالکل بے جان نظر آنے لگا۔ اس کی پچھلی کوتیاں انھوں نے وہ مکر چکا تھا اور بدنام کر دینے میں کچھ بھی باقی نہ رکھا تھا۔ دوسرے نسوانی ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کے ایک طرف کو ہو لئی کرنل صاحب نے سینہ پر ہاتھ باندھ لئے اور لڑکے کو گھورنے لگے۔ خدا ان کو چبھتی ہوئی نظروں سے پناہ میں رکھے۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں" انھوں نے رعب دار آواز میں پوچھا۔ "کہ ایک ہونہار سپوت کے بجائے ایک کمینہ ہمارے پلے بندھے کس قدر تکلیف دہ نہ ہوگا؟"

" الفاظ نے کوڑے کا سا تڑاخہ لگایا۔ خجالت کی کڑواہٹ اور تمتماہٹ سے اس کے رخسار تپنے اور جھلسنے لگے اور وہ ہاتھ ملنے لگا۔ مگر اس نے زبان نہیں کھولی اور بولتا بھی تو کیا بولتا۔ کس منہ سے بولتا ؟ اپنے کرتوت اس پر عیاں تھے۔ وہ خط جو اس پر نفریں کر رہا تھا، اور جس نے ایک عورت کا کلیجہ نچوڑ ڈالا تھا، میز پر کھلا پڑا تھا۔ وہ الفاظ جو اس نے اعتذار میں تراشے تھے ہونٹوں ہی پر پھسل کے رہ گئے میں اس منظر کی تفصیلات پورے طور پر پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ جب اس لمحہ کی شدت کشاکش اور تناؤ میں ڈھیلا پن پیدا ہوا تو پھر گفتگو ہونے لگی آخر میں سب ایک سمجھوتے کی طرف آنے لگے۔ اتنے میں میری موکلہ کچھ بولنے لگی اور میں سمجھتا ہوں ابتداء میں کسی نے اس کی بات سنی بھی نہ ہوگی"

"میں جس مقصد کے لئے آئی تھی حاصل کر چکی" وہ صاف صاف بولنے لگی اور اس نے لیڈی ویر کے چہرہ سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ "میں نے اچھی طرح سے ثابت کر دیا ہے کہ میں آپ کے فرزند کی

شریکِ اور جان نہ ہوئی ہوتی۔ میں آپ کی شفقت اور مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب رہا "ان" کا معاملہ تو میں اپنی خوشی سے دوبارہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی۔ اور نہ کبھی منہ لگاؤں گی۔ مسٹر ویڈربرن! اگر آپ تیار ہیں تو بسم اللہ ہم روانہ ہو جائیں۔"

"میں نے دیکھا اس کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ دوسرے لمحہ وہ بے قابو ہو جاتی میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مگر لیڈی ویڈربرن بیچ میں آگئیں۔"

"مگر پیاری تو یوں تو نہیں جا سکتی۔ تو میرے بچہ کی دلہن ہے۔ اس نے جو کچھ کیا سو کیا مگر اب تو تو ہماری ہے۔ میرے کوئی بچی نہیں اللہ پاک نے تجھے ہمیں بخشا ہے۔ آ! رہ جا ہمارے ساتھ!!"

"میری موکلہ نے جلدی سے لیڈی ویڈربرن کا ہاتھ لے کے لبوں سے لگا لیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔"

"نہیں نہیں۔ میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے جانے دیجئے" اور میں نے انھیں اشارہ سے کہہ دیا کہ ہمیں جانے ہی دیں۔

"رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائیگا" میں نے لیڈی ویڈر سے کھسیاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں وہ اس وقت حق پر ہے۔ بعد میں کوئی بھی راہ نکل سکتی ہے"

"انھوں نے مہربانی کی کہ ہمیں چھوڑ دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت اسے وہاں روک سکنے پر قادر نہیں۔ اس شخص کی صورت کا پیش نظر ہو جانا جس نے اس سے دغا کی تھی اس کی برداشت سے بالکل باہر تھا۔"

"یہاں مسٹر ویڈربرن نے ایک وقفہ لیا اور میں نے دیکھا اس واقعہ نے ان کے دل پر عجیب طرح سے اثر کیا تھا۔

"تو کیا وہ واقعی آپ کے ساتھ بلوچستان واپس آگئی؟"

"یقیناً۔ آج شام میں لیونڈرس کی قدیم قیام گاہ پر چھوڑ آیا اور میرا خیال ہے وہ پھر کے دن سے پھر تعلیم دینے میں مشغول ہو جائیں گی۔ اور یہ وہی دن ہوگا جس دن اس کا شوہر ہندوستان کی طرف کوچ کریگا۔"

"ارے! تو پھر نتیجہ کیا رہا؟" میں ناامیدی سے پوچھ اٹھا۔

"نہیں بابا!" میرے افسر نے اپنے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کو تاکتے ہوئے جواب دیا "ابھی نتیجہ باقی ہے۔"

(مترجم)

محمد وقار الدین صدیقی — (ڈیوڈ لایل)

ٹھوکریں

میرے دوست کسی بڑے مفکر کا قول ہے کہ عقل کا کام جذبات کے لئے راستہ صاف کرنا ہے۔ اگر آپ کی عقل نے آپ کے جذبات کی رہنمائی کی ہے تو یقیناً آپ کی زندگی آپ کی تمنا ہوگی اور آپ محبت کے کھیلوں سے دامن کشی ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے محبت کے صدمے نہیں اٹھائے لیکن جانئے محبت کا آغاز جس قدر پُرکیف ہوتا ہے انجام اتنا ہی قدر تلخ۔ یہی ایک حقیقت ہے جو افسانہ بنی رہتی ہے۔ مگر ہم نے جذبات کی اندھا دھند پیروی کی ہے اور اسی جوشِ جنون میں ہم نے تمنا کی تھی۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

دل کی یہ کبھی کبھی کی تنہائیاں ہی تو غضب ڈھاتی ہیں۔ بھولی بسری محبتوں کی یورش ہوتی ہے۔ کچھ یاد آتا ہے اور دل کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ میرا بچپن تھا، سات سال کا ہوں گا اپنے والد کے ساتھ میں ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ہمارے محلے میں ایک بڑے زمیندار ملازم سرکار رہتے تھے۔ میں اسکول سے چھٹی کر وہیں جاتا۔ ان کے پاس ایک عورت تھی وہ عورت مجھے ہر روز آنے کے لئے کہتی۔ وہ عورت گوری چٹی نہ تھی، حسین نہ تھی۔ بس ایک عورت تھی جسے ہارمونیم بجانا آتا تھا۔ اور گانا بھی آتا تھا میں وہاں گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ بیٹھا گھورتا رہتا۔ اس عورت کو۔ اس گانے بجانے والی عورت کو اور اندر ہی اندر میرا دل ایک عجیب گھلاوٹ سی محسوس کرتا۔ وہ گاتی، مجھے بھی ساتھ دینے کے لئے کہتی اور میں جب اس کے ساتھ گانے لگتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری آواز ہی نہیں۔ میری زندگی بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تخلیق ہوئی ہے۔ کہاں میں چھ سات سال کا بچہ اور کہاں وہ بیس پچیس سال کی عورت۔ لیکن مجھے عمر سے کیا سروکار تھا میں تو اس کی آواز اور ہارمونیم پر ناچنے والی انگلیوں کا دیوانہ تھا۔ میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا اور جب وہاں سے زبردستی اٹھا دیا جاتا تو راستہ بھر سوچتا رہتا کہ اگر کبھی میری شادی ہوگی، کسی عورت کو میں اپنی بیوی بناؤں گا تو وہ ایسی ہی عورت ہوگی۔ میرے والد کا تبادلہ ہو گیا تو مجھے اس گاؤں کو چھوڑنا پڑا۔ جانے سے پہلے میں اس عورت سے ملا۔ اس نے اپنا صندوق کھولا۔ اس میں سے۔۔۔ ایک قلم نکالا۔ کافور کا قلم جس پر پھول پتے بنے ہوئے تھے۔ اس قلم کو اس نے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کچھ دیر میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا اور میری پیشانی اور گالوں کو چومنے لگی۔ جب میں جانے کو ہوا تو اس نے مجھے ہاتھ کے اشارہ سے روکا اور ہارمونیم لے کر بیٹھ گئی۔ اس طرح دل لگا کر گانے لگی کہ میں رو پڑا۔ اسی طرح روتے ہوئے میں وہاں سے چلا گیا اور وہ بھی میرے ساتھ ہو گئی، میرے دل میں بیٹھی ہوئی۔ پتنگ ہوا میں اڑتی ہے تو ڈور بھی ساتھ رہتی ہے۔ لیکن اس معصوم محبت کی ڈور ٹوٹ گئی۔ ایک نوخیز الہڑ لڑکی نے لوٹ لیا۔ مگر اس کا قلم اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جانے کب تک رہے۔ میرے دل سے کھیلنے والی یہ دوسری لڑکی میری رشتہ دار تھی۔

میں گانے کا شوقین ہوگیا تھا۔ جب کبھی موقع ملتا میں تانیں اڑاتا رہتا۔ جانے کس گیت کا اثر تھا کہ اس نے ایک دفعہ کچھ عجیب انداز سے دیکھا اس طرح کہ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ جیسے کچھ میں نے چرا لیا۔

اس وقت میں اپنے بزرگوں کی روک ٹوک اور نگرانیوں سے محبت کو چوری ہی سمجھنے لگا تھا۔ اس لڑکی کی نظروں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں ہر وقت اس کے خیال میں گم "کیا کرنا چاہئے" "اور کیا ہوگا" کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا۔ ایک رات گرمی کے مارے برا حال تھا۔ سب کے بچھونے باہر صحن میں بچھ گئے۔ جس پلنگ پر وہ سو رہی تھی وہ میرے پلنگ سے ساتواں تھا۔ سات پلنگ میرے اور اس کے درمیان حائل تھے۔ مجھے اس رات نیند نہ آئی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس نے موتیا کے پھول اپنی چوٹی میں گوندھ رکھے تھے۔ وہ موتیا کے خوشبودار پھول وہ اس کا دمکتا چہرہ اور وہ اس کے چمکیلے بال مجھے نیند نہ آئی۔ اتنے میں زور کی آندھی چلنے لگی۔ سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور چھپر کے سائبان میں سونے کی صلاح ہوئی۔ سائبان کے نیچے بھی بچھونوں کی وہی ترتیب رہی۔ سات پلنگ میرے اس کے درمیان حائل رہے۔ آندھی کا زور بڑھنے لگا اور یکایک سائبان کا ایک بانس ٹوٹ گیا۔ سائبان اڑا اڑا دھم زمین پر آرہا۔ میں ہڑبڑا کر اپنے پلنگ سے اٹھا اور اس لڑکی کے پلنگ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ ہوشیار ہوگئی تھی لیکن اس حادثے سے اس کے ہوش و حواس ٹھکانے سے نہ تھے۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور باہر نکل گیا۔ میرے اطراف سب گھر والے جمع ہوگئے۔ سب کی نظریں کچھ پوچھ رہی تھیں۔

اس تاریخ اور واقعہ کے بعد سے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس لڑکی کی شادی بھی ہوگئی۔ اب بھی میں کبھی کبھی اس لڑکی سے ملتا ہوں۔ وہ ہر دفعہ اس واقعہ کی یاد دلاتی ہے۔ کیا وہ کبھی نہ بھولے گی اس طرح یاد رکھ کر اور یاد دلا کر آخر اس کا مقصد کیا ہے؟

زندگی نکھرے آسمان پر بہنے والے کیلے ابر کے ٹکڑے کی طرح سست رفتار اور بے سہارا ہوگئی۔ دل کے ہر گوشے سے گرم بخارات اٹھتے محسوس ہونے لگے کہ پھر وہی چھیڑ۔ میں نے ان کو نہ دیکھا۔ انھوں نے مجھ کو دیکھا۔ ہاں بعض وسائل ایسے تھے کہ انھیں میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا۔ وہ اپنی سہیلیوں سے کہتیں "میں ان سے محبت کرتا ہوں" اور میں اپنے دوستوں سے کہتا "وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں"۔ اکثروں کو شبہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن یقین مانئے نہ ہم نے ایک دوسرے کو خط لکھے نہ کہیں ہماری ملاقات ہوئی۔ بس دل ہی دل میں شاید ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے اور محبت کرتے ہیں۔ اور اسی محبت کی شہرت ہے۔ وہ اب بھی کہتی ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟ یہ محبت بھی ایک دن مٹ جائے گی۔ ہاں میں محبت کی پائداری کا قائل نہیں ہوں۔ ایک تلخ تجربہ نے مجھے عورتوں اور محبت کا مخالف بنا دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ محبت میں فریقین ایک دوسرے سے بے وفائی کی امید رکھتے ہیں اور ہر ایک اپنی ہی محبت کو "مجنونانہ" ثابت کرتے ہوئے دوسرے کی محبت کو غرضی یا مطلبی بتلاتا ہے۔ لیکن میں نے ان سے جو محبت کی تو میرے دل میں کسی مطلب یا غرض کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں ان کے حسن یا شباب کا وارفتہ نہ تھا۔ مجھے ان میں ایک خاص کشش محسوس ہوتی تھی۔ ایک ایسی کشش جو صرف دل کی پاکی اور گرمی کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھ سے بدظن رہیں۔ آخر اسی بدظنی میں انھوں نے اپنے لئے ایک دوسرے مرد کا انتخاب کرلیا۔ میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ اس نے

ے ساتھ دغا کی اور وہ پھر میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں اب بھی ان کے لئے اپنے دل میں محبت ہی پاتا تھا
بدستور بدظن ہیں۔ کہتی ہیں "تم جھوٹے تمہاری محبت جھوٹی"۔ ان کی بدظنی نہیں نہ جانے اور کتنی
ٹھوکریں کھلوائے۔ میں سوچتا ہوں جب ان کی بدظنی دور ہو جائے گی۔ کیا اس وقت بھی میں ان سے محبت
کر سکوں گا؟۔ شاید۔

حسن اور محبت کی یہ یورشیں ہی کیا کم تھیں کہ ایک اور "محبت نامہ" وصول ہوا جنھیں میں ایک
محترم خاتون سمجھتا تھا انھوں نے لکھ بھیجا تھا کہ "رات کا کھانا" ان کے ساتھ کھاؤں۔ وہ رات میرے لئے
بڑی صبر آزما رہی۔ بڑا پر تکلف انتظام کیا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں پوچھ بیٹھیں "محبت کیا ہوتی ہے" اور
اس سوال نے ان کی آنکھوں میں وہ خاص چمک پیدا کر دی، جو محبت کی پیاس بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ میں نے
انھیں اپنے سے دور رکھنے کے لئے اپنی محبت کی ساری داستانیں بیان کر دیں (ان میں زیادہ تر فرضی
اور من گھڑت افسانے تھے) کہنے لگیں "آپ تو چھپے رستم ہیں۔ ہمیں بھی سکھائیے نا محبت"۔ کون میں؟
میرا دماغ چکرانے لگا۔ وہ اس طرح مگن ہو گئیں جیسے میں انھیں مایوس کر ہی نہیں سکتا وہ اپنے پلنگ سے اٹھیں
میرے قریب سے گزریں۔ ان کا پلو میرے چہرہ پر لہرا گیا اور وہ گنگنانے لگیں "تیرے من میں بسوں گی — او"
اب وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن انھوں نے راستہ روک دیا "آپ صبح جائیے۔ اتنی اندھیری
رات میں آپ کیسے گھر جا سکیں گے"۔ کس طرح میں نے ان سے چھٹکارا پایا ہے، میرا ہی دل جانتا ہے۔ دوسرے
دن میں نے اپنے ایک دوست سے رات کا واقعہ بیان کر دیا۔ اس دوست نے کسی سے کہا اور کسی نے ان سے
کہہ دیا۔ بہت چراغ پا ہوئیں۔ مجھے بہت برا بھلا کہا اور جہاں کہیں بھی میرا ذکر آتا ہے۔ کہتی ہیں "اس سے تو
مجھے نفرت ہے"۔

محبت اور نفرت کے اس ہجوم میں دل دھڑک رہا ہے۔ محبت کی آڑ لے کر بہت سی نادانیاں کر بیٹھے
بہت سی کامرانیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن اب دل کی تنہائی سے وحشت ہوتی ہے۔ عقل کو آگے ہی آگے رکھنا
چاہتا ہوں اور دل کی باگ مضبوطی سے تھاما ہوا ہوں۔ اب اس کی سرکشی میری جان پر بنا دے گی۔ لیکن
ان حالات میں سکون اور یکسانیت زندگی کو کچھ اس درجہ بے کیف بنا دیتے ہیں کہ بے اختیار کسی ہلچل سے
آشنا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میں اپنے کنج عافیت سے باہر نہیں نکلتا۔ بیتے ہوئے حادثوں کو یاد کر لیتا
ہوں۔ سکون کے سارے بوجھل پردے چاک چاک ہو جاتے ہیں اور دل کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ ماضی
کے لئے میں اپنے حال اور مستقبل سے دامن کش نہیں ہونا چاہتا۔ ٹھوکروں سے سنبھلنے اور اپنی منزل سے
قریب ہو چکنے کے بعد میں لوٹ کر پھر ان پتھروں میں گھرنا نہیں چاہتا۔ رکشاؤں، تانگوں اور موٹروں کے
ہٹتے سرکتے پردوں کی اوٹ میں مجھے کھوئے ہوئے جلووں کی جھلملاہٹیں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن میرے
دل میں کوئی چنگاری نہیں چٹکتی! ۔ کسی سے میری مڈبھیڑ بھی ہو جاتی ہے۔ بے رخیاں، شکایتیں، عتاب
اس کے سوا بھی کچھ ہو تو میرے سر آنکھوں پر۔ لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں اور کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہے۔
ان آنکھوں میں مجھے وہی پہلے کی سی ہمت افزائیاں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ ان کے حسن کی تمنائیں للکار للکار کر
پوچھتی ہیں "ہم نے مایوس کیا تو پھر تمہیں جینے کا حق کیسے ملے گا"۔ میں محبت کو نشاطِ زندگی سمجھتا ہوں —

سوہان روح . . . تمہیں یہ اپنی موت سے ایک بار اپنا دامن چھڑا لیتا ہوں۔

کہیں سے دعوت نامے وصول ہوتے ہیں۔ بچھڑنے سے ملنے کے جتن کئے جاتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں۔ اس کے بعد۔ میری عقل کی نارسائیوں پر خیال جاتے ہیں۔ دوسرے طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے ہاتھ کا پان تو اس کو ہمیشہ سے بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے۔ بتا دوں۔ آپ کو یاد ہے وہ رات تانگہ سے ہم دونوں گر پڑے تھے۔ آپ اور یں۔ کس بری طرح گرے تھے۔ اچھا ہوا رات تھی۔ اور ابھی شادی کی تو یں قائل نہیں۔ آپ جو چاہیں سمجھیں " میں پھر بھی کچھ نہیں سمجھتا یا سمجھتا بھی ہوں تو اپنی سمجھداری کو ناسمجھی کے پردہ میں چھپانا چاہتا ہوں۔ آپ تو بالکل بدل گئے۔ وہ جمائی لینی ہیں۔ میرے پاس ان کے لئے " شب بخیر " کے سوا اور کیا رہتا ہے۔

بعض اپنی شادیوں میں بلاتی ہیں۔ میں شریک ہوتا ہوں اور مجھے خوشی ہوتی ہے۔ بعض اپنی " نئی قاشوں " سے تعارف کرانے کے لئے بلا بھیجتی ہیں۔ میں جاتا ہوں اور ان دو گرفتاروں کی قسمتوں پر روتا آتا ہوں کہ جس جال میں پھنسے ہو اس سے چھوٹو گے بھی تو ہائے ہائے کرنے کے لئے "

چند دل والیوں نے ایسی بھی نکلیں جنہوں نے " پریم سندیسہ " بھیجا۔ محبت کے کھیل میں مقابل ہونے کے لئے آواز دی۔ اپنی محبت ہر طرح اطمینان دلایا۔ لیکن انھوں نے راکھ کی ڈھیر پر ہاتھ مارا تھا۔ گرمی محسوس نہ ہوئی تو انھوں نے اس ڈھیر کو پھونک مار کر اڑا دیا۔ اچھا ہی کیا! میری دعائیں ان کے لئے۔

اب بھاگتا ہوں سایۂ عشق بتاں سے میں　　　کچھ دل سے ہوں ڈرا ہوا کچھ آسماں سے میں

یہ " کارنامے " اس شوہر کے ہیں۔ جو اپنی زندگی میں۔ میرا دوست اور اپنی بیوی کا پاکباز شوہر تھا۔ آج میری بیوہ بھابی مرحوم کی معصومیوں اور وفاشعاریوں کا ذکر کرتے تھکتی نہیں۔ اسی کے سوگ میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتی ہیں۔ ایسے فرشتے ہم انسانوں میں کہاں ؟

رشید قریشی

تنقید و تبصرہ

عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاد قانون جامعہ عثمانیہ

مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن

یہ ۵۶ صفحات کا ایک رسالہ ہے جو دراصل مجموعۂ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ میں چھ سات سال قبل بہ حیثیت مضمون کے شائع ہوا تھا۔ بعد کو لائق مولف نے نظرِ ثانی اور ترمیم و اصلاح کے ساتھ اسے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

یہ کتاب گو بہت مختصر ہے لیکن مولف نے عہدِ نبوی کی جنگوں کے حالات اور ان کے محلِ وقوع نہایت تحقیق اور تلاش سے قلمبند کئے ہیں اور جن مقامات کا جہاں یہ جنگیں لڑی گئی تھیں مولف نے نہ صرف بچشم خود معائنہ کیا بلکہ ان کے فوٹو بھی لئے اور نقشے بھی تیار کئے جو اس کتاب میں شریک ہیں اس لحاظ سے یہ کتاب بہت گراں قدر اور بیش بہا معلومات کی حامل بن گئی ہے۔ اب تک غزوات نبوی سے متعلق زیادہ تر تاریخی اور روایتی واقعات کتابوں میں درج کئے جاتے تھے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ نے پہلی بار سائنٹفک نقطۂ نظر سے ان لڑائیوں پر نظر ڈالی ہے جس کے مطالعے سے نہ صرف عہد نبوی کی جنگوں کے اسباب ذہن نشین ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کی قیادت میں کس طرح اپنے دشمنوں کو مغلوب اور مرعوب کیا تھا اور جنگ کرنے کے کتنے اچھے ڈھنگ انھوں نے رائج کیے تھے۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ عام تاریخ اور سیاسیات کے طلبہ بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان کے معاشی مسائل

از محمد ناصر علی ایم اے لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

تقریباً چار سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے جس میں مولف کے تیئیس مضامین یک جا کر دئے گئے ہیں۔ ان سب مضامین کا تعلق ہندوستان اور حیدرآباد کے معاشی مسائل سے ہے۔ ناصر علی صاحب جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق تعلیم یافتہ ہیں اور اس سے قبل انھوں نے کئی مضامین اور کتابیں لکھیں اور شائع کی ہیں۔ معاشیات پر جتنا تحریری کام اردو میں انھوں نے گزشتہ چند سالوں کے قلیل عرصے میں کیا ہے اتنا کام کسی اور شخص نے یا کسی اور زمانے میں اس زبان میں نہیں کیا گیا۔

وہ اپنے مضمون پر بخوبی حاوی ہیں اور عوام کو معاشی مسائل سمجھانے کے لئے جس اندازِ بیان اور نقطۂ نظر کی ضرورت ہے اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی پڑھے لکھے لوگوں میں ہندوستان کے معاشی مسائل سے متعلق ضروری معلومات میں اضافے کا باعث ہوگی۔

فتراک

از جہاں بانو بیگم لکچرار اردو کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ

جہاں بانو بیگم حیدرآباد کی ان تعلیم یافتہ خواتین میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ذوق ادب اور انشا پردازی کی بنا پر ممالک محروسہ کے باہر بھی اچھی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کے دو چار مجموعے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی ان کے مزاحیہ اور سماجی مضمونوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے ستائیس مضمون شریک ہیں۔ جہاں بانو بیگم کا اسلوب بیان بہت دلچسپ ہے اور ان کی ہر عبارت میں ایک خاص شوخی اور طنز کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے مضمون میں مٹھاس کو بھی تلخی میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ

اردو ادب میں اب تک خواتین کی جو کتابیں یا مضامین ہم دست ہوتے ہیں ان سبھوں میں جہاں بانو بیگم کی کتابیں اپنے طعن و طنز کی بناء پر ایک خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ عہد حاضر کی خواتین میں وہ اپنے اس مخصوص انداز کی وجہ سے بہت ممتاز ہیں اور ان کی یہ تحریریں اردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں اضافے کا باعث ثابت ہو رہی ہیں۔ جو لوگ دنیا کو اس خاص نقطۂ نظر سے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ان کے لئے اس مجموعۂ مضامین کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ ثابت ہوگا۔

سیر افغانستان

از سید سلیمان ندوی مطبوعہ نفیس اکیڈیمی حیدرآباد۔

۱۹۳۳ء میں نادر شاہ والی افغانستان نے علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو کابل آنے کی دعوت دی تھی تاکہ ان تینوں کے مشورے سے افغانستان میں نظام تعلیم کا ایک اچھا سلسلہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ تینوں اصحاب اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کابل گئے اور وہاں دو چار روز قیام کیا۔ اس مختصر قیام میں نادر شاہ اور ان کے عمائد سلطنت اور افغانی عالموں اور ادیبوں سے ان تینوں نے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور اپنے مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

زیر نظر کتاب میں اپنے اور اپنے ہم سفروں کے تجربات سفر کو مولوی سید سلیمان ندوی نے اپنے سلیس اور دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے اور جگہ جگہ ان کے قلم سے ایسے دردمندانہ اور پُر کیف جملے نکل پڑتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک حساس اور صاحب ذوق عالم اپنے شاگردوں کو ساتھ لئے ہوئے سفر کر رہا ہے اور آثار کی تحقیق و تاریخ کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے دوسرے ماخذوں کی طرف بھی توجہ دلاتا جاتا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ ایک باضابطہ سفرنامۂ افغانستان نہیں ہے لیکن ہندوستان کے ایک مشہور عالم و فاضل کے ایسے احساسات پر مشتمل ہے جو انھوں نے افغانستان کے سفر کے درمیان قلمبند کئے تھے اس لئے اس کی اہمیت ایک معمولی سفرنامے سے بہت زیادہ ہے۔

یونان اور روما کے انوکھے قصے

از امجد علی ناشر حیدرآباد بک ڈپو۔

اس چھوٹی سی کتاب کے مصنف امجد علی صاحب ہیں۔ جو اس سے قبل مصوری اور تاریخ حسن کاری کے موضوعوں پر مختلف کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے اپنے ذوق حسن کاری کی تشریح ہی کی خاطر لکھی ہے۔ اس لئے کہ قدیم حسن کاروں نے یونان و روما ہی کے دیو مالا کے کرداروں کو تصویروں اور مجسموں کے قالب میں ڈھالا ہے جن کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان قصوں سے واقفیت ہو جن پر قدیم مصوروں اور بت تراشوں کی تصویریں اور مجسمے مبنی ہیں۔

یوں بھی اردو زبان میں انگریزی اور یوروپین زبانوں کے توسط سے یونان اور روما کے مختلف افسانوی کرداروں کے نام اور حوالے نظر سے گزرتے رہتے ہیں لیکن اردو میں کوئی ایسی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی ہے جس میں ان تلمیحات کی تشریح کی گئی ہو اس لئے یونان و روما کے انوکھے قصوں کا یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور افسانوی لطف کے علاوہ پڑھنے والے کو یونان اور روما کے دیومالا سے بھی واقف کرائے گا۔

دلکش شخصیت

از برزوجی فیروز شاہ تاراپوری ناشر۔ راج پبلشنگ ہاؤس حیدرآباد

یہ کتاب مشہور مفکر و ماہر نفسیات مسٹر الیف اوس کی انگریزی کتاب وننگ (Winning

پرسنیالٹی کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم برزوجی فیروز شاہ حیدرآباد کے ایک صاحب ذوق پارسی بزرگ ہیں جن کو اردو ادب اور تصنیف و تالیف کا بھی بڑا اچھا ذوق حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے اب تک اس زبان میں کئی کتابیں تالیف و تصنیف کی ہیں جن میں برنارڈ شاہ کے ڈرامے، جوان آف آرک کا ترجمہ مظلوم دوشیزہ بہت مقبول ہو چکا ہے۔

زیر نظر کتاب ایک شہرۂ آفاق اور مفید انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور اس کا مطالعہ ہر ایسے نوجوان کے لئے ضروری ہے جو اپنی زندگی میں کامیابی اور ترقی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوان ہیں شخصیت، شعوری شخصیت، نیم شعوری شخصیت اور عملی شخصیت۔ ان چاروں ابواب میں متعدد ذیلی سرخیوں کے تحت یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زندگی کو کامیاب اور خوش بنانے کے لئے انسان کو کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہترین اصلاحی کتاب ہے اور اگر اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کیا جائے تو بہت سی مایوس اور ناکام زندگیاں امید اور کامرانی سے مملو ہو جائیں گی۔

انگریزی کتاب کا اسلوب بیان خشک اور ناصحانہ ہے مترجم نے اپنے اردو اسلوب کو شگفتہ اور کاروباری بنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے پر کسی قسم کا دماغی بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ توقع ہے کہ طلبہ، عوام اور کاروباری اصحاب اس کتاب کو پڑھ کر اپنی زندگیوں کو سنوارنے اور اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوں گے۔

گریز از عزیز احمد - ناشر مکتبۂ جدید۔ لاہور

یہ ایک ناول ہے جس کے مصنف عزیز احمد سابق لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ اپنے ذوق تصنیف و تالیف کی وجہ سے جامعۂ عثمانیہ کے فیض یافتوں میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس سے قبل ترقی پسند ادب پر بھی ایک کتاب شائع کی ہے۔ اور ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "ماہ لقا اور دوسری نظمیں" ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر ناول حیدرآباد اور ہندوستان کے ان نوجوانوں کی سماجی زندگی اور ذہنی کشمکش کا ایک بہترین آئینہ ہے جو ہندوستان سے باہر خاص کر یوروپی ممالک کو تعلیم کے لئے جاتے ہیں۔ اس کے کردار اور اس کا خاکہ ہر ہر قدم پر نوجوانوں کی گریزی خصوصیات کو واضح کرتا جاتا ہے۔ اس کتاب میں پلاٹ کے علاوہ اس وجہ سے بھی ایک طرح کی دل کشی پیدا ہو گئی ہے کہ اس میں عام ناول نگاروں کی طرح محض سنی سنائی باتوں پر قصے کی تعمیر نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف نے زندگی کے ان تمام شعبوں کا مشرق اور مغرب میں بچشم خود معائنہ کیا ہے جن کا ذکر اس ناول میں نہایت ہی خلوص اور بے باکی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول خود مصنف کا سفر نامۂ یورپ ہے۔ یوروپی زندگی کی عام عریانی اور اخلاق باختگی کو مصنف نے بعض جگہ اتنی بے تکلفی سے بیان کیا ہے کہ عریانی جھلکنے لگی ہے۔ کتاب کا اسلوب جدید اور ترقی پسند ادب کی اکثر کتابوں کی طرح نہایت بے باک ہے لیکن زبان میں شائستگی اور نفاست بھی پائی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ یہ ناول جدید اردو ادب میں بے باکی اور شائستگی کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ ثابت ہوگا۔

"ق"

نئی زندگی - اڈیٹر سید انیس الرحمٰن صاحب

قیمت اسپیشل نمبر ایک روپیہ - چندہ سالانہ چھے روپے ملنے کا پتہ دفتر نئی زندگی الہ آباد

رسالہ نئی زندگی اردو زبان کا واحد سیاسی رسالہ ہے۔ عام طور پر بالعموم عالم اور خاص طور پر جو ہندوستان کی سیاسی زندگی سے واقف ہونا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ رسالہ بہت زیادہ کارآمد ہے اور یوں بھی تعلیم یافتہ طبقہ کا سیاسیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ سان فرانسسکو نمبر ہے۔ چار ابواب کے تحت مختلف عنوانات قائم کرکے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ سب مقالے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ بھی اچھا ہے۔

مظلوم دوشیزہ - مترجمہ برزجی۔ فیروز شاہ تاراپوری قیمت تین روپے کلدار تین روپے آٹھ آنے حالی۔ حجم صفحہ (۲۶۳) ملنے کا پتہ۔ نفیس اکیڈیمی عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

جون آف آرک کے نام سے کون واقف نہیں۔ انگلستان کے مشہور ڈراما نویس برنارڈ شا کے ڈرامے جون آف آرک کو مترجم نے اردو جامہ پہنایا ہے۔ زبان گوارا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ المیہ ڈراما کی پوری دلچسپی ترجمہ میں بھی باقی رہے۔

دنیائے شہرزاد از محترمہ آمنہ محمودہ رضویہ (ادیب فاضل) قیمت۔ عا حجم صفحہ ۱۶۶ ملنے کا پتہ۔ عباسی کتب خانہ۔ جونا مارکٹ بابشیر احمد اینڈ سنز جونا مارکٹ کراچی

محترمہ رضویہ اردو کی بڑی زود نویس ادیبہ ہیں یہ ان کی تیرھویں تصنیف ہے۔ اُن کی گزشتہ تصانیف سے یہ کتاب بہتر ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں انھوں نے بجائے حسن و عشق کی المیہ کہانیوں کے عراق کی تاریخ و معاشرت پر قلم اٹھایا ہے۔ اپنا سفرنامہ عراق بھی اس میں شامل کیا ہے جو دلچسپ ہے۔ بعض اوقات زبان کی غلطیاں بہت ناگوار ہوتی ہیں یہ شاید ناقص کتابت کی وجہ ہے۔ خصوصاً بھاوج کی جگہ بھاوجہ ایک جگہ بری طرح کھٹکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ تانیث کی تانیث کیسی۔ فارسی ترکیبوں کا بے جا استعمال اگر یہ ترک کردیں۔ تو زبان بڑی حد تک سدھر جائے۔

افسانۂ زرین مترجمہ اسماء صاحبہ۔ قیمت عہ حجم ۱۱۱ صفحے ملنے کا پتہ۔ --- اردو اکیڈیمی لاہور۔

ایک امریکی مصنف کی کتاب کا ترجمہ یہ افسانہ ہے۔ پیش لفظ فیض نے لکھا ہے اور اس کوشش کو سراہا بھی ہے۔ لیکن درحقیقت ترجمہ اُس فن کا نام ہے جو اصل مصنف سے کتاب کو چھین لے۔ آئندہ کوشش شاید کامیاب ہو۔ اس ترجمہ میں تو کوئی دلچسپی نہیں مگر شاید کہانی کو صرف قصہ کی خاطر پڑھنے والے اسے پسند کریں۔

سویت یونین کی قومیں از ادھیکاری مترجمہ احمد حسین صاحب قیمت ۱۲ر۔ حجم ۵۹ صفحے۔ ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت بمبئی

یہ کتابچہ اس سلسلہ مضامین کی ایک کڑی ہے جو اشتراکیت کا مطلب و مفہوم عوام کو سمجھانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ذیلی طور پر موجودہ روسی نظام کو سراہا گیا ہے اور مختلف مثالوں سے یہ بات خاص طور پر واضح کی گئی ہے کہ روس میں مختلف اقوام اپنے اتحاد کی وجہ ایک ہیں۔ اور آپس میں برابر ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ان کے اپنے قومی حقوق کی بھی حفاظت ہوتی ہے۔ اور انھیں اس کا اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں الگ ہو جائیں۔ شاہیت اور اشتراکیت دونوں ادوار میں ان اقوام کی حالت کا موازنہ کیا گیا ہے اور بے شک موجودہ زمانہ ان کو زندگی کے جائز حقوق عطا کرتا ہے۔ ادبی حیثیت سے اس کتابچہ کا کچھ درجہ نہیں لیکن اپنے مقصد کی تکمیل بدرجۂ اتم کرتا ہے۔ عوام اور خواص دونوں کے لئے اس کتابچہ کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ یہ سیاسی

ادارے کی خبریں

روئداد مجلس اردو امتحانات

مجلس ہذا کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۳ فروردی ۱۳۵۵ف مطابق ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء روز یکشنبہ شام کے ۶ بجے پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی کے مکان واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ بہ اتفاق آرا پروفیسر صدیقی صاحب نے جلسے کی صدارت کی۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ ۲۔ ملا فخر الحسن صاحب۔ ۳۔ پروفیسر فضل حق صاحب۔ ۴۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ ۵۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد۔ ۶۔ مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ۔

الف۔ گزشتہ جلسے کی روئداد کی خواندگی اور توثیق کے بعد حسب ذیل امور پیش اور طے ہوئے۔

(۱) مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مجلس اردو امتحانات کی اس خواہش کی بنا پر کہ موصوف کو ختم ۱۳۵۵ف تک بوجہ مصروفیات سرکاری مجلس ہذا کی صدارت کے فرائض کی انجام دہی سے معاف رکھا جائے۔ طے پایا کہ موصوف کی جگہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ختم ۱۳۵۵ف تک بحیثیت نگران کار صدر کام انجام دیں۔

(۲) طے پایا کہ سال حال کا جلسہ تقسیم اسناد ۴ اردی بہشت ۱۳۵۵ف کو منعقد کیا جائے اور اس کی صدارت کے لئے حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر سے اور تقسیم اسناد و انعامات کے لئے حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ سے درخواست کی جائے۔

(۳) طے پایا کہ آئندہ سے اردو دانی کے ساتھ اردو زبان دانی کا امتحان بھی سال میں دو بار لیا جائے بشرطیکہ ان دونوں امتحانات میں کافی تعداد میں امیدوار شریک ہوں اور امتحانات کے اخراجات کی شعبے کی گنجائش سے بآسانی سربراہی ہو سکے۔

(۴) طے پایا کہ سال حال مجلس ہذا کے امتحانات ۱۰۔۱۱۔۱۲۔ امرداد ۱۳۵۵ف کو لئے جائیں۔ اس کے بعد تمام سالانہ امتحانات ڈسمبر میں منعقد ہوا کریں۔

(۵) طے پایا کہ اردو زبان دانی کے امتحان میں بجائے محمد اسمٰعیل کی قواعد اردو کے بشیر النساء بیگم صاحبہ کی کتاب "پہلی قواعد اردو" شریک نصاب کی جائے۔

(۶) طے پایا کہ معاوضہ ممتحنین کے لئے ملا سید فخر الحسن صاحب، مولوی سید محمد صاحب اور مولوی خواجہ حمید الدین صاحب کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو تمام امور پر غور کر کے آئندہ مجلس میں اس خصوص میں رپورٹ پیش کرے۔

(۷) طے پایا کہ مولوی خواجہ حمید الدین صاحب کو جو بحیثیت مہتمم ادارہ مجلس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے مجلس ہذا کا رکن منتخب کیا جاتا ہے۔

جلسہ تقسیم اسناد اردو امتحانات بابت ۱۹۴۵ء

اردو امتحانات بابتہ ۱۹۴۵ء کا جلسہ تقسیم اسناد بصدارت عالیجناب حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر بتاریخ ۴ اردی بہشت ۱۳۵۵ف م ۳ اپریل ۱۹۴۶ء شام کے ۵ بجے کو آپریٹیو یونین ہال متصل نظام کالج میں منعقد ہوا۔ آنریبل نواب ڈاکٹر سر مہدی یار جنگ بہادر نائب صدر اعظم دولت آصفیہ و صدر ادارہ ادبیات اردو نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ نواب صاحب معزز کی استدعا پر حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ نے اپنے دست مبارک سے

کامیاب امیدواروں کو اسناد اور تمغے تقسیم فرمائے۔ اس کے بعد حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر نے اپنا پر مغز خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ اسناد لینے والوں میں افواج آصفیہ کے امیدوار زیادہ تعداد میں شریک تھے۔ اضلاع کے مرکزوں میں سے تاکل جاگیر، بشیر آباد، اور بیلی کے نمائندے شریک جلسہ تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کی کارروائی کے بعد جلسہ بحسن و خوبی اختتام کو پہنچا۔ علم دوست اصحاب کے علاوہ حسب ذیل مہمان قابل ذکر ہیں۔

آنریبل نواب رافت جنگ بہادر صدر المہام فوج و صنعت و حرفت، مولوی سجاد مرزا صاحب نیز ناظم تعلیمات، ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب مہتمم کتب خانۂ آصفیہ، مولوی میر محمد عالم صاحب مددگار تعلیمات، ملا فخر الحسن صاحب لکچرر عثمانیہ ٹریننگ کالج، پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی، مولوی فاروق علی صاحب ایڈوکیٹ، مولوی ضامن علی صاحب غازی کمشنر آبکاری، پروفیسر سید محمد صاحب، مسٹر مہندر راج سکسینہ ریڈر جامعہ عثمانیہ، مسٹر وینکٹ راؤ، لفٹننٹ ایس شنکرن آرمی ایجوکیشنل افسر۔ اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں مولوی ضامن علی صاحب غازی نے کارکنان ادارہ کا بہت ہاتھ بٹایا۔ نیز منیجر صاحب کو اپریٹیو یونین ہال نے جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دے کر شکریہ کا موقع عطا فرمایا۔

آئندہ اردو امتحانات کی تاریخیں

ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات سال حال ۱۰ تا ۱۲ امرداد ۱۳۵۵ف مطابق ۱۵ تا ۱۷ جون ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوں گے۔

شرکت کی فیس دفتر ادارہ خیریت آباد پر ۱۲ تیر مطابق ۱۱ مئی ۱۹۴۶ء تک پہنچ جانی چاہیے۔ نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جو اصحاب یا ادارے کی شاخیں اپنے اپنے مستقر پر اردو امتحانات کے مرکز قائم کرنا چاہتے ہوں۔ قبل از قبل ادارے سے مراسلت کریں تاکہ ممکنہ سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔

ہر وہ مقام مرکز قرار پا سکتا ہے جہاں سے کم از کم پچاس امیدوار شریک ہوں۔

خطبۂ استقبالیہ

جلسۂ تقسیم اسناد و امتحانات ادارۂ ادبیات اردو بابتہ سنہ ۱۹۴۵ عیسوی

آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر ایم اے، ڈی لٹ صدر ادارۂ ادبیات اردو و نائب صدر اعظم باب حکومت آصفی

حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر، حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ و معزز خواتین و حضرات!

ادارۂ ادبیات اردو و شعبۂ امتحانات کی جانب سے آج اس جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں آپ سب خواتین و حضرات کا نہایت مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔ ادارۂ ادبیات اردو ہندوستان کی عام اور ہماری سرکاری زبان اردو کی ترقی و اشاعت، تعلیم بالغاں کی ترویج اور خواندگی کی توسیع کے لئے جو کوشش کر رہا ہے وہ نہ صرف خواص و عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی ہیں بلکہ ہمارے لئے یہ ایک فخر کی بات ہے کہ ان کو خاندان آصفی کی سرپرستی بھی حاصل ہوتی رہی ہے۔ اس ادارے کے امتحانات کی سندوں اور انعاموں کی تقسیم کے گذشتہ جلسوں کی صدارت حضرت شہزادہ جنرل والا شان سر اعظم جاہ بہادر اور حضرت شہزادہ والا شان سر معظم جاہ بہادر فرما چکے ہیں۔ آج ہم اپنی خوش بختی پر مسرور ہیں کہ اسی مبارک خانوادۂ آصفی کے ایک اور چشم و چراغ صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر ہمارے اس جلسے کی صدارت فرما رہے ہیں اور حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ اپنے دست مبارک سے اسناد اور انعامات تقسیم فرمانے والی ہیں۔

حضرات! آپ صاحبان اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو علمی مسائل سے بے حد دلچسپی ہے۔ آپ نے مجلس تعلیم ثانوی کے صدر اعلیٰ کی حیثیت سے ریاست کے مختلف مدارس کا وقتاً فوقتاً بہ نفس نفیس معائنہ فرما کر توسیع تعلیم میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا۔ آپ کی توجہ گرامی سے مدرسوں میں نہ صرف ذہنی تعلیم کی رفتار ترقی پذیر ہو گئی ہے بلکہ طلبہ کی جسمانی تربیت کی ترقی کے لئے آپ نے مختلف جسمانی مقابلوں کے قیام اور ان کے معائنوں کے ذریعہ سے بھی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ آپ کی ذات گرامی ہمارے ملک سے جہالت اور ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے شمع ہدایت ثابت ہو رہی ہے اور اسی مناسبت سے ادارے کے اس جلسہ کی صدارت کے لئے اس موقع پر حضرت صاحبزادہ صاحب سے زیادہ موزوں کوئی اور شخصیت نہیں ہو سکتی۔

حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ بھی خواتین کی ہر جہتی ترقی اور خصوصاً ان کی معاشرتی اور تعلیمی اصلاح و فلاح سے جو خاص دلچسپی رکھتی ہیں اس سے آپ سب حضرات بخوبی واقف ہیں۔ میں نہایت ادب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحب اور حضرت صاحبزادی صاحبہ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور کارکنان ادارہ کی جانب سے نذرانۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

حضرات! ادارۂ ادبیات اردو جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور ان کے چند اردو دوست رفقاء نے اب سے سولہ برس پہلے قائم کیا تھا خاموشی کے ساتھ اردو زبان اور ادب کی جو خدمات اپنے بارہ ۱۲ مختلف شعبوں کے ذریعے سے نیز اپنی مطبوعات و رسائل سب رس کے علاوہ ایک مخزن علوم و فنون یعنی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و طباعت کے صبر آزما مراحل طے کر کے انجام دے رہا ہے وہ آپ سے مخفی نہیں ہیں۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اس کے ایک شعبہ اردو امتحانات کی افادیت اور

دائرہ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ نہ صرف بلدہ اور متعدد اضلاع و دیہات میں بلکہ ممالک محروسہ کے باہر بھی اس کے اردو امتحانات کو مقبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے سالہائے ماسبق کی طرح سال گزشتہ بھی اردو دانی کا امتحان دو بار لیا گیا جن کے نتائج امید افزا رہے۔ اس امتحان میں ایک ہزار پچانوے (۱۰۹۵) بالغوں نے شرکت کی اور چھ سو اٹھتر (۶۷۸) کامیاب ہوئے۔ جن میں (۱۲۲) نے امتیاز حاصل کیا۔

دوسرے امتحانوں کے شرکا اور کامیاب امیدواروں کی تفصیل یہ ہے۔

اردو دانی	شریک ۳۰۶	غیر حاضر ۴۲	کامیاب ۲۶۰	فی صد ۹۸
اردو عالم	" ۱۵۶	" ۳۷	" ۵۱	" ۴۳
اردو فاضل	" ۴۵	" ۸	" ۳۳	" ۸۹
خوش نویسی	" ۸	" ۳	" ۱	" ۲۰

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ادارے کے امتحانات نہ صرف بلدہ حیدرآباد ہی میں مقبول ہیں بلکہ اضلاع اور دیہات میں بھی یہاں سے زیادہ مقبولیت حاصل کرچکے ہیں چنانچہ سال گزشتہ بلدہ کے تین مرکزوں یعنی مرکز نگور، مرکز اناث اور مرکز فوج کے علاوہ اضلاع میں حسب ذیل مقامات سے مرکز تھے۔

اندولہ، النہ، بشیرآباد، بلولی، بانسواڑہ، پرلی، پاکلی، کوڑنگل، جگتیال، گدوال، ناگرکرنول، نظام آباد، منجھلے گاؤں، دوم کنڈہ، مومن آباد۔

ریاست حیدرآباد کے ان مراکز کے علاوہ صوبہ بمبئی اور ریاست میسور میں ادارے کی یہ مہم قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی اور ان دونوں جگہ بھی گزشتہ سال مرکز قائم ہوئے۔ مرکز بمبئی سے ایک سو اڑتیس امیدواروں نے شرکت کی اور امتحان اردو عالم میں ایک خاتون فنیزہ خانم نے درجۂ اول میں کامیابی حاصل کی اور سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے کے صلہ میں تمغے کی مستحق قرار پائیں۔

اردو امتحانات کے ان اعداد و شمار کے سلسلہ میں آپ کی اطلاع کے لئے اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ امتحانات ایک مجلس کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے ہیں جو ملک کے ماہرین تعلیم اور اساتذہ اردو پر مشتمل ہے۔ انہی کی ہدایت اور مشورے کے مطابق ادارہ ادبیات اردو تعلیم بالغان کی مہم کو پیش نظر کے لئے مفید کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اردو دانی کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کے شوق مطالعہ کو برقرار رکھنے کے لئے موزوں کتابیں بھی ادارے کی جانب سے لکھوائی اور شائع کی گئی ہیں اور تدریجی طریقہ امتحان بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اضلاع میں تعلیم بالغان کی ترویج کے لئے ادارے کی طرف سے وقتاً فوقتاً ضرورت میں حسب ضرورت دورے بھی کئے جاتے ہیں اور مختلف مقامات پر تعلیم بالغان کے مدارس شبینہ کے قیام کی اسکیم بھی مرتب ہو چکی ہے اور جیسے ہی رقمی سہولتیں فراہم ہوں یہ تجاویز بھی روبہ عمل لائی جائیں گی۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ادارے کے ان اردو امتحانات میں ہر قوم و مذہب کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور انھیں یکساں طور پر ملک و بیرون ملک میں تمام اقوام و ملل میں مقبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ ان امتحانات کی فیس بھی بہت کم رکھی گئی ہے یہ اتنی قلیل یعنے ایک روپیہ، دو روپے اور پانچ روپے ہے کہ اس سے ان امتحانات کے پورے پورے اخراجات نہیں نکل سکتے اور ممتحنین جن میں تقریباً نصف بیرون ریاست کے ماہرین علم و ادب شامل ہوتے ہیں نہایت ہی ایثار کے ساتھ پرچہ جات سوالات کی ترتیب اور جانچ کی زحمت برداشت کرتے ہیں۔

اردو امتحانات میں اول آنے والے امیدواروں کے لئے ہر سال مختلف علم دوست اصحاب اور خود ادارے کی طرف سے تمغے عطا کئے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال اردو فاضل میں کوئی امید وار درجۂ اول میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس لئے سر فضیل جنگ مرحوم کا عطا کردہ طلائی تمغہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ نواب صاحب مرحوم اردو امتحانات کے خاص قدردان تھے اور انھوں نے پانچ سال قبل اپنے رقمی عطیے کے ذریعہ سے ایسا انتظام فرما دیا تھا کہ ہر سال اردو فاضل میں اول آنے والے کو یہ تمغہ ملتا رہے گا۔

میں ان تمام مخلص کارکنان بلدہ و اضلاع اور خاص کر عارف الدین حسن صاحب۔ کمانڈر احمد العیدروس بہادر۔ کیپٹن نذیر الاسلام خاں، محمد غوث صاحب (دوم کنندہ) شیخ لعل صاحب وکیل (ناگل) مولوی عبد الرزاق قریشی اور مولوی اسمٰعیل منعم صاحب (بمبئی) اور پروفیسر سروری صاحب (میسور) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ محض اردو دوستی کے لئے ادارے کے امتحانات کو کامیاب بنانے میں ہر طرح کی امداد فرماتے رہے۔

آپ صاحبوں اور خصوصاً حضرت نواب بسالت جاہ بہادر اور حضرت صاحبزادی صاحبہ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس جلسے کو زینت بخشی۔

ادارے کی نئی کتابیں

(۱) ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو از ڈاکٹر ایشورا ٹوپا صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔

ڈاکٹر ایشورا ٹوپا صاحب کی ایک کتاب "ہندوستانی تمدن" ادارے کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جو علمی حلقوں میں بیحد پسند کی گئی۔ ادارے کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسری کتاب "ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو" لکھ کر ایک اہم موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستانی قومیت کا مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے۔ موجودہ دور میں تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے اس بات کی بیحد ضرورت تھی کہ ہم اپنی سماج کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تاکہ ہندوستانی قومیت کے مسئلے کی گتھیاں سلجھ سکیں۔ ڈاکٹر ٹوپا صاحب نے اپنے عالمانہ اور ماہرانہ انداز میں اس مسئلہ کو واضح کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ سیاست اور تمدن کی بحثوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بیحد مفید ثابت ہوگا۔ صفحات (۵۲) قیمت ۸؍

(۲) عروض از مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل، منشی فاضل، اردو فاضل اردو امتحانات کے نصاب کے لئے مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب نے ادارے کی خواہش پر ایک کتاب "بلاغت" مرتب کی تھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ اب تک اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ عروض اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جس کے مطالعہ سے مبتدی اس فن پر بخوبی حاوی ہو سکتے ہیں۔ اس رسالہ کی ترتیب میں عربی فارسی اور اردو کی مستند کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

(صفحات (۵۶) قیمت ۱۰؍)

خطبۂ صدارت

حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر دام اقبالہٗ

جلسہ

حاضرین!

ہمارے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان سے ہم دونوں بہت متاثر ہوئے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ادارہ ادبیات اردو کا نصب العین قابلِ تحسین ہے اور اس کے پرجوش کارکن جو علم و فن کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مجھے یہ معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی کہ ادارہ اپنی عمر کے سولہ منازل اردو زبان و ادب کی خدمت میں نہایت کامیابی سے طے کر چکا ہے اور اپنے دیگر مقاصد کے ساتھ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں نمایاں خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہمارے ملک کی پست تعلیمی حالت کے مدِنظر یہ کام نہایت اہم اور مفید ہے اور دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے قابلِ تقلید یہ امر باعث مسرت ہے کہ ادارہ کا لائحۂ عمل نہایت وسیع نظر سے مرتب کیا گیا ہے اور ادارے کے امتحانات کو اندرون و بیرون ملک بڑی مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ہر قوم و ملت کے مرد و خواتین شریک امتحانات ہوتے ہیں نتائج نہایت امید افزا ثابت ہو رہے ہیں نیز سال گزشتہ مرکز بمبئی سے اردو عالم کے امتحان میں ایک خاتون نے شاندار کامیابی حاصل کی اور تمغہ کی مستحق قرار پائیں۔

ماہرین تعلیم اور اساتذہ اردو کی مشتمل مجلس کے زیر اہتمام ادارہ کے امتحانات کا انعقاد نہ صرف ایک صحیح طریق کار ہے بلکہ ادارہ کی افادیت، بہبودی اور دائرہ اثر کی روز افزوں ترقی کا ضامن ہے اور مجھے امید ہے کہ جو کتابیں تعلیم بالغان کی مہم کی پیش رفت کے لئے ادارہ کی جانب سے لکھی اور شائع کی گئی ہیں وہ طالب علموں میں ذوق مطالعہ کے علاوہ فرض شناسی۔ وقت کی پابندی۔ محنت ضابطہ تنظیم۔ استقلال۔ راست بازی۔ روشن خیالی۔ کشادہ دلی۔ ہمدردی اور سب سے زیادہ ملک و مالک کی محبت کو ترقی دیں گی۔

تعلیم بالغان کے ضمن میں شبینہ مدرسوں کا قیام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اضلاع کیا بلحاظ بلدہ و بیرونی مرکزی مقامات میں شبینہ مدارس قائم کئے جائیں اور ان کی تعداد میں مزید اضافہ کرنے کی پیہم کوشش جاری رکھی جائے۔ مجھے امید ہے کہ وقتی مشکلات سدِ راہ نہ ہوسکیں گی اور ملک کے باثروت و علم دوست اصحاب مالی اعانت و دستگیری میں دریغ نہ کریں گے۔ جہالت اور ناخواندگی کو دور کرنے کی مساعی بارآور ہوں گی۔

ادارہ جس نے امتحانات کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اور ممتحن جنھوں نے ایثار کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے ملک کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مجھے قوی توقع ہے کہ یہ ادارہ اپنے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی ان تھک کوششوں کی وجہ سے شاہراہ ترقی پر گامزن رہے گا اور ملک کی تعلیمی اور تمدنی ارتقا میں قابلِ قدر حصہ لے گا۔

یہ سب شاہ ذیجاہ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی کی دوراندیشانہ قیادت کے فیوض و برکات ہیں کہ سرزمین دکن علم و ادب کا گہوارہ بن گئی ہے اور یہاں نشاۃ ثانیہ کی زیبائی اور شان دیکھنے میں آرہی ہے۔ ملک کے نوجوان ملک کی عام اور ذہنی سطح بلند کرنے میں کوشاں ہیں اور علم و فن کی خدمت کے لئے کمربستہ اور انسانوں کے قلوب ایسی یگانگت کا مسکن ہیں کہ جس کے بغیر تحصیل علم و ترقی ناممکن ہے۔

میں دست بدعا ہوں کہ خدائے عزوجل شاہِ جم جاہ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور ذاتِ شاہانہ کی رہبری میں ملک ترقی کے مزید منازل طے کرے۔

روداد مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۱۹ خورداد ۱۳۵۵ف م ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء شام کے پانچ بجے عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر کے دولت کدہ "کوہان" پر منعقد ہوا جس سے قبل آنریبل موصوف نے ارکان مجلس کو اپنی جانب سے ایک عصرانہ پر مدعو فرمایا تھا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر صدر المہام فوج و صنعت و حرفت

" " معین نواز جنگ بہادر صدر المہام اصلاحات

" مولوی سید علی اکبر صاحب ناظم تعلیمات

" عبد المجید صاحب صدیقی صاحب

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد اعزازی ادارہ

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے بذریعہ تحریر اور آنریبل مولوی سید محمد اعظم صاحب نے بالمشافہ معتمد صاحب کو اطلاع دی کہ وہ دیگر مصروفیات کے باعث شریک اجلاس نہ ہو سکیں گے۔

گزشتہ اجلاس کی روداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

حسب ذیل امور پیش ہوئے اور طے پائے۔

(۱) عالیجناب نواب معین نواز جنگ بہادر کی صدر المہامی اصلاحات پر ترقی کے سلسلہ میں حسب ذیل قرارداد مسرت باتفاق آرا منظور کی گئی۔

"ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی اپنے ہر دلعزیز رکن عالیجناب آنریبل نواب معین نواز جنگ بہادر کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتی ہے کہ جناب کی اعلیٰ خدمات کی قدر کرتے ہوئے حضرت اقدس اعلیٰ نے بہ عطوفت شاہانہ معزز کونسل باب حکومت کی رکنیت پر آپ کا تقرر فرما کر عزت بخشی جس کی وجہ سے نہ صرف ادارۂ ہذا کے اعزاز میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی علمی و ادبی خدمت گزاری کے منصوبے اور زیادہ مستحکم ہو گئے۔

مجلس ہذا کو یقین ہے کہ عالی جناب اپنے اعلیٰ کردار اور ملک و مالک کی خدمات کی بنا پر اس سے زیادہ اعزاز و مناصب حاصل فرمائیں گے اور مجلس انتظامی کو اسی طرح کئی بار مبارکباد پیش کرنے کا موقع ملے گا۔"

(۲) مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کے کتب خانے کی خریدی کے بارے میں معتمد صاحب نے اطلاع دی کہ ہاشمی صاحب سے ان کے کتب خانے کے معائنے کے بارے میں وقت کا تعین نہ ہو سکا اس لئے یہ کارروائی آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کی گئی۔

(۳) عمارت ادارہ ہذا کے سلسلے میں معتمد نے گزشتہ اجلاس سے اب تک جو کارروائی اور مراسلت عمل میں آئی اس سے ارکان مجلس کو مطلع کیا۔ اور طے پایا کہ نواب زین یار جنگ بہادر سے مل کر طبیہ خانہ آصفیہ والے مکان کے بارے میں قطعی طور پر طے کر لیا جائے اسی سلسلہ میں یہ بھی طے پایا کہ اگر اس مقام کے ملنے میں دشواری ہو تو آرائش بلدہ کے محاذی جو زمین خالی ہے اس کے لئے یا آرائش بلدہ کے دفتر کے مقابل

رحمت علی سید صاحب کا جو مکان ہے اسکے حصول کے بارے میں نواب زین یار جنگ بہادر سے مشورہ کرکے ضروری کارروائی کی جائے۔

(۴) اردو امتحانات کی نیس انتظامی نے سال حال کے امتحانات کے لئے جو تاریخیں۔ آتا ۱۲ ار امرداد مطابق ۱۵ تا ۱۷ اجون مقرر کی ہیں ان کی توثیق کی گئی۔

(۵) طباعت اردو انسائیکلوپیڈیا کے سلسلہ میں جو سرکاری کارروائی ہو رہی ہے اس کے بارے میں غور ملتوی کیا گیا تاکہ آئندہ آنریبل مولوی سید محمد اعظم صاحب کی موجودگی میں اس کا تصفیہ ہو سکے۔

(۶) معتمد نے ارکان مجلس کو توجہ دلائی کہ بعض معتمدین کے دفاتر سرکار عالی محکمہ باب حکومت کے محاذی جو نئی عمارت بنی ہے اس میں منتقل ہو رہے ہیں اس لئے اگر کوئی خالی شدہ سرکاری عمارت ادارے کے لئے عارضی طور پر حاصل کی جائے تو سہولت کا باعث ہوگا۔ اس بارے میں جناب صدر اور آنریبل نواب معین نواز جنگ بہادر نے توجہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

مذکورۂ بالا تحریکات کے علاوہ بعض امور کے متعلق مناسب تصفیے کئے گئے۔

ادارہ کی مطبوعات

	صفحات	قیمت		صفحات	قیمت
(۱) سرگزشت حاتم	۱۲۸	عال	(۱۶) گریہ و تبسم	۱۹۲	عال
(۲) سرگزشت غالب	۹۴	۸ر	(۱۷) مشاہیر قند ہار و کن	۱۸۴	عہ
(۳) تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	ہے	(۱۸) من کی دنیا	۱۴۵	عہ
(۴) محبت کی چھاؤں	۱۳۲	عہ	(۱۹) مدراس میں اردو	۱۹۶	عہ
(۵) اقبال نمبر	۲۶۸	عہ	(۲۰) روح غالب	۱۴۰	عال
(۶) شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	عال	(۲۱) دفتری معلومات	۵۶	۶ر
(۷) مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	عال	(۲۲) سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۸ر
(۸) فن تقریر	۹۲	۱۲ر	(۲۳) میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	عال
(۹) مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۳	حہ	(۲۴) انوار	۱۶۸	عہ
(۱۰) تاریخ ادب اردو	۱۷۲	جہ	(۲۵) گارساں دتاسی	۱۲۰	عہ
(۱۱) شاد اقبال	۱۶۹	عال	(۲۶) بلاغت	۵۲	۸ر
(۱۲) نظام علی خاں	۳۰	عہ	(۲۷) ادارہ ۱۹۳۴ء میں	۲۰۰	۸ر
(۱۳) عرب اور عربستان	۵۶	۱۰ر	(۲۸) ناصر الدولہ	۲۴	۴ر
(۱۴) مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	حمہ	(۲۹) افضل الدولہ	۳۲	۴ر
(۱۵) " " دوم (۵۰) "	۱۷۵	عہ	(۳۰) نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۴ر

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ صفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۰۹۰
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

سب رس

جلد ۹ بابت مئی سنہ ۱۹۴۶ء شمارہ ۵

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے کے اہتمام سے محمودیہ مشین پریس میں چھپکر دفتر منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

شعر و نغمہ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

اب لطف و بیاں سب ختم ہوئے اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

یارب یہ مقامِ عشق ہے کیا گو دیدہ و دل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں آرام ہے اور آرام نہیں

کیوں مستِ شرابِ عیش و طرب تکلیفِ توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے آوازِ شکستِ جام نہیں

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

ہر جلوۂ تصویر پیشِ نظر ہر جنتِ نظارہ حاصل
پھر بھی ہے وہ کیا شے سینے میں ممکن ہی جسے آرام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
میکش یہی اب تک سمجھے تھے شائستۂ دورِ جام نہیں

عشق اور گوارا خود کر لے بے شرط شکستِ فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش تھی تنہا یہ نظر کا کام نہیں

اس حسن کا شکوہ کیا کیجے محدود ہے جس کی اک دنیا
اُس سعیٔ طلب کو کیا کہیے جو سعیٔ طلب ناکام نہیں

سب جس کو اسیری کہتے ہیں وہ تو ہے اسیری ہی لیکن
وہ کونسی آزادی ہے یہاں جو آپ خود اپنا دام نہیں

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگر میخانۂ فطرت میں لیکن
محروم نگاہِ ساقی ہے وہ رند جو دُرد آشام نہیں

مرسلہ اشفاق حسین صدیقی
(مراد آباد)

جگر مرادآبادی

ترقی پسند ادب

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ زندگی اور وہ بھی غلام اقوام کی زندگی ہمیشہ عبوری دور سے گزرتی نظر آتی ہے۔ لمحے ہر آن اور ہر دم ایک نئی کروٹ اور ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ ایسے نت نئے پہلو بدلنے والی زندگی کب قدامت کو خاطر میں لا سکتی۔ اسے ہر پرانی چیز سے عداوت ہو جاتی ہے۔ اس کے خیال میں رہا ہے یہ خیال غلط ہو یا درست۔ یہی قدامت غلامی کے بندھنوں کو مضبوط رکھتی ہے۔ اس لئے ایسی فضا میں رہنے والا انسان اور ایسے بندھنوں میں جکڑا ہوا انسان ہر وقت اور ہر لمحہ پرانی چیزوں کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر شئے کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھتا اور یہ سوال کرتا ہے کہ یہ چیز آزادی کی راہ میں ممد و معاون ہے یا مشکلات کا باعث بن رہی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اچھی چیزوں کو حیات نو بخشی جاتی ہیں اور بری چیزوں کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔ آج اردو ادب ایک نیا روپ اختیار کر رہا ہے۔ ترقی پسند ادیب مجسم انقلاب بن چکے ہیں۔

ترقی پسند ادب اور اس سے پہلے کے ادب میں مابہ الامتیاز چیز یہ ہے کہ ترقی پسند ادب میں طبقہ سوم یا پست ترین طبقے کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اس طبقے کی ناگفتہ بہ حالت کو پیش کر کے قوم کو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ یہ اس لئے بھی اہم ہے کہ دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ افلاس زدہ افراد پر مشتمل ہے اور یہ کیفیت بالخصوص ہندوستان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

آج کل دنیا کے بدلتے ہوئے حالات طبقۂ اعلیٰ کو انتہائی اہم مقام دیئے چلے جا رہے ہیں جن کی طرف ماضی میں طبقۂ اعلیٰ نے کسی قسم کی توجہ کرنا خلاف شان سمجھا۔ آج مزدوروں کی بین الاقوامی انجمنیں قائم ہیں اور ان میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اسی لئے ان کی آواز پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ موجودہ صنعتی دور یا مشینی دور میں مزدوروں کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے خود سرمایہ دار بھی ان پر رحم و کرم کی نظر رکھنا اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

جرمنی کا مشہور فلسفی شوپنہاور دنیا میں کمزوروں پر مظالم کو دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور ہوا تھا کہ قدرت اندھی ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ دنیا میں ظلم و استبداد اور ناکامی و حسرت و یاس کیوں غریبوں اور کمزوروں کے حصے میں آئے ہیں اور کیوں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ یا معاوضہ صحیح اصول پر نہیں دیا جاتا جس کی وجہ سے غریبوں کی غربت میں اور امیروں کی امارت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شوپنہاور کی آنکھوں نے ہر جگہ انصاف کا خون ہوتا ہوا دیکھا اور کمزور پر طاقتور کے مظالم کا مشاہدہ کیا۔ اسی وجہ سے دنیا کے حالات سے وہ مایوس سا ہو گیا اور قنوطیت اس کے دل و دماغ میں راہ پا گئی۔

لیکن جرمنی ہی کے ایک فلسفی حکیم نطشے کا خیال ہے کہ دنیا میں کمزوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اقتدار حاصل کریں۔ کشمکش برائے اقتدار کو وہ لازمۂ حیات سمجھتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ پستی ہمیشہ بلندی کی دشمن رہی ہے لیکن بلندی نے پستی کا ہمیشہ خیال رکھا اور اس کی اصلاح و ہمدردی میں کوشاں رہی ہے۔

دنیا میں دولت مند طبقہ مختصر رہا ہے لیکن اس کا وجود بہرحال ہر زمانے میں رہا اور اس کا رہنا ضروری بھی ہے۔ سماج میں فرق مراتب ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ اگر سماج میں تمام افراد کو غذا فراہم کرنے کے انتظامات

بھی میسر ہو جاتیں تو پھر بھی فرقِ مراتب نظامِ زندگی کو چلانے کے لئے بیحد ضروری ہے۔

قوموں کی قیادت کے لیے طبقۂ اعلیٰ ہی سے بہترین افراد اٹھتے ہیں اور قیادت کی باگ دراصل ان ہی کے ہاتھوں میں ہونی بھی چاہیے جو بہترین دماغ رکھتے ہوں پست طبقے کے افراد سے ایسی توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ اگر کبھی قوموں کی قیادت طبقۂ اسفل کے افراد میں سے کسی نے کی بھی ہے تو اسی صورت میں جبکہ اس میں طبقۂ اعلیٰ کی بہترین خصوصیات پیدا ہوئیں۔ یعنی ایسی ذہنی صلاحیت پاکیزہ اخلاق، جرأت و ہمت، وسعتِ نظر وغیرہ۔

قوم کے افراد بھیڑ بکریاں ہیں۔ ان کی نگہبانی کرنے کے لئے ایک نگہبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم میں لیڈر کا ہونا بہرحال ضروری ہے جس کے حکم کے آگے سب بلا امتیاز سرِ تسلیم خم کردیں۔

افلاطون نے طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ اسفل کے لئے ایک بڑی اچھی مثال دی ہے۔ وہ انھیں انسانی جسم کے اعضاء سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم میں سر بلند مقام پر ہوتا ہے اور پیر نیچے ہی ہوتے ہیں۔ سر کا بلند مقام پر ہونا ضروری ہے اور پیر نیچے ہی رہیں تو اپنا فرض بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ دماغ کو اس لئے بلند مقام پر رکھا گیا ہے کہ وہ انسان کی بہت اہم خدمت انجام دیتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہمیں پیر کی اہمیت سے انکار ہے: ہمیں پیر کی پرواہ نہیں ہے۔ ہم انھیں بھی اپنی بقا کے لئے ایسا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسے کہ دماغ کو لیکن ہمارا کہنا صرف اس قدر ہے کہ سر اپنے مقام پر اور پیر اپنے مقام ہی پر رہیں تو زندگی کی یہ گاڑی بخیر و خوبی چل سکتی ہے ورنہ سارا نظامِ زندگی درہم و برہم ہو جائے گا۔

ترقی پسند ادیب اپنے مخالفوں سے مزدوروں کی نمائندگی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقین رکھئے کہ پاؤں کبھی سر بننا نہیں چاہتے لیکن ان کی حفاظت آپ کا ہمارا اور سب کا فرض ہے۔ اگر انھیں یوں ہی برہنہ چھوڑ دیا جائے گا اور محض یہ سمجھ کر کہ ان کا کام ہی چلنا ہے تو پھر یہ گرد آلود ہو جائیں گے اس پر بھی چشم پوشی کی جائے گی تو ان میں آبلے پڑ جائیں گے اور نتیجۃً آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیں گے۔ اور اس سے آپ ہی کی رفتارِ ترقی میں خلل واقع ہوگا۔ اس لئے پیر کی حفاظت کیجئے تاکہ آپ اپنی تیز رفتاری سے میدانِ عمل میں گامزن ہوں۔ پاؤں کو توڑیے نہیں کیونکہ انھیں توڑ کر آپ اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے۔

ترقی پسند ادب کے متعلق ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد عریانیت پر رکھی گئی ہے۔ اس کے متعلق یہ عرض کرنا بہت کافی ہے کہ سماج کے جس طبقے کو اس ادب میں پیش کیا جا رہا ہے وہ خود اخلاق کی حدیں توڑ چکا ہے۔ اس لئے اگر جدید ادب کے اس حصے میں عریانیت آجائے تو ناک بھوں چڑھانا کوئی اچھی بات نہیں جب اس طبقے کی اصلاح ہو جائے گی تو ادب بھی اصلاح پا جائے گا۔

ترقی پسند ادب کے حامی یہ کہتے ہیں کہ وہ اس ادب کے ذریعے انسانوں کی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ ایسے انسانوں کی جن کی تعداد سوسائٹی میں عموماً بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہ کہ ادب کو انسانوں سے متعلق رہنا چاہیے، انسانوں سے ہٹ کر جس چیز کو پیش کیا جائے گا، وہ نظرانداز کرنے کے قابل ہے۔ لیکن ان کے اس خیال کی تردید میں یہ حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ ادب کو اس طرح محدود موضوع کا پابند نہ بنائیے ادب عالمگیر ہوتا ہے۔ اس میں ساری کائنات کو سمو دیا جاسکتا ہے۔ اور سمو دیا جانا چاہیے۔ اور اس میں انسانوں کی زندگی ضرور پیش کی جاسکتی ہے لیکن انسان کا تعلق صرف انسانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ چونکہ وہ صاحبِ عقل اور تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے اس لئے وہ ساری دنیا سے اپنے آپ کو متعلق پاتا ہے۔ فطرت کے حسین مناظر اس کے دل پر اثرانداز ہوتے رہیں۔ کبھی کبھی قوانینِ قدرت اس کی مزاحمت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مختلف موسم اس کی طبیعت پر مختلف

اثرات پیدا کرتے ہیں۔ جذبۂ انسانی، جستجو کی بے نیازیاں، جذبات رنج و مسرت اور فطری مناظر سے متاثر ہونے کی صلاحیت سے اس کا دل کبھی مسرور اور کبھی مغموم ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جذبۂ محبت جو انسان، حیوان، نباتات، جمادات الغرض کائنات کی بے شمار چیزوں سے انس کی وجہ سے حرکت میں آتا ہے اس کے دل و دماغ کے ساکن سمندر میں احساس و تخیل کی لہریں پیدا کرتا ہے جن کے اظہار پر وہ اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اسی لئے ہماری شاعری بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں قدرتی مناظر کے پرستار، موسم بہار کے مدح، برسات کی برکتوں کو بیان کرنے والے، حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے والے اپنے بیش بہا تاثرات کو پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تمام جذبات ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں جو امتداد زمانہ سے یا دوسری وجوہ سے کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔

اس کے برخلاف ایسے موضوعات کو شاعری کا واحد موضوع بنانا جو وقتی اور ہنگامی ہیں جن کی اہمیت عارضی ہے جیسے مزدوروں کی مشکلات اور ان کے مصائب یا کسانوں کی ناگفتہ بہ حالت یا ملک میں جہالت کا دور دورہ جو بالکل ہنگامی ہیں اور جنھیں تھوڑے سے عرصے کی کشمکش اور جد و جہد کے بعد دور کیا جا سکتا ہے ادب جیسی بلند مرتبہ اور اعلیٰ ترین شے کے شایان شان نہیں۔ ادب میں لافانی احساسات و جذبات اور تاثرات کو بیان کیا جاتا ہے ادب کا موضوع محدود نہیں ہوتا۔ وہ کسی ایک سماج کی ترجمانی نہیں کرتا۔ وہ کسی ملک کے ایک خاص طبقے کی نمائندگی نہیں کرتا۔ وہ سب کے لئے ہوتا ہے۔ وہ ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ ادب مذہب و ملت، رنگ و نسل کی تفریق سے بھی زیادہ بلند مقام پر ہوتا ہے۔ بہترین ادب چاہے وہ کسی زبان میں ہو اور کسی قوم کا ملک ہو، کبھی اس زبان اور اس ملک یا قوم کی میراث ہو کر نہیں رہتا بلکہ وہ سورج کی طرح بلند ترین مقام پر پہونچ کر اپنی شعاعوں سے دنیا کے چپہ چپہ کے انسانوں کے دماغوں اور دلوں کی تاریکی کو دور کرتا ہے۔ ایسے ہی ادب کو اعلیٰ ترین ادب کہا جا سکتا ہے۔ اور ایسے ہی ادب کے پیدا کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جا سکتی ہے۔ موسموں کے تغیرات، انسانی طبائع کے تغیرات، عمر کی زیادتی یا کمی ان میں سے کوئی چیز بھی ایسے ادب کی ضرورت اور عظمت و اثر کو کم نہیں کر سکتی۔

ترقی پسند ادیب سرمایہ داروں کے دشمن ہیں۔ ان سے دولت چھین کر یہ طبقۂ اسفل میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں لیکن سوسائٹی کو سرمایہ داروں کی ضرورت ہے۔ طبقۂ اسفل کی اصلاح بہت نیک مقصد ہے۔ ان کے معیار زندگی کو واقعی بلند کرنا چاہئے۔ ان میں زندگی کا احساس اور سوسائٹی میں ان کی اہمیت کا صحیح احساس پیدا کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس کے بجائے اگر ہم بلندی پر رہنے والے چند افراد کو پستی کی طرف کھینچ لائیں تو اسے کسی طرح ترقی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں تو پستی کو بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر بلندی کو بھی پستی کے برابر کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانیت ہزاروں سال کی جد و جہد کے بعد جس مقام تک پہنچ چکی ہے وہاں سے اسے پیچھے کی طرف چلنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ ترقی معکوس کسی قوم کے لئے بھی فال نیک نہیں۔ آگے بڑھنے میں زندگی ہے اور پیچھے ہٹنے میں موت۔ مہذب اقوام نے محنت شاقہ سے اپنی ایک تہذیب اور اپنا ایک تمدن پیدا کیا ہے۔ کیا انھیں پھر اسی دور جاہلیت کی طرف لے جایا جائے گا جب انسان پہاڑوں اور درختوں کی کھوہ میں بسر کیا کرتا تھا۔ فرش خاک پر بے تکلف ہو جاتا تھا۔ ضروریات زندگی انتہا درجے محدود تھیں۔ مختصر یہ کہ تہذیب کا مفہوم ہی متعین نہیں ہوا تھا۔ وہ دن انسانیت کی تاریخ میں المیہ ہوگا جب انسانیت کو اس کے ارفع و اعلیٰ مقام سے اس بری طرح گرانے کی کوشش کی جائے گی۔ ترقی پسند ادیبوں کو جان لینا چاہیے کہ انہیں انسانیت کے شیرازے کو بکھیرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کا فرض تو یہ ہونا چاہیے کہ بعض خود غرض افراد کی جن کوتاہیوں اور لغزشوں کی وجہ سے انسانیت کا شیرازہ منتشر

ہوتا نظر آرہا ہے۔ ان کی طرف اپنے زورِ قلم سے سارے انسانوں کو متوجہ کریں اور ان کے دل میں احساس کی آگ مشتعل کر دیں تاکہ انسانیت اپنے بلند ترین نصب العین کو پالے اور مستقبل کی دنیا خطرات سے جہاں تک ہو سکے محفوظ سے محفوظ تر ہوتی چلی جائے۔

اسی سلسلے میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک اور کوشش کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ان ادیبوں کا خیال ہے کہ تحریر میں جہاں تک ہو سکے سادگی پیدا کی جائے" تاکہ ان کے مضامین ہر شخص پڑھے اور سمجھے۔ چنانچہ اسی تحریک کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں یوں اظہار خیال فرمایا ہے۔

"اسی لئے جہاں سادہ لکھنے کی چیخ پکار ہے وہاں اپنے ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کے پھیلانے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے۔ جو پڑھے ناخواندہ طبقہ ذرا اوپر اٹھے گا اور کچھ ہمارے ادیب اور مصنف ذرا نیچے جھکیں گے۔ اس طرح دونوں کے درمیان تفاوت کم رہ جائے گا اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھنے لگیں گے۔"

ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کے پھیلانے کے خیال کی پر زور تائید کی جا سکتی ہے۔ اور یہ ہر اس شخص کا فرض اولین ہے جسے اپنے ملک کی ترقی کا خیال لگا رہتا ہے۔ لیکن ناخواندہ طبقے کی خاطر ادیبوں اور مصنفوں سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے بلند مقام سے "ذرا نیچے" اتر آئیں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ کیونکہ بلند پایہ ادیبوں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ مقام سے عوام کی خاطر پست سطح پر آ جائیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عوام کی ذہنی سطح پست ہوتی ہے اور وہ ان ادیبوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انھیں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ملک میں تعلیم کے عام ہونے اور جہالت کی تاریکی کے دور ہونے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ ہر شخص میں اعلیٰ ادبی ذوق پیدا ہو چکا ہے اور ہر شخص اعلیٰ پایہ کا ادب پڑھتا، سمجھتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کیا انگلستان میں تعلیم کے عام ہونے کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ وہاں کا ہر شخص شکسپیر، ملٹن، ورڈسورتھ اور دوسرے بڑے شعراء کے کلام کو پڑھتا، سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہمیں عوام سے اس قسم کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ فکر معاش سے بے نیاز اور کام سے بے پرواہ ہو کر اعلیٰ ادب کا مطالعہ کریں۔ عوام کے لئے لائٹ لٹریچر (Light Literature) کی ضرورت ہے اور اس کی فراہمی کے لئے اعلیٰ ادیبوں کو اپنے بلند مقام سے اترنے کی ضرورت نہیں بلکہ دوسرے سینکڑوں ادیب ایسے ہیں جو عوام کے مذاق اور ان کی پست ذہنی سطح کا لحاظ کرتے ان کی تفریح طبع کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کی تعداد عوام ہی کی طرح حشرات الارض کی مانند ہے۔ یہ درجہ سوم کے ادیب ہیں جن کی تحریر میں سطحی پن یا عامیانہ پن ہوا کرتا ہے۔ جس کے مطالعے کے لئے عوام کو اپنے دماغ پر زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یورپ میں ہر سال ایسی ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں جن کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ جو فوجی سپاہیوں اور عام لوگوں کی تفریح طبع کی خاطر لکھی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ ادب کبھی عوام کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

"There is no such thing as literature for the masses".

ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے قدیم ادب کے متعلق کبھی کبھی اس خیال کا اظہار ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ادیب مجبور تھے کہ جاگیردارانہ نظام اور شاہی کے خلاف کچھ نہ لکھیں۔ کیونکہ دربار کا اثر ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے خیالات کی طرح ان کا یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے ادیبوں

میں سیاسی شعور بیدار نہ ہوا تھا۔ اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے اصلی فرائض کیا ہیں۔ اسی لئے انھوں نے کبھی اپنے ماحول سے تنگ آ کر صدائے انقلاب بلند نہیں کی۔ ورنہ اگر سیاسی شعور ہو، فرض کا احساس ہو اور قومی عزت و وقار کو بلند کرنے کی دھن ہو تو بقول اقبال ع

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

کے اصول پر عمل کرنے کا خیال دامن گیر ہوتا ہے۔ کیا آج کے ادیبوں پر پابندیاں عاید نہیں ہیں اور کیا آج بیرونی حکومت ان کے دل و دماغ پر بھی حکمرانی نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال اور جوش اور دوسرے شعرا نے ایسی چیزوں کو بیان کیا جن میں پابندیوں اور بندشوں کے اس دور میں کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود اقبال اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے لہ: ع

سخنے نہ گفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

سچ تو یہ ہے کہ جو الزام قدیم ادیبوں پر لگایا جاتا ہے وہ زیادہ صحیح طور پر موجودہ ادیبوں پر صادق آتا ہے۔ آج ترقی پسند ادیب اپنے دور کے ادیبوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ ادب کو پروپگنڈے کے روپ میں پیش کیا جائے۔ سرخ پرچم کے اونچا ہونے کی دعا کی جائے۔ عوام کی زندگی اگر وہ بھی ایسی زندگی پیش کی جائے جو ہر لحاظ سے نظر انداز کرنے کے قابل ہے جو ادیب ان کے اس "عظیم مقصد" کا ساتھ نہیں دیتا اسے رجعت پسند، قدامت پسند اور مختلف دوسرے نازیبا اور ناشائستہ القاب کے ساتھ یاد کر کے دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان ادیبوں کے سر میں عجیب سودا سمایا ہے۔ وہ ادب میں عوام کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور اسی کوشش میں ان کی تحریروں میں عامیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یقیناً ادب میں زندگی کو پیش کر رہے ہیں لیکن ایسی زندگی کو جسے دیکھ کر زندگی ہی سے جی بیزار ہو جائے۔ وہ حقیقت نگار ضرور ہیں لیکن ان کی حقیقت نگاری اخلاق و مذہب کی سرحدیں پار کر چکی ہے۔ اور عریاں نگاری کے روپ میں نظر آ رہی ہے۔

اگر کوئی شخص جدید ادب پڑھنے سے پیشتر جدید ادیبوں کی ان تنقیدوں کو پڑھے جو جدید ادب پر کی گئی ہیں تو اسے یقین ہوتا ہے کہ جدید ادب واقعی بہت اعلیٰ پائے کی چیز ہوگی لیکن اس ادب کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جس ادب کے متعلق ایسی اعلیٰ پائے کی تنقیدیں لکھی گئی ہیں وہ خود کوئی اعلیٰ پایہ کی چیز نہیں۔ گویا اس لحاظ سے یہ تنقیدیں گمراہ کن ہیں۔ لیکن اگر جدید ادب کم از کم اس سطح پر آ جائے جس پر یہ تنقیدیں نظر آتی ہیں تو یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

ہماری یہ خواہش ہے کہ جدید ادب کو کم از کم اس سطح پر آنا چاہیے جس پر اس کی تنقیدیں آ چکی ہیں۔ اگر یہ ہو جائے تو جدید ادب واقعی قابل قدر چیز ہوگی۔ ورنہ میرے نزدیک موجودہ حالت میں اس کی ہمت افزائی کرنا ادبی گناہ سے کم نہیں۔

محمد منظور احمد

صحرائی درندے

(ایک تصویر)

یہ صحرائی کہ ہے شہروں میں رسوا جن کی خونخواری
نہ یہ بنیے، نہ یہ پنڈت، نہ یہ ملا، نہ یہ صوفی
نہ دامِ مسجد و ہیکل، نہ فتراکِ کلیسائی
کسی مسجد میں یہ جھوٹی حدیثیں گڑھ نہیں سکتے
نہ یہ افغان، نہ یہ سید، نہ شیخ و گبر و نصرانی
نہ عصمت کی کوئی منڈی، نہ دلالوں کے پھیرے ہیں
نہ سجدوں کے نشانوں سے کوئی مغرور پیشانی
نہ ہونٹوں پر ہنسی جھوٹی، نہ زہر آلودہ دلداری
نہ سکوں کی تلاوت ہے، نہ کفر و دین کی ذلت
شمار ان کا نہیں "زر" کے تراشیدہ کمینوں میں
کلاہِ "یارجنگی" ہے نہ کفشِ "آسماں جاہی"
ضمیر و قلب کو "سونے" کی لَو پگھلا نہیں سکتی
کسی ملبوس کی زینت سے نظر دھوکا نہیں کھاتی

نہ ان کا کفر نیلامی، نہ ان کا دین بازاری
نہ یہ "نازی" نہ یہ "تازی"، نہ یہ مصری نہ یہ کوفی
نہ تسبیحوں کے پھندے ہیں، نہ زناروں کی گہرائی
کسی منبر کے اوپر یہ درندے چڑھ نہیں سکتے
نہ سینہ ہے کوئی کالا، نہ ماتھا کوئی نورانی
نہ صبحِ ذکر و قوالی، نہ چکلوں کے اندھیرے ہیں
نہ ماتھوں پر کسی کے خون سے قشقوں میں تابانی
نہ اخلاقوں کی عیاری، نہ اداؤں کی پرکاری
نہ یہ چاندی کے پیغمبر، نہ یہ جاگیر کی امت
نہ صبحیں ان کے ہونٹوں پر، نہ راتیں ان کے سینوں میں
نہ زنجیروں کی تاریکی، نہ قندیلِ شہنشاہی
ہوائے بام و در دشت و جبل تک آ نہیں سکتی
گلاب و عطر کی بدبو کہیں پائی نہیں جاتی

یہ حیواں جن کا تاج و تخت سے کوئی نہیں ناتا
انھیں خود اپنی نسلوں کو نگل جانا نہیں آتا

شورؔ

وجہی اور ابن نشاطی کے اسالیب کا موازنہ

زیر نظر مضمون میں ہم وجہی اور ابن نشاطی کے اسلوب بیان اور زبان کا مطالعہ صرف صنف مثنوی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کر رہے ہیں۔ ان کے نثری کارناموں اور دیگر اصناف سخن سے فی الحال ہمیں بحث نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ولی اورنگ آبادی سے قبل دکنی زبان میں اگر کسی صنف سخن کو معراج کمال پر پہنچنے کا موقع ملا تو وہ صنف مثنوی ہے۔ اردو ادب کا سرمایہ عرصہ دراز تک غزل ہی رہا ہے اور وہ بھی دیگر اصناف سخن کی طرح صنف سخن فارسی ہے۔ غزل کی اردو میں ترقی اور عروج کی غالباً ایک بڑی وجہ اس کی رمزیت ہے اور جس طرح مشرقی شعرا کا معشوق پردہ کی رسم و رواج کی وجہ سے "حجاب اندر حجاب" بنا رہا اسی طرح شاعر کا ہر جذبہ و خیال رمزیت کا پیرایہ اختیار کرتا گیا۔ غزل کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے (واضح ہو کر میں صنف غزل کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں) کہ وہ شاعر کے محض اندرون کی آئینہ داری کرتی ہے اور اس بیرونی دنیا ([illegible]) کا ہمیں اس میں کوئی نقش نہیں ملتا جس میں خود شاعر اٹھتا بیٹھتا، غور و فکر کرتا اور ہر جذبہ و خیال کا ادراک کرتا ہے۔ غزل کے برخلاف مثنوی میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں شاعر کا اندرون اور بیرون یا اس کے داخلی اور خارجی دونوں عناصر بار پا سکتے ہیں۔ اور پھر جہاں تک مثنوی کی ٹکنیک کا تعلق ہے وہ ردیف و قافیہ کے تسلسل سے بھی آزاد ہے۔ ہر شعر کا قافیہ اور ردیف دوسرے شعر سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ صنف مثنوی اپنے اندرون کے اعتبار سے بھی کچھ اتنی وسعت گیر واقع ہوئی ہے کہ اس میں تمام اصناف سخن کی خصوصیات سما سکتی ہیں۔ غزل کا سوز و گداز، قصیدے کی تشبیب کا چمن، ڈرامے کی کردار نگاری، نیچرل شاعری کی مرقع نگاری، غرض ہر خیال اور ہر جذبہ جو شاعر کے سینہ میں موجزن ہو اس میں بآسانی ظاہر ہو سکتا ہے۔ غالباً یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے مثنوی کی صنف کو دکن میں بہت جلد ترقی حاصل ہوئی۔ دکن کے مشہور مثنوی نگاروں میں نصرتی، غواصی، وجہی، ابن نشاطی، رستمی، غلام علی وغیرہ کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ دکنی مثنویات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے موضوع اور پلاٹ کے اعتبار سے اوریجنل ہیں اور دوسرے وہ جو فارسی یا ہندی مثنویات کا ترجمہ ہیں۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر مثنویوں "قطب مشتری" اور "پھولبن" میں اول الذکر اوریجنل اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کی داستان حسن و عشق پر مبنی ہے۔ اور موخر الذکر فارسی مثنوی "بساتین" سے ماخوذ بلکہ بڑی حد تک اس کا ترجمہ ہے۔

جہاں تک ان دونوں مثنویوں کے اسلوب اظہار کا تعلق ہے ہم اک ذرا ان مثنویوں کے لکھنے والوں یعنے ابن نشاطی اور وجہی ہی سے کچھ سن لیں۔ ابن نشاطی "پھولبن" میں لکھتا ہے۔

اسے انشا پو میرا میل دائم
طبیعت کو مری ہے حظ ملائم

جس سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کو اپنی شاعری سے زیادہ نثر نگاری یا "انشا پردازی" پر ناز تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں مثنوی "پھولبن" آمد نہیں بلکہ آورد کا نتیجہ ہے۔ ابن نشاطی نے اپنے اندرونی جوہر کو پیش نظر رکھے بغیر محض اپنی طبیعت پر زور دے کر "پھولبن" لکھی ہے۔ اس کے برخلاف وجہی اپنی مخصوص شاعرانہ تعلّی کے لہجے میں اپنے آپ کو ایک بڑا شاعر بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے "قطب مشتری" میں جو

وہ باتیں لکھی ہیں کہ لاکھ برس تک بھی انسان اس کو سمجھ نہیں پائے گا ؎

جو لک برس کوئی سر پیوے رنج کوں | پناوے کدہیں اس چھپے گنج کوں
ہوا جیو جب شعر یو بولنے | تو نے لگیا غیب کے کھولنے
اگر غوطے لک برس غواص کھائے | تو یک گوہر اس دھات امولک نپائے
یو موتی نہیں وو جو غواص پائیں | یو موتی نہیں وہ جو کس ہات آئیں

پھر کہتا ہے کہ میرے اشعار کو سن کر لوگوں کا دل اس طرح پگھلنے لگتا ہے جس طرح مصری پانی میں پگھلتی ہے ؎

ترا شعر سن دل پگلتا ہے یوں | کہ پانی تے ابلوج (مصری) گھلتا ہے جیوں

وجہی کی یہ تعلّی کوئی مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ درحقیقت خودداری اور انفرادیت کے احساس پر دال ہے "قطب مشتری" کسی فارسی یا ہندی مثنوی کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ یہ محض وجہی کے ذوق اور اندرونی خواہش کی پیداوار ہے۔ بلاشبہ وجہی کی یہ مثنوی اپنے بلند شاعرانہ اور فلسفیانہ موضوعات اور نکات کے اعتبار سے اردو ادب کا بہت بڑا شاہکار ہے جس تک "پھولبن" کسی طرح لگا نہیں کھا سکتی۔ لیکن جہاں تک شعر کے ظاہری محاسن کا تعلق ہے ہم "پھولبن" کی شاندار خوبیوں کو "قطب مشتری" کے مقابلہ میں کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ابن نشاطی نے ایک بڑا مفکر نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسی شعریت پائی تھی کہ ہمیں اس کے شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں (گو وہ شعریت کے اعتبار سے بھی وجہی کی ٹکر کا شاعر نہیں ہے) ابن نشاطی نے کچھ ایسا انداز بیان پایا تھا کہ بسا اوقات ہمیں اس کی آورد پر بھی آمد کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ بلکہ ہر مقام پر وہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے جو وجہی سے کسی طرح کم درجہ نہیں۔ اور پھر زبان بھی اس کو ایک ایسے دور کی زبان ملی تھی جو وجہی سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سلاست اور صفائی و سادگی جو ابن نشاطی کے دور کی خصوصیات ہیں وجہی کی "قطب مشتری" میں نہیں ملتیں۔

جدت اور اپج | جیسا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں بیان کیا ہے مثنوی "پھولبن" فارسی مثنوی "بساتین" سے ماخوذ اور اسی کا ترجمہ ہے۔ لیکن ایک ذرا سی جدت ابن نشاطی نے اس میں یہ دکھائی ہے کہ "مناجات" کا حصہ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ یوں تو اور بھی ایسے مقامات ہیں جہاں کہیں کہیں ابن نشاطی کے انفرادی رنگ کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ خصوصاً مذہبی موضوعات پر جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو اس کا اندرونی سوز و گداز اور مذہبی جوش و خروش ظاہر ہونے لگتا ہے۔ لیکن "مناجات" اس مثنوی کا ایسا حصہ ہے جس میں ابن نشاطی کی ذاتی جدت و اختراع پوری شان کے ساتھ ہویدا ہے۔ لیکن اگر "پھولبن" کے اس حصہ کو نظرانداز کرکے جب ہم "قطب مشتری" سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں کوئی بات سوائے ایک دو مثالوں کے نئی نظر نہیں آتی۔ "قطب مشتری" یوں بھی پلاٹ اور موضوع کے اعتبار سے اوریجنل ہے۔ لیکن جو خیالات و جذبات وجہی نے اس میں ظاہر کئے ہیں وہ ماخوذ یا ترجمہ نہیں اس کی ذاتی اور انفرادی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ کہیں تو وہ شاعری کے بلند موضوعات، اس کے اندرون اور اس کی اسپرٹ پر تنقید کرتا ہے تو کہیں حسن کی حقیقت و ماہیت کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ مثلاً شاعری کی سب سے بڑی خوبی وجہی کے نزدیک اس کا "تاثر" ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بغیر تاثر کے شاعری محض بیکار ہے۔ پھر وہ بیان کرتا ہے کہ شاعری کی عبارت بہت سادہ ہو اور الفاظ اس طرح استعمال کئے جائیں کہ عبارت کا مطلب بآسانی سمجھ میں آ سکے۔ لیکن یہی الفاظ پراثر بھی ہوں۔

پھر وہ حسن کی تعریف یوں بیان کرتا ہے کہ حسن معشوق یا کسی شئے کے اعضا و اجزا میں نہیں ہوتا بلکہ خود دیکھنے والے کی چشم بینش میں اس کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ حسن کا تعلق رنگ و بو سے نہیں، بلکہ وہ ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

نہ یک جنس لک جنس محبوب ہے — جو بھاوے اپس کوں وہی خوب ہے
جو عاشق لبدتا ہے دیک آس تے — وہ کچھ خارج ہے رنگ اور باس تے

ایک اور مقام پر وجہی نے عشق کی اہمیت سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا سوز ابدی ہے کہ اس کی حقیقت اور کنہ آج تک انسان کو معلوم نہ ہو سکی۔

ع "یو کیا بھید ہے کوئی کہتا نہیں"

اور پھر وہ اس حقیقت نامعلوم کو مانتے ہوئے اس کی تاثیر کے متعلق کہتا ہے کہ "جذبات، 'عقلیت' سے بڑھ کر قوت رکھتے ہیں۔

ع "کہ آدم پہ غالب ہے دل کیا سبب؟"

اس قسم کے بیسیوں اور مجمل موضوعات "قطب مشتری" کی جان ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ "پھول بن" اس طرح کے عمیق اور اور مجمل موضوعات سے خالی نظر آتی ہے۔

معاشرت کے عناصر

شاید ہی کوئی ایسا مقام ہوگا جہاں وجہی نے 'قطب مشتری' کے افسانوی پردہ میں اپنے دور کی معاشرت پر تنقید نہ کی ہو۔ محمد قلی قطب شاہ کو اس داستان کا ہیرو بنا کر وجہی نے دکن کے تمام سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی اقدار و معیار پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ایک تہذیب یافتہ طبقے کے خیالات کو قلم بند کیا ہے۔ 'پھول بن' میں یہ (Local Elements) مشکل ہی سے کہیں پائے جاتے ہیں۔ شاید ہی ایک دو مثالیں ہم ایسی پیش کر سکیں جن میں ابن نشاطی نے اپنے دور کی زندگی کو سمویا ہو۔ اور عام سیاسی معاشرتی رجحانات پر روشنی ڈالی ہو۔ مثلاً ابن نشاطی جہاں سمن کے پرے کے محل کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس کی دیواروں پر قطب شاہی بزم کی تصویریں بھی دکھاتا ہے۔ اسی طرح سمن پر گئے کردار کے پیچھے ہمیں ابن نشاطی کے دور کی حسین دوشیزائیں نظر آنے لگتی ہیں۔ ان ایک دو مثالوں کے قطع نظر ہمیں مشکل سے 'پھول بن' میں دکن کی خارجی زندگی کے حقائق ملیں گے۔ اس کے برخلاف وجہی نے ایک ناقد اور مفکر شاعر کی حیثیت سے اپنے دور کی زندگی پر جگہ جگہ تنقید کی ہے۔

محاکات اور کردار نگاری

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن نشاطی نے افسانے کے مختلف کرداروں کے ربط و تعلق اور ان کے موقع و محل کو خوب سمجھا ہے اور ان میں وہ تمام خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو ایک ڈرامے کے کردار میں موجود ہونی چاہئیں۔ لیکن پھر بھی 'قطب مشتری' اس خصوص میں 'پھول بن' سے بہت آگے نکل جاتی ہے۔ اس کے کردار زندہ انسان اور چلتی پھرتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہر کردار اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ ان کے ہر موقع و محل کی گفتگو اور حرکات و سکنات بالکل فطری معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کرداروں پر ہمیں ایک اداکار کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ تصنع یا تکلف یا آورد قطب مشتری کے کسی کردار میں ہمیں نہیں دکھائی دیتی۔ برخلاف اس کے پھول بن میں کہیں کہیں تصنع اور تکلف کا شائبہ پایا جاتا ہے۔

اور پھر جب ہم محاکات پر غور کرتے ہیں تو "قطب مشتری" ایک لاجواب مثنوی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ اردو ادب عہد طفولیت سے گزر رہا ہو، وجہی کا ایک ایسا اور مکمل شاہکار پیش کرنا معجزہ سے کم نہیں۔ خصوصاً محاکات کا تو وجہی باوا آدم معلوم ہوتا ہے۔ اگر ذرا میر حسن کے باغ کے سین اور وجہی کے باغ کے سین دونوں کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو باوجود زبان کی ابتدائی کوتاہیوں کے ہم وجہی کو کسی طرح میر حسن سے پیچھے نہیں دیکھتے بلکہ بعض اعتبارات سے وہ ان سے بھی بہت آگے نکل گیا ہے۔

تشبیہ و استعارہ

اگر زبان کے ایک تھوڑے سے تغیر کے ساتھ وجہی کی تشبیہات و استعارات پیش کی جائیں تو ہمیں ان کے جدید ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔ ایسی جدت اور انوکھا پن ان تشبیہات میں پایا جاتا ہے کہ وجہی کے دور کا خیال کرتے ہوئے ہمیں تعجب ہے کہ یہ جدید رنگ کیسے ان میں چلا آیا۔ مثال کے طور پر وجہی نے باغ کے سین میں جو نازک تشبیہات باندھی ہیں ان کے چند نمونے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) اچھیں نین اس کیس کالے منے — کہ مچھلیاں دو سنپڑیاں ہیں جالے منے

یعنی زلفیں چہرے پر بکھر گئی ہیں تو ان کالے بالوں میں دو آنکھیں ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے دو مچھلیاں جال میں پھنس گئی ہوں۔

(۲) اچھلتیاں ہیں بجلیاں اجالاں تلے — کہ نیناں چمکتے ہیں بالاں تلے

یعنی آنکھیں بالوں میں ایسی چمک رہی ہیں جیسے بادلوں میں بجلی۔

(۳) سو دھن کے سو اوپر دسے یوں گہر — کہ بیٹھے ہیں جگنے مگر سرو پر

یعنی معشوق کے بدن پر گوہر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے سرو پر جگنو۔

(۴) رہی چوٹی یوں پیٹ پر اچھب سوں آ — پٹی پر اچھے جیوں الف ثلث کا

یعنی پیٹھ پر پڑی ہوئی چوٹی گویا تختی پر خط ثلث کے الف کی طرح معلوم ہوتی ہے۔

"قطب مشتری" کی ان تشبیہوں کو دیکھنے کے بعد جب ہم "پھولبن" پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ یکسر اس لطف و نزاکت سے خالی نظر آتی ہیں۔ ان میں وہی پرانا پن اور روایت پسندی معلوم ہونے لگتی ہے جو قدیم دور کی خصوصیات ہیں۔

زبان

"قطب مشتری" کا سن تصنیف سنہ ۱۰۱۸ھ ہے اور "پھولبن" کا سنہ ۱۰۶۶ھ ہے۔ اس طرح ان کے درمیان ۴۸ برس کی خلیج حائل ہے جس کے دھاروں پر زبان مختلف انقلابات سے دوچار ہوتی رہی۔ ملا وجہی محمد قلی قطب شاہ کے دور کا درباری شاعر تھا اور ابن نشاطی عبد اللہ قطب شاہ کے دور کا۔ ان دو ادوار کے اس ظاہری فرق سے ہمیں وجہی اور ابن نشاطی کے لسانی اختلافات اور تبدیلیوں کا پتہ ملتا ہے۔

وجہی یا محمد قلی قطب شاہ کے دور میں دکن بیرونی حملوں کے خطرہ سے آزاد، اور ملک میں ہر طرف خوشحالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا۔ یوں تو وہ "رشتہ" اتحاد جس کا سنگ بنیاد "حسن" کے ساتھ "گنگو بہمنی" کے جوڑنے پیدا کر دیا تھا روز بروز مستحکم ہو رہا تھا لیکن اندرونی اطمینان اور امن کی وجہ سے یہ اتحاد اور یگانگت محمد قلی قطب شاہ کے دور میں اپنے انتہائی نقطہ کو پہنچ چکی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی دکن زدگی کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے لباس اور طرز

ماند و اود تک ہندوؤں ہی کی اختیار کر لی تھی۔ اس یگانگت اور میل ملاپ کا ایک بڑا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اردو ادب (میری مراد دکھنی ادب سے ہے) میں دکن کے مقامی عناصر تیزی کے ساتھ داخل ہوتے گئے۔ چنانچہ وجہی کی "قطب مشتری" میں اور "سب رس" میں مختلف زبانوں کے محاورے، الفاظ اور ضرب الامثال اسی اثر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، جن میں خاص طور پر سنسکرت، ہندی بھاشا، تلنگی اور مرہٹی زبانیں قابل ذکر ہیں۔ وجہی نے بیسیوں ایسے الفاظ اور محاورے استعمال کئے ہیں جو عام طور پر دکن میں بولے اور سمجھے جاتے تھے اور جن کا تعلق بڑی حد تک (Colloquial) زبان سے تھا۔ اس کے برخلاف ابن نشاطی کے دور میں دکنی عناصر سے زیادہ شمالی ہند کے عناصر یعنی فارسی الفاظ و محاورے کثرت سے داخل ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے اندازے کے مطابق وجہی کے دور میں ہندی بھاشا اور فارسی عربی الفاظ کا تناسب ڈھائی اور ایک کا تھا۔

دکنی زبان کی ابتدا ([illegible]) تو یا شبہ ہندی بھاشا سے جا ملتی ہے لیکن الفاظ کے نقل مقام اور مرور ایام کی وجہ سے ان میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کا تعلق نہ ہندی بھاشا سے تھا اور نہ عربی و فارسی سے بلکہ خالص دکنی زبان کی انفرادی خصوصیات سے تھا۔ کہیں الفاظ کے تلفظ میں تبدیلیاں ہو گئی تھیں تو کہیں ان کے لہجے اور بیرونی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ کہیں کچھ حروف کا اضافہ ہوا تھا تو کہیں اختصار پیدا ہو گیا تھا۔ مثلاً "پوچھنا" اور "دودھ" جس میں (ھ) ایک (Short Vowel) کے طور پر استعمال ہوا ہے متغیر ہو کر "پوچنا" اور "دود" ہو گئے۔ اسی طرح "آنکھ" "آنک" بن گئی۔ بعض عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ جن کا صحیح تلفظ دکنی عوام میں نہیں پایا جاتا تھا، وجہی اور دیگر دکنی ادیبوں نے ان کو اسی غلط تلفظ کے تحت باندھا ہے۔ حالانکہ وہ اس غلطی سے آگاہ تھے۔ مثلاً "وضع" "صبح" اور "عقل" کے بجائے وجہی "وضا" "صبا" "اخل" لکھتا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی تغیرات کا ہمیں پتہ ملتا ہے۔ جن کا تعلق خالص دکنی معاشرت، دکنی تہذیب اور دکنی زبان سے ہے۔ جب تک دکن کی سرزمین بیرونی حملوں سے محفوظ رہی یہ تغیرات بڑھتے رہے لیکن جب مغلوں کے ساتھ دکن میں مغلوں کی زبان نے قدم جمائے تو دکنی زبان میں بجائے دکنی عناصر کے شمالی ہند کے عناصر داخل ہونے لگے۔

چنانچہ ابن نشاطی کے دور میں عبداللہ قطب شاہ نے شاہجہاں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور ملکی آزادی کا خاتمہ ہونے لگا تھا۔ شمال کی سیاست دکن پر تیز گام ابر کی طرح چھائے جا رہی تھی۔ شمال کی تہذیب و تمدن اور ثقافت و زبان دکن میں تیزی کے ساتھ پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ شمالی ہند کی وہ زبان جو فارسی سے متاثر اور اس کی آفریدہ تھی، دکنی زبان میں داخل ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی ایسے بیشتر الفاظ و محاورات جو دکنی زبان میں رس بس گئے تھے۔ ان کا نکالنا بہت مشکل تھا۔ یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ شمال کے اس عنصر کے داخل ہونے سے دکنی زبان میں کوئی لسانی انحطاط پیدا ہو رہا تھا، بلکہ اس کا خوش گوار نتیجہ بھی برآمد ہوا کہ دکنی زبان روز افزوں ارتقا پانے لگی۔ ابن نشاطی کے دور میں اب وہ تعقید اور ثقالت باقی نہیں رہی تھی جو وجہی کے دور کی خصوصیت تھی۔ وجہی کی زبان میں بلاشبہ ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ وجہی کو وہ سادہ و سلیس زبان نہیں ملی جو بعد میں منج منج کر ابن نشاطی کے دور میں عوام الناس کی زبان پر بھی چڑھ گئی تھی۔ اگرچہ آج ہم "قطب مشتری" اور "پھولبن" کا پہلو بہ پہلو مطالعہ کرتے ہیں تو دونوں کی زبان ہمارے لئے ایک ہی قسم کی دشواریاں پیش کرتی ہے۔ لیکن "پھولبن"

کا انداز خود بتائے دیتا ہے کہ یہ وجہی کے بہت بعد کی صاف اور نکھری ہوئی زبان ہے۔ سچ پوچھیے تو پھولبن کو قطب مشتری پر اگر کسی اعتبار سے ترجیح دی جاسکتی ہے تو وہ پھولبن کا سادہ و سلیس اور رواں دواں طرزِ تحریر ہے۔ ابن نشاطی میں وہ بلند پایہ ادبی خصوصیات تو نہیں پائی جاتیں جو وجہی کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں لیکن جہاں تک زبان اور طرزِ اظہار کا تعلق ہے ابن نشاطی زیادہ قادر الکلام شاعر کہا جاسکتا ہے۔ جذبات کی حقیقی تصویر اس کے لفظی اور معنوی صنایع بدایع کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔ پوری مثنوی "پھولبن" مرصع ہے لیکن اس کو اعجازِ سخن کہیے یا کچھ اور کہ ابن نشاطی نے کہیں بھی سلاست و روانی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

بہر حال جہاں تک شعر کی معنویت اور اس کے اندرون کا تعلق ہے ابن نشاطی وجہی سے کسی طرح لگا نہیں کھا سکتا۔ اور جہاں ہم شعر کے بیرون یعنی زبان اور زبان کے ظاہری و معنوی محاسن پر نظر کرتے ہیں تو ہم ابن نشاطی کے مقابلہ میں وجہی کو بہت پیچھے دیکھتے ہیں۔ ابن نشاطی کی طبیعت میں جودت اور تیزی کا ایک بڑا جوہر موجود تھا۔ اور زبان میں وہ جدتیں اور ندرتیں پیدا کرتا تھا کہ ہم کو اس کی بہت کم مثالیں وجہی میں ملتی ہیں۔ لیکن وجہی کی سی پختگی اور تجربہ کاری سے وہ عاری تھا۔ وجہی ایک شاعر اور صاحب ذوق شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مفکر اور حساس انسان بھی تھا، اور یہی وہ ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی تصنیفات کو ادبیاتِ عالیہ میں شمار ہونے کے قابل بنا دیتی ہیں۔

محمد معین الدین

نقادوں سے!

"— تو یہ سچ ہے کہ میں نے جب بھی اپنا ساز چھیڑا ہے
مرے نغموں میں غیروں کے تخیل مسکرائے ہیں؟

ابھی تک جب بھی میں نے آئینے میں خود کو دیکھا ہے
مرے چہرے پہ نامعلوم سائے جھلملائے ہیں؟

ابھی تک جب بھی اپنا ہاتھ پھولوں تک بڑھایا ہے
کسی نے کہہ دیا چپکے سے "ٹھیرو، یہ پرائے ہیں!!"

— مگر یہ بھی تو سوچو اے مرے بے رحم نقادو!
کہ میں نے کس طرح "یہ نامکمل گیت" گائے ہیں

بڑی مشکل سے ٹکرائے ہیں آنسو چاند تاروں سے
بڑی مشکل سے ویرانے میں غنچے لہلہائے ہیں

بڑی مشکل سے روشن رہ سکی افکار کی محفل
ہوا تو کیا بگولے شمع کے دامن تک آئے ہیں

ابھی کیا ہے، مجھے بس اک ذرا زندہ تو رہنے دو
ہوائیں تیز ہیں، یہ شمع تابندہ تو رہنے دو—!!

سلام مچھلی شہری

وہ دو عورتیں

یہ مراٹھی کے مشہور افسانہ نگار وامن چورگھڑے کا افسانہ ہے۔ وامن چورگھڑے مراٹھی کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے مراٹھی افسانہ میں ایک جدید راہ نکالی۔ اس سے پہلے میں نے ان کا ایک افسانہ ترجمہ کرکے "شاہکار" میں بھیجا تھا جو ڈیڑھ سال پہلے چھپ چکا۔ ایک مجلہ عثمانیہ میں بھی "آرٹ اور زندگی" کے نام سے چھپا۔ اب یہ تیسرا افسانہ آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔ کرشن چندر نے بھی جو "نئے افسانے" مرتب کی ہے اس میں ہر زبان کے چوٹی کے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کئے ہیں اس میں چورگھڑے کا بھی ایک افسانہ ہے۔ یہ افسانہ تکنیک اور طرز کے لحاظ سے خاص حیثیت رکھتا ہے۔ عورتوں کی بھی مزدور پیشہ طبقہ کی عورتوں کی شوخی ظرافت کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ اسی کا حق ہے۔ (مترجم)

اور اس کے بعد وہ تیزی سے اٹھی اس نے اس کے اس پتھر کے نیچے ہمیشہ کی طرح دھوپ کھسک جانے پر کپڑا دھونا بند کر دیا۔ گھر میں کچھ آواز ہوئی اسی لئے ہاتھ کا کام وہیں چھوڑ کر وہ اندر گئی۔ بلے کے منہ سے نوچی ہوئی آدھی روٹی اس نے کھپریوں کے نیچے چھپا رکھی اور کوٹھڑی کے باہر نکل کر باس کا دروازہ ڈھانپ دیا۔ باہر رادھا کھڑی تھی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا اور "چلو" رادھا کہہ کر چل پڑی۔ ابھی آٹھ بھی نہیں بجے ہوں گے مگر کہیں دیر نہ ہو جائے، اسی ڈر کے مارے دونوں بھی جلدی جلدی چلنے لگیں۔ چلتے وقت ان کے ہاتھ کی کانسے کی چوڑیوں کی آواز آ رہی تھی۔

"رادھا! دیر تو نہیں ہوئی؟" مل کے بھونگوں سے آگے جانے والے دھوئیں کی طرف دیکھتے ہوئے رامیسری نے پوچھا۔

"نہیں ری۔ مگر تجھے ایسی جلدی کیا پڑی ہے؟ شائد شام کا کام کاج سب کر رکھا......" "صبح ہی کا تو گاڑی بھر کام پڑا ہے۔ تیری جیسی سکھی کہاں ہوں میں؟ ساس اپنی روٹی ٹکڑا اپنا کر رکھ دیتی ہے اور اپنا آرام سے.... ہاں ساس کے رنگ دیکھے نہیں ابھی؟ اسی لئے سکھ کے سپنے دیکھ رہی ہیں تجھے! خیر گھر کاج تو روز کا ہی رونا ہے مگر یہ تو بتا کہ تیری آنکھیں کیوں ایسی لال سوجھ آئیں؟"

"کل رات پلک سے پلک نہیں لگی"

"اچھا"—— رادھا شرارت بھری مسکراہٹ کے بعد خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوا ری ہنسنے کو؟" ذرا غصہ سے رامیسری نے اسے کرید کر پوچھا۔

"جو جاننا تھا سو تو کھل ہی پڑا۔ اب باتیں بنانے سے حاصل؟"

"اری! دیسا نہیں، تجھے تو ہمیشہ کچھ واہیات ہی سوجھتا ہے۔ میں جو کہوں سو واہیات اور تو جیسے بالکل ویراگن (جوگن) بن گئی ہے نا! دیسا نہیں تو پھر کیا؟ کل کی رات کیسی گل گلوں سے بیتی ہوگی۔ یہی نا؟

کیا سو رکھا ہے ری؟ ذرا سنے گی بھی یا نہیں؟ ساہوکار کل دروازہ پر پہرہ لگائے بیٹھا تھا اسے سمجھاتے سمجھاتے کافی رات ہوگئی اور........

"مگر روز جاتا ہے نا تیرا گھر والا رات کے کام پر؟"

"ہاں مگر کل پچیس بابین کی پوٹلی زیادہ ڈھوئی تھی اور لوٹ کر آتے ہوئے راستہ میں ناچ تماشا جو ہو رہا تھا سو وہیں رم گئے۔ ذرا دیر ادھر ڈولتے، جھولتے جو گھر آئے تو رات کے دو بجے تھے!"

"اور پھر تجھے جگایا گیا؟"

"اری! میں تو جاگتی ہی بیٹھی تھی مجھے بھلا اس وقت تک نیند کہاں آتی؟" بے چاری رامیسری نے بھولے پن سے یہ بات

کہہ دی مگر راد ھا کی شرارت بھری ہنسی سے اس کی غلطی اس کی سمجھ میں آ گئی۔

"راد ھا! آج تجھے بڑی ہنسی آ رہی ہے۔ جا میں تجھ سے بولوں گی ہی نہیں۔"

"ایسی بھی کیا تنک مزاجی۔ ذرا مذاق میں کہا۔" رادھا نے اس کا پلو پکڑ لیا۔

"اچھا۔ اچھا۔ بڑی آئی مذاق والی۔"

"نہیں نہیں میں رونی صورت والی ہی سہی۔ بس! اب تو بولے گی نا! مجھے بھی کئی بار بالکل نیند ہی نہیں آتی۔ ہاں تو دو بجے رات کو وہ آیا تھا ـــــ اس کی آواز سمجھو تے کی تھی۔"

"رادھا میری کا غصہ اس کے آخری الفاظ سے اتر گیا اور وہ بولنے لگی۔

"رات کے دو بجے کے بعد اس پر تماشا دیکھ آنے کے بعد کیا وہ سونے دیتے مجھے؟ تھوڑی دیر گپ شپ ہو کر ایک جھپکی نہ جھپکی کہ سویرے کی سیٹی بجی" اور دونوں ہڑبڑا کر جاگ پڑے اور پھر اس کے بعد............ مل کے پھاٹک کے پاس آتے ہی دونوں نے بولنا گویا ایک دم بند کر دیا۔ پھاٹک پر کا موٹا پٹھان ان کی طرف رسیلی پیاسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی اندر چلی گئیں۔ اندر کی سب جگہ کالی ہو گئی تھی کلوں کی عجیب عجیب آوازیں ایسی آ رہی تھیں جیسے قصائی لکڑے پر گوشت کے ٹکڑے کاٹتا ہے۔ باہر کے بڑے بڑے پنکھے برابر چل رہے تھے دونوں طرف لگی ہوئی مہندی پر کوئلہ کی گرد جم گئی تھی جس سے ان کا ہرا رنگ کالا سونگیا بن گیا تھا درخت ہوا میں اسی طرح لہرا رہے تھے گویا کہ کتنے ہی دنوں سے پانی نہ ملنے پر بھوکے آدمی نے بیزار ہو کر گردن ایک طرف جھکا دی ہو ـــــ وہ گویا بڑے ہو گئے اسی لئے اور کسی طرح جی رہے تھے۔

ان پیڑوں کی آڑ میں وہ دو عورتیں بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

(مترجمہ) امجد یوسف زئی

(نوشتہ) **دامن چور گھڑے**

رات کا بھولا اور دیگر افسانے:۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۰ قیمت عہ۔

محبت کی چھاؤں:۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔

نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر، اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

قافیہ کی صنفی قدر و قیمت

لغت میں قافیہ کے معنی ہیں "پیچھے آنے والا" "پے در پے آنے والا" اور اصطلاح میں ان چند حروف معین کا نام ہے جو مطلع اور ابیات مثنوی کے ہر مصرع کے آخر میں اور قطعہ اور باقی اشعار غزل و قصیدہ کے مصرعہ ثانی کے آخر میں الفاظ مختلفہ کے اندر مکرر آتے ہیں۔ اور مستقل نہیں ہوتے۔ قافیہ کا اطلاق نو حروف پر ہوتا ہے۔ ردف، قید، تاسیس، دخیل، روی، وصل، مرید، خروج، نائرہ۔ لیکن ان سب حروف کا جمع ہونا ضروری نہیں یہ ایک یا دو یا تین یا زیادہ جس قدر چاہیں جمع کریں اور یہ بھی خیال رہے کہ حرف روی اصل قافیہ ہے اسی پر قافیہ منحصر ہے باقی آٹھ حروف کے لانے نہ لانے کا شاعر کو اختیار ہے۔ بہ خلاف حرف روی کے کہ اس کے لانے پر شاعر مجبور ہے۔

اہل عرب کے یہاں ردیف نہیں ہوتی اس لئے ان کی ساری توجہ قافیہ کی خوش آہنگی پر صرف ہوتی ہے۔ چنانچہ عربی شاعری میں قافیہ پر طرح طرح کی پابندیاں ہیں۔ مثلاً قافیہ آخر بیت میں واقع ہو حرف قید کا التزام مطلق نہ ہو تاسیس حرف قبل کا التزام ضرور ہو، وزن ضرب بدلنے نہ پائے یعنی اگر قافیہ متواتر ہے تو سارے قصیدہ میں متواتر ہی رہے گا۔ ان سبھوں کو ایک ساتھ جمع کرنا بھی درست نہیں لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ ان میں سے کوئی قید پائی نہ جائے۔

برخلاف اس کے فارسی اور اردو والوں کے یہاں اتنے قید و بند نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس ردیف قافیہ کے صوتی سقیم کی تلافی کے لئے موجود ہے۔ اس کے علاوہ ردیف کی نباہ اس قدر مشکل ہے کہ اس کے ساتھ قافیہ پر بھی قید و بند عائد کرنا نفس مضمون کا خون کرنا ہے۔ چنانچہ اردو میں قافیہ کا اصول صرف اسی قدر ہے۔

"جو کلمات متشابہ الآخر ہوں خواہ ایک ہی حرف اور اس کی حرکت ماقبل کا متشابہ ہو۔ جیسے "در" "بر" خواہ چند حروف بعینہ ایک ہی طرح کے حرکات و سکنات کے ساتھ پائے جائیں بشرطیکہ ان حروف میں کم سے کم پہلا حرف اصلی ہو مثلاً "آرزو" کا "و" میں سب حرف اصلی ہیں۔ "چبانا" "دبانا" میں "ب" اصلی ہے۔" (تلخیص عروض و قافیہ)

اس کے باوجود فارسی اور اردو میں بھی قافیہ کے حسن و قبح پر ایک مستقل بحث ہے لیکن ان پیچ در پیچ الجھنوں سے بچنے کے لئے قافیہ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا گیا ہے جو ہماری بحث کے سلسلہ میں کافی ہے۔

اعتراض:- شعر میں التزام قافیہ کی بحث وزن سے زیادہ متنازعہ فیہ ہے۔ جیسا کہ اکثر حضرات وزن کو شعر کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی طرح قافیہ بھی شعر کا لازمی عنصر نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن وزن شعر کی جس ضرورت کو پورا کرتا ہے قافیہ اس ضرورت کی تکمیل میں معاونت کرتا ہے۔ اب تک عربی فارسی اور اردو شاعری میں قافیہ کا اس شدت کے ساتھ التزام رکھا گیا ہے کہ بغیر قافیہ کے مشرقی شاعری کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کچھ دنوں سے اور غالباً ادبی انقلاب کے بعد سے قافیہ پر یہ اعتراض کیا جانے لگا ہے کہ اس کے التزام سے اظہار مافی الضمیر میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ حالی کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن قافیہ کی افادیت کا انہیں بھی پورا اندازہ تھا۔ اس مخالفت کے عموماً تین اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ انگریزی شعر و ادب کی تقلید میں ہمارے شعرا نے نظم معرا کی ترویج کرنی چاہی۔ دوسرا سبب جاپانی شاعری کے ترجموں اور ٹیگور کے شاعرانہ نثر کے تراجم کا وہ اثر ہے جس نے بالخصوص نوجوان شعرا کو شعر منثور کی طرف راغب کر دیا۔ تیسری وجہ خود اردو شاعری کا وہ تصنع ہے جو قافیہ اور ردیف کی بیجا ثقالت کے باعث پیدا ہو گیا ہے۔ غرض یہ اور اسی

نوع کے مختلف اسباب نے بعض ادبی حلقوں میں قافیہ سے بیزاری سی پیدا کردی ہے۔ ادبی انقلاب کے آغاز ہی میں شررؔ اور اسمٰعیلؔ نے نظمِ غیر مقفیٰ کو رواج دینے کی کوشش کی لیکن انھیں مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ بعد کو عظمت اللہ خاں نے بھی قافیہ کی پابندی کے خلاف بڑا سخت احتجاج کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

"اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیے کے پھندے کو نکالا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکان ماردی جائے" (سریلے بول)

یہی نہیں بلکہ خاں صاحب سرے سے اردو شاعری ہی کی قلبِ ماہیت کردینی چاہتے تھے۔ غزل کی بیخ کنی سے تشفی نہ ہوسکی تو دوسری اصناف پر بھی پل پڑے چنانچہ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :-

"ہاں تو یہاں تک فنی تعلق ہے غزل اور غزل کے ساتھ موجودہ شعر و سخن کے اور سانچے بیدردی کے ساتھ توڑ دیے جائیں۔"

(سریلے بول)

لیکن حیرت ہے کہ خود خاں صاحب نے اپنی نظموں کے جو نئے نئے سانچے بنائے ہیں سوائے نظمِ غیر مقفیٰ کے سبھوں میں قافیہ کا التزام ہے اور لطف یہ ہے کہ قوافی کی ترتیب اس قدر مشکل رکھی ہے کہ غزل سے زیادہ ان سانچوں میں قافیہ خیال کے لئے سنگِ راہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس مدت سے قافیہ کا وہ صوتی حسن بھی باقی نہیں رہا۔ ان کی دو تین نظموں کے سانچے ملاحظہ ہوں۔

وطن .... ا .... ا
د ....
ب .... ب ....
د ....

موزہنی صورت .... ا .... ا
د ....
ب .... ط .... ب
د ....

پیارا پیارا گھر .... ا .... ب
ب .... ا .... ب

ان خاکوں میں کم و بیش ہر مصرعہ پابندِ قافیہ ہے اور ہم قافیہ مصرعوں کی دوری سے قافیہ کے التزام میں دقت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ صاحب سانچے انھوں نے انگریزی شاعری سے مستعار لئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اردو شاعری کے پرانے سانچوں کو توڑ کر یہ اور اسی قبیل کے اور سانچے رائج کئے جائیں۔ لیکن انھوں نے قدیم سانچوں کے معائب پر ہر پہلو سے روشنی نہیں ڈالی۔ اگر ان کا عیب محض قافیہ کی رکاوٹ ہے تو یہ عیب ان کے جدید سانچوں میں بھی موجود ہے۔ خود انگریزی شاعری اور بالخصوص لرک کی اصناف میں قافیہ کا بڑا التزام ہے۔ بعض اصناف میں ہم قافیہ مصرعے اس قدر دور پڑتے ہیں کہ تسلسل و تکرار کا تمامی حسن محو ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اتنی دور سے قافیہ کو نباہنے کی دقت بھی محتاجِ بیان نہیں۔ مثال کے لئے چند انگریزی اصناف کے سانچے ملاحظہ کریں۔

اسپنسری اسٹانزا (Spenserian Stanza) کی ترتیب یہ ہے۔ (a b a b b c b c c)

ریفرین اسٹانزا (Refrain stanza) ایک خالص لرک کی صنف ہے۔ جس میں ہر بند کا آخری مصرع ایک ہی لفظ پر ختم کیا جاتا ہے جس سے بند کی موسیقیت بڑھ جاتی ہے۔

سانٹ (Sonnet) کی اطالوی شکل (octave, a b b a a b b a Sestet (c d e c d e)

سانیٹ کی انگریزی شکل (abab cdcd efef gg)

انگریزی شاعری کی اصناف میں قوافی کی بوقلمونی، ترتیب، سانچوں کی پیچیدہ ساخت اور اوزان کی تبدیلیاں معنی کا خون کرنے کی بجائے موسیقیت اور قوت اظہار میں اضافہ کرتی ہیں تو یہ فنی قیود اردو شاعری ہی میں تخیل کے لئے سنگ راہ کیوں بن جاتی ہیں۔ جہاں تک ہم نے اس اعتراض کی حقیقت پر غور کیا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ناقدین نے شاعر کی کم سوادی کو قافیہ کی فنی قید کے سر تھوپ دیا ہے

غزل کی تخلیق شعری بالعموم دو طرح پر عمل میں آتی ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ شاعر کسی معینہ خیال کو معینہ زمین میں پیش کرتا ہے۔ دوسری صورت اس کے برعکس ہے یعنی قافیہ کی تحریک سے جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ اس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ پہلی صورت میں قافیہ کی مزاحمت شاعر کی فنکارانہ مہارت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے جس طرح ایک فن کار کو ایک عرصہ کی مشق و مزاولت کے بعد کسی فن پر قدرت تامہ حاصل ہوتی ہے بالکل اسی طرح ایک شاعر کو بھی ایک عرصہ کی سعی و کاوش کے بعد الفاظ، تراکیب اور پیرایۂ اظہار پر قدرت نصیب ہوتی ہے۔ اعلیٰ اظہار کے لئے محض الفاظ اور اسلوب پر قدرت ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انفعال کی قوت بھی درکار ہے جس قدر انفعال قوی ہوگا اسی قدر آسانی کے ساتھ لفظ و بیان کے موزوں ترین سانچے شاعر کی دسترس میں آتے جائیں گے۔ قدرت بیان اور قوت انفعال کی یہی وہ ہم آہنگی ہے جو ایسے برجستہ ترین قافیہ کو ڈھونڈ لیتی ہے کہ اس لفظ اس سے زیادہ موزوں مقام تصور میں نہیں آسکتا۔ البتہ جس زمین میں قافیہ ثقیل اور ناہموار ہوا اور پھر اس کے ساتھ ایک بے ربط اور طویل ردیف بھی جوڑ دی گئی ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے قافیہ و ردیف اظہار مافی الضمیر میں مزاحم ہوں گے۔ لیکن یہاں بھی قصور قافیہ و ردیف کے فن کا نہیں بلکہ اس بدذاقی کا ہے جو قافیہ و ردیف کے لئے بوجھل اور بے ربط الفاظ انتخاب کرتی ہے۔

تخلیق شعری کی دوسری صورت تحریک قافیہ سے شروع ہوتی ہے۔ ایسی شاعری کو عام طور پر تیسرے درجہ کی شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کا نام قافیہ پیمائی اور تک بندی رکھا گیا ہے۔ یہ تصور غالباً دو اسباب کی بنا پر پیدا ہوا ہے ایک سبب تو یہ ہے کہ کثرت سے شعراء جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا یا کچھ ہے بھی تو کہنے کی استطاعت نہیں رکھتے لیکن اس بے مائگی کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ قافیہ کی مناسبت سے جو مضمون بھی سوجھ جاتا ہے باندھ دیتے ہیں یا اس قافیہ کے ساتھ جس قسم کے مضامین بندھتے آئے ہیں انہیں کو دہرا دیا جاتا ہے۔ ایسی شاعری کو قافیہ پیمائی کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ دوسری وجہ شاعری کا وہ تصنع ہے جو قافیہ کی ناہمواری اور ردیف کی بے ربطی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ جیسے "قفس کی تیلیاں" اور "قفس کی تیلیاں" جیسی زمین میں شاعر سوائے تیلیاں چننے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ اسی قسم کی شاعری کو دیکھ کر یہ کلیہ بنا لیا گیا کہ قافیہ کی مرہون منت شاعری مصنوعی اور بے روح ہوتی ہے۔ حالانکہ متذکرہ دونوں صورتوں میں شاعر کی صلاحیتوں کی کوتاہی اس کی پست شاعری کی ذمہ دار ہے۔ صورت اول میں شاعر کی گرہ میں کچھ ہی نہیں جس کو قافیہ کی تحریک باہر لا سکتی۔ صورت ثانی میں شاعر کی کور ذوقی ایسا بھدا قافیہ اختیار کرتی ہے جو صرف غیر شاعرانہ تجربات کی پیش کشی پر مجبور کرتا ہے۔ غرض نتائج کے اسی غلط استخراج کے باعث قافیہ کی مخالفت کرنے والوں کو اس کی بے پایاں قوت تحریک کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اگر شاعر کا وجدان تیز اور تخیل قوی ہو تو قافیہ کی ایک ذرا سی تحریک اس کے تحت شعور پڑے ہوئے گراں قدر تجربات کو شعور کی دنیا میں کھینچ لاتی ہے جہاں وہ شاعر کے جذبہ و احساس سے امتزاج پا کر انفعال اور پھر تصور شعر کے مدارج سے گزرتے ہوئے تخلیق شعر کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ فراق گورکھپوری نے اپنے

مضمون دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی میں قافیہ کی اس افادیت کو پوری طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ :-

"ہر قافیہ میں شاعر کے وارداتِ حیات، تجربات واحساسات اور نقدِ حیات کے راز مضمر ہیں۔ قافیہ وردیف تخیل نفسی کے ان تاثرات کا کام کرتے ہیں جو حیاتِ شاعر کے بظاہر فراموش اور حقیقتاً کبھی فراموش نہ ہونے والے واقعات اور واردات کی ترجمانی میں محرک اور معاون ہیں۔ شاعر کی سوئی ہوئی شخصیت کو قافیہ وردیف چونکا دیتے ہیں۔ مگر یہ صرف غزل میں داخلی اور نفسیاتی شاعری میں ممکن ہے۔ غزل میں قافیے شاعر کی نفسیاتی سوانحعمری کے علامات ہیں۔ قافیہ شاعر کے ذہن کے لئے ایک لحاظ سے پہلا قدم اور دوسرے لحاظ سے منزل پر آخری قدم کا کام کرتا ہے۔" منا

نگار سنہ ۱۹۳۶ء بابتہ جولائی

فراق نے قافیہ کی اس صنف کو داخلی شاعری کے لئے مخصوص کرلیا ہے۔ اور یہ تخصیص ایک اعتبار سے درست بھی ہے لیکن جان ڈرائیڈن (John Dryden) ہر قسم کی شاعری میں قافیہ کو خیال کا محرک سمجھتے ہیں۔ وہ (The Rival Ladies) کے انتساب میں نظم معرا کے مقابلہ میں قافیہ کی افادیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعر کا تخیل بے مہار ہوتا ہے۔ اگر اس پر قید وبند عائد نہ کی جائے تو نفس خیال کے ساتھ غیر ضروری جزئیات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ ایسا نہ بھی ہو تو کم از کم وہ غیر ضروری تفصیل اور طوالت اختیار کرلیتا ہے اس لئے یہ قافیہ کا بڑا وصف ہے کہ وہ شاعر کے تخیل کے لئے ایک راستہ متعین کر دیتا ہے۔ یہ تحدید نہ صرف تخیل کی معاونت کرتی ہے بلکہ شاعر کو ایسے الفاظ کے تفحص پر مجبور کرتی ہے کہ قافیہ خود بخود ان کا تابع ہو جاتا ہے قافیہ کے اس تحدیدی وصف سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب قافیہ تخیل کو متعین اور منظم کرتا ہے اور شاعر کی فن کارانہ صلاحیت سے کام لیتا ہے تو لازماً وہ شاعر کو انتہائی بلند اور واضح خیال بخشتا ہے۔

یہاں یہ اعتراض ممکن ہے کہ قافیہ کی اک ذرا سی تحریک اس قدر ہیجان کیونکر پیدا کرسکتی ہے؟ ورڈس ورتھ (Wordsworth) نے اس گتھی کو بھی سلجھا دیا ہے۔ (Lyrical Ballads) کے دیباچہ میں وہ رقمطراز ہیں کہ شاعری سکون میں سوچے ہوئے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اس جذبہ میں استغراق ہوتا ہے تو ردعمل کے طور پر سکون رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے اور استغراق سے پہلے کے جذبے سے مشابہ ایک جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو تخلیق شعری کا موجب ہوتا ہے۔

حفیظ قتیل

میر محمد مومن :- عہد محمد قلی قطب شاہ وسلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلی بچھادی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور ومعروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالاتِ زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عہ

تلقین

شبِ فراق کا مفہوم انتظار نہیں!
نگاہِ شوق بہرحال منتظر نہ رہے
سفینۂ درد کا سیلابِ اشک سے بہے
لبِ خموش سے بھی اپنی داستاں نہ کہے
زباں پہ حرفِ شکایت نہ آئے ظلم سہے

اس اضطرابِ تمنا سے فائدہ کیا ہے؟
یہ کس کی یاد میں دل کروٹیں بدلتا ہے؟
یہ کیوں جگر میں محبت کا درد پیدا ہے؟
خیال کس بتِ بیداد گر کا آتا ہے؟

یہ بڑھتی بڑھتی سی تاریکیوں میں خوف و ہراس
رخِ قرار پہ مایوسیاں، سکوں اداس
نہ موت کی کوئی صورت نہ زندگی کی آس
نہ میں ہوں اُن کے قریب اور نہ وہ ہیں میرے پاس

یہ پچھلی شب یہ سکوت و جمود کا عالم
کہ سانس لیتا ہے رک رک کے کائنات کا دم
اداس اداس فضائیں یہ حکمرانیٔ غم
تڑپ نہ اے دلِ مضطر تجھے خدا کی قسم
شبِ فراق کا مفہوم انتظار نہیں!

جبریل

استفسار؟

کون ہے جو میرے افکار پہ یوں چھایا ہے؟
اپنے مرکز سے پرے ہٹ کے نظر گھوم گئی
روحِ احساس کی گہرائیوں میں جھوم گئی
کون یہ دل میں نشہ بن کے اتر آیا ہے؟
یک بیک کس نے مرے دل میں یہ چٹکی لی ہے؟
دفعتاً کیوں مرے جذبات امڈ آئے ہیں؟
اک گھٹا بن کے جو احساس پہ لہرائے ہیں!
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے پی ہے!
کس نے دنیائے سکوں میں یہ مچا دی ہلچل؟
کون ہے جس نے کیا ہے خرد و ہوش کا خوں؟
کر دیا کس نے مجھے محرمِ اسرارِ جنوں؟
ہو رہا ہوں اسی احساس سے میں تو پاگل!
کون ہے جو میرے افکار پہ یوں چھایا ہے؟
کون یہ دل میں نشہ بن کے اتر آیا ہے؟

جمیل ملک

تعارف

محبت :- کیا میں اندر آ سکتی ہوں جناب ؟

بیمار :- جی ہاں، تشریف لائیے۔

محبت :- معاف کیجئے گا بلا تعارف کے آپ سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل کر رہی ہوں۔

بیمار :- جی نہیں کوئی ایسی بات نہیں، اور میں بھی تو بغیر تعارف کے شرف ملاقات حاصل کر رہا ہوں۔ کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ مجھے کس سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟

محبت :- جی مجھے "محبت" کہتے ہیں۔ چند احباب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اس لئے دل نے کہا چلو ذرا دیکھ ہی آئیں۔ وہ آپ کے اخلاق کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ فرمائیے اب مزاج کیسے ہیں؟

بیمار :- اوہ محبت صاحبہ معاف فرمائیے اٹھ نہیں سکتا ورنہ آپ کے قدم چوم لیتا۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میرا اور آپ کا پہلے ہی غائبانہ تعارف تھا اور مدت سے آپ سے ملنے کا اشتیاق بھی رکھتا تھا یہ تمنا آج پوری ہوئی۔ کتنا خوش قسمت ہوں کہ آپ نے غریب خانہ تک زحمت گوارا کی میرے دوست آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور جب کبھی دو چار مل بیٹھتے ہیں تو آپ ہی کا ذکر خیر ہوتا ہے اور جو آپ سے متعارف ہیں وہ آپ کے کئی کرشمے بتا کر ہمارا اور آپ کا غائبانہ تعارف کرا چکے ہیں۔

ان میں سے ایک کہتا ہے "کیوں میاں آپ میں سے کسی کی محبت صاحبہ سے دوستی ہے ؟" تو دوسرا کہتا ہے "ارے یار ان سے تو ہمارا بہت زمانہ کا یارانہ ہے ہم دونوں ایک جان دو قالب ہیں" تیسرا بول اٹھتا ہے "ارے تو تو یوں ہی بکا کرتا ہے آخر کوئی ثبوت بھی ہے تیرے پاس ان کی محبت کا ؟" تو وہ شخص جواب دیتا ہے "کیا میں جھوٹ کہتا ہوں دوست اگر گواہ اور ثبوت ہی چاہتے ہو تو لو دیکھو

ایک کیا دو ہیں "محبت" کی گواہی کے لئے
دل صد چاک بھی ہے دیدہ خونبار بھی

اس کے بعد ایک اور صاحب بول اٹھتے ہیں "واقعی یار محبت کے کرشمے کچھ عجیب و غریب ہوتے ہیں وہ جب ملتی ہیں ہر ایک پر اپنا نرالا ہی اثر جما کر اٹھتی ہیں دیکھیے ہم ان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ آتے ہیں تو دل میں کچھ خلش معلوم ہوتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو "محبت" تو نہیں کہتے

اس کے بعد شیفتہ نے اس کی تائید اس طرح کر کے آپ کا غائبانہ تعارف ہم سے کرا دیا ؎

شائد اسی کا نام "محبت" ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

محبت :- جی نہیں شکریہ، آپ نے تو مجھے کانٹوں میں گھسیٹا جو کچھ بھی آپ نے فرمایا وہ آپ کا اور میرے احباب کا صرف حسن ظن ہے۔ کہیئے اب مزاج کا کیا حال ہے ؟ کیا بیماری ہے ؟ کس کا علاج جاری ہے۔

بیمار :- محترمہ، یہ نہ پوچھو بیماری کیا ہے ؟ ہماری شمع زندگی بجھا چاہتی ہے۔ میری دلی آرزو آپ سے ملنے کی تھی سو وہ پوری ہو گئی۔ علاج تو میں نے بہت کچھ کروایا لیکن بیماری میں کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ابھی ایک حکیم صاحب آئے تھے انہوں نے نبض دیکھی اور صرف یہ کہہ کر تشریف لے گئے ؎

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
دردمند ہجر را دارو بجز دیدار نیست

محبت :- سنا ہے آپ کے سر میں بھی درد ہوتا ہے اس کے لئے

کسی اچھے حکیم سے رائے لی ہوتی۔

بیمار:- ہاں محترمہ، ایک طبیب کو میں نے بلوایا تھا ان کو درد سر کی کیفیت بیان کی انھوں نے یہ نسخہ بتایا کہ

ع درد سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید

لیکن میں نے کہا حکیم صاحب اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے بس اس پر وہ خفا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اب آپ ہی بتایئے کہ کیا کیا جائے؟

محبت:- جناب مجھے آپ سے پوری دلی ہمدردی ہے میں بھی کچھ طب جانتی ہوں بتایئے اب کس جگہ درد ہے؟

بیمار:- آہ محترمہ کیا بتاؤں درد ایک جگہ ہو تو کہوں ؎

کبھی دل میں کبھی سر میں ہے کبھی پہلو میں
چارہ گر کیا کہوں میں درد کہاں ہوتا ہے؟

محبت:- دوست، پہلو میں اگر درد محسوس ہوتا ہے تو ہمارے پاس اس کا آسان نسخہ ہے اس پر عمل کرو جلد آرام ہو جائے گا۔

ع جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

بیمار:- شکریہ حکیم جی، یہ ترکیب تو میں نے کر دیکھی کچھ بھی تو فائدہ نہیں ہوا۔

محبت:- مجھے اس کا بہت افسوس ہے خیر یہ بیماری انسان کے دل و جگر پر بہت جلد حملہ کرتی ہے اس لئے دل و جگر کی اچھی خبر لیتے رہیے۔

بیمار:- محترمہ، میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟ مر کر بھی میں آپ کی ہمدردی بھول نہیں سکتا۔ ایک صاحب کل ہی آئے تھے انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ دل و جگر ہی کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

؎ شب فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاج دل تو اچھا ہے؟

اور اب سانس بھی تشفی بخش جواب نہیں دے رہا ہے محترمہ!

محبت:- دوست مجھے بہت جلد ہر شخص سے بے تکلف ہونے کی عادت ہے اس لئے آپ بھی تکلف نہ فرمایئے۔ کہیے آپ کے لئے میرے لائق کوئی خدمت ہے تاکہ اس کو میں انجام دوں اور دیکھئے صاحب میرا ایک ذاتی مطبع ہے۔ اگر آپ کوئی چیز شائع کرانے سے چھوڑ جاتے ہیں تو اس خدمت کو انجام دینے کی سعادت مجھے عطا فرمایئے۔ اس طرح مجھے آپ کی روح کو مسرت پہنچا کر بڑی خوشی حاصل ہوگی۔

بیمار:- ہاں خوب یاد دلایا۔ اب میرے پاس سوائے اس کے رکھا ہی کیا ہے ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اور آپ سے یہی التجا ہے کہ ان خطوط کو طبع کرا دیجئے۔ آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی۔

محبت:- اجی جناب کیسی تکلیف، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں اچھا اب اجازت دیجئے۔

بیمار:- محبت صاحبہ آپ جاتی تو ہیں لیکن ہماری میت میں ضرور شریک ہونا اور اس کا بھی خیال رکھنا کہ آپ اوروں سے کچھ زیادہ ہی رو دیں تاکہ لوگ آپ کو قاتل نہ سمجھیں ؎

ہو نہ دامن گیر کوئی جان کر قاتل تجھے
تو بھی روتا چل جنازے کو ہمارے دیکھ کر

محبت:- ٹھیک تو ہے! لیکن میں اس قدر کیوں روؤں؟ اب تک میری آنکھیں نہیں جانتی ہیں کہ آنسو کیا ہوتے ہیں؟ اس لئے اس سے کوئی آسان نسخہ تجویز فرمایئے تو مہربانی ہوگی۔

بیمار:- مجھے تو کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اگر آپ ہی کوئی ترکیب بتائیں تو بہتر ہے۔

محبت:- ہاں صاحب ایک ترکیب یاد آ گئی اگر آپ اس پر عمل کرنے پر راضی ہیں تو میں بتاتی ہوں ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

بیمار :- بہت بہتر محترمہ اسی میں آپ کی بھلائی ہے کسی کا آپ پر گمان تک نہ ہوگا۔

محبت :- میں خدا سے صدق دل سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ آپ کو جنت نصیب کرے اور آپ کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بیمار :- نہیں محبت صاحبہ میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے اور تمام احباب میں صرف آپ ہی ایک ایسی ہیں جن سے مجھے محبت ہے۔ اس لئے میں بھی خدا سے دعا کرتا ہوں کہ " رحمتِ تمام ! میری ہر خطا معاف' اور میری جان سے زیادہ عزیز "محبت" کو عمر خضر نصیب ہو اور ساتھ ہی اس کو صبر جمیل بھی عطا فرما۔"

او ہ محبت صاحبہ' میرے کان میں کسی کی آواز آرہی ہے۔ شائد میری دعا قبول ہو گئی۔ کوئی آہستہ سے کہہ رہا ہے " ارے دیوانے' محبت کو تو نے کیا سمجھ رکھا ہے ! محبت زندگی ہے' محبت دنیا ہے اور جب تک دنیا رہے گی اس کے ساتھ محبت بھی رہے گی۔" اچھا محبت الوداع

ع۔ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

ملک ارجن

غزل

دل کو غمِ حیات گوارا ہے ان دنوں — پہلے جو درد تھا وہی چارا ہے ان دنوں

ایک ایک اشک جان سے پیارا ہے ان دنوں — موتی ہے ان دنوں کوئی تارا ہے ان دنوں

ہر سیلِ اشک ساحلِ تسکیں ہے آج کل — دریا کی موج موج کنارا ہے ان دنوں

یہ دل ذرا سا دل تری یادوں میں کھو گیا — ذرے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں

شمعوں کی اب نہیں ہے وہ پہلی سی روشنی — کیا واقعی وہ انجمن آرا ہے ان دنوں

تم آ سکو تو شب کو بڑھا دوں کچھ اور بھی — اپنے کہے میں صبح کا تارا ہے ان دنوں

نکلا خوشی کا دور بہت مختصر قتیل — پہلے سے تیز وقت کا دھارا ہے ان دنوں

قتیل شفائی

شکست

جعفری اندرونی کشمکش سے ناواقف نہ تھا وہ خوب جانتا تھا کہ یہ شادی محض وکیل صاحب کی ضد سے ہوئی ہے۔ جعفری کو بید صدمہ تو یہ تھا کہ جس پر وہ فریفتہ ہے اس کی محبت کا مرکز تو کوئی دوسری ہستی ہے۔ یہ خیال دل میں لئے ہوئے وہ دلہن کے کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر دراز ہو گیا اس میں یہ ہمت نہ تھی کہ دل شکستہ بلقیس کو چھیڑے۔ بڑی دیر کے بعد جعفری نے کہنا شروع کیا "یہ بھی عجیب بات ہے جس کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ ہم سے نفرت کرتا ہے" آہ نو بہارِ ناز ایک برق جوالا کی طرح یکایک میرے ہوش و حواس پر گری مجھے سسکتا چھوڑ چشم زدن میں نگاہوں سے چھپ گئی۔ دیر تک جعفری محبت کے سر الاپتا رہا۔ بلقیس اپنے خیالات میں مستغرق رہی۔ جعفری گنگناتا ہوا کرسی پر سے اٹھا، بلقیس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا وہ سمٹ کر بیٹھ گئی جعفری قریب آتا ہوا بولا میری والہانہ محبت کے پیکر! میری تمناؤں کی ملکہ!! ایک دفعہ اس رنگین گھونگھٹ کو الٹ کر اپنے فدائی کو دیکھئے (قریب ہوتا ہوا) یہ جھلملاتا، جھلملاتا ہوا گھونگھٹ کتنا جاذب نظر ہے جیسے کوئی حسین مہ جبیں مسکرا رہا ہے۔ بلقیس کچھ سمجھنے نہ پائی تھی کہ جعفری یہ کہتا ہوا پھرتی سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ صورت پر نظر پڑتے ہی بے اختیار جعفری کے منہ سے نکل گیا "کون" حسرتوں، ارمانوں کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور گھبراہٹ و سراسیمگی کی حالت میں وہ کرسی پر گر پڑا۔ بلقیس پر ایک جھرجھری سی آئی ایک بجلی سی اس کے دماغ میں کوند گئی۔ پہلے تو اس نے جعفری کی بے تکی باتوں پر غور نہیں کیا۔ سمجھی یونہی بکے جا رہے ہیں لیکن اس کے یہ کہنے پر "کون" وہ سمجھ گئی کہ یہ بے تکی باتیں محض خیال آرائی نہیں تھیں ضرور اصلیت رکھتی ہیں۔ وہ فوراً تاڑ گئی کہ جعفری میری بجائے کسی اور کو دیکھنے کے متمنی تھے اس کو جس نے ان کا دل سر بازار لیا تھا اور جیسے وہ وکیل صاحب کی بیٹی تصور کئے ہوئے تھے۔ ہائے کیا دھوکا ہوا۔ ابا جان آپ نے میری زندگی بالکل تباہ کر دی۔ اپنی ضد پر میری مسرتوں، میری تمناؤں کو بھینٹ چڑھا دیا۔ خیالی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ جس پہ جعفری فریفتہ تھے انھیں وہ ملا اور میں اپنی مرضی کے خلاف ان کے پالے پڑ گئی۔ یہ سوچتے سوچتے بلقیس خیالات کے سمندر میں غرق ہو گئی"

بڑی دیر تک کمرہ میں سکوت چھایا رہا۔ ادھر دولہا غائب تو ادھر دولہن کھوئی ہوئی اس طویل المدت خاموشی کو جعفری نے توڑا وہ سوچتا ہوا بلقیس کے قریب آیا اور صاف سلجھے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے باعث آپ اس قدر روحانی تکالیف میں گرفتار ہوئیں میری وجہ سے آپ کی خوشیوں کو ٹھکرا دیا گیا۔" بلقیس بالکل خاموش تھی جعفری نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ سے میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں میں جس لڑکی سے شادی کرنے کے تصور میں تھا جس کو میں نے ایک دفعہ دیکھا تھا وہ آپ نہیں ہیں۔ مجھے اس لڑکی کو وکیل صاحب کی صاحبزادی باور کرایا گیا۔" بلقیس چپ رہی جعفری کہتا ہوا "مشیت ایزدی کے آگے انسان مجبور ہے یہ خدا کو منظور تھا کہ ہم ایک دوسرے رشتۂ ازدواج میں جوڑ دیئے جائیں ایک نامعلوم قوت سے جوڑ دیے گئے۔ اپنی قسمت پر شاکر و صابر رہنا ہی عبدیت کا ثبوت ہے۔

بلقیس چونکی جعفری اس کے مقصد سے دور ہٹ گیا تھا۔ بولی آپ بھول رہے ہیں اب بھی ہمیں موقع ہے اب بھی ہم بگڑی ہوئی تقدیر بنا سکتے ہیں اب بھی مذہب ہماری رہنمائی کر سکتا ہے اب بھی ہم اس زبردستی کے رشتہ کو توڑ کر آزاد ہو سکتے ہیں اپنی زندگی کے سدھارنے میں ہمیں کون روک سکتا ہے۔

اس قسم کی گفتگو کو جعفری دولہن سے سننے کے لئے تیار نہیں تھا وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا ایسا

ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ بلقیس بولی "لوگ! ہمیں لوگوں سے کیا سروکار۔ ہم تو اپنی کھوئی ہوئی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ ہمارا حق ہے۔

جعفری "آپ غور کیجیے یہ ناممکن ہے۔ بلقیس عاجزانہ لہجہ میں بولی "اب بھی کچھ نہیں گیا مجھ غریب کی زندگی تباہ نہ کیجیے۔ آپ مجھے اس قید سے رہا کر دیجیے۔

جعفری بے چین ہو کر بولا "مجھے کوئی عذر نہیں۔ میں آپ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں —— لیکن یہ بات بجا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے —— جعفری کچھ سوچنے لگا ——

بلقیس تیزی سے بولی "ہرگز نہیں ہم بالکل حق بجانب ہیں اسی طریقہ سے ... تین زندگیاں سدھر جائیں گی۔

جعفری "مگر آپ خود تو سوچیے کہ ایسا کرنے کے بعد آپکے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہوگا۔ کیا لڑکا وہ آپ کو قبول کرے گا۔ بلقیس کے دل میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ وہ الجھ کر بولی "مجھے پورا اعتماد ہے اس کی میں ذمہ دار ہوں آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

جعفری "اور آپ نے اپنے والدین کا خیال نہیں فرمایا وہ اس بے عزتی کو کب برداشت کر سکیں گے۔ وہ خودکشی کریں گے۔" بلقیس "یہ بے عزتی ہرگز نہیں ہو سکتی یہ تو اپنے حقوق کی جنگ ہے۔ ہم مذہب کے حدود سے باہر نہیں ہیں۔

جعفری "یہ آپ کا خیال ہے۔" بلقیس بولی —— "خیال —— خوب میری زندگی کے متعلق لوگوں سے پوچھوں۔ آپ کو دنیا کی پڑی ہے اوروں کو عزت کا پاس ہے۔ آپ نے محبت نہیں کی۔ جب آپ کسی سے محبت کرتے اور آپ کا دل ٹوٹتا تو دیکھتے۔"

جعفری "میں نے جھوٹی محبت کی۔ معاف فرمائیے آپ کا الزام غلط ہے آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ اگر آپ چند دن پیشتر میری حالت دیکھتیں تو معلوم ہوتا کہ میں کس آگ میں جل رہا تھا۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میری زندگی اس ہستی کے بغیر ہیچ ہے۔ میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ میری شادی ہوئی تو اس سے ہوگی۔ آپ اس روح فرسا تکلیف کا اندازہ نہیں فرما سکتیں جو مجھے تھوڑی دیر پیشتر ہوا۔ میری ساری تمنائیں، سارے رنگین خواب برباد ہوگئے (دم لیکر) اور میں زندہ ہوں۔ راضی برضا رہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

بلقیس بولی "مہربان من ایک ہی جذبہ کے اثرات دو مختلف النوع طبیعتوں پر یکساں نہیں پڑ سکتے۔ بعض کے تاثرات نقش بر آب ہوتے ہیں اور بعض کے نقش کالحجر۔ آپ کا یہ کہنا میں نے ایسا نہیں کیا اس لیے تم میرا اتباع کرو انتہائی ظلم ہے۔"

جعفری "بلقیس یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اور میں نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا کہ آپ سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے مسرت کی تلاش نہیں ہے۔ ترتوں کو پورا کرنے کی تمنا نہیں۔ آپ جو کچھ فرما رہی ہیں وہ ایک بیحد دلکش خیال اور خوبصورت تصور ہے۔ جو عمل کے سانچہ میں ڈھل نہیں سکتا۔ ہم موجودہ رشتہ کو توڑ کر خوش و خرم رہیں گے۔ ایک فریب ہے۔ اس سے آپکی زندگی تلخ اور ناقابل برداشت ہو جائے گی اور میں دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہونگا۔ بلقیس کو متاثر پاکر "آپ دنیا کو اپنے مقابل ہیچ سمجھتی ہیں مگر یاد رکھئے آپ اس دنیا ہی کے ایک جز حقیر ہیں۔ کیا جز بھی کل سے علحدہ ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی جھاڑ سے ٹوٹ کر سر سبز ہو سکتی ہے۔ کیا آپ کو اس ہستی کا اتنا بھی پاس نہیں جس نے آپ کو اپنے خون سے سینچا ہو جس نے آپ کے آرام و راحت کے لیے اپنی جان ہلکان کر ڈالی ہو اس ساری جانکاہی کا معاوضہ انھیں یہی ملنا چاہیے کیا اسی کی انھیں توقع تھی۔

بلقیس تنک کر بولی "کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔" آپ موضوع گفتگو سے ہٹ گئے ہیں۔ یہ نظریہ کی کمزوری ہے۔ آپ نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ملامت سے کیا حاصل اگر میں کسی فعل قبیح کی مرتکب ہو رہی ہوں تو اس کی سزا میں بھگتوں۔ آپ کا کہنا کس قدر بے معنی ہے کہ رشتہ کا توڑنا ناقابل عمل ہے۔ یہ فرمائیے خود آپ کا جی نہیں چاہتا۔ باتیں کیوں بناتے ہیں۔

جعفری: "میں موضوع گفتگو کے ہر پہلو پر سوچ چکا ہوں مگر آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے تاثرات کو ہر طریقہ سے مٹاؤں۔ جن ذرائع کو پیش نظر رکھ کر میں آپ کی خواہش پر عمل کروں وہ فضول ہیں نقصانات کا امکان بھی ہے ایسی صورت میں آپ کا کہنا ناقابل عمل نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے آپ سے کوئی تعلق نہیں آپ کی خواہش کی تکمیل سے میری اور آپ کے والد کی زندگی متاثر ہوتی ہے یہی نہیں بلکہ آپ کے سچے بہی خواہ کی جان معرض خطر میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی خاطر اس مہلک خطرہ کی ذمہ داری اپنے سر لوں۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔

بلقیس بیحد متاثر ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "آپ کا جی نہیں چاہتا آپ کی ہمدردی کی انتہا نہ تھی۔ ترحم کے لباس میں شفقت کارفرما تھی۔ مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا آپ کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ مجھے امید نہ تھی کہ آپ ایسی فضول مغز پاشی کی" بلقیس کا دل سونے لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ساری امیدیں مفقود ہو گئیں جو تھوڑی دیر پیشتر پیدا ہو کر اس کے لئے سامان مسرت بن گئی تھیں۔

جعفری بلقیس کے رونے سے پریشان ہو گیا۔ دلجوئی کرتا ہوا بولا "آپ تعلیم یافتہ ہیں بھلا اس رونے دھونے سے کیا حاصل۔ اس قدر زبردست انقلاب کی خواہش کرنے کی بجائے آپ اپنے دل کو سنبھالئے اگر زمانہ آپ کے ساتھ نہیں چلتا تو آپ زمانہ کے ساتھ چلنے کی کوشش کیجئے۔ سمجھ جائیے آپ مجھے ہی چاہتی ہیں اور چاہتی رہیں گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ کی کھوئی ہوئی مسرت واپس آجائے گی۔

بلقیس بیحد حقارت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

"میری محبت میں تلون نہیں ایک شریف عورت اپنا دل ایک ہی کو دے سکتی ہے۔ ہمارے مذہب کے بیہودہ رسم و رواج نے آپ کو مجھ پر اختیار دیدیا ہے آپ میرے جسم کے مالک ہیں مگر دل۔

جعفری جزبز ہو کر "اس کا میں طلب گار نہیں آپ کی محبت کا خواہشمند نہیں۔ میں سکون چاہتا ہوں۔

ہنس کر بلقیس بولی "آپ زبردست بھول کر رہے ہیں۔ تو کیا آپ کو سکون نصیب ہو گا؟ آپ کا گھر تمام عمر ماتم کدہ بنا رہے گا......"

جعفری: "آپ دل کو دبائے ہوئے بولا تیز نہ ہو یہ ساری مصیبتیں آپ کی لائی ہوئی ہوں گی۔ ورنہ جن سے خائف ہیں وہ دنیا کی ہوں گی۔ دلی جذبات دبائے جا سکتے ہیں۔ دنیا کا منہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ آپ چاہیں تو اپنی زندگی کے ساتھ میری اور اپنے پیارے والد کی زندگی شادماں کر سکتی ہیں۔

بلقیس: "میری زندگی تو عمر بھر خوشگوار نہیں ہو سکتی۔"

جعفری: "کم از کم ہماری خاطر"

بلقیس مایوس ہو گئی دل بگڑ کر بولی ظالم کہیں کے زمانہ آپ سے انتقام لے گا اور ضرور لے گا۔"

بلقیس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی جعفری نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ طوفان امنڈتا گیا۔

ایک ہفتہ بلقیس کے لئے انتہائی غم و اندوہ میں گزرا۔ دلگداز اور جگر سوز آہیں اس کے شدید کرب و اضطراب کا پتہ دے رہی تھیں اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ خودکشی کرے اور اس مسلسل جانکنی کی تکلیف سے نجات پائے۔ خودداری نے اسے اس بات سے باز رکھا۔ حریف کے مقابل خودکشی کو وہ اعتراف شکست سمجھتی تھی۔ جعفری کی گفتگو سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر اس سے شادی کی اور اس پر یہ مصیبت نازل کی۔ بلقیس کا سینہ میں شعلے بھڑکنے لگے ـــــ جس نے اس کی زندگی تلخ کی اسے زندہ درگور کر ڈالا اور وہ کسی کو چین سے جینے کے لئے نہیں چھوڑ سکتی اس کے لئے دنیا کو جہنم بنانے کا عزم کر چکی تھی۔

رفتہ رفتہ بلقیس کے رنج و الم میں کمی ہوتی گئی مگر نفرت و انتقام کی آگ اس کے سینہ میں تیز ہو رہی تھی۔ ظالم جعفری اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ بلقیس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ جو تہذیب و مذہب نے، سماج نے

مردوں کی بنائی ہوئی دنیا نے جعفری کو دیا ہے کیا وہ اختیار اس سے چھین نہیں سکتی!

اس اختیار کے سلب ہو جانے سے ہی اس کا مجروح دل صحت پا سکتا ہے۔ اس کی کملائی ہوئی تمنائیں تازہ ہو سکتی ہیں۔ اگر قدرت اس کا ساتھ دے تو دوسری قوت ہرگز دخل نہیں دے سکتی۔

برخلاف اس کے جعفری کا ہر عمل یہ خواہش لیئے ہوئے تھا کہ بلقیس کی ممکنہ دلجوئی کی جائے اس کو اتم اطمینان قلب حاصل ہو۔ اس نے بلقیس سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ اس کو مکمل آزادی دیدی۔ وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے جس سے ملنا چاہے مل سکتی ہے اور جو چاہے کر سکتی ہے۔ وہ بہت کم بلقیس کے ساتھ رہتا تاکہ اسے صحیح طور پر سوچنے، ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ملے اور اپنے غم کو جلد بھول سکے۔ ان کشیدہ تعلقات سے وہ ہر ایک کو اور بالخصوص تمام وکیل صاحب کو لاعلم رکھنا چاہتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس نے ایسی لڑکی سے شادی کی جو دوسرے کو چاہتی ہو۔

جعفری کا بلقیس کے کمرے میں رہنا بلقیس کے لیئے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ شادی کے بعد جعفری کی ہر رات بے خوابی بے کلی اور سراسیمگی میں گزرتی۔ راتوں میں اٹھ کر گھنٹوں وہ مجنون کی طرح ٹہلتا اور سوچتا رہتا۔ جب سوتا تو ایسی نیند کہ ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ یا معمولی کھٹک سے اس کی آنکھ کھل جاتی۔

بلقیس یہ سب جانتی تھی۔ شروع میں اسے جعفری کے اس رویہ پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ رنج و ملال کے ساتھ ساتھ اس کو اور باتوں کا احساس ہونے لگا۔ جعفری کی دوری اس کے لیئے غیر معمولی حیرت انگیز تھی۔ وہ خود کو اس کی مجبور بیوی اور اس کو اپنا مختار جانتی تھی۔ وہ اس اجتناب سے بیحد مسرور اور اسی درجہ ششدر بھی۔

دن گزار رہے تھے دونوں کے توقعات وقت کے ساتھ وابستہ تھے۔ دونوں کے آرزومند دل انقلاب چاہتے تھے۔ ایک کی امیدیں تخریبی تھیں اور دوسرے کی تعمیری۔ ایک دوسرے سے دور یاس و حسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ بلقیس کی صورت مرجھائے ہوئے پھول کی طرح بے رونق ہو رہی تھی۔ جعفری کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

تین ماہ گزر گئے اس دوران میں جعفری نے بلقیس سے گفتگو کرنا چاہا۔ پہلی بار بلقیس کمرے سے باہر چلی گئی دوسری بار جھنجھلا کر بولی "آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجئے میں سن رہی ہوں"۔

جعفری نے کہا "میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں"۔ بلقیس تنگ آکر بولی "مجھ سے گفتگو کفتگو تو ہو چکی۔ میں آپ کا دماغ چاٹنا نہیں چاہتی آپ مجھے دق نہ کیجئے"۔ یہ تھی جعفری کی تین مہینے کی دلجوئی اور ضبط کی تاثیر وہ بھنا گیا لیکن تحمل ہی کو بہتر جانا

ایک دن دفتر سے واپسی پر جعفری سے کلثوم بی (بلقیس کی انّا جو ساتھ تھی) نے کہا "ناصر میاں آئے تھے" (ناصر بلقیس کا محبوب اور چچیرا بھائی ہے) سلام کہہ گئے ہیں۔ جعفری معلوم ہوا کہتا ہوا چار قدم کمرہ کی طرف بڑھا پھر رکا اور پلٹ کر پوچھا بلقیس مجھ سے کہہ دیتیں تم نے کیوں تکلیف کی۔ کلثوم بی نے سادگی سے کہا "بی بی ان سے نہیں ملیں" (جعفری بھی سننا چاہتا تھا بلقیس سے معلوم ہو جانے کا تو بہانہ تھا) جعفری نے حیرت سے پوچھا "کیوں" کلثوم بی بولی "بی بی نے کہلا بھیجا میں نے سامنے نکلنے کی اجازت نہیں لی ہے"۔ جعفری دل میں مرتب رسم و رواج کا اس قدر پاس۔ شادی کی رات کے بعد پہلی دفعہ جعفری کے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جعفری تیزی سے کمرہ میں داخل ہوا اور بیساختہ کہنے لگا "معلوم ہوا ناصر آئے تھے! آپ نے انہیں اندر کیوں نہیں بلایا۔ یہ کیا غضب کیا۔" پر غور پر وہ بلقیس کی صورت غور سے دیکھ رہا تھا۔ بلقیس ساکت و صامت تھی۔ "ناصر تو آپ کے بھائی ہیں"......... چلئے ابھی آپ ان سے معافی چاہیں۔

.... آج پہلی دفعہ جعفری نے بلقیس کے چہرہ پر خون دوڑتا ہوا دیکھا..... پھر جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو بلقیس تیار تھی۔ رات میں دونوں واپس ہو گئے۔

دوسرے دن صبح میز ناشتہ پر بلقیس نے پہلی مرتبہ گفتگو میں پہل کی۔ بلقیس گردن جھکائے ہوئے بولی "میں آج اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

جعفری زیر لب تبسم سے "آپ اپنے گھر میں ہی ہیں۔"

بلقیس جھینپی لیکن فوراً تیور چڑھ گئے "زندہ در گور ہوں۔"

جعفری ان تلخیوں کا عادی سا ہو گیا تھا مسکرا کر بولا "میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

بلقیس "خود کردہ را علاج نیست۔"

جعفری جیسے سنا ہی نہیں "آپ شوق سے جا سکتی ہیں۔"

بلقیس "ناصر جب تک رہیں بس وہیں رہوں گی۔"

جعفری "آپ کو اختیار ہے۔"

ناصر کی موجودگی سے بلقیس کے تن مردہ میں جان پڑ گئی اس کے شباب کی رنگین آرزوؤں اور تمناؤں کا پیکر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ لیکن وہ اس سے بہت دور تھا اس قدر قرب اور اتنا بعد۔ بلقیس کی روح بے چین ہو گئی۔ محرومی اور بدقسمتی کا احساس شدت سے تازہ ہو گیا۔ ناصر کے جانے کے بعد بلقیس مستحکم عزم و استقلال کے ساتھ اپنے گھر لوٹی جعفری نے دیکھا اس قلیل مدت میں بلقیس کا رنگ و روپ نکھر گیا ہے۔ بلقیس نے محسوس کیا کہ جعفری لاغر سا اور لاغر ہو گیا ہے۔

بلقیس انقلاب کے آثار کو اپنے موافق پا رہی تھی اب اس کو صبر کا یارا نہیں تھا وہ عجلت چاہتی تھی۔ قدرت کی سست رفتاری سے وہ بوکھلا رہی تھی نہیں معلوم ابھی کتنے مہینے، کتنے سال آزمائش میں گزریں گے۔ جعفری نے بھی محسوس کیا کہ ان دنوں بلقیس کا رنگ بدلا ہوا ہے وہ کسی تشویش اور الجھن میں گرفتار ہے۔ دن میں اکثر وہ پلنگ پر پڑی رہتی راتوں میں کم سوتی اور بہت بے کل رہتی۔ بلقیس کیا سوچ رہی ہے۔ کونسے خیالات اس کے دماغ

[illegible] جعفری [illegible] [illegible]

[illegible] جعفری کلب سے واپس ہوا بلقیس [illegible] جعفری کو [illegible] طرف آتا ہوا دیکھ کر بلقیس [illegible] کلثوم بی سے بولی میں کھانا کھاؤں گی۔ جعفری [illegible] ہو کر کمرہ میں پہنچا بلقیس بیٹھی تھی چہرہ تمتما رہا تھا۔ جعفری نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا میرا خیال صحیح ہے کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس شروع ہو گیا۔"

بلقیس چین بجبیں ہو کر "آپ ہی غلطی پر ہیں۔ آپ سے دوسری بار اور .... آخری بار میں التجا کرتی ہوں۔

جعفری افسردہ ہو گیا "میں سننے کو تیار ہوں مگر جانتا ہوں فضول ہے (کلثوم بی کی طرف مڑ کر) تم باہر جاؤ۔

بلقیس اضطرار سے "نہیں نہیں آپ سوچئے۔ ضد سے باز آیئے۔ میری اور ناصر کی زندگی تباہ نہ کیجئے۔ رحم کیجئے!

جعفری تندی سے بولا "میں ضد کر رہا ہوں؟ میں زندگیاں تباہ کر رہا ہوں؟ اور آپ تو کچھ سمجھنا نہیں چاہتیں۔

بلقیس بھی تندی سے بولی "میں سوچ چکی۔ آپ ایک بے درد ظالم انسان ہیں۔

جعفری "جیسی ہمدردی آپ چاہتی ہیں۔ وہ ظلم ہے میں ظلم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

بلقیس لال ہو گئی "انتہائی مجبوری جنون خیز ہوتی ہے اب مجھے مجبور نہ کیجئے۔ میں ہر وہ عمل کرنے پر آمادہ ہوں جو مجھے آپ کی قید سے نجات دلائے۔

جعفری، بلقیس کو دیکھ کر "دھمکی نہ دیجئے۔ آپ جو چاہے کر سکتی ہیں۔"

بلقیس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھی۔ بالکل خاموشی میں دونوں نے کھانا کھایا۔ جعفری گردن جھکائے ہوئے تھا۔ پیشانی پر شکنیں تھیں۔ بلقیس کے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد جعفری اٹھا کلثوم بی باہر ہی تھی جعفری گلاس میں پانی ڈال کر گلاس منہ کو لگایا ہی چاہتا تھا کہ بلقیس نے ہرن

کی طرح چھلانگ ماری اور گلاس پر ہاتھ مارا۔ گلاس نیچے گر کر پاش پاش ہوگیا ساتھ ہی اس نے جگ کو بھی زمین پر ٹپک دیا۔ جعفری تعجب سے بلقیس کو دیکھنے لگا۔ جس پھرتی سے بلقیس آئی تھی۔ اتنا ہی آہستہ وہ واپس ہوئی۔ جعفری زرد پڑ گیا طنز سے بولا " یہ کیا کیا تم نے بلقیس وہیں آواز سے (جعفری کو خشمگیں نظروں سے دیکھ کر) میں جو چاہے وہ کرتی ہوں۔

جعفری " حقارت سے بولا " کاش آپ کا قہر و غضب مجھ ہی پر اترتا جگ کی طرح آپ مجھے پاش پاش کر ڈالتیں (زہر خندہ) ۔

بلقیس زخمی شیرنی کی طرح بپھر کر بولی " عورت کا انتقام بڑا خوفناک ہوتا ہے۔

جعفری طنز سے بولا ہم بھی دیکھیں گے۔

بلقیس اسی طرح طنز سے بولی " یہ تو میں دیکھ رہی ہوں"

بلقیس اندرونی ہیجان سے بے قابو ہو رہی تھی؛ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے وہ دوڑتی ہوئی پلنگ پر گر پڑی اور زار زار رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

وہ جانتی تھی کہ مذہب و تمدن کے قوانین کا توڑنا ناز برداشت اخلاقی گناہ ہے۔ لیکن موجودہ شکنجہ سے رستگاری کا زہر سے زیادہ موزوں و مرجح طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مجبوری و جنون میں وہ اس گناہ عظیم کی مرتکب ہونے والی تھی لیکن نسائی فطری کمزوری یکایک آندھی کی طرح اٹھی اور اس کے عزم کو ہلا ڈالا۔

اس واقعہ کے بعد بلقیس کے جنون و وحشت میں کمی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں موتی پرونے لگیں اس کی زندگی یاس و ناامیدی میں بسر ہونے لگی۔ مذہب اس کی مدد نہیں کرتا تھا۔ قدرت اس کا اعتماد کھو رہی تھی اس کو اپنا انجام غیر یقینی اور زیادہ بھیانک نظر آنے لگا۔

جعفری سوچ رہا تھا کہ اس نے بلقیس کا غلط اندازہ لگایا مفت میں دردسری لے لی اجوائی جیسی شیریں اور گراں بہا چیز جھوٹی بازی میں لگا دی۔ اس واقعہ نے اسے یقین دلا دیا۔ یہ تیقن جاں گسل اور دل شکن ثابت ہوا۔ بدمزگی اور تکان کے آثار جعفری کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔ دن بدن اس کی صحت گرتی گئی۔ وہ علیل ہوگیا۔ رنج نے اس کو کمزور کر ڈالا۔ "مالیخولیا" کا اس پر سخت حملہ ہوا۔

اس زمانہ میں متضاد جذبات بلقیس کے دل میں سلجھ دوڑ رہے تھے۔ اس خاص واقعہ سے وہ بیحد متاثر تھی۔ اس خیالات میں سکون پیدا ہو رہا تھا کہ جعفری بیمار ہوگیا ــــ قدرت اس کے جذبات اور اس کی زندگی سے کھیل رہی تھی۔ جعفری کی علالت پر وہ خوشی سے ناچنے لگی۔

جعفری کا اصرار تھا کہ اسے دواخانہ بھیج دیا جائے۔ اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ اسے دواخانہ بھیجدیا گیا۔ جعفری نے جاتے وقت بلقیس کو قریب بلایا اور بولا " بلقیس اب آپ ہر طرح آزاد ہیں۔

بلقیس بیتاب ہوکر بولی " نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا" وفور جذبات سے وہ بیہوش ہوگئی۔

زندگی اسے خوفناک نظر آرہی تھی۔ دن گزرتا تو رات سے وہ خائف ہو جاتی رات ختم ہوتی تو دن اسے بھیانک معلوم ہوتا مسلسل روح فرسائی اور پیہم قلبی اذیت سے وقت گزار رہی تھی۔ ہر وقت وہ قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے تیار تھی۔ قدرت اب بھی "حل انکاری" سے کام لے رہی تھی بلقیس متحیر تھی کہ اس زبردست جاں سوزی کی حالت میں اس کی توانائیوں نے جواب کیوں نہیں دیا۔

مکمل ۲۵ دن کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ جعفری موت کے پنجے سے نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے کھوسی گئی۔ عورت کا زہریلا انتقام جس پر اس کی ساری امیدوں کا دارومدار تھا کامیاب نہ ہوسکا اور جبکہ وہ جعفری کی شخصیت سے متاثر ہوچکی تھی۔ قدرت نے (جس سے بلقیس کی آس ٹوٹ چکی تھی) جعفری پر بے موقع اور بے نتیجہ وار کیا۔ وہ سوچنے لگی۔ کیا فی الحقیقت دنیا کو

جعفری کے وجود کی ضرورت ہے۔ کیا دنیا اس سے کسی مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہتی ہے۔ جعفری جو کچھ کہہ رہے تھے کیا وہ صحیح ہے۔ اس کے پہلے زاویہ نگاہ کی طوفانی واقعات کے پرزور جھکولوں نے جڑیں ڈھیلی کر دیں۔ جعفری کی صحت کی اطلاع نے اسے اور بھی مایوس کر دیا۔

خیالات نے کروٹ لی۔ نئی روشنی کی فضاء میں اس نے موجودہ حالات کا جائزہ لیا۔ پہلے واقعات کی رو کے اثر میں وہ جعفری کے ساتھ دواخانہ جانا چاہتی تھی لیکن اس کے والدین نے اسے روکا۔ اب جبکہ جعفری اچھا ہوگیا تھا۔ بلقیس دواخانہ جانا چاہتی تھی اور یہ وہ سوچ رہی تھی کہ جب ضرورت تھی میں نہیں گئی اب کیا منہ لے کر جاؤں۔ وہ خود ہی آجائیں گے۔

کچھ دنوں بعد بلقیس کو اطلاع ملی کہ جعفری دواخانہ سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس کو دلی تکلیف ہوئی۔ وہ اس کا انتظار کررہی تھی۔ بن بلوائے جانا ٹھیک نہیں۔ خودداری نے اسے اجازت نہیں دی۔ جعفری کی طرف سے بالکل سکوت تھا۔ ماں باپ مجبور کررہے تھے چند دن اس نے انتظار کیا۔ آخر چلی گئی۔

جب بلقیس کمرہ میں داخل ہوئی تو دیکھا۔ ناصر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ جعفری پلنگ پر دراز ہے۔ ایک گوشت و خون کا تنومند مجسمہ دوسرا پوست و استخواں کا مضمحل ڈھانچہ بلقیس نے دونوں کو غور سے دیکھا ناصر سے پوچھا "آپ کیسے" ناصر (جعفری کو بتاکر) "آپ کی علالت کی خبر ملتے ہی فوراً ادھر آگیا۔ تشریف لائیے۔" ایک کرسی ناصر کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ بلقیس کرسی کی طرف بڑھی۔ مڑکر وہ جعفری کے پائنتی پلنگ پر بیٹھ گئی .... گویا مذہب کی معین کردہ جگہ اسے مرغوب ہوگئی۔ اس کے متزلزل قلب نے یکسوئی کی راہ میز کرلی۔ قدرت کے کھلونا بننے کا اس میں حوصلہ نہیں رہا۔

جعفری نے بلقیس کے پلنگ پر بیٹھنے پر نہ کوئی اعتنا کی اور نہ اس کی جگہ کے انتخاب پر غور کیا۔ اس کے خوفناک عزائم اور ہولناک استقلال نے جعفری کے ارادوں کو شکست دیدی۔ کمرہ میں بالکل سکوت تھا۔ ناصر کے جانے کے بعد بھی یہ سکوت قائم رہا۔ جعفری اور بلقیس اس وقت ایک ہی پلنگ پر تھے۔ دونوں مختلف نفسیوں میں گھوم رہے تھے۔ جعفری نے سکوت توڑا۔

جعفری: "میں آپ کو خط لکھنے والا تھا"

بلقیس: "میں بغیر بلائے آگئی۔ فرمائیے"

جعفری روکھے پن سے بولا: "میں آپ کو بلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تصفیہ کرچکا ہوں کہ آپ کو مذہب کے قید و بند سے آزاد کردوں۔ یہ میرا اعتراف شکست ہے۔ انتقام کا رخ پلٹ گیا۔

بلقیس نے جعفری کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی مگر صرف انگلیاں چھوسکیں۔ جعفری بلقیس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی کہ کچھ دیکھنا چاہا۔

"بلقیس سرگوشیانہ انداز میں بولی میں آپ کی قید کو آزادی پر ترجیح دیتی ہوں۔ اعتراف شکست بے عمل ہے بلقیس نے نظریں نیچی کرلیں۔

جعفری کی بھویں تن گئیں "ایثار .... قربانی .... نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ میں برداشت کرسکتا .... میں ان آنکھوں میں ندامت دیکھنا چاہتا ہوں۔

بلقیس لجاجت سے بولی "تو دیکھئے ان آنکھوں میں سوائے ندامت و انفعال کے اور کچھ نہیں جعفری نے زبان سے زیادہ آنکھوں میں اظہار تمنا دیکھا۔

جعفری "میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ حقیقت ہے یا خوشگوار خواب۔

بلقیس بولی "اب میں جاگ گئی۔

جعفری بلقیس کو غور سے دیکھ کر بولا "آپ بدل جائیں گی! مجھے اس کی کوئی امید نہ تھی۔ کمزوری کا اعتراف کرنا بڑے دل کا کام ہے۔ بلقیس بیحد پشیمان تھی۔ لیکن وہ اس فضا کو جلد از جلد صاف کرلینا چاہتی تھی بولی "یہ سب میرا قصور تھا۔

جعفری: "خدا کا شکر ہے"

بلقیس: "تفصیلات میں نہ جانے میں جان گئی آپ غیر معمولی انسان ہیں۔ ضبط و تحمل کا مکمل نمونہ۔

جعفری: "شکریہ۔

بلقیس حیرت سے "وہ کیوں؟"

جعفری: پہلے میں آپ کا دل جیتنا چاہتا تھا..... جو آسان نہ تھا۔ میں نے دل جیت لیا۔

"سچ!" بلقیس اس خیال میں کھوسی گئی۔

ابوالظفر عون اللہ ظفر

غزل

پیغام دے رہی تھی فنا کا بقا مجھے
آخر بقا کی دھن نے کیا ہے فنا مجھے

وہ آگئے تو ہوگئی حاصل شفا مجھے
حیران ہو کے دیکھ رہی ہے قضا مجھے

کچھ کہہ گئی ہے کان میں جب سے صبا مجھے
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

خنجر نے تیرے جب سے کیا آشنا مجھے
میرے لہو سے آتی ہے بوئے وفا مجھے

آباد دل کیا میرا احسان ہے تیرا
رہ رہ کے یاد آتی ہے تیری جفا مجھے

زلفِ سیاہِ یار ہے یا مار آستین
جینے کہیں نہ دیگی یہ کالی بلا مجھے

دن رات ہجر میں تیرے آنکھیں ہیں اشکبار
کب چین لینے دیگی یہ آہ و بکا مجھے

غیروں کی بیوفائی کا یعنی ہے کیا گلہ
خود میری جان دے گئی آخر دغا مجھے

سید غوث الدین غنی

ڈرامہ گلزار نسیم (نثری ضرورتاً کہیں کہیں نظم)

[سرد ہوائیں، پرندوں کی چہک، آبشار کا گرنا]

تاج الملوک۔ شہزادے! دیکھ لیا باپ کی شفقت، ماں کا
پیار، بھائیوں کی محبت۔ اب تجھے آگے بڑھنا ہے،
اپنی دنیا آپ بناتی ہے۔ اپنے پر اعتماد کرنا سیکھ،
.... یہ کیا بھی بچی بچی مچا رکھی ہے۔ (جھینگر جھینگے کی آواز)

سپاہی۔ (اپنے ساتھی سے) ابھی تک شہزادوں کا پتہ نہیں چلا۔
جانے کہاں غائب ہو گئے۔

دوسرا سپاہی۔ چلو، اب ڈھونڈنا فضول ہے۔ شام بھی ہو چکی۔

تاج الملوک۔ کس کی تلاش ہے۔

سپاہی۔ تم نے ہمارے شہزادوں کو دیکھا ہے۔

تاج الملوک۔ شہزادے! مطلب۔

سپاہی۔ کئی دن سے لاپتہ ہیں۔

تاج الملوک۔ کہاں کے شہزادے ہیں۔

سپاہی۔ شہنشاہ زین الملوک کے فرزند ارجمند ہیں۔

تاج الملوک۔ شہنشاہ تاج الملوک کے فرزند!

دوسرا سپاہی۔ ہاں! گل بکاؤلی کی تلاش میں نکلے ہیں۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

بیسوا۔ کون۔

تاج الملوک۔ میں شہزادہ تاج الملوک۔

بیسوا۔ (خوشی کے لہجے میں) تشریف لائیے۔ فرمائیے
کیسے زحمت کی۔

تاج الملوک۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے، سنا ہے کہ شطرنج میں
کمال حاصل ہے۔

بیسوا۔ (انکسار کے لہجہ میں) ذرہ نوازی ہے۔ خواہ مخواہ کے
لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے۔

تاج الملوک۔ تو ایک بازی ہو جائے۔

بیسوا۔ خوب۔

(جنگل سناٹا۔ دور سے خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں۔
جیسے الو چیخ رہے ہوں)

تاج الملوک۔ اُف میں کس خوفناک جنگل میں پہنچ گیا۔ اے خدا
اب تو ہی بچا۔ (دور سے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز
سنائی دیتی ہے)

دیو۔ (خوفناک آوازیں) اہا۔ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں
اُدھر آدم زاد۔ اِدھر اونٹ۔ پہلے کس کو نوالہ بناؤں۔
پہلے اونٹ کو چٹ کر لیں، بعد میں حضرت آدم کی
خبر لیں۔ قہقہہ۔

تاج الملوک۔ اے خدا تو ہی میری زندگی کا محافظ ہے، تجھے
بچائے ——— اونٹ۔ دیکھیں اس میں کیا ہے ——— نیچا!

دیو۔ (قریب آ کر) کیوں یہاں صاحبزادے۔

تاج الملوک۔ آداب بجا لاتا ہوں چچا جان۔

دیو۔ اپنے چچا کے لئے کیا رکھا ہے۔

تاج الملوک۔ ایسی چیز ہے بس آپ یاد ہی کرتے رہیئے گا ———
فرمائیے کیسی چیز ہے۔

دیو۔ (خوشی کے لہجہ میں) بڑی مزے کی ہے ——— آج ہم
تجھ سے بہت خوش ہیں۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔

تاج الملوک۔ چچا ——— لیکن آپ وہ چیز نہیں دے سکتے

دیو۔ (غصہ سے) ہم ضرور دیں گے۔ مانگ۔

تاج الملوک۔ چچا دل میں ایک ہی آرزو ہے۔

دیو۔ وہ کیا۔

تاج الملوک۔ باغ ارم کی سیر

دیو۔ باغ ارم کی سیر! یہ سودا کب سے پیدا ہوا۔ جانتا
ہے وہ کس کا باغ ہے۔

تاج الملوک۔ جی ہاں ——— آپ کی مدد درکار ہے۔

دیو۔ افسوس ——— خیر ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ (تالی
بجاتا ہے)

دوسرا دیو۔ حضور

دیو۔ اسے حمالہ دیوی کے ہاں لیجا اور یہ رقعہ دیدے۔

دونوں دیو۔ بہت خوب۔

حمالہ دیونی۔ (محمودہ کو آواز دیتی ہے) محمودہ، محمودہ۔

محمودہ۔ جی۔

حمالہ دیونی۔ خوش ہوجا۔ تیرا ہم جنس آگیا۔

محمودہ۔ سچ۔

تاج الملوک۔ (عالم بےخیالی میں) اُف کیسی سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔

محمودہ۔ (معشوقانہ لہجہ میں) ایسی ہی ہوا سے کلیاں کھلتی ہیں۔ پھول ہنستے ہیں جن کی خوشبو سے سارا چمن مہک اٹھتا ہے۔

تاج الملوک۔ اور جس کے دل کا چمن ہی اجڑ گیا ہو ــــــ کاش میرے دل کا کنول بھی کھل جاتا۔

محمودہ۔ کنول! کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ اتنے اداس کیوں ہیں۔ فرمائیے کیا میں آپ کی کوئی خدمت کرسکتی ہوں۔

تاج الملوک۔ خدمت! ــــ قہقہہ۔ مرد کی بھی ایک ہی کہی۔

محمودہ۔ آپ کی باتوں سے مجھے تو ہول ہوتا ہے۔

[نکاڑ، رام، ہواؤں کے تیز جھونکے، ملے اڑ کر ہوئے فوارے۔ درختوں کی ڈالیوں کو ہٹانے کی آواز۔]

ڈالی سے پھول توڑنے کی آواز۔

تاج الملوک۔ (خوشی کے لہجہ میں) اہا۔ میں کتنا خوش ہوں۔ اے نورانی دنیا، تیری ہر چیز کتنی حسین ہے۔ جس پھول کی خواہش نے مجھے تیری نورانی سرزمین میں لائی میں نے وہ پھول حاصل کرلیا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے میں بلندیوں پر اڑا جا رہا ہوں ــــــ یہ کیا۔ یہ تم ہو۔ اے حسن کی ملکہ دلنواز۔ تم ہی بکاؤلی ہو۔ جن کی تعریف سنا کرتا تھا ــــــ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اس فتنۂ خفتہ کو بیدار کرتا۔ درختوں کے کسی جھنڈ میں، نہر کے کنارے، ہریالی کے مخملیں فرش پر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنتے زندگی گزار دیتے۔ جانے تم عالم خواب میں کن حسین خیالوں کی دنیا میں سیر کر رہی ہوگی۔ اور میں یہاں کھڑا تمہارے قریب حسن کی پیرا رہا ہوں۔ صبح تم اٹھوگی تمہیں اس کا بھی علم نہ ہوگا کہ رات کسی نے تمہیں اس حال میں دیکھا۔ کہ اگر تم خود بھی اپنے آپ کو دیکھیں تو شرما جائیں ــــ دلہن ــــ ایک! جانے سے پہلے ہم تمہیں اپنی ایک نشانی دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ ہماری یاد تمہاری زندگی بن جائے۔

[زین الملوک کے لڑکے پائے تخت کو واپس ہوتے ہیں]

ایک بھائی۔ .... واہ رے مقدر

کس شکل سے پھر کر جاتے ہیں گھر

کیا رنگ زمانے نے دکھائے

گل لینے گئے تھے، داغ لائے

کس منہ سے پدر کے آگے جائیں

کیونکر لے پھول نہ دکھائیں

دوسرا بھائی۔ .... اور پھول لیجائیں

کحال کو بے وقوف ٹھہرائیں

ایک بھائی۔ کیا پھول ہے کیا اثر ہے اس میں

ہوجاتی ہیں روشن اندھی آنکھیں

فقیر۔ (بڈھی آواز میں) صاحبزادے۔ یہ پھول وہ نہیں ہے جس سے آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔ وہ گل بکاؤلی ہے۔

دوسرا بھائی۔ گل ہے کہ علاج نور ہے یہ

گل ہے کہ چراغ طور ہے یہ

تاج الملوک۔ بکو نہیں۔ پاتے اگر اس درخت کی چھاؤں پر رکھتے ہی نہ تم زمیں پر پاؤں۔ ڈینگ آپ کی سب فضول ہے یہ، وہ گل یہ نہیں وہ پھول ہے

دونوں شہزادے۔ خوب۔

فقیر۔ ہاں، ہاں وہ پھول یہی ہے۔

ایک بھائی۔ چھین لو۔

دوسرا بھائی۔ پکڑ لو، جانے نہ پائے۔

تاج الملوک۔ اس طرح حملہ کرتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔۔۔۔
چھوڑ دو ۔۔۔۔ (لڑائی کی آواز)
کوتوال۔ (بکاؤلی) جہاں پناہ! اس پائے تخت اندر مدت
میں ایک بے مثل محل تیار ہوا ہے۔
بادشاہ۔ بے مثل، کیا بک رہا ہے۔
کوتوال۔ اَن داتا۔ سچ کہہ رہا ہوں، ہر روز بے حساب خیرات
تقسیم ہوتی ہے۔
بادشاہ۔ (زین الملوک) جھوٹ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، ہماری
برابری کوئی بھی نہیں کر سکتا۔
وزیر۔ (شیریں نسوانی آواز میں) حضور! ہو سکتا ہے۔
بہتر ہے کہ چل کر دیکھ لیں، حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا۔
بادشا۔ خوب۔
تاج الملوک۔ حضور نے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر رونق بخشی۔
زین الملوک۔ ہم نے تمھاری داد و دہش کی بڑی تعریف سنی ہے۔
تاج الملوک۔ قدر کو نوازی ہے، حضور کے کئی فرزند ارجمند تھے۔
زین الملوک۔ یہ چار عنصر خلافت

ایک اور ہوا تھا قابل چشم
وہ نور بصر تھا دشمن چشم
جب لانے یہ گل بکاؤلی کا
نکلا تب خار روشنی کا

تاج الملوک۔ حضور آخر اب وہ کہاں ہے، کیا حضور نے کبھی
اس کی خبر لی۔
زین الملوک۔ ہمیں کوئی خبر نہیں، کیسا ہے کہاں ہے۔
تاج الملوک۔ کیا کوئی اس شہزادے کو جانتا ہے۔
ایک آدمی۔ حضور! یہ وہی تاج الملوک ہے، جن کو حضرت
پیرو مرشد نے اپنی نظروں سے گرا دیا تھا۔
زین الملوک۔ میرے بیٹے۔
تاج الملوک۔ حضور ابا
زین الملوک۔ میرے بیٹے، اٹھو، اپنا سر اٹھاؤ، مجھے شرمندہ نہ کرو۔
تاج الملوک۔ حضور آپ سے اور بھی نیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

زین الملوک۔ اجازت ہے تخلیہ۔
تاج الملوک۔ دلبر محمودہ۔
دلبر۔ حضور جان کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کروں۔
زین الملوک۔ اجازت ہے۔
دلبر۔ حضور ان شہزادوں نے آپ کو دھوکا دیا۔ پائے تخت سے
نکل کر میری قید میں گرفتار ہوئے۔ شہزادے تاج الملوک
نے تکلیفیں برداشت کر کے گل بکاؤلی کو حاصل کیا اور
پائے تخت روانہ ہوئے۔ راستہ میں ان شہزادوں
نے پھول کو چھین لیا اور آپ کے ہاں سرخرو ہوئے۔
زین الملوک۔ بیٹا۔
تاج الملوک۔ حضور ابا!
زین الملوک۔ بیٹا تم نے مجھے اپنی کھوئی ہوئی روشنی دلائی،
اب اپنی ماں سے ملو، جو تمھاری یاد میں گھل رہی ہے۔
تاج الملوک حضور ابا۔
بکاؤلی شہزادے
تاج الملوک بکاؤلی!
بکاؤلی۔ (شیریں نسوانی لہجہ میں) کیوں جی تمھیں لے گئے تھے دل

کیا کہتی ہوں میں ادھر تو دیکھو
مری طرف اک نظر تو دیکھو
ہے یا نہیں یہ خطا تمھاری
فرمائیے کیا سزا تمھاری

تاج الملوک۔ (خوشی کے لہجہ میں) رضا ہے جو خوشی ہو

عاشق کی سزا پوچھتی ہو
مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ
تلوار سے جو قتل ہو منظور
ابرو کے اشارے سے کر دو چور
زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو
اپنے دل تنگ میں جگہ دو

بکاؤلی۔ (شیریں لہجہ میں)
گلچیں تو نہیں فقط چمن کا، محرم ہے سارے تن بدن کا

رخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں
منہ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

(بکاؤلی کی سہیلیاں بکاؤلی کو سمجھانے لگتی ہیں)

ایک سہیلی۔ ثابت اثر کچھ ستارے کا ہے
اس چاند کو کیا گہن لگا ہے۔
رحم اپنی جوانی پر ذرا کر
منہ دیکھ تو آئینہ منگا کر

دوسری سہیلی۔ صورت تری زار ہو گئی ہے
گل ہو کے تو خار ہو گئی ہے
ہے ہے تیری عقل کس نے کھوئی
تاجنس کو چاہتا ہے کوئی

بکاؤلی۔ رنجور جو ہوں تو میں تمھیں کیا
مجبور جو ہوں تو میں تمھیں کیا
تا مری حالت اب روتا ہے
بہتر ہے وہی جو کچھ بری ہے
بلبل اسی شاخ گل کی ہوں میں
تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں
بیماری عشق لا دوا ہے
اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

سہیلیاں ہنستی ہیں۔ ایک تان دیتی ہے۔
اب تو عشق سر پہ چڑھ کر بول رہا ہے: قہقہہ۔

بکاؤلی۔ روح افزا، خیر تو ہے۔
روح افزا۔ بول مٹھائی کھلاؤ گی۔
بکاؤلی۔ کس خوشی میں۔
روح افزا۔ بڑی مزے کی بات ہے۔
بکاؤلی۔ بتا تو۔
روح افزا۔ چچی جان نے مان لیا۔
بکاؤلی۔ مان لیا۔ کیا مان لیا۔
روح افزا۔ تیرا بیاہ۔
بکاؤلی۔ تیرا بیاہ! کیا بک رہی ہے۔

روح افزا۔ تیرا بیاہ بشر کے ساتھ۔
بکاؤلی۔ سچ ——— اہا۔ اب میں کتنی خوش ہوں۔

(تاج الملوک ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے ——— بکاؤلی پوچھتی ہے۔)

تاج الملوک۔ (ہنسی)
بکاؤلی۔ خیر تو ہے۔
تاج الملوک۔ (ہنسی)
بکاؤلی۔ سبب۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے۔
کوئی بے سبب نہیں ہنستا

تاج الملوک۔ خواب دیکھتا تھا ——— آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بکاؤلی۔ ہم تائیں تعبیر ——— دل سوزی کرے گا کوئی دیگر
تاج الملوک۔ رات کو افق میں ——— خورشید تھا آتش شفق میں
بکاؤلی۔ مہر ہے شمع روز ——— عالم میں سدا رہو گے روشن افروز
تاج الملوک۔ اک مقام ہو تھا ——— گلزار خلیل روبرو تھا
بکاؤلی۔ بشر ہو تم ولادہ ——— سرسبز رہو تم قوم آتشی پہ
تاج الملوک۔ دیکھتی کا شعلہ ——— شعلہ ہو انجمن میں رقصاں
بکاؤلی۔ وہ شعلہ میں پری ہو ——— جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
تاج الملوک۔ جب ہوا اجالا ——— بخشا مہ انجمن نے ہالا
بکاؤلی۔ ہالہ مہ انجمن کا کیا تھا ——— وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا

لائیں یہ کیا۔

تاج الملوک۔ ہار نکلتا (ہنستے لگتا ہے) کیوں جی یہ اکیلے شب کو ہلا
اوپر اوپر مزے اڑانا!

بکاؤلی۔ ——— (سن اے صلاح دشمن) میں جا کے جلی تو غم نہیں ہے
ڈر ہے کہ نہ تجھ پر آنچ آ جائے

تاج الملوک ——— میرے جلنے پر خاک ڈالیے، تم نام نہ واں کے جلنے کا لو
یہ نہ ہو کا مجھ سے کہیں دو قدم آگے ہو گا مجھ سے

(راجہ اندر کا محل، گانا بجانا۔ گھنگرو کا ناچ۔ راجہ کا خاموش مسکرانا۔)

راجہ اندر۔ ہم بکاؤلی کا گانا سننا چاہتے ہیں۔
بکاؤلی۔ کورنش بجا لاتی ہے۔
راجہ اندر۔ کوئی اچھی سی غزل۔

بکاؤلی۔ ستار، سارنگی کی گت پر غزل شروع کرتی ہے۔

ساقی قدح شراب دے دے
مہتاب میں آفتاب دیدے
ساقی باقی جو کچھ ہو لے لے
باقی سب ساقی شراب دیدے
اس بت سے نہیں سوال کچھ۔ اور
اپنے منہ سے جواب دیدے
لیلیٰ میں نے تجھے بنایا
مجنوں مجھ کو خطاب دیدے
اس گل سے بکاؤلی زر نہ مانگ
جو چاہے وہ بے حساب دیدے

راجہ اندر۔ واہ واہ، کمال کر دیا۔ مانگ، کیا مانگتی ہے۔

بکاؤلی۔ حضور۔

راجہ اندر۔ مانگ۔

بکاؤلی۔ حضور ——— تاج الملوک!

راجہ اندر۔ تاج الملوک۔ بے شرم، بے حیا۔ یہ مجال، لیجاؤ اس کو میری نظروں سے دور کر دو، دور پھینک دو۔

بکاؤلی۔ مہاراج!

راجہ اندر۔ بارہ برس تک تو پتھر کی مورت بن جا۔

بکاؤلی۔ مہاراج!

(ہل جوتنے کی آواز۔ دہقان کا بیلوں کو ہانکنا)

تاج الملوک۔ بکاؤلی! ——— بکاؤلی!

بکاؤلی۔ کون ——— آپ ——— شہزادے۔ یہاں کیسے۔

تاج الملوک۔ بکاؤلی۔ بتاؤ تم ہی بکاؤلی ہو۔ کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں، تم کو پاکر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔

بکاؤلی۔ کیوں جھوٹ کہتے ہو شہزادے۔ میں جانتی ہوں، اس لئے تو آپ نے رانی سے شادی کی۔

تاج الملوک۔ مجبوری۔

بکاؤلی۔ مجبوری! ——— خوب۔

تاج الملوک۔ بکاؤلی، زخموں پر نمک نہ چھڑکو، میں شرمندہ ہوں۔ میں مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے رانی سے شادی کر لی۔ چھوڑو ان واہیات باتوں کو، آؤ کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر پیار کی باتیں کریں۔

بکاؤلی آپ چلئے، میں ابھی آئی۔ بابا کو روٹی دیکر آتی ہوں۔ آپ میرا انتظار کیجئے۔

دہقان: (غصہ سے) یہ بات ہے، کیوں جوانی زور کرنے لگی۔

بکاؤلی۔ بابا۔

دہقان۔ مکار، دور ہو،

بکاؤلی۔ بابا۔ یہ میرے شوہر ہیں۔

دہقان۔ (حقارت سے) شوہر! بتاتا ہوں، تو سمجھتی ہے کیا تو ایسے ہی بیاہی جائے گی۔ تجھے تو سونے میں تولوں گا۔ کیا یوں ہی تجھے کھلا پلا کر بڑا کیا ہے۔

بکاؤلی۔ (غصہ سے) بابا ——— آپ دولت چاہتے ہیں۔ آئیے، میں آپ کو دولت دیتی ہوں، اس گڑھے میں دیکھئے۔ اٹھائیے آپ جتنی دولت لے سکتے ہیں لے جائیے۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہیں۔

دہقان۔ (خوشی کے لہجہ میں) دولت!

بکاؤلی۔ آپ کو دولت سے محبت ہے نا۔

دہقان۔ میری بیٹی!

بکاؤلی۔ بابا۔ یہ میرے شوہر ہیں۔ آج سے بارہ سال پہلے ان کے ساتھ میری شادی ہو چکی تھی۔ راجہ اندر کی بددعا سے میں پتھر کی مورت میں تبدیل ہو گئی۔ اب مصیبت کے دن ختم ہو گئے۔ اب میں آپ سے جدا ہوتی ہوں۔

تاج الملوک۔ بکاؤلی تم نے مجھے زندگی بخشی، آؤ چلیں، ایک ایسی دنیا میں جہاں محبت کی چھاؤں ہو، جہاں یہ دل دکھانے والی باتیں نہ ہوں، بس تم ہو اور میں۔ چڑیوں کے چہچہے، آبشار کا ترنم ایک ایسی ہی سرزمین میں۔ اپنی زندگی گزار دیں۔

سید محی الدین احمد

غزل

خوشبو کا کارواں اِدھر آیا اُدھر گیا
طوفاں بہار کا جو اٹھا تھا گزر گیا

ابرِ سیاہ میکدہ پر سے گزر گیا
دیوانہ دل کو اور بھی دیوانہ کر گیا

جب سے مذاقِ دید طلوعِ سحر گیا
بندہ نواز آپ کا ذوقِ نظر گیا

بجلی سے بات چیت نشیمن کے دم سے تھی
کاشانہ جل گیا تو وہ نشّہ اُتر گیا

گزرا ہے کون رہگذرِ فکر سے کہ آج
دامن تصوّرات کا جلووں سے بھر گیا

تدبیر اک بہانہ تھی، تقدیر اک خیال
تو نے جسے سنوار دیا وہ سنور گیا

لالہ بھی دل میں داغِ غمِ زندگی لئے
چندے نگاہِ اہلِ جہاں میں اُبھر گیا

اب دل ہے اور جذب کی کیفیتِ لطیف
وہ اشتیاقِ سجدۂ ہر سنگِ در گیا

رندوں کو میکدے کی روایات سونپ کر
ساقی شراب پی کے نہ جانے کدھر گیا

بکھرے پڑے ہیں پھول کسی کے مزار پر
یہ کون صبح صبح غریبوں کے گھر گیا

آنسو میں عکس ریز ہے کس کی ضیائے رُخ
کس کی جھلک سے رُوپ گہر کا نکھر گیا

طوفاں اٹھا اٹھا کے حوادث گزر گئے
اپنی ہی راہ میرا دلِ بے خبر گیا

ساغر نہیں، شراب نہیں، میکدہ نہیں
فطرتؔ کسی کا عہدِ جوانی گزر گیا

عبدالعزیز فطرت

آرٹ میں حسن کار کی شخصیت کا عکس

آرٹ کے متعلق کولرج کہتا ہے "وہی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں، قدرت کی پیدا کی ہوئی یا انسان کی بنائی ہوئی۔ مادی چیزیں تو خیر قدرت پیدا کرتی ہے، لیکن تخیلی اشیاء بالکلیہ انسانی پیداوار ہوتی ہیں۔ ان دونوں عناصر (یعنی مادی و غیر مادی) کے خوش آہنگ اتحاد و امتزاج کو آرٹ کہتے ہیں۔" اس تعریف کے اعتبار سے انسانی تخیل اور قدرتی اشیاء کی درمیانی کیفیت کا نام آرٹ ہوا۔ یوں تو ہر نظری آرٹ میں صرف نیچر ہی کام ہوتی ہے، جس کے اکثر رموز سے عام نقاد کو واسطہ پڑتا رہتا ہے، لیکن اسی نیچر پر انسانی اثر کا اضافہ ہوتے ہی یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان نے قدرت کو کس جذبے کی عینک سے دیکھ کر بنایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سطح تصویر پر قدرت معہودہ بلکہ دکاست ظاہر ہو جاتی ہے جسے ہم دیکھتے ہی فوراً پہچان بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بنانے والے صناع کا اسی میں سراغ لگانے کے لئے گہری نظر کی ضرورت ہے۔ حسن کار کی شخصیت کا سراغ لگانے میں ذیل کی چند تنقیحات ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

(۱) فرض کیجئے کہ ایک حسن کار شبیہ کش مصور یعنی چترکار ہے۔ اس کی شبیہ پر نظر پڑتے ہی ہمیں غور کرنا چاہیے کہ آیا اس نے اپنے معمول کے جسم کی بیرونی سطح کے نشیب و فراز کی نقاشی کی ہے، یا کہ اس کی کرداری خصوصیات کو بھی اجاگر کیا ہے؟ اگر تصویر سے یہ ظاہر ہو کہ مصور نے کردار نگاری میں تھکا ماندہ پس و پیش کیا ہے لیکن شباہت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تو اس تصویر کے متعلق ہم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مصور نے اپنے معمول کو کیمرے سے دیوار پر ٹھونک دیا ہے اور بس۔ اور اگر اس نے کردار نگاری کی کوشش کی ہے تو ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ اس خصوص میں کلی یا جزوی حیثیت سے اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہر معمول کی شبیہی تصویر حسن کار کے لطافت ذوق اور نزاکت خیال کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اسی آئینہ کے اندر مصور کی شستہ مذاقی اور دقیقہ اس ذہانت کا عکس نظر آجاتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کردار نگاری کی کوشش میں تصویر کے غلط اور ناہموار سطحیں اور بغور دیکھنے سے مصور کا باطنی بھدا پن اور فطرت کی ناہمواری ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دوسرے موضوعات کے مقابلے میں شبیہی تصویروں کے اندر حسن کار کی شخصیت زیادہ نمایاں اور منعکس ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض قابل اساتذۂ فن کسی شخص کے کرداری خصوصیات کو نمایاں کرتے وقت کہیں نہ کہیں اپنی ذاتی خصوصیات کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں۔ پوری تصویر کو جب تک خود نہ بنا لے تھے اس پر دستخط نہیں کرتے تھے، اسی لئے قدیم اساتذہ کی تصویروں پر شاذ ہی ان کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔ ان حضرات کا ایسا طرز عمل اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بڑا چترکار (Portraitist) ایک دقیقہ رس اور نازک خیال شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ تاریخ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔

(۲) اگر ہمارا پسندیدہ حسن کار روزمرہ واقعات کا قلمی عکاس ہے، تو اس صورت میں ہم یہ غور کرنے پر مجبور ہوں گے کہ آیا اس کا نفس روزانہ وقوع پذیر ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے خوش بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ یا محض ہماری خوشی اور خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش سے اس نے ایسی تصویریں بنا دی ہیں۔ اگر ایسا حسن کار محض ہمیں خوش کرنے کے لئے تصویر کشی کرتا ہے، تو وہ حقیقت میں ایک ملازم پیشہ شاعر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، اس لئے کہ جن واقعات کی وہ عکاسی کرتا ہے، ان سے اس کو کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے اگر وہ

حقیقت میں اپنی ذاتی دلچسپی کے مدنظر روزمرہ واقعات کا مرقع بناتا ہے، تو ہم یہ ضرور دیکھیں گے کہ آیا اس نے کل واقعہ یا تمام اشیائے متعلقہ پر نہایت خلوص سے مصورانہ انداز میں نظر ڈالتے ہوئے، کسی نہ کسی جگہ اپنی حقیقی فراست (genius) کا ایک آدھ شیشہ ضرور لگا دیا ہوگا، جس سے اس کی حقیقی دلچسپی و دلبستگی کا ثبوت ملے۔ ورنہ وہ تماشائی کی مذمت سے بچنے کی خاطر ضروری فہرست کے مطابق یکے بعد دیگرے کل اشیاء کی تکلیں بنا کر تصویر کو اس طرح مکمل کر دے گا کہ اس میں نقاد یا تماشائی کو سوائے اشیاء کے ڈھیر کے اور کوئی سامان دل بستگی نہ ملے گا۔ ایسی تصویروں میں ناظر یا تماشائی کو یہ بھی غور سے دیکھنا چاہیئے کہ مصور نے اپنے تصویری موضوع یعنی شئے مصورہ کو قدرتی اشیاء کی نقل اتارنے سے ہٹ کر، اپنی جدت طرازی سے کس حد تک بلند و مرتفع بنایا ہے۔ ورنہ اس کی تصویر ایسے عمل کا نمونہ ثابت ہوگی جو محض قدرتی اشکال کی نقل آتارنے ہی کو آرٹ کا منتہائے کمال سمجھتا ہے۔

(۳) اگر کوئی مصور، خود کو محض تاریخی واقعات کی تصویر سازی کا پابند بنا لیا ہو، تو اس حسن کار کا اولین فرض ہوگا کہ جن معلومات کی بناء پر وہ اپنی تصویریں بناتا ہے، تماشائی کو اس امر کا یقین دلائے کہ جو موضوع پیش کیا جا رہا ہے وہ بالکل حقیقی اور مبنی بر صداقت ہے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی غیر حقیقی تفصیل نگاری کو صحیح مان لینے کے لئے ناظر پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بھی جانچنا ہوگا کہ جس منظر کو یہ حسن کار پیش کر رہا ہے، آیا وہ منظر اسے واقعی اتفاقاً ہوا ہے، یا کہ محض پامال اور پیش پا افتادہ موضوع کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کو ہر معمولی مصور بھی پیش کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ تاریخی تصویر کی خاص خوبی یہی ہوتی ہے کہ جس زمانہ کی وہ نمائندگی کرتی ہے، تماشائی کو اسی زمانے کے ماحول میں لا کھڑا کر دیتی ہے۔ تاریخی پیکر اس انداز میں ہرگز نہ پیش کئے جائیں، جس طرح حالیہ زمانے کا کوئی معمولی کرایہ کا لباس زیب تن کئے ہوئے تصویر کے لئے نشست دے رہا ہو۔ اور تصویر ختم ہوتے ہی اپنا اصلی لباس پہن کر گھر جانا چاہتا ہو۔ بلکہ تصویر کے پیکر اور دوسری اشکال بھی بالکل اپنے زمانے کی معلوم ہوں۔ زیر غور تصویر میں یہ نکات ظاہر نہ ہوں، تو وہ تصویر بیکار ہے۔

(۴) جو مصور گل کاری کرتا ہو، اس کے کام کو اس انداز سے جانچنا پڑے گا کہ آیا وہ حقیقی معنی میں حسن کار ہے بھی یا نہیں؟ یا کہ وہ ایک ماہر نباتیات معلوم ہوتا ہے۔ اگر حسن کار ہوگا تو اس کی تصویر کے پھول پتے، گل بوٹے نباتیاتی تفصیلات اور توضیحات سے پاک ہوں گے، کیونکہ مصورانہ انداز میں بنائے ہوئے پھولوں کے گملوں اور گلدانوں میں، تازگی، شگفتگی، ہم آہنگی، اور تخیل کاری کو زبردست اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

(۵) بحری یا سمندری منظر نگار کی تصویروں کو اسی نقطۂ نگاہ سے جانچنا چاہیئے، جس نگاہ سے خشکی کے قدرتی منظر نگار کی تصویروں کو جانچا جاتا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ قدرتی منظر نگار کی طرح، سمندری منظر نگار بھی اپنے بنائے ہوئے منظر سے اسی طرح متاثر ہو کر بنایا ہے یا نہیں؟ ورنہ وہی مثل ہوگی کہ تماشائی بھی مثل حضرت مسیح کے، ان پر ایمان لائے بغیر پانی پر چلنے لگیں گے۔ غور سے دیکھو کہ بحر بیکراں کی وسعت اور اس کی شان کو مصور نے کس حد تک دوبالا کیا ہے۔ سمندر کے رنگ اور اس کے ٹون میں کس قدر دلکشی پیدا کی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سمندری ہلچل اور حرکات کو کس دلکش انداز میں ظاہر کیا ہے؟

(۶) اگر کوئی حسن کار، منظر نگاری کا مدعی ہو تو اس کا دعویٰ مذکورۂ بالا تمام حسن کاروں سے افضل ہے۔ اس صورت میں ناظر کے اس اصول کو یاد رکھئے کہ جو شخص اصل موضوع سے جتنی دور ہٹتا جاتا ہے، یا اس کے برعکس تماشائی سے جو چیز فاصلے میں جتنی دور ہٹتی جاتی ہے، ہر دو صورتوں میں اس چیز کی شکل اور نظارے کی باریک

تفصیلات بتدریج دھندلی ہونے کے علاوہ تعداد میں بھی کم اور کم دکھائی دینے لگتی ہیں۔ پس دیکھئے کہ منظر نگار نے اپنی تصویر میں اس اصول کی کہاں تک پابندی کی ہے؟ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے تصویری ضرورت کے مطابق موضوع کی باریک جزئیات یا تفصیلات کو ترک کر دیا جاتا ہے، تو اسے عمل اختصار یا تسہیل کہتے ہیں۔ اور ایسے اختصار کا عمل زیادہ تر انفرادی ذوق اور تجربے پر منحصر ہوتا ہے۔ اس لئے دیکھنا ہوگا کہ مصور نے کس حد تک اپنے انفرادی ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مصور کا نفس جن اشکال و حقایق کو قدرت سے اخذ کرتا ہے، بجنسہ انھیں سطح تصویر پر لوٹا دیتا ہے۔ لیکن منظر نگار تو حقیقت میں، اپنے اور قدرت کے موقتی جذبات (Moods) کا مفسر ہوتا ہے۔ اور اسی موقتی انتخاب کی مدد سے وہ اپنے باطنی تاثرات یا کیفیات کو دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ منظری تصویر کو جانچتے وقت یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا مصور کا مقصد یہ تو نہیں کہ وہ تماشائی کو کسی اونچے پہاڑ یا ٹیلے پر چڑھا کر وہاں سے دنیا کے پھیلاؤ کو اس انداز سے بتلائے کہ تماشائی پہاڑ سے جست کرکے پرندے کی طرح ہوا میں دور تک پرواز ہی پرواز کرتا چلا جائے اور درمیان میں ٹکنے کے لئے (نظر کو) کوئی سہارا نہ ملے۔ یا یہ کہ تصویر میں ایسی سنگلاخ اور دشوار گزار زمین بنادی ہو، جس پر سے گزرنا تماشائی کے لئے (یعنی نظر کے لئے) باعث تکلیف ثابت ہو۔ ایک حسن کار کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ قدرت کے ہر نازک، دلکش اور ترو تازہ ترکیب میں تماشائی کو بھی اپنا شریک اور ہمنوا بنالے۔ اگر اس اصول کے خلاف وہ ناہموار راہگزر، موٹی موٹی بے ڈھنگی، کرخت اور کھردری پیڑوں سے ایک روک حائل کردے گا، تو واقعی ایسا حسن کار اپنی نااہلی کے ساتھ باطنی بدذوقی اور خامی کا ثبوت بھی دے گا۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بھاپ، بجلی، ہوا، آندھی، اور بادل جیسی انسان پر قابو رکھنے والی قدرت کی مخفی طاقتیں بھی، انسانی علم کے تابع ہوجاتی ہیں۔ پس حسن کار بھی ان قوتوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہوئے، صرف انہی مظاہرات اور قدرتی اعمال کی رونگاری کرتا جاتا ہے، جس انداز سے یہ قوتیں خاص خاص حالات کے تحت ظاہر ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ ان قوتوں کو اس خوبی سے اپنی تصویر میں جگہ دیتا ہے کہ ان کی موجودگی سے تصویر میں تنوع، یا گونا گونی پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی تنوع کی مدد سے، ہم ان طاقتوں کی اضافی یا اندرونی اہمیت سے واقف ہوجاتے ہیں۔

جو تصویریں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں، وہ ضرور دو جذبات کو اکساتی ہیں۔ ایک کا تعلق تصویری موضوع کی دلکشی سے ہوتا ہے، اور دوسرے کا حسن کار کی تعریف و ستایش سے۔ مصور کی فن کاری کی نسبت یہ عام خیال ہے کہ حاصل عمل کے فنا ہوتے ہی (خواہ تصویر ہو یا اور کوئی چیز) عامل (حسن کار) کی قوت اظہار اور کمال مہارت کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے تصویر میں شئے مصورہ میں حسن کار کا زور قلم اور صناعانہ مہارت، تماشائی کو اپنی طرف متوجہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ پتھر، مٹی، کاغذ، رنگ یا جو بھی وسائل حسن کاری میں استعمال ہوتے ہیں، ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ایسی فطری کمزوری ضرور پائی جاتی ہے، جو مصور کے تصور کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتے۔ لیکن ایک ماہر فن حسن کار اپنے منتخبہ وسیلہ (medium) کی خامیوں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اپنی خداداد قابلیت سے اس میں آرٹ کے زیادہ سے زیادہ محاسن کو سماتا اور نمایاں کرتا ہے۔ یہی خوبی اس کی شخصیت یا کمال مہارت ہوتا ہے، جسے ستایش نصیب ہوتی ہے۔ غالباً ایک شاعر کی مثال سے اس اصول کی وضاحت ہوجائے گی۔ فرض کیجئے کہ کسی شاعر کے دل میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے ارمان تڑپ رہے ہوں۔

اگر وہ شعر و سخن کے وسیع تر حدود سے فائدہ اٹھا کر نظم لکھے گا تو وہ ستائش ہرگز نصیب نہ ہوگی، جو میکس یا رباعی جیسے تنگ حدود میں رہتے ہوئے اپنی طبع رسا کے جوہر دکھلانے پر ہوگی اور اسی محدود دائرے میں رہنے کی وجہ سے اس کی شخصیت کے جوہر بھی زیادہ نمایاں ہوں گے ۔ حسن کار کی بھی یہی حالت ہوتی ہے، جو اپنے تختہ و سیاہی کے حدود میں کام کرکے ستائش حاصل کرتا ہے ۔

شخصیت ہی کے عنصر نے فوٹو گرافی کو بھی حسن کاری کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ جے۔ سی۔ وان ڈائک کہتا ہے "غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تصویر محض سوانح حیات یا سرگزشت واقعات سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے استعجاب و استحسان کو اکسانے والے، واقعات نہیں ہوتے بلکہ انسان (مصور) ہوتا ہے۔ جب تک ہم تصویر میں کسی انسانی کارگزاری اور اس کی خداداد ذہانت (genius) کو محسوس نہ کریں گے، اس وقت تک تصویر ہمارے لئے محض چند واقعات کا مجموعہ ہی رہے گی اور بس ۔ حقیقت میں کام نہیں، کام کا کرنے والا، سانچہ نہیں، سانچے کا ڈھالنے اور بنانے والا، رنگ نہیں، رنگ کا لگانے والا مصور ہی ہمارے خوابیدہ تخیل کو بیدار کرکے خراج تحسین حاصل کرتا ہے"۔

جو شخص بھی میکائل انجیلو کے بنائے ہوئے مجسموں یا تصویروں کو دیکھے گا یہی بات محسوس کرے گا۔ اسی طرح فرانز ہالز، ریمبرانٹ، روبینس، وان ڈائک، ویلاسکز، ٹیراری، پیرا، گویا، واٹو، ٹے نیا، تیلے، ٹرایان، روسو، کیوٹرز، کانسٹیبل، گنیس برو، فلاڈے، فران ہسلر، مونے، روواں، برنارڈ، ان نس، وائی یانٹ اور جارج فرز کے شاہکاروں کو غور سے دیکھیں تو ان میں ان استادوں کی شخصیتیں بخوبی محسوس ہو جائیں گی۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ جس طرح مذہب سطحیت کا نام نہیں، ویسے ہی آرٹ بھی سطحیت کا نام نہیں ہے۔ حقیقی معنی میں آرٹ روحانیت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر تصویر میں حسن کار کی روح کو تلاش کرنا چاہئے۔ اس لئے آرٹ میں انسان یعنی مصور کی شخصیت کا پتہ لگاؤ، اور دیکھو کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔

(ترجمہ) امجد علی

زلزلے

اسی قدیم کلیان پہاڑی پر میں اور معراج کھڑے تھے جو تاریخ میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ جب تک میرا قیام کلیانی میں رہا ہر روز شام کو کسی نہ کسی بہانے میں اپنے ملازم معراج کو ساتھ لئے یہاں آجاتا۔ کبھی ساتھ دو ایک بوڑھے بھی ہوتے جن سے کلیانی کے متعلق سیکڑوں معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ اسی دلچسپی میں گھنٹوں گزر جاتے لیکن پھر بھی جی اٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ ایک شام ہم دونوں جب وہاں پہنچے، تو وہاں کوئی نہ تھا۔ خدا جانے بات کیا تھی، عموماً پنجشنبہ کو لوگ وہاں آنے سے جھجکتے تھے۔ اس روز معراج نے بھی شکار کے بہانے میری بندوق اٹھالی تھی۔ خیر قصہ مختصر ہم وہاں پہنچے، تھوڑی دیر جھاڑیوں میں ادھر ادھر مارے مارے پھرا کئے، دو تین دفعہ بندوق چلانے کی بھی نوبت آئی۔ خاص لطف نہ آیا۔ جھاڑیوں میں سے نکل کر ہم اپنی پرانی جگہ آ بیٹھے۔ بیٹھے ہوئے کچھ تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ معراج نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور گھر چلنے پر اصرار کیا، میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گھوم کر دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ نظروں نے آس پاس ادھر ادھر رنگینی سی محسوس کی، اس احساس کے ساتھ ہی بے اختیار نظریں سامنے افق پر اٹھ گئیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک آتشی کرہ بالکل سطح ارض سے چھوتا ہوا ببانگ دہل اعلان کر رہا تھا۔ جس کی تیز شعاعوں اور چمکتی کرنوں سے تم اپنا منہ چھپائے رہتے ہو، اس کا دوسرا رخ بھی دیکھ لو۔ اسی کی رنگین شعاعیں تمہیں دعوت نظارہ دے رہی ہیں، اب تم چاہتے ہو کہ ساری عمر ایسا ہی موسم رہے۔ پھر کبھی سورج کی شدید شعاعیں تمہیں نہ ستائیں۔ یہ تمہارے دل کی کیا حالت ہے، کبھی اسی چیز سے بیزاری۔ اور کبھی اسی چیز کی خواہش کرتے ہو، کیا نفرت اور محبت کا بھی یہی معاملہ ہے، کیا تمہارے دل بدلتے دیر نہیں لگتی ——؟ میں انہی خیالات میں منہمک جہاں کا وہاں کھڑا تھا۔ اسی دوران میں معراج نے کئی ایک دفعہ چلنے کے لئے کہا، مگر میں نے اس کو جلد سمجھنے کی کوشش کی۔ بھلا ایسے وقت ایسا کون بے وقوف ہوگا جو گھر کی راہ لے گا۔ دیکھتے دیکھتے رخ روشن نے روئے احمر اختیار کیا، اور پھر خدا جانے اس کے بعد اس نے کونسی شکل اختیار کی البتہ اتنا ضرور ہوا، بھیگتی جاگتی دنیا نے سیاہ چادر تان لی۔

"صاحب" معراج نے ایک عجیب ذہنی کشمکش کے زیر اثر کہا" اندھیرا چھا رہا ہے گھر چلئے نا آپ" اس کی آواز میں ایک نامعلوم خوف اور ایک عجیب کپکپاہٹ تھی۔

"تم چلے چلو" میں نے بڑی متانت سے کہا اب تو میں نہیں چلنے کا ——" اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ یوں تو کئی بار سورج کو غروب ہوتا دیکھا لیکن کبھی ایسا اثر نہ ہوا کہ پتھر کے نقش کی طرح دنوں قائم رہتا۔ سورج روز کی طرح غروب ہوا لیکن غروب ہوتے ہوئے میرے تاریک دل میں دیا روشن کر گیا۔

آپ کو یہ صرف ایک معمولی سی کیفیت معلوم ہوئی لیکن سچ پوچھو تو صحیح معنوں میں اسی دن سے میری زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اکثر اوقات ایسے عظیم الشان انقلاب زندگی سے پیشتر دماغ گوناگوں خیالات کا آماجگاہ بن جاتا ہے۔ رہ رہ کر ہر بار دماغ کے پردوں سے یہ خیال ٹکراتا تھا "کیا ایک کی بربادی پر دوسرے کی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے؟" لیکن ساتھ ہی دماغ کی اندرونی گہرائیوں سے ایک خاموش آواز نکلتی تھی۔ "کیا باغبان کے نقصان پر کمہار ہنس سکتا ہے؟" خدا جانے یہ سوچ بچار کا عجیب سلسلہ کب تک قائم رہتا۔ معراج نے اپنے اندرونی خلفشار کا اظہار ان الفاظ سے کیا۔ "حضور رات کو یہاں بھوت آیا کرتے ہیں اور جو کوئی بھولا بھٹکا ادھر آ نکلتا ہے اس کی تو ہڈیاں بھی نہیں چھوڑتے۔"

"یہ تو بات اور اچھی ہوئی" میں نے ایک اطمینان کا

کش لیتے ہوئے کہا "وہ بھی تو یاد ہی کریں گے انھیں پالا پوسا پڑا تھا ـــــ" یہ کہہ کر میں نے منہ سے دھوئیں کے چھلے نکالے۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں سرکار"

"ایسی باتیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں بھوتوں کا قائل نہیں"

"قائل نہیں ـــــ" اس نے اپنے اچانک تعجب کا اظہار کیا "اجی صاحب! نہیں آکر تو ان لوگوں کا کفر ٹوٹتا ہے"

"اچھا ـــــ" مجھے ایک دیہاتی لڑکے کی زبانی ایسا اچھا جملہ سن کر سخت تعجب ہوا "بعض اوقات تم اچھے اچھے جملے کہہ لیتے ہو"

"صاحب" ایک شانِ بے اعتنائی کیساتھ اس نے کہا "مڈل پاس ہوں۔ جماعت میں ہمیشہ اول رہا کرتا تھا۔ خدا بخشے، اللہ بخش مرحوم میری بڑی عزت کیا کرتے تھے" وہ برابر بولتا گیا۔ میں خوش تھا کہ کم از کم اس کے خیالات تو بٹ گئے۔ ممکن ہے اب اس کو بھوتوں کے تکلیف دہ احساس کا خیال نہ رہا ہو۔ مگر وہ کہتے کہتے رک گیا اور پھر وہی اصرار "چلئے صاحب، رات ہو رہی ہے، گھر پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی"

"اچھا بابا ـــــ" میں نے مایوس کن لہجہ میں کہا "جو تیری مرضی، ان سے پھر کبھی ملاقات ہو جائے گی"

"آج تو سستے ہی چھوٹے سرکار ـــــ" اس نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں میں خاموش ہو رہا چلتے چلتے میں نے دور ایک روشنی دیکھی اس کے بارے میں یونہی معراج سے دریافت کیا "معراج! وہاں یہ روشنی کیسی ہو رہی ہے کسی کا گھر ہے کیا ـــــ"

"آج جمعرات ہے نا حضور ـــــ" اس نے پھر قدرے توقف کے بعد کہنا شروع کیا "ہر جمعرات کو اس مقام پر روشنی سی دکھائی دیتی ہے، فقیر بابا کہتے تھے وہ ایک چڑیل کا مکان ہے جہاں بیٹھ کر وہ ایک ہفتہ کی غذا اپنے کنڈے سے پیٹ میں بھر لیتی ہے" صاحب! وہ ایک قبرستان ہے جہاں تمام خبیث ارواح رہتی ہیں ـــــ ہمارے فقیر بابا، کبھی جھوٹ نہیں بولتے "وہ راتوں کو جنوں سے باتیں کرتے ہیں"

"کتنا غلط خیال ہے تمہارا" میں نے اس کے اس خیال سے اختلاف کیا "خبیث روحیں وہیں کیوں رہنے چلیں" "جھوٹ نہیں سرکار ـــــ" وہ بالکل قسم کھانے کے انداز میں بول رہا تھا "ہندوؤں کا قبرستان ہے وہ" "غلط غلط، سراسر غلط" میں نے کہا "مسلمانوں کا مدفن ہو یا ہندوؤں کا مرگھٹ۔ یہ ضروری نہیں کہ دنیا بھر کے شیاطین اور خبیث ارواح وہاں موجود ہوں۔ اجی یہ تو تمہارے اپنے دل کی کمزوری ہے۔ تم مندر میں رات کو ٹھیرے ہو تو صبح کہتے ہو ایک شعلہ نیم کے پیڑ سے نکلا اور آہستہ آہستہ سبزہ کے پودے میں داخل ہو گیا۔ داخل ہو کر پھر اس کی چوٹی سے ایک عجیب آدمی کی شکل میں نکلا، جس کا سر چکنے گھڑے کی طرح صاف تھا، مگر پچھلے حصے سے ایک دم لٹک رہی تھی ـــــ وہیں اور اسی جگہ ایک ہندو اپنی زندگی کی اگلی راتیں گزار دیتا ہے اور صبح اٹھ کر کہتا ہے "بھگوان کا شکر ہے جو یہاں رات گھر سے زیادہ آرام میں کٹی۔ کسی ہندو کو مسجد میں سلاؤ اور صبح کو سن لو ایسے ایسے واقعات بیان کرے گا کہ سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ آپ خیال کریں گے وہ من گھڑت واقعات سنائے گا۔ جی معاف فرمائیے وہ اپنی آنکھوں دیکھی باتیں کہے گا جس پر آپ کبھی ایمان نہیں لاسکتے ہیں یہی تو آپ کی ضعیف الاعتقادی ہے۔ اگر تم یہ خیال کرو کہ زہر بھی حق میں باعثِ ہلاکت نہیں اس اعتقاد پر تم ثابت قدم رہو تو یقین مانو زہر بھی تمہارے حق میں باعثِ حیات ہو سکتا ہے، تم ہو مڈل پاس اس فلسفہ کو سمجھ نہ سکو گے، اس کے متعلق مزید کہنا بے سود ہو گا۔ چلو چل کر دیکھ لیں گے، وہ ہے کون"

"ہیں سرکار ـــــ" وہ چیخ اٹھا "ہندوؤں کے قبرستان میں رات کے وقت ـــــ" "ہاں ـــــ" مجھے ایک کریدی سی تھی، آپ تو جانتے ہی ہیں میں ایسے فرضی دلائل کا سرے سے قائل ہی نہیں۔ جب اس نے اتنے وثوق کے ساتھ کہا کہ وہ شیاطین کا مرکز ہے تو یار دل نے بھی خوب اچھالا۔ پھر اشتیاق اس کی تائید کیوں نہ کرتا یہاں تو یہ حالت کہ جہاں ذرا سی خواہش ہوئی

وہاں اشتیاق نے کبھی مٹی کا تیل چھڑکنے میں کوتاہی نہ کی۔ مجھے ہمیشہ محیر العقول واقعات کے انکشافات کا تجسس دامنگیر رہتا ہے۔ میں نے کبھی ایسے معاملات میں اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔

"ہم سے تو یہ نہ ہوگا جناب!" وہ بولا "جان چلی جائے پر میں نہ آنے کا۔"

"یہ میرا حکم ہے، اس کی تعمیل تمہارا اولین فرض ہے" میں نے کڑک کر کہا۔ "جان کے آگے وقت ضرورت اپنا مذہب بھی بدلنے کی اجازت خدا دیتا ہے۔" "تو پھر جاؤ، تم آج سے ہمارے نوکر نہیں ہو، کل بڑے صاحب سے اپنا حساب چکتا کر لینا ——"

"جو حکم سرکار ——" وہ بولا "پائے گدا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست، خدا کے فضل سے کھانے پینے کی کمی نہیں۔" "ادھر لاؤ ٹارچ اور میری بندوق، بزدل کہیں کا ——" میں نے اپنے بے معنی غصے کو بہت کچھ رفع دفع کرتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھوں سے ٹارچ اور بندوق ایک جھٹکے کے ساتھ لے لی۔ میں بمشکل تمام دس قدم ہی گیا ہوں گا کہ اس نے کہا "حضور، میری بات مان جائیے، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" "چل اپنا راستہ کاٹ، اب یہ بکواس بند کر ——"

"تو پھر چلئے میں بھی آپ کا ساتھ دیتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ——" میں نے خفگی کے لہجہ میں کہا "تم میرے نوکر نہیں ہو ——"

"کوئی پرواہ نہیں ——" وہ بولا "آپکا بہت پرانا نمک خوار ہوں، بڑے صاحب، جب سے یہاں آئے ہیں، انہیں کے پاس نوکر ہوں، بھلا آج آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

میں خاموش تھا مصلحت وقت کی خاطر گو دل ہی دل میں اس کی اس بے مثل وفاداری پہ عش عش کر رہا تھا، اس کی نظروں کے سامنے موت رقصاں تھی لیکن اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات بھی حق وفاداری بصرف کر دیئے —— وہ اپنی آنکھوں سے صاف صاف دیکھ رہا تھا کہ اس کے مالک کے پاس جہنم کا ٹکٹ ہے اور خود کے پاس جنت کا پروانہ مگر اس نے جنت بوجھتے دراو جہنم لی —— کتنی تعجب کی بات ہے۔

راستہ بڑا پرخطر تھا، وہ برابر ٹارچ سے مجھے راستہ بتاتا اور آنے والے خطرناک گڑھوں سے قبل از وقت ہوشیار کرتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی چٹان ایسی صاف ملتی کہ قدم نہ جمنے پاتے تھے، اور کبھی کبھی ایسے موڑ ملتے تھے کہ زندگی موت کے ہم آغوش ہونے کے لئے آگے بڑھ جاتی تھی —— لیکن ہم دونوں ایک عزم صمیم کے ساتھ بڑھے گئے۔ خدا خدا کر کے احاطۂ قبرستان کے قریب آپہنچے۔ یہاں چند جھاڑیاں ایسی تھیں جن کے کانٹے ایک ایسا خوفناک منظر پیدا کر رہے تھے کہ دل لرز اٹھتا تھا۔ ایسی کانٹی کہ جسم سے چھو جائے تو قسم لے لو جو کپڑا پھٹنے سے پیشتر ہی نکلے —— خیر سوا تین گھنٹے کی طویل عرق ریزی کے بعد قبرستان میں داخل ہوئے۔ یہاں خود میرے بھی قدم کچھ بھاری بھاری پڑ رہے تھے۔ ایک ہلکا سا خوف چھا رہا تھا لیکن میں ہر بار اپنا جی کڑا کر رہا تھا۔ کیونکہ اس سے ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں یہی ہلکا سا خوف، ہیبت کا محرک نہ ہو جائے۔ میں نے اپنی بندوق پر نظر دوڑا کر اطمینان کی سانس لی اور معراج نے دو تین گارے کے پتھر اٹھا لئے۔ ہم پاؤں دبائے ہوئے منگرنی اور سنیاٹے کے جھنڈ کے پیچھے آ چھپے جہاں سے ہم نے ایک پرانی قبر دیکھی جس کے سرہانے ایک دیا روشن تھا۔

وہیں پاس ہی چند بتیاں تھیں اور ایک شیشہ میں تیل تھا۔ اور دیا روشن کرنے والی خود سجدہ میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کے پاؤں دیکھے" وہ چڑیلوں کے سے نہ تھے ——" میں نے بندوق کی نالی اوپر کر دی، اور اس عجیب عورت کو تکتا کھڑا رہا۔ اس نے زار زار روتے ہوئے اپنا سر اوپر اٹھایا اور کہا "رمیش تم مجھے معاف کر دو، میں اپنی ساری عمر تمہارے نام بھینٹ چڑھاتی ہوں۔"

میری نظریں اس عورت پر پڑیں اور پچھلے سارے واقعات گھوم گئے۔ اس اچانک دماغی حملے کے باعث میری زبان سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اسی اثنا میں میں نے چند عجیب پرشور، خلط ملط دماغی آوازیں

کے ساتھ ایک اور چیخ سنی لیکن اس وقت ماحول سمجھنے کی دماغی صلاحیت مفلوج ہوئی جا رہی تھی‘ اس لئے اس چیخ پر چنداں غور کرنے سے مجبور تھا‘ رفتہ رفتہ چند لمحوں کے عرصہ میں دماغ کا شیطانی ناچ ختم ہوا‘ بے سُری آوازیں مدہم پڑنے لگیں اور میں اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر ہو کر پانچ سال قبل کے زمانہ میں پہنچ گیا۔

اگر کسی کو اپنی تندرستی پر فخر کرنے کے مواقع حاصل تھے تو وہ مسعود تھا۔ اس کو سوائے دردِ سر کے کسی اور بیماری نے کبھی گھیرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جب کبھی وہ اپنے کسی دوست کو مریض دیکھتا تو اس کا دل کھول کر خوب مذاق اڑایا کرتا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آئی نہیں‘ آئی نہیں‘ اور جو آئی تو کمبخت بیماری نے جانے کا نام نہ لیا۔ دیواروں اور چھاتوں سے ٹکر لینے والا نوجوان بستر سنبھال کر پڑا رہا۔ بہت دنوں تو گھر ہی پر ڈاکٹر دیکھ جایا کرتے تھے‘ لیکن جب بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو ڈاکٹر کے مشورہ پر اس کو عثمانیہ دواخانہ میں رجوع کرا دیا گیا۔ کھاتے پیتے گھرانے کا تو آدمی تھا ہی‘ بہت جلد ایک علیحدہ کمرہ مل گیا‘ جہاں ازالۂ بیماری کی خاطر بہت سی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ مہربان ڈاکٹر نے چلنا ال دیکھا اپنی خاص ہمدردی جتائی۔ نبض وبض کو خوب اچھی طرح دیکھ بھال لیا‘ پھر اپنے نسخہ خاص کی کئیں۔ سے جیب گرم کی اور چلتی دفعہ دو نرسوں کو خاص تیمارداری اور سب دیکھ بھال کی ہدایت کی ـــــــ!"

للتا کو چوبیس گھنٹے یہ فکر تھی کہ آخر یہ ہے کون‘ جو نہ رات کو رات خیال کرتا ہے اور نہ دن کو دن‘ باوجود بیماری کے یہ دن رات لکھا جا رہا ہے۔ باوجود تاکید کے جب جی میں آتا ہے‘ لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ ہر روز باوجود انکار کے ملاقاتیوں کا اصرار ہوتا ہے‘ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جو ڈاکیہ کے پھیرے سے بچ جاتا ہو۔ آخر یہ خوش قسمت ہے کون ـــــــ"

للتا ایک خوش مزاج اور خوش گلو تھی‘ جس کی آواز میں ہمدردی‘ شیرینی‘ محبت اور خدا جانے اور کون کون سے عناصر تھے کہ مریض اس کی تیمارداری سے بہت جلد شفایاب ہو جاتا تھا‘ اس کی انگلیاں جس سے چھو جاتی تھیں وہ بھاڑ جھنک کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ مریضوں کے لئے ایک نوید جانفزا اور مردوں کے لئے پیام زندگی تھی۔ اسی خصوصیت کے باعث وہ دنیائے دواخانہ میں "مسیحا" کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔

جب سے مسعود دواخانہ آیا وہ برابر دیکھے گئی اور سوچے گئی۔ لیکن بڑی تلاش کے بعد بھی اس کو اس کا حل نہ مل سکا۔ ایک دن اس نے اپنا جی کڑا کیا اور قطعی فیصلہ کر لیا کہ آج یہ معلوم کر کے رہے گی کہ "مسعود" کون ہے۔ اس نے رات کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا۔ رات کی نوکری اسی کی تھی۔ مریض کی دیکھ بھال کے بہانے وہ اس کے کمرے میں گھس آئی۔ جب دیکھا کہ مسعود بے خبر پڑا ہے تو اس نے تپائی پر کے فرشتہ کا غذات اٹھائے اور چونک پڑی۔ "معیار محبت" کا ضا جس کی مجھے بڑی کھوج تھا‘ جس کی ملاقات کی میں متمنی تھی‘ وہی آج میرے زیر تیمارداری پڑا ہوا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی‘ جس میں لذت پنہاں تھی۔ ایک نظر مسعود پر ڈالی‘ اس نظر میں ایک تقویٰ شکن قوت مستور تھی‘ پھر وہ چلی گئی ـــــــ"

"مسعود صاحب! صبح میں للتا نے دوائی کا گلاس دیتے ہوئے کہا "آپ نے یہاں اپنا نام غلط کیوں درج کرایا ہے اور پھر تعجب ہے کہ اس نام پر آپ کو ایک افسانہ نگار کے خطوط کیسے مل جاتے تھے۔ خیر جب افسانہ مکمل ہو جائے۔ ہمیں بھی سنانا۔

"کس نے کہا" مسعود بولا "کون کہتا ہے میں افسانہ نگار ہوں"

"یہ تو آپ کی انکساری ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو للتا۔"

"آپ مجھے غلط باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں‘ اب چھپانے سے کیا حاصل رات یہ حقیقت کھل چکی ہے۔"

"مس للتا‘ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں افسانہ نگار ہوں تو میں اس کو تمہارا حسنِ ظن سمجھوں گا۔"

"کتنے بلند خیال ہیں آپ کیسی عجیب خاکساری ہے آپ کی' آپ کی اسی خاکساری نے آپ کو کسی کی آنکھوں میں جگہ دلا دی ہے ———"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں مس للتا!"

"میں پوچھ رہی تھی آپ ہی نے لکھا ہے 'ناآسودہ محبت'"

"اب تم سے کیا چھپاؤں" مسعود نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا جیسے چور پکڑا گیا۔

"مجھے آپ سے ملنے کی بڑی آرزو تھی' جو آج پوری ہو گئی"

مسعود خاموش ہو رہا کوئی جواب بن نہ پڑا۔

"آپ کا وہ افسانہ بہت اچھا تھا ——— بہت اچھا تھا"

"شکریہ ———!" پرانا لفظ دہرا دیا۔

پہلی گفتگو جو دواخانہ کے کسی بھی موضوع پر نہ تھی' ختم ہو گئی' اور حسین للتا' شوخ چشم للتا' دوسرے مریض کی دیکھ بھال کے لیے چلی گئی۔

اس کے بعد بھی کئی اور ایسے مواقع نصیب ہوئے جس میں انھوں نے پورا پورا لطف اٹھایا' گھنٹوں مختلف موضوعات پر بحثیں ہوتی رہیں۔ لیکن کبھی وہ پیچھے نہ ہٹے' رات گئے بیٹھے رہتے' مگر کوئی بھی نہ تھکتا تھا' آخر ایک دن ایسا بھی آیا جب کہ دنیا کے سارے موضوعات کو ختم کر کے انھوں نے "محبت" کو اپنی بحث کا نشانہ بنایا۔

"اب ہمارے دن قریب ہیں للتا ———" مسعود نے تقریباً نیم گریہ آلود لہجہ میں کہا۔

"ہاں!" للتا نے اپنی لانبی سانس کے ساتھ کہا "اب جلے چلے ہو چکے ہو' رہ کر کروگے بھی کیا"

"للتا ———" مسعود نے دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔

"تمہارا خیال خام ہے تم سمجھتی ہو میں اچھا ہو گیا۔ لیکن کوئی میری باطنی حالت دیکھے' کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جبکہ طوفان' نہ اٹھتے ہوں' زلزلے نہ آتے ہوں۔ تم کہتی ہو میں تندرست ہو گیا' اُف! تم دیکھو' میرے دل کے ناسور دیکھو' رستے ہوئے خون کو دیکھو' جلتی ہوئی بھٹی دیکھو ——— کہو اور کیا بتاؤں!"

"کاش ———!" اسکو اپنی ناکامی محبت کا پہلے ہی سے احساس تھا "ہم دو ایک ہوتے"

"خدا کرے ایک ہو جائیں"

"ناممکن ہے مسعود ———" اس نے فوراً کہا "سماج کا سمندر ہم دونوں کے درمیان حائل ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہوئے بھی' ایسے ہی نابلد اور ناآشنائے محض ہیں جیسے سمندر کے دو ساحل"

"للتا ——— تم پھر بھٹکیں' آخر تم یہ سطحی بینی کب چھوڑو گی' کہہ رہی ہو' سمندر کے دو ساحل ایک دوسرے سے ناواقف ہیں' تم کیسے کہہ سکتی ہو جبکہ دونوں ساحلوں کو ایک ہی پانی چھوتا ہے کیا اپریل کے دونوں ستونوں میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہوتا' کیا انھیں ملانے والا درمیانی تار نہیں' تو پھر تم یہ کیوں کہتی ہو کہ ہم دونوں کے درمیان ایک وسیع سمندر حائل ہے' یہی تو وہ سمندر ہے' جو ہم دونوں کو ملائے گا۔ تم اس کی وسعت پر کیوں جاتی ہو' پہلے باہمی رشتہ تو دیکھو"

"تم تو بال کی کھال اتار لیتے ہو ———" للتا نے اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا "ایک طرف' سماج کا خوف اور دوسری طرف رمیش کا ڈر ——— وہ میرا منگیتر ہے' مجھ پر جان چھڑکتا ہے' اس کو مجھ سے والہانہ محبت ہے' وہ پروانہ وار قربان ہونا چاہتا ہے' وہ کب گوارا کرے گا کہ اس کی منگیتر' دوسرے کی آغوش میں چلی جائے کیا اس کو اپنی ناموس کا خیال نہیں"

"تم نہیں جانتیں للتا" میں نے کہا "محبت کی قربانی زندگی کا عجیب انقلاب ہے"

"ہوا کرے" وہ بولی۔

"اجی' یہاں تو سو آفتاب مغرب سے طلوع ہوتے ہیں' اور مشرق میں غروب' یہ بھی کوئی مشکل ہے' تم صرف' اپنے منگیتر کو لئے بیٹھی ہو ———"

"اس کی اس فریفتگی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں بھی اس پر کم از کم ایک نظر التفات ہی ڈال لوں ———"

"رمیش ہماری محبت میں' سنگ راہ ہوگا ———"

"آپ کا مطلب ـــــ؟" تیوری پر بل ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"سنگِ راہ، دور کر دیا جاتا ہے ـــــ" میں نے پھولتی سانس کے ساتھ کسی قدر اطمینان سے کہا۔

"کیا کہا ـــــ؟" وہ چلا اٹھی۔

"محبت کی قربانی زندگی کا عجیب انقلاب ہے ـــــ" میں نے اپنا جملہ دہرایا۔ "یہ کام تمھیں کو کرنا ہوگا ـــــ"

"اُف! آٹوگراف ـــــ" اس نے ایک اندرونی سانس کے ساتھ کہا، اور اس کی نظریں پھیکی پھیکی سی ہوگئیں۔ "معاف کیجیے۔ ایک دن للتا نے مجھے آٹوگراف لکھنے پر مجبور کیا، اور کہا، میں ملاقات کی تمنا اسی لیے رکھتی تھی! میں نے جو آٹوگراف دیا وہی جملہ تھا، جس کو میں نے دہرایا تھا ـــــ"

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا "میں سوچ کر دوں گی"

"للتا ـــــ" میں نے مخاطب کیا "محبت سوچنے کی مہلت بھی کب دیتی ہے۔" وہ رو رہی تھی، کمزور فطرت، عورت جو تھی۔ مگر میں سوچ رہا تھا "رمیش کی بربادی پر میری زندگی کی فلک بوس عمارت کھڑی ہوگی۔"

ایک دن رمیش جو ملاقات کے لئے آیا تو للتا نے کہا "رمیش تمھاری حالت روز بروز کیوں گری جا رہی ہے؟ آخر تمھیں کونسا غم کھائے جا رہا ہے؟"

"اس کی دوا تو تمھارے پاس ہے" رمیش نے شدتِ محبت، بلفظ عقیدت سے مجبور ہو کر کہا "اپنے ان ہاتھوں سے کوئی امرت ہی پلا کر دوسری زندگی بخشو۔"

"اچھا ـــــ" للتا بولی "تم بیٹھو میں لاتی ہوں، نئی زندگی بخشنے والی دوائی" یہ کہہ کر وہ برابر والے کمرے میں گئی۔ تھوڑی دیر میں چند خوشبو ئیات ملا کر ایک گلاس میں لے آئی۔ جس کو رمیش نے، آبِ حیات سمجھ کر چڑھا لیا۔ اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت للتا کی حالت نہ پوچھو! دینے کو تو اس نے دے دیا، لیکن ضمیر کی ملامت نے ہر لمحہ اس کے چہرے کے رنگوں میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کر دی، اس کے اترتے چڑھتے رنگوں کو دیکھ کر رمیش سہم گیا، وہ حقیقتِ حال بھانپ گیا، لیکن للتا کے ان الفاظ نے مزید تقویت پہنچائی "جائیے، آپ گھر جا کر آرام فرمائیے، گہری نیند آ جائے گی۔ اب یہاں نہ ٹھیریئے، سونے کے لئے جگہ نہیں ہے یہاں ـــــ" پھر بھی وہ اپنے شک و شبہ پر یقین کرنے سے مجبور رہتا، وہ اس کی عزیز محبوبہ اور منگیتر تھی۔

محبوبہ ہو، چاہے ماں ہو، جہاں ایک دفعہ وہم نے سر اٹھایا، سنبھالی تو پھر مقیاس الحرارت کے پارہ کی طرح بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تو تندرست سے تندرست آدمی بھی چٹ پٹ چند منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس ایک معمولی سے خیال کی آمد نے اس کے دماغ میں انتشار پیدا کر دیا۔ اور اس پر زہر سے زیادہ واہمہ نے کام کیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، حلق میں کھرکھراہٹ پیدا ہو گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا ـــــ"

بھلا ایسی بات، چھپ بھی کیسے سکتی تھی، دیکھتے دیکھتے یہ خبر دواخانہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آگ کی طرح پہنچ گئی کہ للتا نے ایک ناکردہ گناہ شخص کو زہر سے ہلاک کر دیا، بوڑھی، کرنہیہ المنظر عورتوں نے یہ خبر سن کر کانوں پر ہاتھ دھر لیے، اور کہا "ہمیں تو اس کے چلن سے ہی معلوم ہو گیا تھا، حسین ناگن ہے نہ کیسے بل کھاتی ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر مٹک چٹک پھرا کرتی تھی ظالم" ان مریضوں کو کبھی اس بات پر یقین نہ آیا، جنھیں دورانِ مرض نرس للتا سے سابقہ پڑ چکا تھا، رمیش کو فوراً بڑے ڈاکٹر کے پاس لیجایا گیا، جہاں چند اور نامی ڈاکٹروں نے اس کا علاج شروع کر دیا، کیمیائی تجزیہ کا نتیجہ موت اور زندگی کی کشمکش میں پڑا ہوا تھا اور للتا ـــــ چونکہ اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا تھا، ماخوذ کر لی گئی۔

للتا پر عائد کردہ جرم کی صفائی میں جج نے اس پر سوال کیا

جس کے جواب میں للتا نے صرف اتنا کہا "مجھ سے بھول ہوئی" یہی وہ الفاظ تھے جن میں اقرارِ جرم تھا۔ اس کے اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ وکیلوں نے بڑی خوبی کا زور لگایا لیکن للتا نے "مجھ سے بھول ہوئی" کے سوا کچھ اور نہ کہا

جج نے اپنا آخری فیصلہ سنایا۔ للتا نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے۔ جب قاتل خود اقرار کرے تو شہادت و گواہی کی کوئی ضرورت نہیں۔ چونکہ للتا ایک عرصہ سے ... ایسے جرم کا ارتکاب سزاوار نہیں، ممکن ہے وہ آئندہ بھی ایسے خطرناک افعال کے ارتکاب کی کوشش کرے اور چونکہ اس نے اقدامِ قتل کیا ہے جس کی سزا ازروئے تعزیراتِ ہند قصاص ہے اور چونکہ ——

جج اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ "مریض" عدالت میں گھس آیا اور اس نے اپنی لڑکھڑاتی زبان سے پُردرد آواز میں جج کو مخاطب کیا۔

قابلِ صد احترام جج اور معزز حاضرین!

یقیناً ڈاکٹروں نے مجھے موت سے بچا لیا ہے، جن کا میں مشکور ہوں، میں زندہ ہوں لیکن میرا بیان قلمبند نہیں کیا گیا اور محض للتا کے اقرارِ بے معنی پر تکیہ کیا گیا۔ میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ للتا پر کیوں یہ جرم عاید کیا گیا۔ وہ اس سلسلہ میں بالکل بے قصور ہے۔ وہ میری منگیتر ہے بھلا وہ ایسے شرمناک فعل کا ارتکاب کیوں کرنے چلی۔ وہ اس معاملہ میں قطعاً معصوم ہے اسے سزا دینا قانون کی ناانصافی ہے، چونکہ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہو رہی تھی، اس لئے میں نے خود خنجر اپنے پیٹ میں گھونپ لیا اور جانتا ہوں ازروئے قانون خودکشی کی سزا کیا ہے ——— میں ——— "وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ لڑکھڑا کر گرا۔ ہال کی تالیاں یک لخت رک گئیں اور سب حاضرین اٹھ کھڑے ہوئے کہ ماجرا کیا ہے، نتیجہ کیا نکلا؟ رشید گزر چکا تھا مگر مرتے مرتے اس نے اپنی عدیم المثال قربانی پیش کی۔

آہ! وہ رنجش تھا اور میں! میں مشہود ——— دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے، وہ آسمان تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

للتا نے اعترافات و واقعات کہہ کر رکھ دیا ———

کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ ——— دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت صرف ایک ہی دفعہ محبت کرتی ہے اور اسی کی ہو رہتی ہے۔ کہاں ہیں وہ فلسفی جنہوں نے محبت کے معاملہ میں ارسطو کو سب جھوٹ بڑا دیا تھا ——— للتا نے میری محبت کے حصول کی خاطر اپنے منگیتر کو ختم کیا۔ لیکن پھر اس کے بعد اس نے مجھ سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کی، اس واقعہ کے تین سال بعد ایک دفعہ اتفاقیہ ملی تھی اس وقت بھی اس نے اجنبیوں کا سا سلوک کیا۔ اور پھر دو سال بعد یہ موقع دیدار نصیب ہوا۔ اس وقت بھی وہ رنجش کی محبت کا دم بھر رہی ہے۔ آہ! اس کے دل کا یہ کیسا زلزلہ تھا، جو آج تک نہ تو کبھی دنیا ہی میں آیا اور نہ دوزخ میں۔ کیا کبھی ایسے طوفان عورت کے دل میں اٹھ سکتے ہیں۔ جو طوفانِ نوح سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا، قبر کے پاس کوئی نہیں ——— اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سورج نکل چکا ہے۔ ہنکر کھلتے ہی جو مجھے پہلا احساس ہوا تھا وہ یہی کہ قبر کے پاس کوئی ہے ——— للتا جا چکی تھی صرف اس کے آثار رہ گئے تھے نیچے گرا ہوا آنچل، اور ایک میلی ہوئی انگیٹھی۔ البتہ اس کے پاؤں کے نشانات تھے۔ یکایک مجھے اپنے ساتھی معراج کا خیال آیا اور میں نے اس کی طرف جو رخ کیا تو وہ میٹھی نیند سو رہا تھا، اب مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ خلط ملط دو آوازوں کے سانحہ میں سے جو انسانی کیا تھی وہ اسی کی تھی، جو میرے قہقہے کے جواب میں تھی، معراج بے خوف سو رہا تھا۔ اس کو اب دنیا کی کسی چیز کا خوف نہ رہا تھا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ بہادر تھا کیونکہ اس کو اب دنیا کی کسی چیز سے کوئی تعلق نہ رہا تھا ——— تاریخ کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا، اور بند دروازہ وہی تھی یہ دونوں چیزیں اب بھی ویسی ہی ہیں۔

سہام مرزا

تضمین بر قصیدہ سعدیؒ

ہائے بچپن گیا گئی وہ خوشی — تھی عجب طرح کی شہنشاہی
پھر جو بیتی تھی تو لڑکپن کی — چند قصوں میں وہ تمام ہوئی
بات پوچھو تو تب جوانی کی — ایک دم بھر کی تھی وہ بے ہوشی
اب ہے آغازِ حالتِ پیری — بس ذرا چند سانس ہیں باقی

ہر دم از عمر می‌رود نفسی
چون نگہ می‌کنم نماندہ بسی

دس برس تک نہیں تھے ہوش بجا — بیس تک کھیل کود ہی میں رہا
رہا چالیس تک تو دیوانہ — عیش و عشرت میں محو و بیخود تھا
سال آخر پچاس تک بھی ہوا — نہیں غفلت میں کچھ کمی اصلا
کھول آنکھیں تو نفسِ ناکارہ — موت سر پر کھڑی ہے دیکھ ذرا

ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی
مگر این پنج روز دریابی

کر نہ دنیا کو بے سبب بدنام — عمل خیر کا یہی ہے مقام
خاص ہو کوئی یا ہو کوئی عام — چند روزہ یہاں ہے سب کا قیام
چاہتا ہے جو نیک ہو انجام — دیر مت کر ارے نفسِ نافرجام
نیکیاں جمع کر یہ سعی تمام — منتظر کوچ کا ہو صبح و شام

خجل آن کس کہ رفت و کار نساخت
کوس رحلت زدند و بار نساخت

تو مسافر ہے اور جہاں ہے سرا — صرف دو روز ہے قیام ترا
سامنے آخرت کا ہے رستہ — یہی رستہ ہے تیری منزل کا
دم میں نکلے گا صبح کا تارہ — اینڈ کر کیوں پڑا ہے تو سوتا
نیند گہری نہ لے یہاں اصلا — کھوئی منزل نہ کر ارے بیجا

خواب نوشین بامداد رحیل
باز دارد پیادہ را ز سبیل

چھوڑ یا با خیال بام و در — خاک پتھر ہیں گھر و سیم و زر
مرچکانے کو تجھ پڑا ہو اگر — ہوگا وہ دن کسی طرح سے گزر
جبکہ ہوگا یہاں سے تیرا سفر — خیر کا ہوگا تیرا [illegible]
دوسروں کے لیے یہ فکر نہ کر — قول سعدی نہیں سنا ہے مگر

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت و منزل بدیگری پرداخت

جس کا تو آج ہے مکیں یہ مکاں
چھوڑ جائے گا تو، رہے گا یہاں
دوسرا ہوگا اس پہ قبضہ نشیں
اور بڑھائے گا ان کو تا امکاں
رہے کوشش میں وہ بھی حیراں
کہ عمارت ہو سب میں عالی شاں
چھوڑ کر وہ بھی یونہی طرح میاں
جا بسائے گا شہرِ خاموشاں

مال و زر رخت ہم چنیں ہوتے
بی نگاہ ست بسے نہ بردکھے

جان کر تجھ کو صاحبِ اقبال
اور کچھ پاس دیکھ کے زر و مال
جمع جو دوست ہیں سبھی ان کا
دل میں کچھ ہے زباں پہ کچھ ہے مقال
ہو جو دولت کو تیرے آج زوال
دیکھ ہر ایک جھاڑ کر پر و بال
یہ نہیں دوست چھوڑ ان کا خیال
گر تجھے کچھ بھی ہے خیالِ مآل

یارِ ناپائدار دوست مدار
دوستی را نشاید این غدار

یوں تو ہیں جسم میں کئی اعضا
اور ہر ایک کے ہیں کام جدا
پیٹ کا حال ہے مگر نیارا
سارا ساماں ہے اسی میں بھرا
یہی مخزن ہے کل غذاؤں کا
یہیں اعضا کا ہے قسیم غذا
یہ رہے ٹھیک تو ہے اپنا بھلا
یہ جو بگڑے تو کام ہو پورا

معدۂ عیش آدمی شکم است
تا بتدریج می رود چہ غم است

ماہرین فنونِ طبیات
یعنی حکما نے کی ہے تحقیقات
کھاتے ہیں جو غذا و ماکولات
جا کے پڑتے ہیں معدہ میں دن رات
ان سے بنتے ہیں خون او فضلات
خون سے تازگی ہے اور حیات
فضلے خارج نہ ہوں اگر ہیہات
جان خطرہ میں ہو بلا شبہات

گر بہ بندد چنان کہ نکشاید
گر دل از غم پری کند شاید

علم ابدان سے جنھیں ہے ساز
ان حکیموں سے یہ کھلا ہے راز
زندگی جس سے ہو قلیل و دراز
یہی فضلہ ہے یعنی بول و براز
ان کا منفذ نہ باز ہو نہ فراز
رہے ہر حال معتدل انداز
ہو جو اخراج میں نشیب و فراز
موت ہی واقع ہو بہ عجز و گداز

در کشاید چناں کہ نتواں بست
گو بہ شوی از حیات دنیا دست

ہے صفت آگ میں جلانے کی — جذب و معدوم کرتی ہے مٹی
باد ہر شے کو ہے اڑا دیتی — آب میں ہے سکت بہانے کی
چار عنصر ہیں آدمی کے یہی — شکل انسان ہے انھیں سے بنی
جمع ضدین ہیں بہ دشواری — بس غنیمت ہے ان کی یکجائی

چار طبع مخالف و سرکش
چند روزے بوند باہم خوش

جسم انسان کے یہ چار اضداد — آتش و آب اور خاک و باد
ہے اطبا کا اس طرح ارشاد — خوب میں جاودان ہیں یہ آزاد
اعتدال ان کا دل کو رکھے شاد — کمی بیشی ہے ان کی وجہ فساد
ایک بھی ان میں کا اگر ہو زیاد — زندگی ہو تباہ اور برباد

گر یکے زین چہار شد غالب
جان شیریں برآید از قالب

زیست ہے چند روزہ بھائی جاں — جان اور بوجھ کر نہ ہو انجان
ایک مہماں سرا ہے تیرا مکاں — جس میں ہے چار دن کا تو مہماں
جد و پیہم سے جب تلک امکاں — جمع کر اپنے کوچ کا ساماں
امرِ حق کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ — ہے اٹل اس میں شک نہیں ہے جان

لاجرم مرد عارف کامل
نہ نہد بر حیات دنیا دل

حاتم نامدار و ذی ہمت — اور نوشیروان با عظمت
گرچہ دنیا سے ہو گئے رخصت — نام زندہ ہیں ان کے باعزت
اور ہزاروں ہی صاحب دولت — بانی ظلم و شر و بد طینت
جب انھوں نے یہاں سے کی رحلت — کچھ نہیں لے گئے بجز حسرت

نیک و بد چوں ہمی بباید مرد
خنک آں کس کہ گوئے نیکی برد

گو کہ ماں باپ کو ہے تجھ پر پیار — اور بھائی بہن ہیں تجھ پہ نثار
زن و فرزند بھی ہیں بس غمخوار — دوست کیا ہے چاہتے ہیں سب اغیار
روپے اور پیسے بحال نزار — ساتھ دیں گے فقط یہ تا بمزار
کر عمل نیک زندگی ہی میں یار — زاد رہ اپنا آپ کر تیار

برگ عیشی بگور خویش فرست
کس نیارد ز پس تو پیش فرست

کیسے کیسے شہنشاہان زمن — جن کے زیر نگیں تھے چین و ختن
کتنے ہی ماہرین علم و فن — اور زہاد و عابدان حسن
کیسے کیسے فصیح و اہل سخن — اور حسینان دہر نازک تن
آئے چند سے اٹھائے رنج و محن — خاک ہو کر ہیں اب تہ مدفن

عمر برف است و آفتاب تموز
اندکے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

کیسا بازار ہے یہ خوش اسلوب — مزرع آخرت ہے نام بھی خوب
جنس نیکی بدی جو ہو مطلوب — تجھے مل جائے گی جو شے مرغوب
نفس بدخو حریص و پر ز عیوب — دیکھ شہوات کا نہ ہو مغلوب
ہاتھ خالی نہ جا کہ ہے معیوب — کام ایسا نہ کر کہ ہو معتوب

اے تہی دست رفتہ در بازار
ترسمت پر نیاوری دستار

چار ہوتے ہیں دو سے دو مل کر — کلیہ قاعدہ ہے یہ اظہر
موت واقع ہو زہر کھائے اگر — حظ ملے اس کو جس نے کھائی شکر
تخم نیکی جو بوئے نیک سیر — پائے گا ثمرہ بھی وہ شیریں تر
اور جو باندھے کوئی بدی پہ کمر — بد نتیجہ وہ دیکھے گا اکثر

ہر کہ مزروع خود بخورد بخوید
وقت خرمنش خوشہ باید چید

تا بکے غفلت اور نادانی — ہو کے گمراہ دشت پیمائی
جس طرف کو ہوا ہے تو راہی — نہیں یہ راہ تیری منزل کی
ہو خبردار راہ لے سیدھی — بس اسی میں ہے تیری بہبودی
مہر نادان حضرت سعدی — کہہ رہے ہیں ز راہ ہمدردی

پند سعدی بگوش دل بشنو
رہ چنین است مرد باش و برو

میر محمد شجاع الدین مہر

شعریت فلسفہ آمیز

دے کے صبا جھونکے پرچھو اُنکا
منہ چومے ہنس مکھ پھولوں کا

کون وہ کیا سمجھے پھولوں کی
سچ سنو مجھ سے پھولوں کی

پھولوں کے جلوے روشن ہیں
پھول لطافت کا مخزن ہیں

پھول حسیں بھی حسن فزا بھی
حسن کے مرکز پر ہیں فدا بھی

خوش رو بھی خوش ہیں پھولوں سے
یہ سنتا ہوں میں پھولوں سے

ایسا ربط باہم دیگر
پھر بھی جدا رہتے ہیں اکثر

لاکھ کہے کوئی البیلی
ہائے چنبیلی ہائے چنبیلی

پھول چنبیلی کے نہ آئیں گے
موسم جب آئے گا کھلیں گے

سب پھولوں کا حال یہی ہے
شاہد اس کا سرو سہی ہے

پھولوں کی جتنی ہیں قسمیں
جمع ہوئیں سب کس مجلس میں

طور یہی ہے خاص پھلوں کا
دیکھ لیا اغراض پھلوں کا

سارے میوے ہر موسم میں
جمع ہوئے کب اس عالم میں

میں نہیں کہتا باغ جناں کی
مجھ کو خبر ہے صرف یہاں کی

جی چاہے سو مل نہیں سکتا
غنچۂ خاطر کھل نہیں سکتا

آم کا موسم سیتا پھل دے!
کیوں نہ کوئی ہنستا ہوا پھل دے

ہم جب ان دونوں کو چاہیں
ڈھونڈتی ہی رہ جائیں نگاہیں

سیتا پھل کی ہر اک ڈالی
ہاتھ اپنے دکھلائے گی خالی

ہر میوے کی فصل جدا ہے
فصل جدا ہے اصل جدا ہے

لذت دنیا ہے ہنگامی
یا ہے یہ میرے ذوق کی خامی!

کیف سے میں خود ہوں بیگانہ
یاد ہے ادھورا "نعمت خانہ"

سید علی منظور

تنقید و تبصرہ

دنیا ہماری :- از پردیسی۔ حجم ۱۳۶ صفحہ قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ۔ راج محل پبلشرز ہمواری کشمیر۔

یہ پردیسی کے چند منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانوں کے پس منظر میں کشمیر کی مفلسی جھلکتی ہے۔ بو وجوہ ترقی پسند مسائل پیش کرنے کے عزائم کا کہیں پتہ نہیں۔ زندگی کے مختلف پہلو افسانہ نگار کے سامنے ہیں۔ "کاریگر" اس مجموعہ کا بہترین افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا لفظ لفظ شاہد ہے کہ براہ راست ... زندگی کی مایوسیوں کو محسوس کیا ہے۔

کروٹ :- از سعادت حسن منٹو۔ قیمت ۳/۔ حجم صفحہ ۲۰۸ ملنے کا پتہ اردو اکیڈمی لاہور۔

اردو کے سب سے زیادہ بدنام مصنف منٹو کے گیارہ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ یہ کروٹ ہے۔ سرورق کی تصویر سے پڑھنے والا دھوکا کھاتا ہے کہ شاید اس میں عریانیت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن ہر ڈراما ناظر کو زندگی کی نئی نئی اداؤں سے روشناس کرتا ہے۔ انسانی فطرت کی عجیب خامیوں کو دکھاتا ہے۔ انسان کے آنسوؤں سے متاثر اور اس کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز کراتا ہے۔ منٹو نے زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے کہ وہ اپنے احساس کی شدت اور بیان کے خلوص کے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں رکھتا۔ تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں۔ اس کے نام سے چونکنے کی بجائے اس کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کرنا اس کو ادیب تسلیم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یوں تو ہر ڈراما اپنی جگہ بہت اچھا ہے لیکن کروٹ، جیتک، اور سب سے زیادہ سلمہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف روپ بظاہر مختلف ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ سب انسانی کش مکش کے مختلف مظاہر ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو جنسی مریض ہے وہ "سلمہ" کا ضرور مطالعہ کریں۔ کیونکہ اس افسانہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملعون منٹو ایسی چیز بھی لکھ سکتا ہے۔ زبان صاف ستھری اور دلکش ہے۔ کتابت اور طباعت بہترین۔

ترسول :- از جناب نور الحسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ... انگلاسکو، قیمت ... عثمانیہ ... مجلد ... ملنے کا پتہ ... حیدرآباد بک ڈپو ... حیدرآباد دکن۔

مصنف کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ترسول ہے۔ زبان سیدھی سادھی ہے۔ اور مصنف کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانوں کے روپ میں نوعمر لڑکے لڑکیوں کے لئے اخلاقی سبق پیش کئے جائیں۔ جابجا پند و نصیحت بھی آگئی ہے۔ کتاب کو دیکھتے ہوئے قیمت زیادہ ہے۔

ایک حمام میں :- از خواجہ محمد شفیع دہلوی حجم ۱۶۸ صفحہ (سنگ سنگاتی) قیمت دو روپے ملنے کا پتہ نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی۔

"ایک حمام میں" بڑا دلچسپ ناول ہے۔ زبان خواجہ محمد شفیع دہلوی کی ہے۔ نہایت سلیس اور ستھری۔ ایسی زبان لکھنے والے اب کمیاب ہیں۔ قصہ الف لیلی سے نہیں بلکہ ہماری اپنی دنیا کی زندگی سے لیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب ترقی پسند ادب کے حامی نہیں مگر اس ناول کو لکھ کر وہ اس تحریک کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ کرداروں کو نہایت چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک مقصد کے تحت سب کو ایک مرکز پر لایا گیا ہے۔ نفسیات نگاری کا کمال اس سے ظاہر ہے کہ شریف بیوی، طوائف، چور، شہدے اور دلی کے رنگیلے نواب زادے سبھی اس میں موجود ہیں اور ہر ایک کے کردار پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ تھیٹریکل کمپنی کا ذکر بڑے مزے سے کیا ہے اور اس ضمن میں ایک علیحدہ افسانہ "روشن آرا" بھی ناول میں ضم کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی دلی کے محاورے اور ان کا استعمال سیکھنا چاہے تو یہ کتاب نہایت مفید ہوگی۔ کتاب عمدہ ہے۔

نیا راگ :- مرتبہ ذکیہ سلطانہ ساغر حجم صفحہ ۱۰۳ قیمت ... ناشر- ... تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔

ماہنامہ "ایشیا" میں جو نظمیں اور غزلیں مختلف اوقات میں شائع ہوئی ہیں ان کا نہایت ستھرا انتخاب "نیا راگ" کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

دیکھیے سلطانہ صاحبہ کے سلجھے مذاق کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ جب ہم تینتالیس ۴۳ مشہور شاعروں کا منتخب کلام پڑھتے ہیں تو مرتبہ خود بھی شاعرہ ہیں اور شاعر کی رفیقۂ حیات بھی۔ اس لئے انتخاب کا معیار بہت بلند ہے۔ طباعت و کتابت عمدہ اور قیمت نہایت کم۔ ایسے انتخابات کی اشاعت اردو ادب کی بڑی خدمت ہے۔

سنگم

از جناب سید شبیر حسین قیس۔ حجم ۹۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ناشر۔ دکن بک ڈپو حیدرآباد دکن

جناب شبیر حسین قیس نہایت پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کے گیارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ "سنگم" ہے۔ افسانوں کے پلاٹ پرانے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا قلم لکھتے لکھتے تھک گیا ہے۔ افسانوں میں کوئی جدت اور نوکھا پن نہیں۔ مگر ان اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپ ہوگا جو افسانوں کو محض دل بہلانے کے لئے پڑھتے ہیں۔ فن کی نزاکت اور باریکیوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ قیمت کے لحاظ سے مجموعہ برا نہیں۔ ایک افسانہ "سنگم" واقعی اچھا ہے۔

یاد اقبالؒ

مرتبہ غلام سرور فگار۔ حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ ناشر۔ اقبال اکیڈمی لاہور۔

یہ جو کسی نے کہا ہے کہ بڑا شاعر کبھی مرتا نہیں اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اقبالؒ پر روز روز کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے۔ فگار صاحب نے اس مجموعہ میں ۴۰ مشہور شاعروں کی ان نظموں کو پیش کیا ہے جو اقبالؒ کی یاد میں لکھی گئیں۔ حفیظ ہوشیارپوری کا مرثیہ لاجواب ہے۔ سر عبد القادر نے مقدمہ لکھا ہے اور جناب محمد حسنین سید بی اے جامعی نے اقبالؒ کی مختصر اور جامع سوانح حیات نہایت سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہے۔ اس میں پسند خواتین کی نظمیں بھی شامل ہیں۔

زہریلے پودے

از محمد عبد السلام بی اے ایم ایس سی لکچرار نباتیات جامعہ عثمانیہ۔ حجم ۶۲ صفحات۔ قیمت ۱۰ؔ۔ ناشر۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

مولوی عبد السلام نے نہایت سادہ زبان میں مختلف زہریلے پودوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ان کے زہر دور کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔ سائنس کے متعلق ایسی عام فہم کتابیں اردو میں ضرور لکھی جائیں۔ سائنس کے طالب علم اور عوام ہر ایک کے لئے اس کا مطالعہ یکساں مفید ہے۔

یونان و روما کے انوکھے قصے

از امجد علی صاحب۔ قیمت ۱۲ؔ کلدار۔ حجم ۱۹۰ صفحات۔ ناشر حیدرآباد بک ڈپو حیدرآباد دکن۔

انگریزی ادب میں اکثر تلمیحات لاطینی اور یونانی مستعمل ہیں چونکہ اردو ادب پر انگریزی کا اثر بہت زیادہ ہے اس لئے یہ اردو میں بھی رائج ہیں۔

آٹھ تلمیحات کو افسانوں کی شکل میں پیش کیا ہے اور اکثر بہت مشہور ہیں۔ اس لئے کتاب کا مطالعہ عوام کے لئے خصوصاً جو انگریزی سے ناواقف ہیں مفید ہوگا۔

تذکرہ باب حکومت

مرتبہ محمد منظر۔ حجم ۳۰۰ صفحات۔ قیمت قسم اول عسہ قسم دوم ممہ قسم سوم ہے۔ مطبوعہ انتظامیہ پریس حیدرآباد دکن۔

محمد منظر صاحب نے اپنی ذاتی معلومات سے کام لے کر اس تذکرہ کو مرتب کیا ہے۔ ملک اور حکومت سے دلچسپی لینے والے حضرات اسے ضرور پڑھیں۔

باب حکومت کی نہایت مبسوط تاریخ ہے۔ اس کا خاتمہ فرمان عالیہ کے دو فقروں پر کیا گیا ہے۔

"ز ۔ س"

ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کا ماہنامہ

نشان ڈاک آصفیہ ۱۵۳
نشان ڈاک برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم۔اے
سکینہ بیگم

جلد ۹ بابت ستمبر ۱۹۴۶ء شمارہ ۹

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے کے اہتمام سے دستگیری پریس میں چھپکر رفعت منزل خیرت آباد سے شائع ہوا

تجلیات

غم ہے کیا، زینۂ صفات و ذات
غم نہیں ہے تو آرزو۔ نہ حیات

نغمۂ آرزو و رقصِ حیات
مرحبا عاشقانِ خوش اوقات

تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

آرزو ہر نفس حیات و مرگ
عاشقی بے نیازِ مرگ و حیات

باتوں باتوں میں آج تو سرِ بزم
کہہ گئے وہ ہر ایک دل کی بات

آپ جو کچھ کہیں بجا، لیکن
آپ پر بھی ہیں چند الزامات

ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل
ہم سے پوچھو ستم کے احساسات

عشق وہ تشنہ کام ہے کہ جسے
زہر کا گھونٹ بھی ہے آبِ حیات

اے کمالِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

جگر مرادآبادی

عربی ادب عہدِ بنی اُمیّہ میں

(سنہ ۴۱ھ سے سنہ ۱۳۲ھ تک)

خلافت راشدہ کے خاتمہ پر عرب کے سیاسی حالات میں پھر ایک انقلاب رونما ہوا۔ حضرت معاویہ جو اپنی سیاست دانی اور تدبر کے بل بوتے پر اب تک صرف گورنر بن سکے تھے، اب موقعہ پاکر انھوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ خلافت کے حاصل کرنے کی اس کوشش میں انھوں نے مستحقین یعنی اہل بیت ہی سے جنگ کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کے بنیادی اصول سے انحراف کیا یا نہیں یہ ہمارے مبحث سے خارج ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ خلافت کو تبدیل کرکے انھوں نے بادشاہی کی بنیاد ڈالی۔

اموی حکومت شام میں قائم ہوئی جس کا دارالخلافہ دمشق قرار پایا۔ اہل شام نے امیر معاویہ کے ہاتھ پر سنہ میں بیعت کی اور انھیں اپنا خلیفہ تسلیم کیا۔ عرب کی اس جدید خلافت میں شخصی حکومت کی پوری شان نمایاں تھی۔ حضرت معاویہ کے بعد یہ سلطنت نہایت کمزور اور کوتاہ اندیش حکمرانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ صرف عبدالملک بن مروان (سنہ ۶۵ھ سے سنہ ۸۶ھ تک) اور حضرت عمر بن عبدالعزیز قابل حکمران گزرے۔ بالآخر سنہ ۱۳۲ھ میں خلافت عباسیہ کے بانی کے ہاتھوں اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

اموی حکومت اور خلافت راشدہ میں بعض اختلافات بیحد نمایاں ہیں۔ مثلاً خلافت راشدہ میں خلافت کی بنیاد عوام کی پسند پر تھی۔ سب لوگ مشورہ اور رائے سے جسے منتخب کرتے وہی خلیفہ ہوتا بجائے اس کے بنو امیہ میں "سلطنت دست بدست" چلی آتی رہی۔ خلفاء راشدین عوام کے مشورہ اور مدد سے اسلامی امور کی بجاآوری کرتے لیکن خاندان امیہ کے خلفاء بالکل خود مختار اور مطلق العنان تھے۔ سب سے بڑھ کر خلافت راشدہ کے تمام کام دینی اصولوں، مذہبی احکام اور خدا اور رسول کے فرامین کے مطابق ہوتے مگر شاہان بنو امیہ ان اصولوں کی پابندی پر مجبور نہ تھے۔ یہی وجوہ تھے جن کی بنا پر ابتدائے اسلام کی حق پرستی، سادگی، راستی اور راست بازی اس عہد میں بالکل نہیں تو بہت کچھ غائب ہوگئی۔

سیاسی اعتبار سے اموی حکومت کامیاب کہی جائے یا نہ کہی جائے لیکن علمی سرپرستی اور علماء نوازی کی حد تک اس کی مثال قابل تقلید ہے۔ علوم و فنون کی سرپرستی اور ان کی ترقی میں بنو امیہ کے ہر خلیفہ نے کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ خصوصاً شاعری اس عہد میں خوب پھلی پھولی۔ اس عہد میں شاعروں کی قدر و منزلت ہونے کے کئی وجوہ ہیں جنھیں آگے بیان کیا جائے گا۔

اموی حکومت کے آتے ہی قبائل عرب میں پھر ایک مرتبہ پھوٹ پڑ گئی۔ اسلام نے آکر جہاں ہزارہا قبائل اور متعدد قوموں میں یگانگت اور اتحاد کی روح پھونک دی تھی وہاں اب سلطنت کی خواہش نے عرب کے ان جنگجوؤں میں پھر اختلافات کا بیج بویا۔ ہر قبیلہ اپنی پرانی روایات کو دہرانے لگا اور اپنے قدیم عز و شرف پر ناز کرنے لگا۔ اصل میں دیکھا جائے تو ان جھگڑوں کی بنا حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ہوتی ہے۔

اسی واقعہ فاجعہ کے بعد حضرت علیؓ کے طرفداروں کی ایک جماعت بن گئی اور دوسری حضرت معاویہ کی حتیٰ کہ ان کی لڑائیوں کا سلسلہ بہت زمانہ تک جاری رہا۔ جس کے آخر میں تاریخ اسلام کا وہ خونچکاں اور دل گداز واقعہ پیش آیا جسے ساری دنیا "سانحۂ کربلا"

کے نام سے یاد کرتی ہے۔ وہ پھوٹ جواب تک سیاست کے میدان میں چند خاندانوں تک محدود تھی اب عوام میں پھیل گئی۔ حتیٰ کہ بچہ بچہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔

اس عہد میں فتوحات کا سلسلہ بھی جاری رہا چنانچہ کئی نئے ممالک اس زمانہ میں مقبوضات اسلام میں شامل ہوئے جو ممالک خلافت راشدہ کے زمانے میں پوری طور پر فتح نہ ہونے پائے تھے یا فتح ہونے کے بعد بھی جہاں پوری طور پر قبضہ نہ ہو سکا تھا وہ اسی دور میں اسلامی تصرف میں آگئے اس کی وجہ سے سلطنت کا خزانہ معمور اور رعایا میں آسودہ حالی بڑھ گئی۔ دمشق کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔ نئے شہر بسائے گئے باغ لگوائے گئے۔ نہریں اور کنویں کھدوائے گئے۔ بڑی عالیشان اور خوبصورت عمارتیں، مساجد، درسگاہ، سرائیں، پل، مینار اور محلات وغیرہ تعمیر کئے گئے۔
غرض فساد اور بدامنی کے ساتھ جیسی کہ خوارج کی بغاوت یا دوسری ایسی ہی اندرونی سرکشیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، ملک میں خوشحالی اور آسودگی پھیل گئی تھی۔ عرب بدوی پہلی مرتبہ اپنے بے برگ و گیاہ صحراؤں کو خیرباد کر کے اموی بادشاہوں کی سرپرستی کے نو معمور شہروں میں جا بسے۔ یہ صحرائی، شہری زندگی سے اور اپنے وحشی تہذیب و تمدن سے آشنا ہونے لگے۔ دولت کی فراوانی سے عوام کا معیار زندگی بلند ہو گیا۔ ان وجوہ کا اثر لوگوں کے خیالات پر پڑا جس کا عکس ادب کے ہر شعر اور تحریر کے ہر پارے میں ابھر آیا۔

اس زمانہ کے ادب کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) جدید ادب جس میں حسب ذیل علوم شامل ہیں۔
(ا) علوم اسلامی مثلاً علوم القرآن، حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ۔
(ب) علوم لسانی مثلاً لغت، نحو وغیرہ۔
(ج) تاریخ و جغرافیہ وغیرہ۔
(د) وہ علوم جو یونان، فارس اور ہند وغیرہ سے ادب عربی میں منتقل کئے گئے۔
(۲) قدیم علوم و فنون جو جاہلیت اور ایام راشدین دونوں میں موجود تھے جیسے لغت، خطابت، امثال، شعر وغیرہ۔

علوم و فنون کی مندرجہ بالا فہرست میں بعض علوم ایسے بھی ہیں جن کی اس زمانہ میں حقیقی معنوں میں بنیاد پڑی اور جن کی ترقی عہد عباسی میں ہوئی جیسے یہی علوم اسلامی ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے ہمارا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہو گا کہ جدید ادب کی صرف بنیاد اس زمانہ میں رکھی گئی۔ یہ واقعہ ہے کہ علوم و فنون کی حالت بالکل انسانوں کی سی ہے کہ انہیں کی طرح علوم کی زندگی بھی ہوتی ہے یعنی پہلے تو وہ تکوین پاتے ہیں جس طرح کہ بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد وہ کچھ ترقی کرتے ہیں پھر پورے شباب پر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کمزور ہو جاتے ہیں اور بالآخر بوڑھے ہو کر ادب کے آسمان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے ہیں۔

انسانوں ہی کی طرح ان کے بھی بڑھنے اور گھٹنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ زمانہ اور ماحول۔ انہیں کو پیش نظر رکھ کر ہم ان علوم کی تفصیلات پیش کریں گے۔

عربی ادب کے مرکز

جس طرح ادب اردو میں دہلی اور لکھنؤ کی علمی مجالس اور انجمنیں تاریخ ادب اردو میں دائمی یادگار بن گئیں، یہی حالت عربی ادب کی تاریخ میں بصرہ اور کوفہ کی ہے مگر ان کی اہمیت اردو کے ان ابتدائی گہواروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ عربی ادب، لغت، شعر و شاعری

اور نحو کا ایک مایۂ ناز حصہ انھیں دو مقامات کا رہین منت ہے۔

بصرہ اور کوفہ کی بناء کا بھی عجیب حال ہے یہ دونوں مقامات آباد تو ہوئے فوجی ضروریات کے تحت لیکن زمانہ نے انھیں علم و ادب کے مرکزوں میں تبدیل کر دیا۔ ابتدائے اسلام میں جبکہ فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اور مقبوضات میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا اس وقت پایۂ تخت سے بر وقت فوجیں روانہ کرنے اور واپس بلانے میں دقت ہوتی تھی اور دوسرے یہ کہ دور دراز کے علاقے آسانی سے قابو میں نہیں رکھے جا سکتے تھے اور ان کے سرکش ہونے کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا تھا اسی لئے جابجا فوجی چھاؤنیاں بنائی گئیں جن میں ہمیشہ فوج رہا کرتی تھی۔

جب یہ چھاؤنیاں خوب آباد ہو گئیں اور یہ فوجی مرکز بڑے شہروں میں بدل گئے اور لڑائیاں کم ہو کر بالآخر امن کا زمانہ آ گیا تو ان کی حالت بھی بدلتی گئی۔ عرب چونکہ فطرتاً شعر پرست واقع ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی موقعہ پر بھی (خواہ وہ جنگ ہی کا کیوں نہ ہو) اپنی اس عادت کے پورا کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان مقامات میں پہلے پہل شعر و شاعری کے مقابلے ہوا کئے پھر ہر قسم کے ادبی مناظرے اور بحثیں وغیرہ ہونے لگیں حتیٰ کہ ان اغراض کے لئے باقاعدہ انجمنیں اور مجلسیں قائم ہو گئیں اور جاہلیت کی طرح اسواق بھی بن گئے۔

بصرہ کے مشہور "سوق مربد" کا نام اس سلسلہ میں بیحد مشہور ہے۔ یہاں ہر قسم کے علمی و ادبی مباحث کا تذکرہ رہا کرتا۔ شعر و شاعری کے معرکۃ الآرا مقابلے بھی یہیں ہوا کرتے اور بعد میں چل کر لغت اور نحو کا بھی یہ زبردست مرکز قرار پایا۔ اس کی حالت جاہلیت کے "سوق عکاظ" سے اتنی مشابہ ہو گئی کہ اسے "عکاظ الاسلام" کہنے لگے۔

خلفاء بنی امیہ کی سرپرستی میں ان شہروں نے اتنی ترقی کی کہ دور دور کے لوگ انھیں دیکھنے اور یہاں کی علمی دلچسپیوں میں حصہ لینے کے لئے آتے۔ علم و ادب کے یہ مرکز تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان کا تذکرہ یہاں اس لئے ضروری تھا کہ جدید عربی ادب بلکہ کل ادب عربی پر جو اسلام کے بعد تیار ہوا ان مقامات کا بیحد اثر پڑا اور اس عہد کے علوم و فنون کے تذکرے میں ان کا ذکر آنا نہایت ضروری ہے۔

اسلامی علوم

اسلامی علوم میں سب سے پہلے قرأت قرآن کا نمبر آتا ہے۔ عرب میں چونکہ پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہوتے تھے اور خصوصاً قرآن کے حفاظ اور اس کی قرأت کے ماہر گنتی کے ہوا کرتے تھے اس لئے امتیازاً انھیں "القرار" کہا جاتا تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ قرآن شریف کی باقاعدہ تدوین کے بعد بھی قرأت کے اختلافات کا سلسلہ قائم رہا۔

فتوحات کی وسعت کے ساتھ مسلمان اقصائے عالم میں پھیلتے گئے اور ان میں بھی ہر قبیلہ اور عرب کے ہر خاندان کے لوگ شامل ہوتے جن کی لغتوں میں ابتدا ہی سے جزوی اختلافات موجود تھے۔ پس یہ اختلافات نئے ماحول کے اثرات اور نئی زبانوں کے اختلاط کی وجہ سے ہر جگہ کی قرأت میں ایک خاص رنگ پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ قرآن کی عبارت کو سات آٹھ طریقوں سے پڑھا جاتا تھا عصر اموی میں صحیح قرأت کے کئی ماہر موجود تھے جن میں بعض بہت عرصہ تک زندہ رہے ان میں سات مشہور

عبداللہ بن کثیر المتوفی سنہ ۱۲۰ھ

عاصم بن ابی النجود المتوفی سنہ ۱۲۸ھ

عبداللہ بن عامر المتوفی سنہ ۱۱۸ھ

یزید بن القعقاع المتوفی سنہ ۱۳۲ھ

حمزہ بن حبیب المتوفی سنہ ۱۵۶ھ

ابو عمرو بن العلاء المتوفی سنہ ۱۵۶ھ

اور نافع بن عبدالرحمن المتوفی سنہ ۱۶۹ھ وغیرہ ہیں۔

تفسیر قرات کے بعد تفسیر کا نمبر آتا ہے اسلام کے ابتدائی ایام میں جب قرآن کی سورتوں اور آیتوں کے معانی کے سمجھنے میں وقت ہوتی تو لوگ آنحضرت صلعم سے استفسار کرتے اور آپ نہایت آسانی سے ان کے شکوک رفع فرما دیتے اس کے علاوہ قرآن چونکہ قریش کی لغت ہی میں نازل ہوا تھا اسی لئے ان کو اس کے سمجھنے میں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ پیچیدہ سورتوں اور آیتوں کے جو معانی اور مطالب آنحضرت صلعم نے بیان کئے تھے انھیں صحابہ نے اور پھر ان کے بعد ان کے تابعین نے محفوظ کر لیا اور یہ سلسلہ یونہی چلا۔ یہی تفسیر کی بنا ہے۔

اس کے بعد قوانین اور احکام کے وضع کرنے میں جب قرآن سے مدد لینے کی ضرورت لاحق ہوئی تو ساتھ ہی مفسرین کی بھی ضرورت پڑی جو مشکل عبارات کے مطالب حل کرتے اس خصوص میں پہلے حضرت ابن عباس رضؓ جنھوں نے قرآن کی سب سے پہلے تفسیر کی اور دوسرے مجاہد المتوفی سنہ ۱۰۲ھ کے نام خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن ہم بلا خوف و خطر کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر کے فن کی صرف بنا اس عہد میں پڑی اور اس کی ساری ترقی عصر عباسی میں ہوئی۔

حدیث کلام الٰہی کے بعد مسلمانوں کے نزدیک سب سے قابل قدر اور قابل احترام اگر کوئی چیز ہے تو وہ اقوال رسول اکرم ہیں۔ آنحضرت نے مسلمانوں کو قرآن شریف کے مطالب کے ادراک اور دیگر دنیوی امور کی رہبری کے لئے زریں نصیحتیں فرمایا کرتے یا زندگی کے اہم ترین مسائل کے حل چند عام فہم اور معمولی الفاظ میں فرمایا کرتے اور یہ جواہر پارے مسلمانوں کے مصائب میں شمع ہدایت کا کام کرتے۔

حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد جو سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے ان میں مختلف جماعتوں نے اپنی اپنی تائید کے لئے نئی نئی احادیث کو گھڑنا شروع کیا یا اصل احادیث ہی سے اپنی مطلب کی باتیں نکالا کرتے جیسے کہ خوارج کے مقابلہ میں مہلب بن ابی صفرہ کیا کرتا تھا۔ یہ اختلافات اتنے شدید ہو گئے کہ اصل احادیث کی تحقیقات کے سلسلہ میں "فن حدیث" کی بنا پڑ گئی۔

اسی زمانہ میں حدیثوں کے مختلف نام قرار پائے مثلاً

صحیح، حسن، ضعیف، مرسل، منقطع، معضل

شاذ اور غریب وغیرہ اس عہد کے مشہور محدثین میں

شعبۃ بن الحجاج المتوفی سنہ ۱۶۰ھ

خالد الحذاء المتوفی سنہ ۱۴۱ھ

ابو المهزم اور عاصم بن سلیمان المتوفی سنہ ۱۴۱ھ

وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ تفسیر کی طرح اس کی ترقی بھی عصر عباسی ہی میں ہوئی۔

فقہ اسلامی قوانین اور احکامات "فقہ" کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ قانون سازی میں گو اہل یونان اور ایک مدت تک اہل روم بھی عربوں سے آگے رہے ہیں مگر جس کمال پر اسلام نے اس فن کو پہونچایا اس کی نظیر آج تک دنیا کی بڑی سے بڑی قانون ساز قوموں میں بھی نہیں ملتی۔

شخصی تنازعات اور باہمی مناقشات کا فیصلہ ابتداً پنچایت وغیرہ کے ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن جب اسلام نے آکر ہر چیز کی منظم اور مدون شکل پیش کی تو عوام کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے بھی کسی ایسے ہی باصول فن کی ضرورت درپیش ہوئی۔ جس کے لئے سب سے بہتر ذریعہ ان کے پاس خدائے عزوجل کے احکامات کی صورت میں موجود تھا یا اس کے بعد فرامین مصطفوی ان کی ہدایت کے لئے موجود تھے۔ چنانچہ یہی ہوا مسلمانوں نے قضایا کے فیصلوں کے لئے قرآن اور حدیث سے ہی کام لینا شروع کیا اور یہ فن آگے چل کر

"فقہ" کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔

اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ فقہ نے بھی ترقی کی۔ ہر بڑے شہر اور مشہور مقام میں فقیہ اور علما موجود ہوتے جن سے شرعی امور متعلق ہوتے۔ فقہ کی بنیاد اصل میں دیکھا جائے تو خلفاء راشدین کے ہاتھوں پڑی کیونکہ مسلمانوں کے کل تنازعات کے فیصلے وہی کیا کرتے تھے اور ان ہی شرعی اصولوں ان کے بعد صحابہ کا نمبر آتا ہے ان میں عبدالرحمن بن عوف، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، عمارہ بن یاسر حذیفہ، زید بن ثابت اور ابوموسی اشعری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عہد اموی میں یعنی تابعین میں سعید بن المسیب، ابوبکر بن عبدالرحمن قاسم، عبیداللہ عروہ، سلیمان اور خارجہ نے بڑا نام پیدا کیا اور ان سات فقہا کے ناموں کو کسی نے ان اشعار میں کیا ہی خوبی سے جمع کیا ہے دیکھئے!

الا کل من لا یقتدی بائمۃ
فقسمتہ ضیزی عن الحق خارجہ
فخذھم عبیداللہ عروۃ قاسم
سعید، سلیمان، ابوبکر، خارجہ

علوم لسانی

نحو اسلام کی آمد اور عربوں کے ہر طرف پھیلنے کے بعد بھی زبان کی حفاظت اور اپنی لسانی خصوصیات کے تحفظ کی طرف عربوں نے کچھ خیال نہ کیا تھا۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ قواعد اور علم نحو کے وجود میں آنے سے صدیوں پہلے سے عرب میں وہ مایۂ ناز شعر و ادب، نثر اور خطابت وغیرہ کا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا جو خود بعد میں نحوی مسائل اور اختلافات لغت کے جواز میں پیش کیا جانے لگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زبان کو پوری طور پر ترقی کرنے اور اس کے تمام محاورات اصطلاحیں، روزمرہ ضرب الامثال اور دوسری ایسی ہی چیزوں کے جاری ہو جانے کے بعد انہیں کی بنیادوں پر نحو کی عمارت کھڑی کی گئی۔ عرب اپنی زبان اور اپنی قوت نطق پر ہمیشہ غرور کرتے چلے آئے ہیں حتی کہ وہ اپنے سوا ہر ایک کو "گونگا" کہا کرتے۔ ان کے تعلقات جب عجمیوں سے ہونے لگے اور حکومت میں اہل فارس اور ایران بھی شریک ہو گئے تو اس اختلاط کا ان کی زبان پر اثر پڑنے لگا۔ عرب یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی لغت میں کسی قسم کی خرابی ہو۔ کلام پر اعراب لگانے کا قاعدہ گو ان کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ لیکن اتنی سی حفاظت زبان کی صحت کے لئے ناکافی تھی۔

اور دوسرے یہ کہ موالی اور فارس کے نومسلم عربی لغت کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے قطعاً نابلد تھے اپنی گفتگو میں بہت غلطیاں کرتے انہیں وجوہات سے متاثر ہو کر عربوں نے نحوی اصول گھڑنے شروع کئے۔ علم نحو کا بانی ابوالاسود الدؤلی ہے جن کا انتقال سنہ ۶۹ھ میں ہوا۔ یہ تابعین کے گروہ میں بہت بڑا شخصیت کا مالک تھا حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ صفین میں حصہ بھی لیا اور پھر بصرہ میں آ کر رہنے لگا۔ زیاد ابن ابیہ والی عراقین (بصرہ و کوفہ) کے سامنے جب اس جب اس نے پہلے پہل اپنی اس ایجاد کو پیش کیا تو اس نے کچھ التفات نہ کیا مگر حالات سے مجبور ہو کر اس نے نحو کی کتاب لکھنے کی اجازت دیدی۔ ابوالاسود نے نہایت محنت سے ایک قواعد مرتب کی جس کے اجزاء مختلف اشیاء پر تحریر کئے۔

(باقی آئندہ)

ابوالفضل

ذوقِ سفر

گردشِ شمس و قمر، گردشِ شام و سحر — وقت ہے گرمِ سفر، وقت ہے گرمِ سفر
میرے نفس نے دیا، وقت کو ذوقِ خرام — رینگتے رہتے یوں ہی ورنہ یہ شام و سحر
میری نظر نے لیا جائزۂ کائنات — مجھ کو نظر آ گیا، میرا ہی حسنِ نظر
میرے ہی خوابوں میں گم، شام کی افسردگی — صبح کی رنگیں شفق میرا ہی خونِ جگر
میرے تبسم کی موج میری جبیں کی شکن — یعنی بہار و خزاں میری ہی طرزِ نظر
عشق میں بے چارگی، حسن میں زعمِ غلط — عشق رہا سرنگوں، حسن رہا خود نگر
نالہ بھی میری نوا، نغمہ بھی میری نوا — وہ بھی مرا چارہ گر، یہ بھی مرا چارہ گر

میری رہِ شوق میں طور بھی تھا اک مقام — طور سے بڑھنے لگا اور بھی ذوقِ سفر
جرأتِ پرواز نے عرش کو چھو بھی لیا — عرش بھی نکلا مگر میری ہی حدِ نظر

میری نظر بڑھ گئی توڑ کے حدِ فلک — اپنی نظر میں ہوں میں اب بھی مگر کم نظر
میرے سکوں میں بھی ہے آرزوئے اضطراب
یعنے یہ شبنم کی بوند رکھتی ہے رقصِ شرر

میکش

داستان

ایک طویل القامت، دبلے پتلے، لانبے بال والے اجنبی نے سارنگی بجانی شروع کی۔ اس شخص کے چہرے سے فقر و فاقہ کے ساتھ ہی بدعنوانی اور غیر معمولی قوتِ تخلیق کے ملے جلے عجیب غریب آثار ہویدا تھے۔ یہ ایک پُرعظمت، ساحرانہ اور شوریدہ نغمہ تھا جس کے اونچے سر نہایت درد انگیز تھے اور نچلے سروں میں حزن و یاس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس میں قرونِ وسطیٰ کی کوئی ادا تھی، کوئی مایوس کن، ناگوار حد تک دلکش، ظالم اور خوف زدہ کرنے والی چیز تھی۔

میزبان جو اپنے آپ کو موسیقی کا سرپرست سمجھتا تھا سرخ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ اس کی بڑی بڑی، سبک اور ادھر ادھر گھومنے والی آنکھیں دیوانے آدمیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا، اس انداز میں گویا وجد و کیف سے بے خود ہو گیا ہو، ساز پر ایک نغمہ گانے لگا اور اس کی آستینوں کی مسلسل بے ترتیب حرکت تپائی پر رکھے ہوئے شیشوں اور پیالوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"مدتیں گزریں کہ ......" اس کے الفاظ بری طرح بگڑ رہے تھے۔ اس لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے منہ کو اوپر اٹھا کر کہا۔ ہرچند کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور بذاتِ خود اس نے اچھی تعلیم پائی تھی، تاہم اس کی گفتگو پر بیویوں کی جیسی اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔

"اس واقعہ کو صدیاں گزر گئیں ...... آہ، اس واقعہ پر کتنا طویل زمانہ گزر گیا، قرن ہا قرن گزر گئے ...... صدیاں بیت گئیں ...... ہر شخص اس کو فراموش کر چکا ہے ...... وہ اس وقت کتنا بھیانک تھا ......"

میز کے گرد بیٹھے ہوئے مجمع میں سے ایک شخص یکایک اٹھا، وہ اس وقت تک خاموش تھا اور اسے شاید ہی کوئی جانتا تھا جو شخص اسے یہاں لے آیا تھا، اس نے بھی اس کا کسی سے تعارف کرانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کے کپڑے معمولی سے تھے، اس کا قد پست تھا، لیکن سینہ کشادہ تھا۔ وہ بظاہر ادھیڑ معلوم ہوتا تھا، اور اس کے بال ایک عجیب مضحکہ خیز طریقے سے بنے ہوئے تھے۔

"کیا آپ مجھے اجازت نہ دیں گے؟" اس نے التجا آمیز آواز میں دریافت کیا۔ میزبان، ایک مسخرے کی طرح پیچھے ہٹا اور اپنے بازوؤں کو سینہ پر سے ایک جھٹکا دے کر زمین کی طرف لاتے ہوئے مضحکہ خیز آواز میں بولا۔

"کیوں نہیں، ضرور، ضرور"

"پھر شروع سے" آوارہ اجنبی نے سارنگیے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں سارنگیے سے چار ہوئیں اور اس نے سارنگی کے پہلے بولوں کے ساتھ اپنا نغمہ شروع کر دیا۔

یہ اگلے وقتوں کا ذکر ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک بہت سے قدیم خاندان دنیا سے ختم ہو چکے ہیں، بہت سے قلعے ویران ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں قدیم قلعہ جھیل کے درمیان چٹانوں پر کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے گرد و نواح میں ہر شخص جانتا تھا کہ جھیل کی وجہ سے قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا، اور یہ کہ لوہے کا لانبا پل رات کے وقت اٹھا لیا جاتا تھا۔

رئیس نے اپنی عمر کی ساٹھ منزلیں طے کی تھیں، تاہم وہ نہایت قوی، بلند حوصلہ اور حد سے زیادہ شجیع تھا۔ کسی عقاب کی پُرمسرت چیخ پر وہ قہر کی شعاعوں کے سرخ دہشت ناک شعلوں میں اپنے سرداروں کے آگے گھوڑے پر بیٹھا تیزی سے پل پر سے گزرتا اور اس کے قدموں کے نیچے جھیل کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور ٹاپوں کی آواز سے ہم آہنگ ہو جاتیں۔ پھر بستیاں شعلوں کی نذر کر دی جاتیں، بستیاں لوٹی جاتیں، اور سامانِ تجارت لانے والے سوداگروں کا قیمتی مال اس کی لوٹ مار کی نذر ہو جاتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایک معمولی لڑکی سے شادی کیوں کی؟ کیا اس کے باج گزاروں کی بیٹیوں میں کسی

حسین عورت کی کمی تھی؟ کیا کسی اونچے گھرانے کی لڑکی کو یہ اعزاز بخشا نہیں جا سکتا تھا؟ اس نے وحشیانہ طور پر اپنی شادی کا جشن منایا، خوب خوب شرابیں پیں، اپنے غلاموں کو مٹھیاں بھر بھر کے جواہرات دیے اور اپنی جوان بیوی کو اپنی بڑی بڑی وحشیانہ بے کیف آنکھوں سے گھورتا رہا۔

وہ ایک غریب مصور کی بیٹی تھی۔

ہزار ہا آنکھوں نے اس حسین عورت کا نظارہ کیا تھا لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس کو محبت بھری نظروں سے تکتا جو زبان حال سے کہتیں "میری جان حاضر ہے، یہ تم پر سے نثار ہے، مجھے تم سے محبت ہے......!"

ایک دن ـــــ جیسا کہ ماضی کی تاریکی میں لپٹی ہوئی داستان میں مذکور ہے ـــــ رئیس ایک مہم سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوعمر غلام اس عورت کے قدموں پر پڑا ہوا ہے۔ اس نے غلام کو صحن میں آنے کا حکم دیا اور اس کی سیدھی آنکھ میں گولی مار کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔

اس نے اپنی بیوی کو چھوا تک نہیں، لیکن اس نے اپنے فرماں بردار اور جفاکش سرداروں کی جمعیت کو طلب کیا اور ہر ایک سردار کو شاہانہ فیاضی سے سونا عطا کر کے کہا۔

"تم آزاد ہو، جہاں جی چاہے جا سکتے ہو۔"

اور جب ان میں کے آخری آدمی نے لوہے کے پل کو پار کر لیا تو رئیس خود اٹھا، زنجیر توڑ ڈالی، اور قلعے کے عظیم الشان دروازوں کو مقفل کر دیا۔

سردار جب قلعہ پر آخری نظر ڈالنے کے لئے پلٹے تو انھوں نے رئیس کو برج کے سب سے بلند جھروکے میں نمودار ہوتے اور لوہے کی بڑی کنجی کو جس سے قلعہ کے دروازے مقفل کئے گئے تھے، بے تاہ جھیل میں پھینکتے ہوئے دیکھا۔

سال ہا سال گزر گئے، کسی نے بھی اس قدیم، ویران قلعے کے متعلق کچھ نہیں سنا۔ سوائے اس کے کہ اب وہاں کچھ باقی نہیں ہے۔ ہر طرف کالی اُگ آئی ہے۔ اور دھول اڑتی رہتی ہے۔ ہری ہری چھپکلیاں ادھر ادھر دوڑتی پھرتی ہیں اور شہد کے چھتے ہوا میں اپنی بو پھیلاتے ہیں۔ ان دو انسانی ہستیوں کا کیا انجام ہوا؟ کیا وہ طویل اور شدید تکلیف اٹھاتے رہے؟ ان دونوں میں سے کس نے زیادہ اذیت اٹھائی؟......

کوئی شخص ہاں کوئی شخص بھی ... کبھی نہ جان سکا۔

موجیں پتھر کی بنیادوں سے ٹکرا رہی ہیں...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان موجوں کی آواز گھوڑوں کے ٹاپوں کی وہ پرانی دہشت ناک آواز کی صدائے بازگشت ہے۔ کوئی بھی اس راز سربستہ کا پتہ کبھی نہ چلا سکے گا......

اور خاموش موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں......

سارنگیہ اور گانے والا دونوں ایک ساتھ چپ ہو گئے اور چاروں طرف چھائی ہوئی لرزہ خیز خاموشی میں میزبان نے ان کی چٹکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"بس، اتنا ہی؟ ہاں طویل نہیں لیکن قدیم ہے، اچھا اس کہن..."

(ترجمہ از کپرن)

سید مبارز الدین رفعت

بغاوت اور موت

مجھے ہوسٹل میں رہتے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا اور اس عرصے میں کئی واقعات رونما ہوئے۔ ہوسٹل کی زندگی کا ماحول بہت پرشور اور ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ ذریعہ پیدا کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ مجھ جیسی خاموش لڑکی کو اپنی زندگی میں ایسے ہنگاموں کا تحمل ہونا ایک دشوار امر تھا۔

ہمارا ہوسٹل چھٹیوں کی ایک طویل مدت کے بعد کھلا تھا اس لئے اس بار بہت سی جگہ پیدا ہوگئی اور ہوسٹل میں دھڑا دھڑ داخلے شروع ہونے لگے۔ یہی وجہ ہوئی کہ میرا کمرہ بھی خالی نہ رہ سکا اور قانتہ نے آکر اس کمی کو پورا کر دیا۔

قانتہ کو ہوسٹل کی وارڈن نے میرے کمرے میں اس کا ٹھکانہ بتایا اور اس کی ماں مطمئن ہو کر قانتہ کو چھوڑ کر جانے لگی تو اس کی صورت سے ایسی سنجیدگی اور متانت ظاہر ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک بارعب ہستی کھڑی ہوئی ہے۔

میرے دل نے گواہی دی کہ اگر دوست ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہستی۔ حالانکہ میں نے اب تک کسی لڑکی کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ میں ایسی سہیلی کی ضرورت محسوس کرتی تھی جو مجھ جیسی ہی خاموش ہو۔

اس لئے میں جلد اس سے مانوس ہو جانا چاہتی تھی جیسا کہ عام لڑکیوں کا خاصہ ہے۔ میں نے اس سے مسکراتے ہوئے کہا کہ کہیئے آپ کو اپنی جگہ پسند آئی۔ میں نے گفتگو کے دوران میں کمرے کا دریچہ کھول دیا اس نے دریچہ کے باہر جھانکتے ہوئے کہا کہ میں تو ایسی ہی پرسکون جگہ کی جویا تھی۔ خیر وقت گزرتا گیا دو تین ہفتے گزرے لیکن قانتہ سے کوئی بے تکلفی نہ ہوئی۔ سوائے معمولی گفتگو کے۔ کبھی تعلیم کے بارے میں کبھی موقعی۔ میں اس کو بار بار مجبور کرتی کہ خدا کے لئے اپنی زندگی کو اس قدر متانت سے نہ گزاریئے۔ لیکن وہ صرف یہ کہہ کر ٹال دیتی ہے۔

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

قانتہ بالکل سیدھی سادی زندگی گزارتی تھی نہ اس میں کوئی تکلف تھا نہ تصنع۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ وہ نماز بھی پڑھتی تھی اور روزے بھی رکھتی تھی۔ باوجود متین ہونے کے ملنسار بھی تھی اور ہمدرد بھی جب کبھی وہ لڑکیوں سے بات کرتی تو مسئلہ قضا و قدر کے متعلق روشنی ڈالتی تو اختلافات الٰہیات پر یہی وجہ تھی کہ تمام لڑکیاں اس کو "زاہدہ خشک" کہا کرتیں۔

قانتہ میرے ساتھ میرے کمرے میں ہوتی تو میں چاہتی کہ اے کاش وہ مجھ سے باتیں ہی کئے جائے۔ میں ہزار موقع تلاش کرتی اور اس سنجیدگی کے راز کو فاش کرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ مصداق ؎

بزبان حال سے ہے حال درد و غم
جس کو کہتے ہیں خموشی ہے وہ گویائی مری

جب میں اس کے خانگی معاملات میں اس کے متعلق پوچھتی تو وہ آہ بھر کر کہا کرتی کہ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں! کیا کہوں۔ صرف یہی سن لیجئے کہ ؎

پکارتا ہے ہر اک داغ میرے سینے کا
لٹے ہوئے چمن سوگ کی بہاروں میں

لیکن میرے پیہم اصرار سے یہ معلوم ہوا کہ وہ سایۂ پدری سے محروم ہے۔ ایک غمگسار بہن بستر علالت پر ہے اور اس کے کمسن بھائی بہنوں کی تعلیم کا عسرت و ناداری کی وجہ سے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہوا۔ اب اس سے اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ ایک روز میں اپنے امتحان کی تیاری کے لئے کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ قانتہ نے میرے پیچھے آکر ایک خط دیا اور کہا کہ پڑھو۔ مجھ سے اس کی بے تکلفی پر تعجب ہوا اور بڑی پرشوق نظروں سے خط کھول کر پڑھنے لگی لیکن آہ اس میں کیا تھا، لکھا تھا کہ اس کی بہن

نزہت اپنی زندگی کے آخری دنوں کو بڑی بے چینی سے گزار رہی ہے [illegible] کے دفعیہ کے لئے میور کی صحت بخش ہوا میں [illegible] میں نے خط پڑھ کر قانتہ کو دیکھا جو [illegible] آنکھوں سے آنسو گراتے ہوئے [illegible] رہی تھی۔

سنبھلنے دے ہجوم ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اس کے چہرے سے یاس و ناامیدی ٹپک رہی تھی میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گھبراؤ نہیں قانتہ خدا پر بھروسہ رکھو اور اس سے دعا مانگو۔

اب اس کے قریب چلی گئی تھی اور میں نے کہا خدا کریم و رحیم ہے وہ تمہارے حال پر رحم و کرم کرے گا۔

قانتہ نے میری طرف دیکھ کر اس قسم سے گھورا کہ میں سہم گئی میں سمجھی شاید اس پر اپنی بہن کی ناسازی کا بہت اثر ہو رہا ہے لیکن اس نے کہنا شروع کیا۔ تم نے کیا کہا؟ رافعہ خدا سے دعا مانگوں؟ اس خدا سے جس نے مجھے بن باپ کا کیا۔ اور اس سے جس نے میرے بھائی بہنوں کو بے وجہ موت کا مزا چکھا کر ہماری زندگیوں کو سوگوار بنا یا اور اس وجہ سے جو اب اس بہن کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے جو ہمارے لئے زندگی کی نعمت غیر مترقبہ ہے اور اس خدا سے جس نے طبقۂ امرا کو اپنی تمام بخششیں عطا کر کے طبقۂ غربا کے لئے اپنے پاس کوئی چیز نہ رکھی تم نہیں دیکھتیں کہ اس کی ہزار ہا مخلوق بے خالق کی طرح ایڑیاں رگڑاتی پڑی ہوئی ہے۔

کیا تم اس کو محسوس نہیں کرتیں کہ سیکڑوں بچے بلا وجہ یتیم ہو کر اپنی زندگیوں کو نیست و نابود کر رہے ہیں اور کیا اس کے لاکھوں بندوں کی تعداد بے یار و مددگار پڑی ہوئی ہے؟ اور کیا ہزاروں شاکر نہیں اپنے کمسن بچوں کو فاقوں سے بلکتے تڑپتے دم توڑتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کی حسب مرضی شاکر نہیں رہیں؟ تم ہی بتاؤ اتنا ہونے پر بھی کیا اس کی رحمت میں جوش آیا؟؟

اگر میں دعا مانگوں تو کیا اس کو اپنی رحمت عطا کرنے کا خیال آئے گا۔ ہرگز نہیں وہ غربا کو ان کی زندگیوں کو تلخ کرنے پر تلا ہوا ہے اس نے ایک سانس میں اتنی لمبی تقریر کر دی میں نے ہکا بکا ہو کر اس کی صورت کو دیکھا اور کہا آہ! قانتہ! تم سے ایسی امید نہ تھی۔ بجائے اس کے کہ تم خدا کا شکر کرتیں اور مدد مانگتیں، اچھی خاصی باغی بن گئیں۔ اس خدائے لایزال ولم یزال کی شان میں گستاخی کر رہی ہو، جس کے قہر اور عذاب کے ڈر سے بڑے بڑے انبیا نے رو رو کر شب بیداری کی اور فاقوں پر فاقے رکھ کر بھی اس کی مرضی کے خلاف گردن نہیں موڑی اور جس کے شان میں میں یہ کہہ سکتی ہوں ؎

عطر و گلاب و مشک سے دھو کر زبان کو
گستاخ ہوں جو پھر بھی ترا نام لے سکیں

یہ سن کر اس کی صورت بدل گئی چہرہ سرخ ہو گیا آنکھوں سے سخت غصہ کا اظہار ہونے لگا۔ مجھ سے کہنے لگی بس بس رافعہ اس وقت تم پند و نصائح کے نشتر سے میرے زخم ہائے جگر کو اور مجروح نہ کرو۔ تم کو کیا معلوم کہ میرے دل میں ناامیدیوں کے سمندر کی موجیں امیدوں کے جہاز کو بڑی تیزی سے بھنور میں پھنسا رہی ہیں اور غم کی موجیں بڑے زور شور سے ساحل دل سے ٹکرا رہی ہیں اور ان موجوں کے نظارے کا لطف حاصل کرنے والے تمہارے طبقے والے ہیں آہ میری دلی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

تم نے دیکھا ہوگا سیدہ کہ میں نے ناامید ہو کر اب خدا کی عبادت بھی چھوڑ دی ہے جب کہ میری بہن کی پہلی دفعہ ناسازی مزاج کی کیفیت معلوم ہو چکی تھی، میں نے خدا کو اپنا بنانے کے لئے تا کہ اس کو ہمارے حال پر رحم آ جائے، اس کے احکام پابندی سے بجا لائے۔ لیکن جب مجھے معلوم

ہو گیا کہ خدا بھی عیش و عشرت میں سرشار رہنے والے انسانوں کی طرح ہماری طرف سے غافل ہے تو ضمیر نے گواہی دی کہ وہ قاضی الحاجات نہیں اب میں کس طرح امید رکھوں کہ میری بہن اتنی سخت بیماری میں بغیر موثر علاج کے صحت مند ہو سکتی ہے۔ اُف۔ افعہ! ہماری زندگی کو خدا نے کس قدر پُر آلام بنایا۔

میں نے کہا اے کاش تم اس پُر آلام زندگی کو باطمینان گزارتیں اور سمجھتیں کہ ؎

آئیں مصیبتیں تو اکڑ مسکرا کے چل
سر جھک گیا تو موت ہے یاں سر اٹھا کے چل

قانتہ! ابتدائے آفرینش سے مخلوق میں خدا کی محبت کے ساتھ بغاوت کی صلاحیت بھی موجود تھی اسی کے تحت جب اس کی محبت میں فرق آجائے تو بغاوت کا جذبہ جوش میں آتا ہے۔ تمہارے دل میں خدا کی محبت باقی نہ رہنے سے باغیانہ خیالات جمع ہو کر تمہارے دماغ کو پراگندہ کر رہے ہیں تم اس کو خوب سمجھ لو ؎

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریب قسمت پر
سکون دل کو جو بخشے وہ اضطراب پیدا کر

میں کچھ اور کہہ رہی تھی یا کچھ اور کہنے والی ہی تھی کہ کچھ خوش باش لڑکیاں پُر لطف گفتگو اور ہوسٹل کو گونجا دینے والے قہقہے لگاتی ہوئی آئیں اور آتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیا لیکن قانتہ اٹھ کر اپنے بستر پر نہ جانے کیا لکھتی بیٹھی رہی چونکہ اس کی یہ عادت تھی ہی اس لئے لڑکیوں نے اس کی اس بے توجہی کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے لیکن قانتہ کی زندگی میں کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی وہ اور زیادہ اداس ہوتی گئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہم دونوں نامعلوم جگہوں میں جا کر بیٹھ جاتے اور میں اس کو سمجھاتی اس کی بہن کی طرف سے تسلی دلاتی وہ کہا کرتی آہ رافعہ بقول کسی کے ؎

یہاں بیٹھا ہوا دل میں کسی کو یاد کرتا ہوں
کبھی آنسو بہاتا ہوں کبھی فریاد کرتا ہوں

اور راتوں کو ہم دونوں ایک ساتھ سوتے لیکن کسی وجہ جب میری آنکھ کھل جاتی تو دیکھتی کہ وہ ٹہل رہی ہے میں اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتی اس کو سمجھاتی لیکن وہ آہ کھینچ کر کہتی ؎

شب میں ہو جاتی ہے جب شورش عالم خاموش
ہم فضا میں تری آواز سنا کرتے ہیں

وہ بہت مایوس ہو کر کہا کرتی رافعہ تم کو نہیں معلوم میرے دل میں کتنی آرزوئیں بستر مرگ پر پڑی ہوئی بہن کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ لیکن مالی کمزوری کے باعث لاہور جانے کے قابل نہیں ہوں۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضا کے جھونکے لمحہ بہ لمحہ بیمار بہن کی کراہ اور تڑپ کو راست مجھ تک لاتے ہیں اور میں دل سے تڑپ جاتی ہوں۔ آہ! کس قدر دلدوز جملہ تھا اس کا۔ میں نے کہا۔ میرے معبود قانتہ کے دل کو سکون نصیب کر۔

(۲)

ایک روز میں حسب معمول کھانے کے وقفہ میں ہوسٹل میں اپنے کمرے میں گئی تاکہ ذرا آرام لوں اور کھانے کی گھنٹی بجتے ہی کھانے پر پہنچوں۔

لیکن میں نے جوں ہی کمرہ میں قدم رکھا کسی کی سسکیوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ قانتہ اپنے پلنگ پر بے ڈھب پڑی ہوئی رو رہی ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس آٹھ مہینے کے عرصے میں وہ کبھی اس طرح نہ روئی تھی میں نے جلدی سے جلد پہنچ کر سبب دریافت کیا اور اس کو منانے لگی۔

بجائے اس کے کہ وہ اور زیادہ روتی اٹھ بیٹھی اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے ایک لفافہ پھینکا۔
میں نے دیکھا اس کی ماں کی طرف سے تار آیا ہے

لکھا تھا "تمہارے دنیا میں اکیلے ہونے کا مجھے بہت افسوس ہے تم نزہت کے خدا کے پاس با اطمینان رہنے کی دعا کرو۔"

اس کو پڑھتے ہی میرا سر چکراتا ہوا معلوم ہوا۔ دل نے کہا جس کا اندیشہ تھا آخر ہو کر رہا۔ سخت میرے معبود تو نے قانتہ کے دل کو زبردست نشتر لگایا۔

اس کے مایوس خیالات کے دریا کا سیلاب امید کے کھیتوں کو کس قدر پامال کرے گا؟ میں اسی فکر کو نیچے رکھنے لگی اور قانتہ کو دیکھا کہ وہ سنبھل کر بیٹھی اور کہنے لگی "ہو رہا قصہ تمہارا کیا خیال ہے کیا میں حقیقتہً باغی ہوں؟ جیسا کہ تمہارا خیال میرے متعلق تھا۔ کیا خدا کو صرف میری بہن کی اتنی شدید ضرورت تھی؟ جس کا وجود ہمارے لئے ایک ذمہ دار باپ سے زیادہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کا مستحکم ارادہ ہماری زندگیوں کو بالکل تباہ کرنے کا تھا۔"

لیکن میں کہتی ہوں کہ وہ کیوں نہ ہمیں ایک دم موت دیدیتا؟ وہ کیوں دنیا کو تنہا کر دنیا والوں کو ہم پر ہنسنے کا موقع دے۔ یا یہ کیا اس کو نہیں معلوم کہ ہماری زندگی میں اس بہن کی کتنی اہم ضرورت تھی؟ کیا اس کے پاس ایسے ہزاروں بندے جن کی دنیا اور دنیا والوں کو کوئی ضرورت نہیں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک کو چن لینا اس کے لیئے امر محال تھا؟ اس نے انتہائی زور و غصہ سے یہ باتیں کیں۔ اس کی آنکھوں سے مشعلے برس رہے تھے پھر اس نے میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا میں نے کہا قانتہ صبر کرو۔ بہ قول شخصے ؎

سطح بین! کاشانۂ ہستی کے یہ نقش و نگار
دستِ قدرت نے بنائے ہیں مٹانے کے لئے

خدا تمہارے صبر کا امتحان کر رہا ہے فوراً اس نے طنزیہ لہجے میں کہا کیا تم لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوگئے؟ میں دل میں بڑی شرمندہ ہوئی مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کیوں کہا!

اس نے انتہائی جوش میں کہا یہ وہ خدا ہے جس کو ایوب علیہ السلام کا صبر پسند نہ آیا وہ ہمارے صبر کا کیا امتحان لے گا؟ میں تمہاری عبث دلیلوں کو سننا نہیں چاہتی تم لوگ ہمدردی کے نشتروں میں مکاری کا انجکشن دیتے ہیں۔ امرا و رؤسا کو تمام راحتیں میسر ہیں یہی وجہ ہے کہ غربا کے حقوق تلف ہو گئے! کیا تم صرف آٹھ آٹھ روز کی چھٹیوں میں اتنے دور دراز فاصلے پر اپنی ماں کے پاس ملنے نہیں جاتیں تمہارے پاس معمولی معمولی وجوہ بڑی اہم نہیں ہوتیں! لیکن ہماری بڑی سی بڑی اہمیت کو کوئی محسوس نہیں کرتا۔ کیا مرنے تک میرے دل میں یہ خلش نہ رہے گی۔ آہ میں نے اسی غربت کی بنا پر مرنے والی کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ اس کا احساس خدا کو ہی نہیں تو تم جیسوں کو کیا ہوتا!! امرا و رؤسا کے پاس غریبوں کی عزت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ غربا کی عزت و حرمت ذلیلوں اور بازاریوں کے برابر بھی نہیں ہوتی کیا وہ کسی غریب لیکن شریف طبقے کو اپنے بہن یا بھائی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

اے کاش! وہ صرف غربا کی عزت کا ہی احساس کر کے غربا کی درگزر کی جانے والی غلطیوں کو قابل قبول سمجھتے! لیکن یہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔

کیا اچھا ہوتا کہ خدا اپنی تمام رحمتیں انہی لوگوں پر ختم کر کے تمام غربا کو موت دیدیتا۔ اگر موت بھی نہ دیتا تو اس قدر بلک بلک کر ایڑیاں رگڑنے نہ دیتا۔ اگر ایسا مجبور بھی کرتا تو اس کا صرف احساس پیدا کراتا۔

لیکن آہ امرا تو غربا کو حشرات الارض سمجھ کر ان کو کچلنے کے درپے رہتے ہیں کہ مبادا ان کے حقوق ان کے اس عیش و عشرت کو متزلزل نہ کردیں۔

سیدہ! میں سچ کہتی ہوں کہ میرے دل میں خدا کی ناانصافی سے بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اور انہی شعلوں سے میں جلی جا رہی ہوں اور اپنے جذبات کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مرے جذبات رہ جاتے ہیں اکثر تشنۂ معنی
ہے کتنی دل شکن الفاظ کی یہ تنگ دامانی

کیا تم نہیں دیکھتیں کہ میں نے اپنے شباب کی کوئی امنگ کوئی آرزو پوری نہیں کی۔ دل مرچکا فنا ہو چکا۔ میرے دل کی شگفتگی ماتم کی سیاہی بن گئی ؎

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

میں نے کہا خدا سے دعا مانگو۔ اس کے احکام پر چلو نہ معلوم خدا کی مصلحت کیا ہے؟ اور کیا معلوم کہ تمہارے نصیب سے تم کو وہاں کوئی اچھی جگہ ملے۔ اس نے بے پروائی سے منہ پھیرتے ہوئے کہا اونھ۔ ع

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دیکھو سیدہ اب میں نہ جنت کی خواہشمند ہوں نہ دوزخ کی۔ ع

نہ میں مشتاق جنت کا نہ میں بیزار جنت سے

کیونکہ میرے باپ، میرے بہن بھائی راہ عدم اختیار کرچکے اب مجھے کوئی حسن دنیا میں رہنے کا نہیں نہ میں دنیا میں رہنے کے قابل ہوں نہ دنیا کو میری ضرورت ہے۔

میں نے کہا فاتنہ آہ تم جیسی سمجھدار ذہین لڑکی سے ایسی امید نہ تھی کہ تمہاری گمراہی حد سے تجاوز کر جائیں گی تم خدا سے ناامید ہو کر موت مانگ رہی ہو؟

کیا تم کو نہیں معلوم کہ خدا تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے کہ ادعونی استجب لکم وہ انہی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی عبادت اور احکامات پر سرنگوں رہتے ہیں اس کی رضاجوئی کے خواہشمند ہوتے ہیں جب ہی وہ خدا کے ہوجاتے ہیں اور خدا ان کا ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امراء و روساء کی تمام خواہشیں آرزوئیں تمام و کمال پوری ہوتی ہیں میری اس تقریر کو بڑی بے چینی سے سنتی رہی اور پھر کہنے لگی۔ آہ سیدہ میرے نشتر زدہ دل کو اور زیادہ مت دکھاؤ۔

تم نے کیا کہا۔ امراء و روساء ہمیشہ خدا کی رضاجوئی کے منتظر رہتے ہیں۔ اسے کوشش کیا غرباء کے لئے ہمیشہ ان کے دروازے درست ادکی طرح بند نہیں رہتے وہ خدا کی خدائی میں شرک کرکے فرعون بے سامان بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ہامان اپنی ذراسی عیش پرستی کی وجہ سے غرباء کی زندگیوں کے بار آور درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کر نہیں پھینک رہے ہیں۔ بتاؤ سیدہ کہ مساکین کی محنتوں کی لہلہاتی کھیتیوں پر طوفان نوح بپا نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ایسے خزانے دار ہیں جن کے ایک خزانہ پر دس قارون کے خزانے برابری نہیں کرسکتے۔

اس دوران میں اس کا غصہ بہت بلند ہوگیا منہ سے کف جاری ہو رہا تھا۔ اپنے ہاتھ کی مٹھیوں کو خوب بھینچ بھینچ کر اس تقریر کو ادا کر رہی تھی پھر کہنے لگی کہ تم انھیں سعی انقلاب اور مظلوموں کی طرفداری کرتی نہیں جو اپنے اندر بے داغ صاف رکھتے ہیں۔

میں خدا کو یہی کہوں گی کہ اس نے ناانصافی کی بےشک اس نے ناانصافی کی ہے۔ میں اس کے بندوں میں سے بننا بھی نہیں چاہتی چنانچہ خدا کے ستائے ہوئے کسی بندے نے کہا ہے ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

(۳)

ایک روز دوران گفتگو میں فاتنہ نے کہا کہ سیدہ میں بہت دن تک سوچتی رہی کہ سکون کیسے نصیب ہوگا۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ خودکشی ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے سکون ابدی حاصل ہو سکتا ہے۔

اور اب میں موت صرف موت چاہتی ہوں اور میں تم کو بتاؤں گی کہ میں کیا کروں گی ؎

جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کردوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کردوں

میں دنیا کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ خودکشی سے کرتی ہوں۔

خودکشی کا نام سن کر میرے حواس معطل اور ہاتھ پاؤں شل ہو گئے میں نے اس سے کچھ نہ کہا کہ مبادا وہ اور مشتعل نہ ہو جائے۔ میرے دل میں ایک خلش سی ہو رہی تھی کہ کہیں سچ مچ یہ خودکشی نہ کر لے۔ میں نے اپنی دواؤں کی صندوقچی کو مقفل کیا اور ہمیشہ سائنس روم میں اس کی خاص نگرانی رکھنے لگی کہ کہیں کوئی زہریلی گیس نہ سونگھے اور نہ کوئی ایسی چیز اٹھالے جس سے جانی خطرہ لاحق ہو۔

اس کو فرصت کے اوقات میں سمجھاتی کہ تم اپنی غربت و افلاس کا ہرگز خیال نہ کرو۔ اس کو ایسا سمجھو کہ ؎

میرے افلاس کی ٹھوکر پہ ہے قارونیت قرباں

مرے پائے گدائی پر نگوں ثروت کی پیشانی

یہ سن کر کہنے لگی نہیں رافعہ میرا مطلب ثروت و دولت کو حاصل کرنا نہیں بقول شخصے ؎

اے زر تو خدا نۂ ولیکن بخدا

ستار العیوب قاضی الحاجاتی

میں اس کی حامی ہوں۔ لیکن رافعہ میرا دل دنیا کے ہنگاموں سے بھر گیا۔ میں نے نہایت آہستگی سے کہا دیکھو قانتہ تم اسم با مسمیٰ ہو خودکشی حرام ہے۔ تمھاری دنیا کو ضرورت اور شدید ضرورت ہے تم ان خرافات کو چھوڑ دو اپنی ہمت کو کام میں لا کر سربلند ہو جاؤ گی تو بہت سی زندگیاں تم کو دیکھ کر اپنے آپ کو سدھار یں گی۔ چونکہ مجھے اس سے قلبی محبت ہو گئی تھی اس لئے ہر ممکن طریقہ سے اس کو باز رکھنے کی کوشش کرتی وہ بہت مایوسانہ انداز میں کہنے لگی رافعہ تم کو کیوں مجھ سے اتنی ہمدردی ہو رہی ہے۔ مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں یا دوسرے معنوں میں سیکڑوں غربا عسرت و ناداری کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں تم کس کس کو مناؤ گی، کس کس کو روکو گی۔ مجھے دنیا کو چھوڑ دینے دو کیونکہ اب دنیا میں کوئی غمگسار نہیں رہا۔

رافعہ! میری زندگی پہلے اچھی خاصی خوش باش تھی میرا دل بھی بھلا چنگا تھا لیکن اب دل مجھ سے پہلے مرچکا۔ کیونکہ میری دنیائے حسرت کو دوبالا کرنے والی ہستیاں بھی موجود تھیں اور میں یہ کہہ سکتی ہوں ؎

شفق، نورِ سحر، کالی گھٹائیں چاند اور تارے

کبھی اجزا تھے یہ سب میری دنیائے مسرت کے

لیکن آہ اب کیا ہے ؎

اور اب یہ حال ہے دل خود بخود ہی بیٹھا جاتا ہے

جیسا کہ بستیوں تاریکیوں میں آتا جاتا ہے

میں نے یہ سن کر اس کو منانے کی حتی الامکان کوششیں کیں اور کہا کہ انشاء اللہ تمھاری زندگی اب ایسی نہ رہے گی تم دنیا میں اوج کمال کو پہونچ کر اپنی ہمت کی بلندی دکھاؤ اور بالکل اس شعر کے مطابق اپنا نصب العین کر لو ؎

دل سے نکال طالع برگشتہ کا خیال

کر چرخ کو اسیر ستاروں کو پائمال

قانتہ اس کو سن کر بہت خاموشی سے بیٹھی رہی اور آہ بھر کر کہنے لگی وقت گزرنے کے بعد کیا ہوتا ہے ؎

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بہت رات گئے تک ہم لوگوں نے اسی قسم کی گفتگو کی۔ دوسرے روز قانتہ اپنے وطن کو جا رہی تھی اور اپنے نام کے اخراج کی درخواست بھی دیدی تھی۔

مجھے اس کا جانا ناگوار خاطر ہوا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو خط لکھنے کی تاکید کی۔ تمام لڑکیوں نے بھی اس کو بادل ناخواستہ خدا حافظ کہا۔ لیکن آہ۔ اس کے جانے کے چند روز بعد ہی ایک اور کھلا خط قانتہ کا آیا لکھا تھا کہ سیدہ میں نے جو خودکشی کا ارادہ کیا تھا اس کو پورا کر رہی ہوں۔ تم کو اس وقت خط ملے گا جب کہ میں دنیا میں نہ ہوں گی۔ لیکن میرے جذبات اور احساسات کا لحاظ کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو قابلِ معافی تصور کرتی ہوں مجھے بھول جاؤ لیکن ہوسکے تو میرے جذبات اور خیالات کو ہمیشہ یاد کرنا خدا حافظ ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تم سے کبھی نہ ملنے والی قانتہ۔

سیدہ بدر رافعہ

علی گڑھ کے چند فارسی مخطوطات

گزشتہ فروری میں کانفرنس کے سالانہ جلسہ سے فراغ کے بعد حضرت قبلہ نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہ العالی کے ارشاد سے کتاب خانہ سلطانی حبیب منزل کا دیکھنے وغیرہ دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ جناب ممدوح کا منشا تو یہ تھا کہ عربی اور فارسی کتابوں کی فہرست از سر نو مرتب کر دی جائے۔ گو یہ فہرست تیار ہو گئی مگر صرف چار روز رہ گئے تھے۔ تین روز کی قلیل مدت میں سب کو نمبر وار ترتیب دے دیا۔ مختصر سا تعارفی نوٹ لکھنا بھی دشوار تھا اس لئے اپنے حالیہ مشغلہ اور دلچسپی کے لحاظ سے فارسی کتابوں میں جو نادر اور کمیاب نسخے نظر آئے خاص کر ان پر سرسری مطالعہ کے بعد جیسے کچھ بھی نوٹس بن پڑے لکھ کر جناب ممدوح کی خدمت میں پیش کر دئے۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں بہت کچھ اضافہ کی گنجائش ہے جس کو مجھ سے زیادہ فرصت اور قابلیت رکھنے والے اصحاب انشاء اللہ پورا کر دیں گے۔ پھر بھی اس ناچیز کی حوصلہ افزائی کے لئے جناب ممدوح نے از راہ بزرگانہ شفقت یہ عبارت تحریر فرما دی جس کو تبرک کے طور پر میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

"میاں نے فہرست ہذا بڑی محنت اور تحقیق سے لکھی ہے جس کی بابت شکریہ فہرست نگار منجانب کانفرنس ادا کیا جاتا ہے۔"

حبیب الرحمٰن سکریٹری

مندرجہ کتابوں پر میں نے اپنے تعارفی نوٹ میں کتاب خانہ کی فہرست میں ان کے نمبر دے دیئے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

محمد عبدالحمید خاں

---

(۱) مثنوی ولدی در بیان اسرار احدی۔

اس مجموعہ میں دو مثنویاں ہیں جو حضرت مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ کے فرزند حضرت سلطان ولد کی تصنیف ہیں۔

پہلی مثنوی کا عنوان "[illegible]" ہے۔

سلطان ولد نے اس کی جو وجہ تصنیف بتائی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں زیادہ لطف دے گی۔ "غرض ـــ از انشاء اللہ مثنوی ولدی در بیان اسرار احدی آں بود کہ حضرت والدم شیخ سلطان العلماء والعارفین جلال الحق والدین محمد بن محمد بن الحسین البلخی در مثنوی خود قصہ ہائے اولیائے گذشتہ را ذکر کردہ است و کرامات و مقالات ایشاں را بیان فرمودہ غرضش از قصہ ہائے ایشان اظہار کرامات و مقالات خود بود و از اں اولیائے کہ ہمدل و ہمدم و ہمنشیں او بودند مثل سلطان الواصلین سید برہان الدین محقق ترمذی و سلطان المحبوبین والمعشوقین شمس الدین تبریزی و قطب الاقطاب صلاح الدین زرکوب قونوی و زبدۃ الاولیاء [illegible] حسام الدین چلپی ولد اخی ترک قونوی۔۔۔
احوال خود را و احوال ایشاں را بواسطہ قصہ ہائے پیشیناں اینجا درج فرمود

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

لیکن چوں بعضے را آں فطنت و زیرکی نبود کہ مقصود و قصہ حال را فہم کنند و غرض او را بدانند دریں مثنوی مقامات و کرامات حضرت شیخ و از اں مصاحبان کہ ہمدم او بودند...... شرح کردہ شد تا مطالعہ

کنندگان و مستفیدان را معلوم شود کہ ان ہمہ احوال او و مصاحبانش بودہ است تا شبہت و گمان از ایشان بر ود۔"

(ترجمہ ملخصاً) مثنوی ولدی دبیان اسرار خودی لکھنے کی غرض یہ تھی کہ حضرت والد نے اپنی مثنوی میں پچھلے اولیا کے جو قصے اور ان کی کرامات و مقامات بیان کئے ہیں اس سے ان کا مقصد اپنے کرامات و مقامات اور ان اولیا کے (کرامات و مقامات) کا اظہار تھا جو ان کے ہمدل ہمدم اور ہم نشیں تھے (اس لئے) اپنے اور ان کے احوال کو پچھلے بزرگوں کے قصوں (کے پردہ) میں درج کیا لیکن چونکہ بعض لوگوں میں اتنی زیادہ سمجھ نہیں ہوتی کہ ان حالات اور (ان کو پردہ میں بیان کرنے کی) غرض کو سمجھ سکیں اس لئے اس مثنوی میں حضرت والد اور ان کے ہمدم مصاحبوں کے مقامات و کرامات کی تشریح کی گئی تاکہ پڑھنے اور سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ (قصوں کے پردہ میں بیان کئے ہوئے) حالات خود ان کے اور ان کے ہمنشینوں کے ہیں اور (ان کے متعلق) جو شبہات دل میں ہوں دور ہو جائیں۔

اس مثنوی کا آغاز ابتدائے ربیع الاول سنہ ۶۹۰ھ میں ہوا اور تکمیل اسی سنہ کی چوتھی جمادی الآخر کو یعنی دو مہینے میں ختم ہوئی۔

مطلع این بیان جاں افزا	بود در شش صد و نود یار را
گفتہ شد اول ربیع الاول	گر فزوں گشت این نگر طول
مقطعش ہم شد ست اے فاخر	چارمین مہ جمادی آخر

دوسری مثنوی رَبابَہ نامہ ہے جو مثنوی مولانا رومؒ کی بحر میں ہے۔ اس کی وجہ تصنیف یہ لکھتے ہیں کہ:۔

بزرگے از بزرگان اہل دل بطریق اعتقاد و دیانت عا کرد و التماس نمود کہ بوزن الٰہی نامہ خواجہ سنائی رحمۃ اللہ علیہ کتابے انشا فرمودہ آید توقع است کہ بروزن مثنوی خداوندگار مولانا قدس سرہ العزیز مثنوی انشا فرمائید جہت خاطر دوستاں کہ بر آں وزن از خواندن بسیار خو کردہ اند و ایں وزن در ایشان نشستہ است کتابے دیگر بسیار ند زیرا کہ ہر نظم کہ گفتہ آید بطریق تتبع و تشبہ حضرتش بودہ است ہم بریں وزن کتابے ساختن اولے بود زیرا کہ معنی متابعت و مشابہت دریں اجل و اکمل ست۔ بموجب التماس ان بزرگ و جہت آنکہ "نے" بحضرت مولانا قدس سرہ العزیز مخصوص و منسوب ست ایں مثنوی را از "رباب" آغاز کردہ شد۔"

(ملخص ترجمہ) اس مثنوی کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ ایک اہل دل بزرگ نے عقیدت مندانہ درخواست کی کہ خواجہ سنائی کی مثنوی "الٰہی نامہ" کے وزن پر تو آپ نے ایک مثنوی لکھ دی ہے (مگر) ہم کو امید ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی مثنوی کے وزن پر ایک مثنوی اور لکھ دیں گے۔ ان احباب کی خاطر جو اس وزن (کے اشعار) ہمیشہ پڑھتے رہنے سے اس کے خوگر ہو گئے ہیں اور یہ وزن ان کے دل نشین ہو گیا ہے۔ (نیز) اس لئے کہ اب تک ہر نظم میں آپ نے حضرت مولانا کا تتبع اور تشبہ ملحوظ رکھا ہے اس وزن پر (دوسری مثنوی) لکھنے سے متابعت اور مشابہت کا مقصد زیادہ بہتر اور مکمل صورت میں پورا ہو جائے گا اس بزرگ کے التماس سے اور اس لئے بھی کہ (لفظ) "نے" حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے ساتھ مخصوص و منسوب ہے اس مثنوی کو "رباب" (کے لفظ) سے شروع کیا گیا۔"

اس مثنوی کا آغاز سنہ ۷۰۰ھ میں ہوا، اور تکمیل تقریباً ۵ مہینے میں اس سنہ کی ذی الحجہ کو۔

رو ولد خامش مکش ایں سر و راز	گرچہ داری در دروں دریائے راز
غرۂ شعبان شد آغاز کتاب	در سنہ سبع مائۃ بہر ثواب

در مہ ذی حجہ شد ہم ایں تمام   تا نماند بر خور معنی غمام

دونوں مثنویوں میں ہر نظم سے پہلے چند سطری نثر کے عنوانات ہیں جن میں ان چیزوں کی مختصر تشریح ہے جن پر اشعار میں خیال آرائی کی گئی ہے۔

دونوں کے شستہ اور پختہ الفاظ اور چست بندشیں مصنف کی کمال شاعری اور پختہ مشقی کی دلیل ہیں۔ پہلی مثنوی کا انداز بیان مولانا رحمۃ اللہ کی مثنوی سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ اگر دونوں کے اشعار ملا دئیے جائیں تو فرق کرنا دشوار ہو جائے گا۔

پہلی مثنوی کے دیباچہ میں اپنی غزلیات اور ان میں حضرت مولانا کے خیالات اور اسلوب بیان کے ساتھ تشبیہہ ملحوظ رکھنے کا بھی ذکر کیا ہے یہ مثنوی حجم میں دوسری مثنوی سے کم ہے۔

اس مجموعہ کی تقطیع متوسط ہے جدولیں کاغذ اور خط بالکل یکساں ہے چند صفحوں کے سوا جو بخط نستعلیق ہیں ساری کتاب نسخ میں ہے اور ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا صرف تاریخ اور سنہ کتابت لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔

[illegible] ماہ محرم الحرام سنہ اثنین وستین وسبعمائۃ (۷۶۲ھ)

یہ مجموعہ ہر اعتبار سے قیمتی اور قابل قدر ہے۔

---

(۲) تحفۃ الاخبار۔

یہ مدراس کرناٹک اور میسور کے مقامی حالات کی عمدہ تاریخ ہے جس کو منشی غلام حسین خاں نے ایلیٹ صاحب گورنر مدراس کے عہد حکومت میں لکھا ہے۔ اس میں پانچ فصلیں ہیں۔

پہلی فصل میں ان روسائے کرناٹک کے حالات ہیں جو عہد عالمگیری سے ۱۲۱۵ھ تک برسر امارت رہے ہیں۔

دوسری فصل میں مدراس کے گورنروں اور ان کی طرز حکومت کا ذکر ہے۔

تیسری فصل میں انگریزی قوانین کے متعلق اظہار رائے کیا گیا ہے۔

چوتھی فصل میں انگریزوں کی معاملہ فہمی اور عدل و انصاف کا بیان ہے۔

پانچویں فصل میں کرناٹک کے قدیم جاگیر داروں اور باج گزار روساء کے حالات ہیں۔ یہ حالات و واقعات کس حد تک صحیح اور قابل اعتماد ہیں اس کا فیصلہ تاریخ داں ہی بہتر کر سکتا ہے۔

زبان صاف و رواں ہے۔ کاغذ قدیم سبزی مائل، خط [illegible] اور تقطیع بڑی صفحات کی تعداد ۲۹۱ ہے سنہ تصنیف ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء نسخہ مکمل و بے عیب ہے۔

---

(۳) لغات عالمگیریہ۔

فہرست میں اس کا نام "صحاح اللغات" غلط درج ہوا ہے۔ مصنف "فاضل خان" امرائے عالمگیری میں سے ہے۔ غالباً دربار شاہی میں تحفۃً پیش کرنے کی غرض سے جیسا کہ دیباچہ میں اشارہ کیا ہے "نامہ کا التحفۃ والہدیہ

اے الملک الہام .... ہ لکھ کر اس کا نام "تحفۂ عالمگیریہ" رکھا ہے۔

یہ لغت کی ایک محققانہ اور مبسوط کتاب ہے۔ قرآن احادیث، رجال و انساب کے لغات نیز فقرا کے ان محاورات کی تشریح جن میں علماء کو اختلاف رہا ہے، بہت خوبی سے کی ہے جن الفاظ کے ساتھ تاریخی واقعات یا مذہبی خیالات وابستہ ہیں ان کو پوری تفصیل اور جامعیت سے لکھا ہے۔ مصنف کو زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یہ کتاب کمیاب ہے۔ دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی ہے۔ تقطیع بڑی ہے کاغذ قدیم حنائی مگر خط زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتا۔ ناقص الآخر ہونے سے سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلا۔

(۴) مکتوبات حضرت امام ربانی

اس کتاب کا جامع اور مولف یار محمد بدخشی طالقانی ہے۔ بہت عمدہ اور بے عیب نسخہ ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں کسی امیر "ہدایت اللہ خاں" نامی کی فرمایش سے لکھوا گیا۔ کاتب کا نام ... ہے۔ ... تاریخ کتابت غرہ رجب ... جلوس۔ آخری صفحہ پر سید غلام خواجہ جمالی کی مہر اور انہی کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر ...

"بدست خود مہر کردم شب ۱۷ صفر المظفر ۱۱۶۰ ہجری"

(۵) تصحیح لغات فرس

یہ کتاب شاہ طہماسپ صفوی کے عہد کی تصنیف ہے۔ مصنف حسین وفائی نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس ... لغات تین رسالوں سے ماخوذ ہیں جن میں سے ایک محمد بن محمد فخر الدین ہندو شاہ نخجوانی نے خواجہ محمد ... الدین محمد ... کے نام پر لکھا ہے۔ دوسرا شمس فخری نے امیر شیخ ابو اسحق بن امیر محمود شاہ انجو کے نام پر تیسرا ... الدین ... کشمیری نے ... اکثر لغات کے شواہد میں اساتذہ کے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ یہ لغت ہے تو مختصر سا مگر بہت مفید اور بصیرت افروز ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ایران میں تصنیف ہوا ورنہ فارسی کے اکثر مروجہ لغات ہندوستان میں تصنیف ہوئے ہیں۔

تقطیع چھوٹی کاغذ باریک اور خط پختہ ہے۔ ۱۰ شوال سنہ ۱۰۴۱ھ میں بمقام ... لکھا گیا ہے۔

(۶) درمجالس

مصنف سیف مظفر برہان۔ یہ کتاب ۴۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دس بابوں میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضور سرور کائنات علیہ افضل التحیات تک انبیاء کے فضائل ہیں۔ باقی میں مذہبی قصص و حکایات۔ کاتب کا نام محمد طاہر ابن محمد ابن شمس الدین محمد ہے۔ لاہور میں ۲ رجب سنہ ... جلوس عالمگیری میں لکھی گئی۔ نسخہ صاف اور خوشخط ہے۔

(۷) ابیات من کلمات الصوفیہ

یہ چھوٹا سا چھوٹی سی تقطیع پر قدیم چھپا ہوا رسالہ ہے جس کو مصنف نے کسی امیر عبداللہ خاں کے دربار تک رسائی کا وسیلہ بنانے کے لئے لکھا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ... اقوال صحابہ اور کلمات صوفیہ کے ... چار چار مصرعوں میں ادا

کیا ہے اوپر جلی خط میں حدیث یا قول صحابی یا کلمات صوفیہ لکھے ہیں اور ان کے نیچے چار مصرعے۔ دیباچہ عربی میں ہے جس کا صرف ایک ورق رہ گیا ہے اور کتاب کے آخر میں لگا ہوا ہے

شاعر کے نام تخلص اور زمانہ کا پتہ نہیں چلا۔ کلام کا انداز ایرانی ہے اور طباعت بھی وہیں کی معلوم ہوتی ہے۔

---

(۸) جنت الفردوس

مذہبی رسالہ ہے۔ اس کی ۳۱ فصلیں ہیں جن میں نماز قرآن خوانی صبر وغیرہ کے فضائل درج ہیں۔ کاغذ اور خط معمولی ہے مصنف کا نام اور سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ صرف اتنا ظاہر ہوا کہ حاجی ابن ترک سلطان کمال الدین کے ایما سے لکھا گیا ہے۔

---

(۹) رسالہ در فقہ فارسی۔

اول اور آخر سے ناقص ہے۔ اس لئے مصنف کے نام اور سنہ تصنیف کا پتہ نہ چل سکا۔ صفحہ ۱۴۱ کے بعد والے دو صفحے غائب ہیں۔ نکاح وصیت اور قصاص وغیرہ کے مسئلے بحوالہ کتب و ائمہ مختصراً لکھے ہیں۔ مسائل کے ضمن میں بعض ائمہ فقہ کے حالات بھی درج کر دیے ہیں۔ کاغذ حنائی قدیم اور رسم الخط نسخ ہے اور موجودہ صفحات کی تعداد ۲۶۱ ہے بہ حیثیت مجموعی رسالہ بہت اچھا اور کارآمد ہے۔

---

(۱۰) گمنام رسالہ۔

فہرست میں اس کا نمبر ۳۰ ہے۔ آگے گمنام لکھا ہوا ہے۔ اس مجلد میں پہلا رسالہ فقہی مسائل کا عربی میں ہے۔ جس کے نام اور مصنف کا پتہ نہ چلا۔ دوسرا رسالہ شیخ علی متقی کے رسالہ "العبارات النصیحۃ فی المواعظ والنصیحۃ" کا پہلا حصہ ہے مصنف کا پورا نام علی بن حسام الدین مشہور بہ متقی ہے۔ جلد سازی کی غلطی سے صفحہ ۱۵ اور ۱۶ کے درمیان دو ورق کسی اور رسالہ کے آگئے ہیں جو عربی میں ہیں۔ کاغذ پتلا اور قدیم ہے۔ تقطیع چھوٹی اور خط معمولی۔

---

(۱۱) بدائع الانشاء۔

اس کتاب کے سابق مالک عبدالغنی ... ساکن ... ریاست حیدرآباد دکن ... ایک مختصر سے نوشتہ میں وہ دادِ تحقیق یہ دی ہے کہ بادشاہ ہمایوں نے اپنے فرزند عزیز قوت العین رفیع الدین حسین کی تعلیم و تربیت کے لیے میر منشی یوسفی سے تصنیف کرائی لیکن مصنف ... ہے۔

"این رسالہ ایست مسمی بہ بدائع الانشاء مشتمل بر ... مطابق ... که جهت فرزند عزیز قوت العین رفیع الدین حسین طال عمرہ وصابر ظ ... در تحریر ... رت وقید کتابت فی آید"

... کے ... الفاظ کی نوعیت سے صاف ... کہ یوسفی نے اپنے ہی بیٹے اور دوسرے ... کے لیے یہ انشاء لکھی ہے۔ ہمایوں بادشاہ کا کوئی بیٹا رفیع الدین حسین نامی نہ تھا۔

مقدمہ میں قابل مصنف نے انشاء کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

فن انشا منقسم می شود بر دو قسم یکے توقیعات کہ مضامین آں منطوی بر امثلہ و احکام سلاطین و حکام است و دیگر محاورات کہ تراکیب آں مواد و صور مکاتبات مفاوضات ست۔

و محاورات منقسم می شود بہ سہ قسم از برائے آں کہ خالی از آں نیست کہ رتبہ مکتوب الیہ از کاتب بلند تر ست یا فروتر یا مساوی ست اگر بلند تر ست مواقعات گویند اگر فروتر ست رقاع و اگر مساوی ست مراسلات و ہر یک ازیں اقسام ثلثہ منقسم می شود بہ خطابی و جوابی۔"

نمونہ کے طور پر جتنے خطوط اور مراسلات درج کئے ہیں ان میں الفاظ کا حسن انتخاب فقروں کا در و بست ان کی شستگی اور پختگی مصنف کی اعلیٰ قابلیت اور پختہ مشقی کا روشن ثبوت ہے۔ سنہ تصنیف مصنف کے ان اشعار سے ۹۴۰ نکلتا ہے۔

این نامہ کز دست فن انشا بہ نظام　　کردہ خرد کش "بدایع الانشا" نام
تکرار کنی چو نام او را یک بار　　شک نیست کہ رہ بری بسال تمام

بحساب جمل "بدایع الانشا" کے اعداد ۴۷۰ ہوتے ہیں جن کی تکرار سے ۹۴۰ھ نکلتا ہے۔

یہ کتاب بہت کمیاب ہے۔ یاد اگر غلطی نہیں کرتی تو اس کا ایک نسخہ صرف رامپور کے کتاب خانہ میں سنا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

صفحات کی تعداد ۲۶۲ ہے۔ افسوس ہے کہ اخیر کے ۱۹ صفحے آدھے آدھے دیمک کی نذر ہو گئے ہیں۔

کاغذ خانی قدیم اور دبیز ہے۔ خط نہایت عمدہ اور پختہ نستعلیق۔

---

(۱۲) خمسہ نظامی۔

اب تک جتنے خمسے نظر سے گزرے ان میں یہ خمسہ ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ اس مجموعہ میں ۶ مثنویاں ہیں۔

مخزن اسرار۔ خسرو شیریں۔ لیلیٰ مجنوں۔ ہفت پیکر۔ سکندر نامہ۔ اور شرف نامہ۔ مثنوی ہفت پیکر میں ۱۱ رنگین تصویریں بھی ہیں جن کے رنگ و طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ کے انداز میں بنوائی گئی ہیں۔ خط ایرانی ہے نہایت صاف اور بے عیب قلم کی شان اول سے آخر تک ایک ہے جدولیں طلائی ہیں۔ شروع کے دو صفحے ایرانی نقاشی اور نازک ترین بوقلمونی کا بہترین نمونہ ہیں۔

مجموعہ کے آخری صفحہ پر کاتب نے اپنا نام اور سنہ کتابت لکھا تھا مگر کسی احمق بنے کاتب کا نام اس طرح بری طرح مٹایا ہے کہ پتہ چلانا ناممکن ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"قد فرغ الکاتب عن تسوید ہذہ الکتاب بعون الملک الوہاب خمسۃ حضرت شیخ الاسلام قطب المحققین شیخ نظامی قدس سرہ العزیز علی ید العبد الضعیف الی رحمۃ اللہ الغنی .... غفر ذنوبہ و ستر عیوبہ فی عاشر شہر ربیع الاول سنہ ۹۶۳ ثلاث و ستین و تسعمائۃ۔"

کاتب کی فطرت اور انشی روایت کے خلاف ہے کہ وہ جابجا تصرف نہ کرتا جائے۔ اس تصرف جا و بیجا میں بھی تو اتفاق سے شعر زمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ جاتا ہے ورنہ اکثر و بیشتر تو آسمان سے کھنچ کر زمین ہی پر آ رہتا ہے۔

ان پانچوں مثنویوں کے جستہ جستہ مقامات خصوصاً وہ حصے جو جامعہ کے نصاب کے سلسلہ میں برسوں سے زیر نظر چلے آرہے ہیں، بغور دیکھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ یہ مجموعہ متداول اغلاط سے پاک ہے۔

(۱۳) دیوان حافظ۔

سورت میں ایک مشہور امیر نواب غلام بابا خاں گزرے ہیں جن کے نام مرزا غالب کے متعدد خطوط اردوئے معلی اور عود ہندی میں موجود ہیں۔ یہ بے نظیر نسخہ ان ہی کے کتاب خانہ کا ہے جو ۱۹۱۹ء میں مولوی انوار احمد زبیری مرحوم سفیر کانفرنس کو ان کے زمانہ قیام سورت میں نواب ممدوح کے پوتے نواب میر حفیظ الدین احمد خاں نے عطا کیا تھا۔ سرورق پر نواب میر غلام بابا خاں مرحوم سی آئی ای کی مہر ثبت ہے اور اس سے آگے صفحہ پر انوار احمد صاحب مرحوم کا لکھا ہوا یہ نوٹ ہے۔

"این نسخہ نادر دیوانِ حافظ از کتاب خانہ نواب میر غلام بابا خاں مرحوم سی آئی ای بہ اجازت نواب زادہ میر حفیظ الدین خاں صاحب گرفتم و داخل کتب خانہ سلطان جہاں منزل کردم۔"

خاکسار انوار احمد زبیری مارہروی مقام سورت

۲ر جنوری ۱۹۱۹ء

اس کے نیچے نواب میر حفیظ الدین احمد خاں نے یہ فقرہ لکھ دیا ہے۔

"بپاس خاطر محبی انوار احمد صاحب بخشیدم۔"

عاصی سید حفیظ الدین خاں

دیوان کے آغاز میں وہی دیباچہ ہے جو اکثر مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے آخری صفحہ پر ایک جگہ عبارت بے جوڑ ہوگئی ہے غالباً کاتب نے کچھ حصہ سہواً چھوڑ دیا ہے۔

تقطیع متوسط۔ کاغذ سرخی مائل بادامی بہت دبیز۔ ہر صفحہ پر طلائی افشاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شایق امیر کے لیے لکھا گیا ہے تمام جدولیں رنگین اور طلائی ہیں۔ خط بہترین نستعلیق ہے۔ ابتدا کے ۱۱ صفحوں پر کہیں کہیں روشنائی اڑ گئی ہے بعض صفحات پر آب رسیدگی کے نشانات بھی ہیں۔ کہاں اور کب لکھا گیا کس نے لکھا یہ کچھ پتہ نہ چلا۔ بہرحال نسخہ بہت قدیم اور نادر ہے۔

(۱۴) شرح قران السعدین۔

یہ حضرت امیر خسرو کی مشہور مثنوی قران السعدین کی نہایت بہترین شرح ہے جو بعض احباب کی فرمایش سے حضرت شیخ نور الحق محدث دہلوی نے لکھی ہے۔ یہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر تھے۔

تیسیر القاری شرح صحیح بخاری کے سوا آپ کی اور تصانیف بھی ہیں جن میں سے ایک تحقیق الرویا عربی میں ہے۔ غیر مطبوعہ اور کمیاب ہے اس کا ایک نسخہ خانقاہ مجددیہ سرہند شریف میں موجود ہے۔ حضرت شیخ نور الحق حضرت امام ربانی علیہ الرحمۃ سے بیعت تھے۔ اور خرقہ خلافت حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ سے لیا۔ مکتوبات امام ربانی (جلد سوم) میں مکتوب سوم ان ہی کے نام ہے۔

اس شرح کو اول سے آخر تک حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے ملاحظہ فرما کر جا بجا جو کمی رہ گئی ہو گی اسے پورا کرایا ہے خود فرماتے ہیں۔

"القصہ تا بزیور قبول ...... آں ادب آموز نکتہ سنج مزین نہ گردید بہ نظر اعتماد و نہ سنجیدم" وشائستہ اعتبار ندانستم و بر بسیارے از لطائف کہ از کوتہی اندیشہ بدآں نرسیدہ بودم آں رموز از آں کل آگہی داد۔"

اس کی تکمیل کی تاریخ حضرت نے خود تحریر فرمائی ہے۔

شکر للہ کہ بانجام رسید — شرح ابیات قران السعدین
مشرقی از پئے تاریخ تمام — برہ نعیمہ رفتی نہ بہ عین
چشم عیب ار زمیان بر دارند — می شود "شرح قران السعدین"

شرح قران السعدین کے اعداد ۱۰۹۴ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ح کے ۸ نکال دینے کے بعد ۱۰۲۴ بنتے ہیں کاتب کے نام اور سنہ کتابت کا کہیں ذکر نہیں۔ تقطیع درمیانی ہے کاغذ ہماں، خط صاف اور پختہ کہیں کہیں کرم خوردہ ہے۔ بڑا نادر اور ...... قیمتی نسخہ ہے۔

(۱۵) یوسف زلیخائے جامی۔

ولایتی کاغذ پر ایرانی خط میں لکھا ہوا نہایت خوشخط اور صاف ستھرا نسخہ ہے۔ اول اور آخر کے کچھ ورق غائب ہیں۔ بہت قدیم لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۱۶) منطق الطیر

اس مجموعہ کے متن میں تو حضرت شیخ فریدالدین عطار کی مشہور مثنوی منطق الطیر ہے اور حاشیہ پر پندنامہ کاغذ و کتابت معمولی۔

(۱۷) نمبر ۴۵ (مندرجہ فہرست)

یہ مذہبی قصص و مباحث کا مختصر سا رسالہ ہے۔ مصنف کاتب یا سنہ کا نہ ابتدا میں ذکر ہے نہ اخیر میں۔

(۱۸) نمبر ۲۵ (مندرجہ فہرست)

اس رسالہ کا نہ نام معلوم ہو سکا۔ نہ یہ کہ کس نے کب لکھا۔ زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے حالات اور عجائبات خلق مذکور ہیں۔

(۱۹) تفسیر حسینی۔

اس کی دونوں جلدیں بہ خط نسخ ہیں۔ آیات سرخی سے لکھی گئی ہیں اور تفسیر سیاہی سے۔ پہلی جلد سوطویں پارہ تک

ہے۔ دوسری قل اعوذ برب الناس تک۔ سب سے اخیر کا ایک صفحہ غائب ہے۔ اس لئے سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ چلا۔ تقطیع بڑی ہے۔ کاغذ حنائی چکنا اور مضبوط۔

---

(۲۰) المحمد فی الحمد

یہ کتاب ابوبکر سعد زنگی والی شیراز (۶۰۸-۶۲۳) کے عہد کی تصنیف ہے مصنف نے اس دور کے مسلمانوں کی ضعیف الایمانی اور اسلامیات کی طرف سے غفلت و لاپروائی کا شکوہ کرتے ہوئے ایسی کتابوں کی ضرورت پر زور دیا ہے جن میں تمام ضروری اعتقادی مسائل صاف اور آسان زبان میں لکھے گئے ہوں۔

ابوبکر سعد زنگی کے نام پر معنون کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے

"تا وقع آن در دلہا ئے عوام افزون تر باشد. و خاطر ان برو دیدہ ہا بحکم تقلید بزرگ تر از ین وجہ آن را بہ ذکر بندہ برگزیدہ خدا لیہ بادشاہی بقیہ صالحہ ملوک و سلاطین اسلام، بادشاہ نیازمند دین ترحم دل درویش نواز سلغر سلطان اتابک ابوبکر سعد زنگی کہ ہموارہ در نظر و کنف خدائے باد معنون گردانید"

سرورق پر مصنف کا نام امام توریشتی یا توریشتی لکھا ہوا ہے۔ کتاب میں تین باب ہیں اور ہر باب میں دس فصلیں۔

باب اول۔ در ایمان بخدائے عزوجل۔

باب دوم۔ در ایمان بہ فرشتگان و کتابہا و پیغمبران۔

باب سوم۔ در مسائل اعتقادی بر موجب کتاب سنت و اجماع امت۔

مسائل آسان اور مدلل عبارتوں میں لکھے ہیں۔ اس نوعیت کی کتابیں بہت کم دیکھنے میں آئیں۔ کس سنہ میں لکھی گئی اس کا پتہ نہیں چلا۔ خط صاف اور عمدہ ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۴۲ ہے۔

---

(۲۱) مظہر الحق فی اباحتہ السماع۔

یہ رسالہ کمال صفی حسینی قزوینی کی تصنیف ہے جو سید السادات حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے معتقدین میں سے تھے۔ ناواقف لوگوں کو روایات اور اصطلاحات فقراء کے رد و انکار سے بچانے کے لئے لکھا گیا ہے۔ خط پختہ و نستعلیق ہے۔ آخری چند صفحے ضائع ہو گئے ہیں۔ اس لئے سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ چلا۔

---

(۲۲) کلیات حزیں۔

اس مجموعہ میں پہلے قصائد ہیں پھر بہ ترتیب ابجد غزلیات۔ غزلوں کے بعد رباعیات و قطعات ہیں۔ سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ چل سکا۔ بظاہر بہت زمانہ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے شروع کے دو صفحوں پر خود شیخ حزیں کا مولفہ دیباچہ ہے۔ کاغذ ولایتی ہے۔ کھرا سفید۔ خط نستعلیق۔

---

(۲۳) نزہتہ الارواح۔

مصنفہ رکن الدین حسین ابن عالم بن ابوالحسین حسینی۔ تصوف و سلوک میں ہے۔ ۲۸ فصلیں ہیں۔ جن میں مبدا سلوک معرفت سلوک مقامات سلوک نصیحت سالک ہدایت خلقت وحدت اور نفس وغیرہ کے مباحث ہیں۔

عبارتیں مغلق اور موٹے موٹے لغات سے بھری ہوئی ہیں۔ آخری صفحہ کی تھوڑی سی عبارت ملاحظہ ہو:-

مصنف این بدیع لطائف و مولف این غرائب و طرائف فقیر حقیر حسین بن عالم بن ابی الحسن الحسینی ...... لذا این غرافین ابکار یعنی نفایس افکار ...... این ضعیف اند بعد از ال کہ از مسند مستقر فطرت بستودع خلقت نزول کردہ انداز کمال طراوت و نہایت لطافت بغایتے رسید کہ صیانت در شہور سنہ احد عشر و سبعمائتہ (۷۱۱) مشاط نشاط فکر بر بساط این بساط کوشش و گردن ہر یک را بزیور فصاحت و بلاغت مسفرط موشح ساخت۔

عبارت مذکورہ میں سنہ تصنیف ۷۱۱ بتایا گیا ہے۔ کتاب دبیز بادامی کاغذ پر ہے۔ تقطیع متوسط اور خط معمولی ہے۔ آخر سے چند صفحات غائب ہیں۔

(۲۴) الجمعات الشاہیتہ جلد ششم

اس کتاب میں نویں صدی کے ایک برہانی رفاعی بزرگ سید محمد بن عبداللہ مخاطب بہ شاہ عالم کی ہفتہ وار صحبتوں کے حالات اور افادات کو کسی معتقد نے جو اپنے آپ کو "جامع کنوز محمدیہ" "جامع ملفوظ مبارک" اور "جامع ملفوظات محمدیہ" کے لقب سے یاد کرتا ہے جمع کیا ہے۔ زیر نظر حصہ یکم محرم ۸۶۹ھ روز جمعہ کے مذاکرے سے شروع ہو کر ۲۰ ذی الحجہ سنہ مذکور کے جمعہ پر ختم ہوا ہے۔

ہر جمعہ کی صحبت میں شیخ برہان الدین ملقب بہ میاں مخدوم قاری خاص اور جامع کنوز محمدیہ کا ذکر ضرور آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالالتزام حاضر مجلس رہا کرتے تھے کہیں کہیں خواجہ کریم الدین اور شیخ فرید بن دولت شاہ کا بھی ذکر ہے۔ ایک جمعہ کی مجلس میں باشندگان احمد آباد کے ہجوم کا ذکر بھی ہے۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ یہ صحبتیں احمد آباد میں ہوا کرتی تھیں۔

اس حصہ میں برہانی (غالباً منسوب بہ قطب عالم سید برہان الدین) کے خاندان مختلف شاخوں کے ۴۴ شجرے درج ہیں اور چند رسالے جہاد وغیرہ کے متعلق ہیں۔

حضرت قطب عالم کے متعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار (مجتبائی) کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں حضرت قطب عالم نبیرہ مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری ست از وطن اصلی خود بہ گجرات رفتہ توطن اختیار کردہ نام او سید برہان الدین ست و مشہور در زبان خلائق آن دیار بہ قطب عالم است۔ روضہ او سہ کروہی از احمد آباد ست۔ وفات او ہشتم ذی الحجہ سنہ سبع و خمسین و ثمان مائتہ الست۔

وقت کی تنگی کے باعث کتاب کو بالاستعیاب دیکھنے کا موقعہ نہ ملا۔ جستہ جستہ جن عنوانوں پر نظر پڑی ان میں سے چند یہ ہیں۔

حقیقت فکر۔ اثبات رویتہ ملائکہ۔ قلب سلیم۔ روز قیامت۔ مناقب صحابۂ کرام۔ صبر و شکر۔ مراقبہ۔ عبودیت۔ استقامت۔ فراست۔ فتوت۔ حقوق والدین۔

ان میں سے ہر ایک پر حضرت شاہ عالم کے ارشادات بڑے عالمانہ اور محققانہ ہیں۔ جامع کتاب ہر موقع پر جن القاب اور جس ادب و احترام سے ان کا نام لیتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موصوف بڑے بلند پایہ عالم اور بڑے عالی مرتبہ صوفی تھے اور خواص و عوام سب ان کا انتہائی ادب کرتے تھے۔

فرصت سے بغور مطالعہ کرنے والے کو اس کتاب میں ایسے مسائل ملیں گے جن کو زوایہ سے الگ کرکے اگر ایک جا کر دیا جائے تو تصوف سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید اور دلچسپ ثابت ہوں گے۔

کتاب میں نہ کہیں جامع کا نام ملا نہ کاتب کا نہ سنہ کتابت۔ البتہ سرورق پر ان اصحاب کے نام مع سنین کے درج ہیں جن کے قبضہ میں نسخہ رہ چکا ہے۔

۱۔ من نعم اللہ علی عبدہ ابن شیخ بہا رالدین۔

۲۔ مالک ملوک اہل بیت النبوی ابوالحسن الحسینی نقشبندی مہر میں ہے۔ خادم درگاہ ابوالحسن دیوانہ۔ سنہ ۱۱۵۲ھ۔ خادم ابوالحسن درگاہ دیوانہ۔

۳۔ رسالہ ہائے حضرت شاہیہ از کتاب خانہ نواب نیک عالم خاں خواجہ عباد اللہ ہدیہ گرفتہ درہراج۔ تاریخ غرہ جمادی الاول سنہ ۱۱۵۸ھ۔

۴۔ این رسالہ جمعات شاہیہ جلد ششم از خواجہ عباد اللہ نانیا الحال فقیر حقیر حسین الدین حسینی بتاریخ غرہ جمادی الثانی سنہ ۱۱۹۰ھ ہدیہ گرفتہ مہر میر حسین الدین سنہ ۱۱۶۴ھ۔

عبدالحمید خاں

(مسٹر رشید قریشی ایم اے حیدرآباد کے کامیاب نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ آپکے افسانوں کا مجموعہ "من کی دنیا" ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہوکر بہت مقبول ہوا۔ اب آپ ایک دوسرا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں) ادارہ

جھنکار

فاروق اپنی خالہ زاد بہن فیروزہ کے ساتھ اب کھیل میں شریک ہوتا تو اس کا دل دھڑکتا رہتا۔ فاروق کی شریر آنکھیں کیسی مدماتی قلندری اور کھوجی ہوگئی تھیں۔ اُف ایک رات اس نے وہ خواب بھی تو دیکھا تھا۔ گڑیوں کی شادی کا نقشہ جما تھا اور تو یہ ہے کیسی شرم کی بات گڑیا کی جگہ وہ خود دلہن بنی بیٹھی تھی اور فاروق..... فیروزہ کا دل سنسنا اٹھا۔ اور سپنے بھی ٹھنڈے۔ مدہوش کرنے والے۔ اسی زمانے میں چھوٹے چچا وہ ریکارڈ لائے تھے۔ جس میں کئی عورتیں مل کر گاتی ہیں: "کرلو محبت کرلو" چھوٹے چچا تو ریکارڈ کے ساتھ خود بھی گانے لگتے۔ پر فیروزہ کیا کرتی بے چاری۔ اور اس دن جو چھوٹے چچا اپنی ہونے والی سسرال چلے گئے تھے۔ اس کی کیسی درگت بنی تھی۔ چھوٹے چچا وہ ریکارڈ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن اس کی ایک ہلکی سی گونج فیروزہ کے دل میں بھٹکتی رہ گئی تھی۔ چھوٹے چچا کی شادی کا دھیان..... اور اس کے بعد اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے چاروں طرف عورتیں ہی عورتیں جمع ہیں اور اسی گانے کا شور مچ رہا ہے۔ کوئی اس کے اندر بھی گانے لگا: "کرلو محبت کرلو"

فیروزہ نے گھبراہٹ کے عالم میں آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ فاروق...... اور فیروزہ کی نظروں نے وہی گیت فاروق کو بھی سنا دیا۔ دھک۔ دھک۔ کرلو محبت کرلو۔ فیروزہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب وہ فاروق کا سامنا کرتے ہوتے جھجکی جا رہی تھی۔ پلو کی آڑ کافی نہ ہوئی تو دروازے کے پٹ نے پناہ دی۔ اپنوں کی یہ اجنبیت۔ کیسی دلچسپ۔ کیسی عجیب تھی۔ بچپن کا معصوم بندھن جوان امنگوں کی تاب نہ لا سکا۔ پہلی ہی نظر میں ٹوٹ گیا۔ اور ایک انوکھا جذبہ دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر رہا تھا۔ دور بھی..... فیروزہ دور ہٹتی گئی دروازے کی آڑ کتنی ناقابل عبور آڑ ہوتی ہے۔ کوئی فاروق کے دل سے پوچھے۔ اسے تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے فیروزہ نہ تھی۔ کوئی آسمانی مخلوق تھی۔ زمین پہ آئی پھر آسمان پر چلی گئی۔ مگر وہ آسمان سے تارے کو توڑنا چاہتا تھا۔ اس کا دل اچھل اچھل کر اسے دروازے کی طرف ڈھکیل رہا تھا۔ اور فیروزہ کی جھانکتی ہوئی آنکھیں اس کے قدموں میں بچھی جا رہی تھیں۔ آج اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ دلوں کے میل کو رتبہ اور دولت کی حد بندیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس کے ماں باپ دولت مند اور فیروزہ غریب ہے۔ تو اپنی امارت داری پر اکڑتے ہوئے غریب نصیب فیروزہ سے انجان کیوں رہا جائے۔ فیروزہ کو دولت اور حیثیت کی خاطر گنوانا کتنی بڑی بھول ہوگی۔ اس نے اپنے باپ کے تاکیدی احکام کی تعمیل میں اپنی خالہ کے ہاں آنا جانا جو چھوڑا برا کیا۔ آج اس کی غلطی دروازے کی آڑ کی صورت میں اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔

"فیروزہ ہم سے پردہ کر رہی ہو؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ فیروزہ کیا جواب دیتی دروازے کے پٹ کو خفیف سی حرکت ہوئی۔ چوڑیاں جھنکیں۔ اور فاروق کے دل میں ہزاروں جگنو ٹمٹمانے لگے۔ فیروزہ کی ماں کے قدموں کی آواز نے اس طوفانی کشمکش میں سکون کی لہریں دوڑا دیں۔ "خالہ بی۔" یہ فیروزہ کی ماں مسکرانے کو تھیں کہ ان کی بھنویں پیشانی کی طرف کھنچ گئیں مسکراہٹ کی یہ ہلکی سی کرن حزن و ملال کے بھنور میں بجھ کر رہ گئی۔ فیروزہ کے چہرے کی تمتماہٹوں اور اس کی خود فراموشیوں کو بھانپ گئی تھیں۔ وہ اس بوجھ سے جس قدر جلد ہو سکے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھیں۔ لیکن جہیز میں سونے کے بازو اور دوسرے مطالبوں کی تکمیل بیوہ ماں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے کوئی اچھا پیام جمتا نہ تھا۔ فاروق کے پاسنگ کا کوئی لڑکا تو انہیں ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔

انھیں یقین تھا کہ فاروق کے اصرار پر ماں باپ اس رشتہ کو ہرگز پسند نہ کریں گے۔ لیکن وہ پھر سوچنے لگتیں۔ شاید فاروق کے اصرار پر مان جائیں۔ شاید فیروزہ کی قسمت اس کی طرح حسین ہو۔ انھوں نے فاروق کی آمد و رفت کو خطرناک تو ضرور محسوس کیا۔ پر فاروق کے ساتھ ان کے سلوک میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا۔

فاروق روز آنے لگا۔ وہ نت نئی آن بان سے آتا۔ دولت مند ماں باپ کی دولت اولاد کے حوصلے پورے نہ کرے تو حق تلفیاں نئے رنگ لائیں گی۔ فیروزہ تو پہلے ہی فاروق کی طرف مائل تھی۔ اب اس کی دولت نواز وابستگی نے تو اس کے دل کو سارے سہاروں سے توڑ لیا فیروزہ کا دل فاروق کے قدموں میں آ گرا۔

ایک دن باتوں باتوں میں فیروزہ کی ماں نے پوچھ ہی لیا۔ بیٹی فاروق بڑا اچھا لڑکا ہے۔ مجھے پسند ہے۔ فیروزہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ مگر بیٹی ایک بات پوچھتی ہوں۔ فاروق نے کبھی شادی کا ذکر بھی چھیڑا ہے۔ فیروزہ جواب دیئے بغیر اپنے کمرہ میں چلی آئی۔
ایک تشویش ناک سنسنی اس کے دماغ میں کسی موذی کیڑے کی طرح بھنبھناتی ہوئی گھس پڑی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ آج وہ فاروق کے ساتھ سینما جائے گی۔ آج تک اس نے اس کی اس خواہش کو ہمیشہ ٹال دیا تھا۔ پر آج تو اسے جانا ہی ہوگا وہ سینما ضرور جائے گی اور وہیں اسے فاروق کے رجحانات کا پتہ چل جائے گا۔

سینما سے واپس ہونے کے بعد فیروزہ جب فاروق کی موٹر سے اتری تو اسے پہلی بار اپنے پیروں تلے زمین کی سخت اور کھردری سطح کا احساس ہوا اور جب فاروق کی موٹر کا شور دھیمے دھیمے بے آواز ہو گیا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ زمین سے ابھر کر آسمان کی نظر نہ آنے والی بلندیوں میں کھو گئی اور پھر ان بلندیوں سے پستیوں کی طرف دھکیل دی گئی۔ وہ روتی رہی۔ اس نازک فیروزہ نے زندگی بھر میں جتنے آنسو وہ بہا سکتی تھی ایک ایک قطرہ کر کے اس کے تکیہ میں جذب ہو گئے۔ اس کا دل اس بچہ کی طرح دہشت زدہ اور مجرمانہ ندامت کے زیر اثر لرز رہا تھا۔ جس نے دیا سلائی کے کھیل میں گھر کو آگ لگا دی ہو۔

فاروق۔ فیروزہ کانپی۔ نہیں نہیں سینما کے سارے تماشائیوں نے پکار پکار کر کہا۔ پردۂ سیمیں کے اداکاروں نے چیخ چیخ کر کہا اور خود فاروق نے کہہ دیا۔ فیروزہ میں تم سے محبت کی بھیک مانگتا ہوں۔ میں مجبور ہوں میں ان بندشوں کو نہیں توڑ سکتا محبت ان ڈھکوسلوں سے بے نیاز ہے۔ لیکن تم میری مجبوریوں کو سمجھو مجھے ٹھکراؤ نہیں۔ فیروزہ سوکھی گھاس کی طرح سلگ اٹھی۔ ظلم کی طرح آپ مجھ پر کچھ خرچ کر کے اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے خبر نہ تھی۔ میرے دل سے کھیل رہے تھے۔ اور میری تباہی کی پیش بندیاں کی گئی تھیں۔ مجھے علم نہ تھا۔ دغا باز۔ فریبی۔ اس کے بعد جو فیروزہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ بارش کے قطروں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح رو پڑی۔
فاروق مجھے تمھاری دولت نہیں چاہیے۔ مجھے یوں بیچ راستہ میں اکیلا نہ چھوڑ جاؤ۔ چلو اس دنیا ہی کو چھوڑ جائیں۔ جہاں انسانوں کو درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور دل پاؤں تلے روندے جاتے ہیں۔ کیا تم میری بات نہ مانو گے۔ فاروق۔ فاروق نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور فیروزہ رنگ برنگ کے دلفریب اجالوں میں سے نکل کر بھیانک اندھیروں میں کھو گئی۔ اس پہلی ہی ٹھوکر نے اس کے شیرازۂ حیات کو درہم برہم کر دیا۔ فیروزہ اپنی ماں سے بھی سارا حال کہہ چکی لیکن وہ فاروق کو شادی پر رضامند کر لینے کے سوا اور کیا مشورہ دے سکتی تھی۔
پر کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک الھڑ لڑکی کو کسی نوجوان کا من جیتنے کے لئے کیسی کٹھنائیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔

مجبوریاں ماں بیٹی کی مجبوریاں۔ گھر کے کھلونوں کی طرف انھیں ڈھکیل رہی تھی۔ اور وہ بڑھتی ہی گئیں۔ فاروق کا آنا جانا اب بہت کم ہو گیا۔ کچھ دن بعد تو یہ کبھی کبھار کا آنا بھی بند ہو گیا۔ ایک فیروزہ نہ ہوئی تو کیا۔ فاروق کے ماں باپ کی دولت اس کے لئے ہر روز حسن اور جوانی کی خریداریاں کر سکتی تھی۔ آنکھیں بھٹک جاتی ہیں تو دل بھی ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ فاروق اس چوٹ کو سہہ جانے کے لئے بیباک جو ہوا تو رنگ رلیوں کی فضاؤں میں اتنی اونچی اڑان مار گیا کہ اس کے ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ صاحب جائداد ماں باپ کے بیٹوں کو کون بیٹی نہیں دیتا۔ ایک معزز اور لکھپتی سیٹھ کی بیٹی سے فاروق کی نسبت قرار پا گئی۔ فیروزہ کے لئے یہ خبر ایک ایسی افتاد تھی جس نے اس کے ارادوں اور منصوبوں کے محل کو ڈھا دیا۔ اب وہ کیا کرے۔ لیکن وہ زہر نہیں کھائے گی۔ کنویں میں ڈوب نہ مرے گی۔

اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت زندگی کی سانسیں لے رہی تھی۔ وہ زندہ رہے گی اور تقدیر کے ہتھیاروں کے مقابل ڈٹی رہے گی۔ اچھا ہوتا جو وہ مر جاتی۔ جینے کا ایسا مجنونانہ عزم بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ ایسا تیر ہوتا ہے جو فراٹے بھرتا ہوا کسی نشانہ کی طرف نہیں بے مقصد ہی چھوٹ جاتا ہے۔ پھر جو بھی اس کی زد میں آ جائے ــــ فاروق کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کئی مقصد ہوتے ہیں۔ فاروق نے اپنی پسند کے ٹھکرا جانے کے بعد صرف ماں باپ کی خوشی پوری کی تھی۔ اب اس کے بعد ماں باپ کی عزت کو پھر خطرہ لاحق ہو گیا۔ فاروق اپنی پچھلی ڈگر پر چل پڑا۔ ڈانٹ ڈپٹ ہوئی رقمی فراہمیوں پر روک تھام کی گئی۔ لیکن فاروق کو نہ سنبھلنا تھا نہ سنبھلا۔ فاروق کی بیوی کو شوہر کی بے راہ روی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس کی مرضی کو کسی نے قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اب وہ فاروق کو اپنے لئے کیوں روک رکھے وہ سب کچھ دیکھتی پر اس طرح بے تعلق رہنا چاہتی تھی جیسے قیدی قید خانے کے دار وغہ سے۔

فیروزہ کے لئے ایک بوڑھے جاگیردار صاحب کا پیام آیا تھا۔ خاصے مالدار آدمی تھے۔ بڑی ڈیوڑھی میں رہتے تھے۔ انھیں جہیز کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ صرف ایک جوان لڑکی درکار تھی۔ جسے وہ اپنی بیوہ چھوڑ جانا چاہتے تھے۔ تھوڑی سی پیروی کے بعد ان کی شادی فیروزہ سے ہو گئی۔ حکیم صاحب کا علاج ابھی مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ جاگیردار صاحب چل بسے وہ اس شادی کے انتظار ہی میں زندگی کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔ بیوگی ایک سانحہ جانگداز ہے عورت کے لئے موت ہے۔ لیکن فیروزہ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ حصہ بخروں کے بعد جو کچھ بھی فیروزہ کے پلے پڑا اس کی امیدوں سے زیادہ تھا۔ وہ اب امیر ہو گئی تھی۔

جوان بیوہ اور مزدور۔ ان دونوں سے ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا ہے۔ محلہ والوں کی رائے ہوئی کہ فیروزہ دوسرا عقد کر لے۔ محلہ نے ایک نوجوان نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ خیر سے تعلیم یافتہ ہے۔ شکل و صورت میں بھی برے نہ تھے۔ فیروزہ ماں کے اصرار پر راضی ہو گئی۔ اور تجمل اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی بڑی رقم کا چک بھنانے کے لئے بنک میں۔ پہلے ہی دن اس نے اپنی بہن کی شادی کے قرضہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ فیروزہ سے کوئی چاہتا اس کی جان مانگ لیتا۔ لیکن روپیہ پیسہ کے معاملہ میں وہ بیحد محتاط ہو گئی تھی۔ اس نے تجمل کو ملازمت کا مشورہ دیا تو تجمل نے یقین دلایا کہ فلاں جو ہیں انھوں نے قسمیں کھائی ہیں۔ فلاں جو ہیں میرے دوست ہیں۔ فلاں جو ہیں انھوں نے وعدہ کیا ہے اور اب کوئی دن جاتا ہے جو مجھے ایک اونچی کرسی پر ٹانگیں جھلاتے ہوئے مکھیاں مارنے کا حکم مل جائے گا۔ فیروزہ ان اڑان گھاٹیوں میں آنے والی نہ تھی۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ

اگر تم نے میری دولت کے لئے شادی کی ہے تو بھول کی ہے۔ میری دولت میری زندگی ہے۔ یہ دولت میرے مرحوم شوہر کی نشانی ہے... یہی میرا شوہر ہے! میری دولت! مجمل چند دن بعد بغیر کچھ کہے سنے گھر سے غائب ہو گیا۔ اور اس کے بعد فیروزہ کے گلے میں بستر لڑا کبھی نظر آیا۔

فاروق نے بیوی کے زیورات کو بھی اپنے مشاغل کی نذر کیا۔ اور ایک ایسی تلاش زندگی گزارنے لگا جو موت کی آرزو میں سرگرداں تھی جس نے اپنوں سے ناتہ توڑ لیا تھا جس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ ماں نے انتقال فیروزہ کو ایک تیز رو ندی کی ساحلی چٹان کے سرے پر پہنچا دیا اب اس مقام سے چھلانگ اٹل تھی۔ لوٹنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ اور ناکامیوں کے سلگتے ہوئے داغوں نے اسے گھلا کر قبل از وقت بوڑھا کر دیا۔ ایک دن اس نے اپنے چھوٹے چچا کو بلوا بھیجا اور اس سے فاروق کے بارے میں دریافت کیا۔ فاروق کی تباہ حالی سے کون واقف نہ تھا۔ فیروزہ ایک کا سارا حال سنتی رہی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔

جیسے اس کے نزدیک فاروق خود اپنی تباہی کا ذمہ دار ہو۔ چھوٹے چچا جانے لگے تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ میرا وقت اب قریب آ گیا ہے۔ چھوٹے چچا کہیں فاروق سے ملنا ہو جائے تو اسے میرے پاس بھیج دیجئے۔ فیروزہ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ بچپن کی فیروزہ۔ جوان فیروزہ سے مختلف تھی اور یہ بستر پر پڑی ہوئی بیمار فیروزہ تو پہچانی ہی نہ جاتی تھی۔ اس کی زندگی قبر سے پہلے اس کے دل میں دفن ہو چکی تھی۔ فیروزہ کی آنکھیں دروازے کی آہٹ پر کچھ کھلنے لگیں۔ فاروق کا دھندلا چہرہ اسے نظر آنے لگا تو فیروزہ کے ہونٹ مسکرانے لگے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے اپنے چہرے پر آنچل ڈال لیا: مجھ سے پردہ کرو گی؟ فاروق نے سسکتے ہوئے کہا: فاروق میرے قریب آؤ...... فیروزہ نے اپنے سرہانے سے ایک گٹھڑی نکالی: سنو تم نے مجھے غریب جان کر ٹھکرا دیا۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے آپ کو بیچ کر یہ دولت اکٹھی کی ہے۔ میرے قریب آؤ۔ میں امیر ہوں اب۔ لو یہ شاید تمہارے کچھ کام آ سکے۔ فیروزہ کا کمزور ہاتھ اس وزن کو تھام نہ سکا۔ گٹھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی چھن۔ سونے چاندی کے سکے اور زیورات بستر کی چادر پر بکھر گئے۔ اس جھنکار میں کسی کے دل کی ناتواں دھڑکن، کراہ بن کر ڈوب گئی۔ فاروق آگے بڑھنے لگا۔ پلنگ کے قریب پہنچ کر اس نے فیروزہ کے چہرے پر سے آنچل سرکایا۔ فیروزہ کی زندگی ایک مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں سے چپکی رہ گئی تھی۔ اس مسکراہٹ کی اوٹ میں غم و اندوہ کے کتنے امڈتے ہوئے طوفان دم توڑ چکے تھے۔ کتنے آنسو۔ کتنی فریادیں۔ کتنی ہچکیاں گھٹی ہوئی تھیں۔

(حیدرآباد ریڈیو سے نشر کیا گیا)

رشید قریشی

حیاتِ محمد قلی قطب شاہ

از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ

اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی کی یہ سوانح حیات جدید ترین انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ اس کی خصوصیات کا اندازہ اردو کے چند مشہور ادیبوں کی حسبِ ذیل آراء سے ہوگا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی
قدرت نے اس کام کے لئے ڈاکٹر زورؔ کو چن لیا اور انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ خادمِ زبان و ادب ہونا تو ان کا پہلے ہی سے مسلّم تھا۔ مورخ وہ اب نکلے۔ کتاب قابلِ دید ہے۔ مفصل بھی ہے جامع بھی اور بقدرِ امکان مستند بھی۔ مورخانہ شان ادبی آن دونوں موجود۔ عبارت سلجھی ہوئی اور شستہ۔ ہر بحث سنجیدہ اور شائستہ۔ (صدق ۳۰ ڈسمبر ۱۹۴۰ء)

مولانا نیاز فتحپوری
پروفیسر زورؔ کی یہ تالیف دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ یہ تصنیف فنِ سیرت و انتقاد کے موجودہ اصولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ ہر حیثیت سے معیاری چیز ہے۔ جس محنت و سلیقہ سے کام لیا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ (نگار ڈسمبر ۱۹۴۰ء)

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام
سوانح حیات لکھنے کا ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اور اس لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کی یہ علمی اور تحقیقاتی کوشش اہلِ علم اور عوام کے حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

حکیم یوسف حسین صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور
یہ علمی کتاب دیکھ کر دل کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ہمارے خیال میں اردو زبان میں اتنی اچھی کتاب کئی سالوں بھی شائع نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کی تیاری میں بلاشبہ سیکڑوں پرانی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اور کئی سال صرف کر دیئے ہوں گے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی
یہ کتاب تاریخِ ادب اور تاریخِ سیاسی میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اس زمانے کے تمدن کو نہایت صاف اور واضح کر کے رکھ دیا ہے۔ تاریخی تنقیدی حصے بھی نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔

(صفحات ۵۰۰ سے زیادہ تصویریں عکسی ۳۰ سے زیادہ)

قیمت مجلد ۵ روپے ۱۲ آنے

ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد

ہماری قومی زبان

ہندستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اس کو براعظم کہا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے تو دوسری طرف مختلف زبانوں کا مخزن ہے۔ یہاں رنگ برنگ کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور ہر خطہ کی بولی جدا جدا ہے ـــــ اس لئے ہندستانی بچہ قدرتاً دو زبان بولنے پر مجبور ہے۔ ایک تو اس کی اپنی مادری زبان جس کو وہ دنیا میں جنم لیتے ہی رات دن اپنے گھر میں سنتا رہتا ہے۔ اور دوسری وہ زبان جس کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کے مختلف زبان والوں کے خیالات سے واقف ہو سکے۔ اپنی بات انھیں سنا سکے اور ان کی بات خود سمجھ سکے۔

مشترکہ زبان کی ضرورت :- ہر ملک اور قوم کی ایک ایسی مشترکہ زبان ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے افراد آپس میں تبادلۂ خیال کے قابل ہوتے ہیں۔ جیسے عربوں کی زبان عربی، ایرانیوں کی فارسی اور انگریزوں کی انگریزی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایک عام اور مشترکہ زبان قومی ترقی کی اولین شرط ہے۔ دنیا کا ہر مہذب ملک ایک قومی زبان رکھتا ہے کیونکہ باہمی تبادلۂ خیال کے لئے کسی مشترکہ ذریعہ کے بغیر کسی نصب العین کو جاننا ایک مشکل امر ہے۔

قدیم زمانہ میں جب ہماری معاشرت، معاشی حالات اور آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے، ممکن تھا کہ مقامی زبان ہماری ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو۔ مگر آج کل تہذیب و تمدن کی ترقی، سائنسی انکشافات اور آمد و رفت کی سہولتوں نے دنیا کے تمام ممالک اور ہندوستان کے مختلف خطوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب تر کر دیا ہے کہ اب ہماری ضروریات محض مقامی حد تک محدود نہیں رہ سکتیں بلکہ ہمیں مختلف حصوں سے رشتہ جوڑنا پڑتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں ہمیں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جب ہم ہندوستان کے کسی مقام پر جانا چاہیں تو نہ ہماری بولی وہاں سمجھی جاتی ہے اور نہ ہم وہاں کی بولی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ ایک مقام والے دوسرے مقام کی بولی سیکھیں۔ مگر ہم اپنی ضروریات کے تحت نہ صرف ایک مقام بلکہ کئی مقامات پر جانے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم ہر جگہ کی بولی سیکھنے بیٹھیں تو اس کے لئے ہماری عمر وفا نہ کرے گی۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ ایک نہ ایک ایسی زبان ہو جس کو ملک ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب بولتے اور سمجھتے ہوں۔

مہاتما گاندھی نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں بمقام "رام پور ہاٹ" آسام میں بالکل بجا فرمایا کہ :-

"اگر ہم سارے ہندستان کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے پاس آئیں تو ہماری ایک مشترک زبان ہونی چاہئے اور یہ زبان ہندوستانی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو ہندوستانی کے دونوں اشکال اور رسم الخط (اردو، ہندی) سیکھنا چاہئے۔"

اس ضرورت کو ہماری اپنی بین قومی زبان "لنگوا فرینکا" نے ایجا ہے ہم اسے اردو کہیں یا ہندی یا ہندستانی پورا کر دیا ہے۔ یہاں اس بات کے بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ اس زبان کو بنانے، پال پوس کر پروان چڑھانے اور ارتقائی منازل سے گزار کر موجودہ حالت پر پہنچانے کا سہرا کسی خاص قوم و مذہب کے سر نہیں ہے، بلکہ اس کی پرورش اور پرداخت میں مادر ہند کے دونوں سپوت، ہندو اور مسلمان برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی اور لاعلمی ہے کہ اس زبان کو کسی خاص مذہب یا فرقہ سے متعلق کر کے "اردو" اور "ہندی" کا جھگڑا کھڑا کیا جائے کیونکہ اردو

اور ہندی میں بجز طرز نوشت کے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ زبان تو ایک ہی ہے، مگر اس کا لباس جدا ہے۔ ایک کو فارسی خط میں لکھتے ہیں تو دوسرے کو دیوناگری میں۔ اس کے علاوہ اُردو میں ہندی کی تو اعداد پچاس فیصد سے زیادہ الفاظ موجود ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ لوگ اس حقیقت سے دانستہ یا نادانستہ انجان بن جاتے ہیں۔

اُردو زبان کا پھیلاؤ۔ ہندوستان کی ان گنت زبانوں میں جس کا اندازہ ہندوستانی زبانوں کے محقق مسٹر گریرسن کے حساب سے (۲۲۳) ہے "اُردو" کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ دُنیا میں انگریزی کے بعد "اُردو" کو تمام آریائی خاندان کی زبانوں میں یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ نہ صرف تعلیم یافتہ افراد کی بولی ہے بلکہ یہ عوام کی زبان ہے۔ کانگریس کمیٹی کے فراہم کردہ اعداد کے لحاظ سے ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد (۱۷) کروڑ (۲۰) لاکھ ہے۔ اگر اس میں اس کے سمجھنے والوں کو بھی ملالیا جائے تو ان کی تعداد (۲۵) کروڑ ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے باہر ہندوستانی زبانوں میں سے یہی زبان زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ممالک غیر میں بھی اس کو بین قومی حیثیت حاصل ہے۔ حجاز اور عراق میں تمام ہندوستانی اسی زبان میں آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں، اور اسی طرح چین اور ہانگ کانگ وغیرہ میں بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔

اُردو نہ صرف ہماری ریاست، بلکہ کل ہند اور بیرون ہند کے لئے بھی اہم ہے۔ کشمیر سے لیکر راس کماری بلکہ لنکا تک، اور بلوچستان سے لیکر برما تک یہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کا جاننے والا جیسے ملایالم، تامل، تلنگی، مرہٹی، بنگالی، سندھی، گجراتی، پنجابی وغیرہ بولنے والا ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں چلا جائے تو وہاں وہ اجنبی ہو جاتا ہے کیونکہ نہ تو وہ وہاں کی بولی سمجھتا ہے اور نہ اس کی بات وہاں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اُردو بولنے اور سمجھنے والا ہندوستان کے کسی خطے میں بھی کسی دشواری سے دوچار نہیں ہوتا۔ حدود ہند سے باہر مشرق میں جاوا، برما، سیام اور مغرب میں عدن اور سویز وغیرہ تک بھی یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

حیدرآباد کی حد تک تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ یہ ہماری ریاست کی بین فرقہ جاتی زبان ہے۔ ہر علاقہ کا باشندہ، چاہے وہ مرہٹواڑہ کا ہو یا کرناٹک اور تلنگانہ کا، یہی زبان اس کے تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے۔ اس زبان کو یہاں نہ صرف سرکاری، عدالتی اور کاروباری زبان ہونے کا امتیاز حاصل ہے بلکہ جامعہ میں بھی یہی ذریعہ تعلیم ہے۔ ہماری ریاست نے اس کو اپنا کر اور ذریعۂ تعلیم بنا کر جو پہل کی ہے اس کی معقولیت کو مشرق و مغرب دونوں نے مان لیا ہے، اور ہندوستان کی اور جامعات بھی اس کی پیروی پر آمادہ ہو گئی ہیں چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی پیروی کرتے ہوئے جامعہ لکھنؤ نے فیصلہ کیا ہے کہ ابتداء میں بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی، ایل۔ ایل۔ بی اور بی کام کا سارا نصاب اُردو، ہندی میں رہے، اور ذریعۂ تعلیم اُردو زبان قرار دی جائے، اور آسان اُردو یا ہندی زبان میں تعلیم شروع کی جائے۔

اُردو زبان ہندوستان کی عام فہم زبان ہے۔ اس کے ذریعہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں ہم زبان ہو کر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کر سکیں گی، اور ہندوستان کی بین الملکی مغائرت اس کے استعمال سے زائل ہو جائے گی۔ اس کا جاننے والا بنگال، آسام، گجرات، ٹراونکور، مدراس، سرحی ملک، بمبئی اور کلکتہ، غرض تمام ہندوستان میں جہاں کہیں چلا جائے کسی دشواری سے دوچار نہ ہوگا۔

اردو کی خصوصیات اور دوسری زبانوں پر اس کی فوقیت :— اردو زبان کا سیکھنا جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس کے باہر بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے کسی طرح فائدہ سے خالی نہیں۔

(۱) اردو تاریخی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہتی کی سب سے اہم اور عظیم الشان یادگار ہے۔ یہ زبان ہندو مسلمانوں کے باہمی میل جول، رواداری اور رفاقت کا نتیجہ ہے۔ یہ زبان تمام ہندوستانیوں کا بلا امتیاز مذہب و ملت موروثی ترکہ ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ: "ہندو مسلم اتحاد کو اس سے بڑھ کر کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ اردو کو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے بنی ہے، مٹانے کی کوشش کی جائے" اور یہ کہنا کہ "اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ نہیں ہے" تاریخ کو جھٹلاتا ہے۔"

(۲) یہ زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے بنائی۔ اس کے بنانے میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یوں تو زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی قوم اور ذات ہوتی ہے خصوصاً اردو کی بناوٹ تو کچھ اس قسم کی اور اس کی نشو و نما کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ یہ بلا لحاظ قوم و ملت سارے ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے۔

(۳) مشترکہ زبان ہونے کا دعویٰ ہر بولی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے چند شرطیں ہیں:-

(۱) دیسی ہو بدیسی نہ ہو۔ (۲) کسی خاص فرقے اور رقبے تک محدود نہ ہو۔ (۳) ملک کے بڑے علاقہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ (۴) ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے ادا کرنے پر قادر ہو۔ (۵) زمانے کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے۔

یہ تمام خصوصیات اردو زبان میں موجود ہیں ـــــ یہ خالص دیسی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ نہ تو یہ کسی خاص فرقہ کی زبان ہے اور نہ کسی خاص رقبہ تک محدود ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کے بنانے اور ترقی دینے میں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ انگریز، پارسی، سکھ وغیرہ بھی اس میں شریک ہیں، اور ان میں سے ہر قوم کے لوگ اردو کے مصنف، شاعر اور مضمون نگار گذرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔

(۴) جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط بڑھنے لگا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھا، اردو زبان کے بغیر کام چلانا مشکل ہوگیا تو اس کے لئے انگریزوں نے اردو ہی کا انتخاب کیا، اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد ڈالی، جہاں انگریز نو واردوں کو ہندوستانی (اردو) کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں ہندوستان کے قابل افراد سے اردو میں کتابیں لکھوائی گئیں، اور تراجم شائع کئے گئے۔ اس میں اردو کے ہندو مسلمان ادیبوں نے مل کر کام کیا، اور اپنے قلم کے زور سے زبان کی ایسی کایا پلٹ دی کہ ۱۸۳۷ء میں جب دفتروں اور عدالتوں سے فارسی زبان خارج کی گئی تو اردو زبان نے اس کی جگہ لی۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اردو ہی ہندوستان کی عام زبان تسلیم کی گئی۔ اس کالج کے معلم اول جان گلکرائسٹ اس زبان کو (Grand Popular Speech of India) کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ـــ "یہ نہایت کارآمد اور عام زبان ہے جس پر ہندوستان فخر کر سکتا ہے۔" عیسائی مشنریوں نے بھی اسی کو اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنایا، اور اس میں کثرت سے کتابیں اور رسالے شائع کئے۔

(۵) ہندوستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ہندوستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا عام رواج نہیں جتنا ہندوستانی کا ہے۔ کیڈٹوں کو (جو فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں) بنگال، مدراس اور بمبئی میں ہندوستانی

سکھائی جاتی ہے۔ ہندستان میں ہندستانی کا وہی درجہ ہے جو انگریزی کا برطانیہ میں یا ترکی کا ترکستان میں۔

(۶) اُردو زبان ہمیں اتحاد و یکجہتی کا سبق دیتی ہے۔ یہ زبان مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے اور مختلف زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے سے مل کر ایسے ایک ہو گئے ہیں کہ ان میں فرق کرنا عوام کے لئے ناممکن ہے۔

(۷) یہ زبان ہندستان ہی میں پیدا ہوئی، ہندو مسلمانوں نے مل کر اس کو جنم دیا، پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ اگر اب انہی دونوں میں اس زبان کے بارے میں آپس میں کھینچ تان ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا وہی حال ہوگا جو ماں باپ کی نااتفاقی سے اولاد کا ہوتا ہے ——— اس کا نام گو بدیسی ہے (کیونکہ اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے) مگر نام اُردو ہو یا ہندستانی، زبان تو ایک ہی ہے، اور بقول خان بہادر شیخ عبدالقادر "ہم نام کے پابند نہیں، ہمیں کام سے کام ہے، جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو اسی نام سے اسے یاد کرے"۔

(۸) زمانۂ جنگ میں ہندستانی مسلمہ طور پر تمام دنیا میں ہندستان کی مشترکہ زبان سمجھی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جاپان، جرمنی، ترکستان، انگلستان وغیرہ سے ہندستان والوں کے لئے ہندستانی (اُردو) میں خبریں لاسلکی کے ذریعہ سے نشر کی جاتی تھیں۔

(۹) دنیا بھر کی زبانوں میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو سب سے کم جگہ گھیرتی ہے۔ چونکہ آج کل معاشی حیثیت سے اختصار کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اس لئے اُردو زبان اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

(۱۰) "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" اُردو زبان کی ایجاد ایک زمانہ میں ضرورت ہی کے تحت ہوئی۔ آج کل تو اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ہر قوم اس کوشش میں ہے کہ ایک مشترکہ زبان ایجاد کرے۔ چنانچہ ایک روسی عالم نے یورپ کے لئے "اسپرانٹو" (زبان امید) ایجاد کی جس میں روسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اطالوی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں، اور مغرب کا ہر ملک اپنی تجارتی، معاشی اور سیاسی سہولتوں کے لئے اس زبان کی ترویج میں مصروف ہے۔ اس کی وجہ سے تاجروں، سیاحوں اور سیاسیوں کو بڑی سہولت ہو گئی ہے ——— بقول سر شیخ عبدالقادر "ہماری اسپرانٹو وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اُردو، کوئی ہندی اور کوئی ہندستانی کہتا ہے۔ مگر اُردو مغربی اسپرانٹو کی طرح مصنوعی نہیں ہے بلکہ صدیوں میں قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے ہوئی ہے۔ اس لئے اُردو کی ترویج کا کام بہ نسبت اسپرانٹو کے آسان ہے"۔

(۱۱) اُردو کے پھیلاؤ کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ہندستان کے طول و عرض میں تقریباً (۲۵) کروڑ باشندے اُردو سمجھتے اور بولتے ہیں ہندوستان کے باہر بھی افریقہ، ایران، عرب اور دیگر علاقوں میں تقریباً (۳) کروڑ دس لاکھ اُردو بولنے والے موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ :-

۱۔ یہ بول چال کی زبان ہے۔ اس کے بنانے میں عوام کا بڑا حصہ ہے، اور زبانوں کی طرح یہ محض تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان نہیں ہے، بلکہ یہ عوام کی زبان ہے۔

۲۔ یہ ہندستان کی دو بڑی قوموں کے اتحاد کی عزیز ترین یادگار ہے۔

۳۔ ہمارے تمدن و معاشرت، ہمارے دل و دماغ کے نتائج اور ہمارے مادی اور روحانی خیالات کی حامل ہے۔

۴۔ ہمارے اسلاف کی صدیوں کی محنت، جانکاہی اور دماغی و ذہنی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔

۵۔ اور بزرگوں کی مقدس وراثت ہے۔

اُردو اور انگریزی :- بعض لوگ اُردو کے مقابلہ میں انگریزی کو ترجیح دینے اور اس کو مشترک زبان بنانے کے حامی ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ جتنی توجہ وہ انگریزی کے سیکھنے پر صرف کرتے ہیں اگر اس کا دسواں حصہ بھی اُردو پر صرف کریں تو وہ آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا سیکھنا ہندوستانیوں کے لئے بالکل سہل ہے کیونکہ اُردو شہروں، بازاروں، سڑکوں اور گھروں میں غرض کہ ہر جگہ اور ہر مقام پر سننے میں آتی ہے۔ اس لئے اس زبان سے کان آشنا رہتے ہیں اور یہ زبان اجنبی نہیں معلوم ہوتی جتنی کہ انگریزی زبان ہے۔ اُردو کے سیکڑوں الفاظ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں داخل ہونے کے علاوہ یہ زبان ہندوستان کے اکثر صوبوں میں بخوبی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اپنے پھیلاؤ کے علاوہ یہ زبان آسان ہے اور اس کا بولنا اور سمجھنا بہت جلد آ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ہر جگہ بولی جاتی ہے اور اس کے الفاظ بچپن ہی سے کانوں میں پڑتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

مہاتما گاندھی فرماتے ہیں کہ :- ”بلا شبہ انگریزی بین قومی زبان ہے۔ مگر یہ کبھی ہماری قومی زبان نہیں بن سکتی۔ قومی زبان کو ہماری قوم کے کروڑوں افراد کی ملک ہونی چاہئے۔ وہ انگریزی کو سیکھنے کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ ہندوستانی قدرتی طور پر قومی زبان ہے۔ اس لئے کہ اسے اس وقت ۲۱ کروڑ آدمی سمجھ لیتے ہیں اور باقی لوگ بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن انگریزی صرف چند آدمیوں (زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ آدمیوں) کی قومی زبان کہی جا سکتی ہے۔ اگر ہندوستان ایک قوم ہے تو اس کی قومی زبان بھی ایک ہونی چاہئے“ —— ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ :- ”ہندوستانی زبان عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور آج کل ہندوستانی ہندی اور اُردو کے مرکب کا نام ہے۔ جو شخص ہندی جانتا ہے اس کے لئے ہندوستانی آسان ہے ——

فارسی رسم الخط کا سیکھنا بہت آسان ہے۔ اس خط میں چند ہی بنیادی حروف ہیں جو (۳۷) حروف کے قائم مقام ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حروف کا ملانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن حروف اور ان کے جوڑ سیکھنا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی بات ہے۔ اگر ابتدا میں روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ دیا جائے اور اس کے بعد روزانہ آدھ گھنٹہ کی مشق کی جائے تو چھ مہینے میں کام چلانے کی حد تک اُردو سیکھ سکتے ہیں —— یقینی دونوں قسم کے خطوں کا مطالعہ جو ایک ہی زبان کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں، بڑا دلچسپ ہے۔ اگر ہمارے دل میں وطن اور اہل وطن کے لئے محبت ہے تو یہ تمام کوششیں بار آور ہو سکتی ہیں —— (اور انگریزی کے مقابلہ میں اس میں کم محنت کی ضرورت پڑے گی) فارسی رسم الخط مسلمانوں کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے ہندوؤں کے لئے سنسکرت۔ اس کے علاوہ یہ خط شمالی ہند میں کروڑوں ہندو اور مسلمان لکھتے ہیں۔ ایک وسیع ہندوستانی کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں قسم کی (فارسی اور دیوناگری) تحریر سیکھیں“۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ :- مسٹر رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ ادب اُردو، لکھتے ہیں کہ :- ”عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، اور ہندی ہندوؤں کی، اور اس بحث میں لوگ زبان اُردو کی اصل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ زبان اُردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی۔

یہ کہنا بجا ہے کہ زبان ہندی اُردو کی اصل اور ماں ہے۔ زبانِ اُردو کی صرف و نحو، محاورات، اور [illegible] الفاظ کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور بعض [illegible] وہ ہندستان کی عام زبان بن گئی۔ مگر حال کی ہندی اُردو سے جدا ہوگئی۔ وہ اس طرح کہ اُردو سے فارسی [illegible] کو نکال کر اس کی [illegible] سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ رکھ دئے گئے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اُردو اور ہندی اپنے ماخذ کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے بھی تو اس کی نشو ونما کے طریقہ میں ہے ——— اُردو مسلمانوں میں پلی اس لئے اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہوگئی۔ اور ہندی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کی ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ ایک میں عربی، فارسی کی بھرمار ہے تو دوسرے میں سنسکرت کی ٹھونس ٹھانس ہے۔"

اردو کو عام بنانا کیا ہندستان کی اور زبانوں کے حق میں مضر ہوگا؟

——— اُردو کے پرچم ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:- "ایک ہی زبان ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ "ملک میں کوئی دوسری زبان نہ رہے" تو یہ دعویٰ سرے سے نامعقول اور غیر مقبول ہے۔ اگر اس سے مطلب یہ ہے کہ مقامی زبانوں کے علاوہ کوئی ایسی مشترک زبان بھی ہو جو باہم تبادلۂ خیالات، کاروبار اور تعلیم وغیرہ کا ذریعہ ہو سکے تو اس کی معقولیت میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔"

ہندی کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے ملاحظہ ہو: — "ہندی کی اشاعت سے ہندی سیکھنے والے اُردو سے اور اُردو کی اشاعت سے اُردو سیکھنے والے ہندی سے زیادہ قریب ہو جائیں گے کیونکہ ہندستان کی کوئی دو زبانیں باہم اتنی قریب نہیں جتنی اُردو اور ہندی ہیں ——— اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی شخص اُردو کا اعلیٰ ادیب اور محقق نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندی نہ جانے کیونکہ ان دونوں زبانوں کا بلا مبالغہ اور اصلی معنوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور اس لئے ایک دوسرے کی مخالفت لاحاصل ہی نہیں بلکہ مضر ہے ——— جہاں کہیں میں نے ضرورت سمجھی ہندی کی حمایت کی۔ جامعہ عثمانیہ میں ہندی کے رواج دینے میں تھوڑی سی میری ناچیز کوشش کو بھی دخل ہے۔ جس قدر ہندی زبان کا زیادہ رواج ہوگا اسی قدر ہندو ہم سے زیادہ قریب ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہندی سے زیادہ ہندوستان کی کوئی زبان "اُردو" سے زیادہ قریب بلکہ اقرب نہیں ہے۔"

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ملک کی موجودہ فضا نے زبان کے مسئلہ کو پیچیدہ اور ناگوار بنا دیا ہے۔ کسی نے اس کا ناتا مذہب سے جوڑا ہے، اور کسی نے سیاست سے۔ یہ باتیں ہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے والی ہیں۔ ہر زبان کو خواہ ہندی ہو یا اُردو، ترقی کا حق حاصل ہے۔ لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری زبان کی ترقی میں حائل ہو۔ ایک دوسرے سے بدگمانی کی بجائے ایک دوسرے سے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

علامہ سیماب اکبرآبادی کا خیال ہے کہ: ——— "ہم پر ہندستان کی ہر زبان کا احترام فرض ہے۔ ہم کسی زبان کو ناقص یا غیر ضروری نہیں سمجھتے۔ جب ہم غیر ملکی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرنا عیب نہیں سمجھتے تو ہندوستانی زبانوں کے حاصل کرنے سے ہمارا اجتناب بے معنی اور ناپسندیدہ ہے۔ ہمیں ہندوستان کی ہر زبان سے دلچسپی ہے ——— زبانوں کے متعلق جو باہمی جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے ہیں، وہ بے فائدہ ہیں۔ زبان قومی نہیں بلکہ ملکی ہوتی ہے۔ کچھ دنوں سے ہندی زبان کو ترقی دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ہم اس طریق کار سے بدگمان یا بددل

نہیں ہوں، اور چاہتا ہوں کہ "ہندی" سے مسلمان ویسی ہی دلچسپی لیں جس طرح ہندو "اردو" سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی ایک ہندستانی زبان ہے، اور کسی زبان کا جاننا نہ جاننے سے بہتر ہے۔"

ان ذمہ دار حضرات کی آراء سے صاف ظاہر ہے کہ اردو کے بہی خواہ ہندی یا کسی اور دوسری زبان کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ وہ ہندی سیکھنے کی تاکید مسلمانوں کو بھی کرتے ہیں ــــ اردو زبان کو مشترک بنانے کے معنی مقامی زبانوں کی روک تھام نہیں، بلکہ ہندستان کے عام باشندوں کو ایک زبان بنا کر آپس کے ہمدردانہ تعلقات کو بڑھانا ہے تاکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل بنیں۔

اردو زبان کے بارے میں اہل مشرق اور اہل مغرب کے خیالات ــــ اردو زبان کے فرانسیسی پروفیسر اور عالم گارساں دتاسی، جنھوں نے اردو زبان و ادب پر پیرس میں خطبے پڑھے، ۱۸۶۱ء کے خطبہ میں لکھتے ہیں: ــــ "اردو زبان نے ہندستان میں وہی رتبہ حاصل کیا ہے جو فرانسیسی نے یورپ میں۔ یہ وہ زبان ہے جو بکثرت استعمال میں رہتی ہے۔ یورپین لوگوں سے گفتگو کرنے کا وسیلہ یہی ایک زبان ہے۔" ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ: ــــ

"اردو سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے اور روز بروز جو ترقی اس کو ہو رہی ہے، اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرے گی۔ اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو، مسلمان دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔"

مسٹر جارج کیمبل اپنی کتاب (India as it may be) میں لکھتے ہیں کہ: ــــ "ہندستانی (اردو) ملک کے اکثر طبقوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے، اور اس سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تحریری زبان کو ایک حد تک فارسی رکھا، مگر بول چال میں عام طور پر ہندستانی کو استعمال کرتے تھے، اور یہی ہندوستان کی عام زبان قرار پائی۔ اور زبانیں جہاں تک ضرورت ہے سکھائی جائیں، مگر بغیر مشترک زبان کے ترقی محال ہے۔"

ڈینی سن راس، مشہور مستشرق کا خیال ہے کہ: ــــ "اردو ہندوستان کی لنگوا فرنیکا (عام مشترک زبان) ہے، اور یہ وہ زبان ہے جو مختلف قوموں کو اتحاد اور اخوت کے مضبوط رشتہ میں جکڑے ہوئے ہے۔"

سائمن کمیشن کو اعتراف ہے کہ: ــــ "ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے۔"

مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کا خیال ہے کہ: ــــ "اردو زبان ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو مسلم اتحاد کی یادگار ہے، اور جس قدر اسے فروغ ہوگا اسی قدر دونوں قوموں کی یکجہتی کا باعث ہوگا۔"

جنوبی افریقہ کا ڈیلیگیشن اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ: ــــ

"جنوبی افریقہ میں جو ہندستانی لوگ آباد ہیں وہ ہندستانی بولتے ہیں۔"

نواب ڈاکٹر مہدی یار جنگ بہادر کا ارشاد ہوتا ہے کہ: ــــ

"اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ اس کو بولتے ہیں۔ عام اس سے کہ ان کا کیا مذہب و ملت ہے۔"

نواب بہادر احمد خاں صاحب والی محمود آباد کی رائے ہے کہ: ـــــ "اردو زبان کی بنیاد اتحاد پر قائم ہے، جو باہمی اتفاق کا ثبوت ہے۔ بعض قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی مگر ہندو شعرا و مصنفین کی خدمات بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ اردو کو سرتیج بہادر سپرو اور مہاراجہ کشن پرشاد بہادر جیسے بزرگوں کی سرپرستی اور حضرت کیفی دہلوی جیسے عالموں کی امداد حاصل ہے۔"

سرتیج بہادر سپرو کا خیال ہے کہ: ـــــ "دراصل اردو زبان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ ہو سکیں۔ میں یہ تسلیم کرنے تیار نہیں ہوں کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو بولنے والے محض مسلمان ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے اردو کی بنیاد اتحاد کے لئے ڈالی تھی۔ اگر آپ اتحاد کے خواہاں ہیں جس کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا، تو آپ اردو کو ترقی دیں۔"

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو "اردو" کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ـــــ "یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے موجودہ منافرت دور کی جاسکتی ہے اور ہم آپس میں متحد ہوسکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اگر کسی زبان کو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار کہا جاسکتا ہے تو وہ اردو ہے، اور اس کے تمام اجزا ہندو مسلم اشتراک کا صاف مظہر ہونے کے علاوہ اسے ہندوستان میں سب سے زیادہ وسعت اور اثر حاصل ہے۔"

غرض یہ کہ کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا عیسائی سب اس بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اگر ہم ان اقوال پر غیر جانبدارانہ طور پر نظر ڈالیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو ایک ہر دلعزیز، مقبول عام اور مشترکہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

زبان و مذہب: ـــــ ہمیں اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ زبان کا تعلق مقامات سے ہے، مذہب سے نہیں۔ اس لئے اگر زبان کو مذہب سے متعلق نہ کیا جائے تو زبان کا جھگڑا جلد مٹ سکتا ہے ـــــ

ہندی کو ہندوؤں کی زبان کہا جاتا ہے، مگر جب کانگریس کی طرف سے ہندی کے پرچار کی کوشش کی گئی تو بہار میں بنگالی اور مدراس کے تامل اور آندھرا اس کے خلاف ستیہ گرہ کر کے جیل میں تک گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندی کی مخالفت خود ہندوؤں نے کی ـــــ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے، مگر کیا کوئی ترکی، ایرانی، افغانی، عربی اور چینی مسلمانوں کو اس کے بولنے اور لکھنے پر مجبور کرسکتا ہے؟ مدراس کے ہندو مسلمان دونوں ہی تامل اور بنگال کے بنگالی اور گجرات کے گجراتی بولتے ہیں۔ یہی حال حیدرآباد کا ہے جہاں کے ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب مرہٹواڑہ میں مرہٹی اور تلنگانہ میں تلنگی اور کرناٹک میں کنڑی بولتے ہیں۔

اردو کو عام کیسے بنایا جاسکتا ہے ـــــ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ: ـــــ "اردو زبان کی ترقی دوسری زبانوں سے نفرت کرنے یا دوسری زبانوں کے ہمدردوں سے دشمنی مول لینے سے نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک تخریبی طریقہ ہے۔ اردو بولنے اور سمجھنے والے کشمیر سے لنکا تک اور بلوچستان سے آسام تک محض اس لئے اب بھی مل جاتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے صلح جویانہ مسلک اختیار کیا۔ کبھی کسی مقامی یا دوسری زبانوں کی مخالفت نہیں کی، حالانکہ اس زبان کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے کہ اس کے بولنے والے صاحبان تخت و تاج تھے اور ہر طرح کی سماجی اور سیاسی اقتدار رکھتے تھے۔ اگر اردو کے مصنفین اور مؤلفین ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیں جو اس کی دیرینہ روایات کے خلاف ہے، اور جس پر اپنے حاکمانہ اقتدار کے زمانے میں بھی

ارباب اُردو" نے عمل نہیں کیا تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا نتیجہ اس کے حق میں مفید نہ ہوگا اور اہلِ اُردو ہمیشہ کے لئے تاریخ میں بد نام ہو جائیں گے۔"

اُردو کی عام اشاعت کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کی تفصیل میں عوام کے لئے جو مشکلات ہیں ان کو دُور کیا جائے، اور رسم الخط کی اصلاحات کی جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کینٹب) نے جدید رسم الخط کی ایجاد کرکے جوڑ اور کرسیوں کو کم کر دیا ہے، اور سیکھنے والوں کے لئے سہولت پیدا کر دی ہے ——— کہ بقول سید ظفر احسن صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج: ——— "گو اُردو زبان آسان ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں غیر زبان والوں کے لئے دشواریاں نہیں ہیں۔ اگرچہ گردان اور تصریف دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہ آسان ہے مگر رسم الخط اور بعض وقت اوپر کی دشواریاں غیروں کے لئے اور بعض وقت خود اہلِ زبان کے لئے بھی مصیبت کا باعث ہوتی ہیں ——" اس جانب ارباب اُردو کو توجہ کرنی چاہئے۔"

مولانا وحید الدین سلیم مرحوم سابق صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے اُردو زبان کی ترویج کے بارے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ ارباب فکر کے لئے قابل توجہ ہیں: ———

"اُردو زبان کی قدرتی ساخت آریائی ہے، کیونکہ اس کی گرامر وہی ہے جو آریائی زبانوں کی ہے۔ اس کو عربی گرامر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جو حضرات سنسکرت الفاظ کی بھرمار اردو میں کرتے ہیں یا عربی الفاظ اردو میں بکثرت استعمال کرتے ہیں، وہ گویا اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اُردو ہندوستان کے لئے عام فہم نہ رہے، اور ہندو مسلمانوں میں جدائی کی خلیج وسیع ہوتی رہے اور خود اُردو زبان اپنی قدرتی بناوٹ سے دُور ہوتی جائے۔"

"اس غرض کے لئے کہ اُردو عام ہندوستانی زبان بن سکے، ایک موثر تدبیر یہ ہے کہ ہندی کے ان الفاظ کا اُردو میں اضافہ کیا جائے جو آسان، عام فہم اور شیریں ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہندو بھائی اس زبان سے زیادہ مانوس ہو جائیں گے۔ اس سے نہ صرف ہماری زبان کا دائرہ وسیع ہوگا بلکہ ہندوستان کے ہر صوبے کے باشندوں کے لئے یہ عام فہم ہو جائے گی ——— اُردو زبان میں مسلمانوں کی تاریخ، مذہب اور رسم و رواج کے متعلق الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اگر اس میں ہندو تاریخ، دیو مالا، مذہب اور رسم و رواج کے متعلق الفاظ بڑھا دئے جائیں تو پھر یہ زبان ایک ایسی زبان بن جائے گی، جس کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو یکساں دلچسپی ہوگی۔" ——— اب ہندوستان کو ایسے ادیبوں کی ضرورت نہیں ہے جو ہندو مسلمانوں کے تعصبات کو بھڑکائیں، بلکہ ایسے ادیبوں کی ضرورت ہے جو حب وطن کے ترانے سنا کر ہندوستانیوں میں اتحاد و محبت کی روح پھونکیں، اور اُردو زبان کو جو ہندو مسلمانوں کے ملاپ سے بنی ہے ایسی حالت پر پہنچائیں کہ وہ تمام اقوام کی مشترک زبان بن جائے۔"

"اُردو زبان کا موجودہ ادب، عرب و ایران کے متحدہ اثر سے تیار ہوا ہے۔ اس میں ہندوستانیت کی جھلک نام کو نہیں ہے۔ اگر ہم اُردو کو ملکی زبان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسا ادب تیار کرنا چاہئے جس کا مطالعہ کرنے والا قدم قدم پر ہندوستانیت کی نشانیاں دیکھتا جائے۔ یہی نشانیاں اس ادب کو تمام ہندوستان کی نظروں میں محبوب و عزیز بنا دے گی۔ کیونکہ غیر ملکی خیالات کو ہم جبراً ہندوستانیوں کے دماغوں میں ٹھونس نہیں سکتے ——— اُردو زبان میں موجودہ تلمیحات کا بیشتر حصہ عرب و ایران سے لایا گیا ہے۔ ہندوستانی تلمیحات عام بول چال میں کسی قدر ہیں مگر وہ لائق شمار نہیں ہیں ——— ہندوستان کی زبانوں اور ان کی ادبیات سے نفرت و گریز کرنے کے بعد کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اُردو زبان کو ہندوستان کی

مشترک زبان کا خطاب دیں۔" ——— اُردو میں ہندو مذہب، ہندو دیو مالا اور تاریخ و ادب کی تلمیحات کا اگر اضافہ کریں تو اس سے ہمارے مذہب اور عقل پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا، بلکہ اس سے ہمیں حسب ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔ ———

(۱) مختلف خیالات کے ادا کرنے پر ہم پہلے سے زیادہ قادر ہوں گے۔

(۲) یہ الزام ہم پر سے دُور ہوگا کہ ہم محض مذہبی تعصب کی بناء پر ہندو ادبیات سے گریز کرتے رہے۔

(۳) ہماری زبان صحیح معنوں میں ہندستانی اور ہمارا ادب صحیح معنوں میں ہندستانی کہلانے کا مستحق ہوگا۔

(۴) ہندو ہمارے ادب سے پیشتر کی نسبت زیادہ مانوس ہو جائیں گے۔

(۵) ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد مضبوط ہوگی اور حُب وطن کے میدان میں آسانی سے دونوں قومیں ایک ساتھ دوڑیں گی۔

بقول سر شیخ عبد القادر: ——— "اُردو زبان کو کئی زبانوں کا مرکب ہونے میں "اسپرانٹو" کے ساتھ پوری مشابہت ہے، اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ابھی اور الفاظ کی آمیزش کی گنجائش اس میں موجود ہے۔ ہندوستان کی مختلف بولیاں ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں، اور خصوصاً ہندستانی کے الفاظ اس میں بہت شامل ہیں۔ انگریزی الفاظ کی آمیزش سے یہ مشترک حصہ ان میں اور بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ ایسی صورت میں اُردو کا عام رواج دیا جانا سب کی آسانی کا باعث ہوگا ———

یورپ دس، بارہ مختلف سلطنتوں کا مجموعہ ہے، جس کے لئے ایک مشترکہ زبان پیدا کرنے کی کوشش ہے، اور باوجود اختلاف کے ایک نیا رشتۂ یگانگت پیدا کرنے کی فکر ہے، اور ہم ایک ہی ملک اور ایک ہی حکومت اور مشترک ضروریات اور اغراض کے باوجود فکر ہم زبانی سے غافل ہیں۔ حالانکہ ہمارے رستے میں وہ مشکلات بھی نہیں جو ان کے رستے میں ہیں۔ اگر ہم ان سب ذرائع سے جو اس کی اشاعت کے لئے ہمارے پاس ہیں، کام لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری اسپرانٹو (اُردو) ہندوستان بھر کی عمومی زبان نہ بن جائے ———

اگر اسپرانٹو کے حامی چند سال میں کئی سو سے کئی ہزار اور کئی ہزار سے کئی لاکھ بن سکتے ہیں تو کیا ہماری اسپرانٹو کے کئی کروڑ بولنے والے اور کئی کروڑ آدمی اپنے ساتھ نہیں لے سکتے؟

یالرڈی

آسرا

مجھ کو مری وفاؤں کا اچھا صلہ دیا
اب کیوں کھنچے کھنچے نظر آتے ہو آج کل،
میں ڈوبنے لگا تو سہارا دیا مجھے،
یہ بھی کوئی ادا ہے کہ اظہار دید پر
تیری عنایتوں کا مجھے اعتراف ہے
نفرت بھی کچھ نہ کچھ ہے محبت کے ساتھ ساتھ
میں نے تو خضر راہ بنایا تھا آپ کو
نقش وجود صفحۂ ہستی سے لو مرا
اب مرگ و زیست دونوں کے قابل نہیں ہے تو

غم اس قدر دیے کہ مجھے غم بنا دیا
شاید کہ تم نے مجھ کو نظر سے گرا دیا
ابھرا تو اور جوشِ تلاطم بڑھا دیا
افسانۂ کلیم لیا اور سنا دیا
مجھ کو مری حیات کا مقصد بتا دیا
تیرے کرم نے مجھ کو دو طرفہ مزا دیا
مجھ کو فریب کس لئے پھر جا بجا دیا
حرفِ غلط سمجھ کے کسی نے مٹا دیا
جبریل مجھ کو اس نے بڑا آسرا دیا

جبریل

قصۂ شاہ داؤد

ایک زمانے میں بغداد شریف کا ایک بادشاہ تھا جس کو شاہ جُنید کہا کرتے تھے۔ اُس کے ایک لڑکا مسمی شاہ داؤد تھا۔ حضرت شاہ جُنید کا وصال ہوگیا، اُس وقت اُن کی ایک بیوی اور کمسن لڑکا داؤد پسماندگان میں تھے۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد اُن کا بھائی مسمی امن تخت و تاج کا مالک بن گیا۔ بیوہ اور شاہ داؤد کو گھر سے نکال کر ساری جائداد پر قابض ہوگیا۔ وہ لوگ کھانے پینے سے بھی محتاج ہوگئے، بیوہ چکی پیس کر اپنا اور بچے کا پیٹ پالتی۔

حضرت شاہ جُنید نے اپنے فرزند شاہ داؤد کی نسبت شداد شاہ مصر کی لڑکی سے کی تھی۔ شاہ جُنید کے انتقال کے بعد شداد شاہ مصر اپنی لڑکی شاہ داؤد سے بیاہنے رضامند نہ تھا، چنانچہ اُس کی نسبت کو منقطع کر دیا اور شاہ روم کے لڑکے سے نسبت کی۔ داؤد کمسن تھا، اپنا سارا وقت کھیل کود میں گزارتا۔ کھیل ہمیشہ فوجی، تخت و تاج اور عدل و انصاف کا کھیلا کرتا۔

بیٹا شاہ جُنید کا اک کھیل بنایا　　اونچی مٹی دیکھ کے اک تخت بنایا
آپ بنا تھا بادشاہ کوئی نوکر لایا　　کوئی بنایا چوبدار تو کوئی کوتوال بنایا
تیلی کا چھوکرا پکڑ کے جب چور بنایا　　بیڑی ڈنڈا ٹھوک کے بہتا دھمکایا
کھال بدن کی ڈھا دی کچھ خوف نہ آیا

جب تیلن (جو بہت نیک اور روشن ضمیر ولی صفت تھی) کو اپنے لڑکے کی مار پیٹ کا حال معلوم ہوا تو اسے اپنے ساتھ لیکر شاہ داؤد کے پاس فریاد کی اور شاہ داؤد کے سامنے اُس کی نسبت کا حال (جس کی اس کو خبر نہ تھی) سُنایا اور پھر رشتہ منقطع ہوکر شاہ روم کے لڑکے سے ہونے کا ذکر کیا تو داؤد یہ حال سُنکر سوچ و فکر میں پڑ گیا۔

(۲)

لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے جب تیلن روئی　　جہاں بیٹھے تھے حضرت داؤد وہاں نکل آئی
تو نے مارے پوت غریب کی تو نے سمجھا کوئی　　شداد مصر میں بادشاہ تیری ہوئی تھی سگائی
انھیں بیٹے روم کا بادشاہ تجھ ملنی نا ہیں　　جو تو ایسا مرد ہے لا تو کر بیاہی لا
اتنی سن شاہ داؤد من چنتا ہوئی

آخر کار مجبور ہوکر اپنے چچا شاہ امن کے دربار میں جا کر اپنا مدعا ظاہر کرتے ہوئے امداد کا طالب ہوا جس کی بنا پر شاہ امن نے امداد دینے کے لئے اپنے بیٹے کو فوج لے کر داؤد کے ساتھ جانے کا حکم دیا، لیکن اس کے بیٹے نے شاہ جنید کے مظالم بت شکنی اور سب کو دائرۂ اسلام میں لانے کے واقعات کا اعادہ کیا تو شاہ امن نے امداد دینے سے انکار کرتے ہوئے اپنے گھر واپس بھاگ جانے کا حکم دیا۔

(۳)

چچا کے دربار میں داؤد پکارے　　مانگ لئے میرے مصر میں اختیار تمہارے

کہتا امن بادشاہ فرزند تمہارے　　جا داؤد کے ساتھ مِل لشکر سارے　　فوج
پوت کہتا شاہ کا سُن باوا تمہارے　　بیٹا شاہ جُنید کا جنعیں علم گزارے
ہمیں جبر کیے مسلمان بت توڑے تمہارے　　کیسے بغداد ت باہر سے قہر گزارے
اتنا سُنکر چچانے لڑکا نیچے اُتارے　　بھاگ جا پوت جُنید گھر نو تمہارے

جب شاہ داؤد کو اپنے چچا کی جانب سے بھی نا اُمیدی ہوئی تو اُس نے اپنے باپ حضرت جُنید کا گھوڑا (کہتے ہیں کہ تہ خانے میں رکھا جاتا تھا) باہر نکالا، اور اُس پر سوار ہو کر امداد کے لئے بجانب مدینہ شریف آنحضرت صلعم کے پاس جانے کے ارادے سے راہی ہوا، اثنائے راہ میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی (جو شکار کھیلنے کی غرض سے نکلے تھے) حضرت علیؓ نے شاہ جُنید کے گھوڑے کو پہچان کر داؤد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ اُس نے اپنا سارا حال کہہ سُنایا اور برائے امداد مدینہ شریف کا قصد ظاہر کیا۔ حضرت علیؓ کو خیال ہوا کہ امداد کے لئے آنحضرت صلعم اس کام پر یقینی مجھ کو ہی مامور فرمائیں گے، اس لئے مناسب تو یہی ہے کہ قبل ہی امداد دی جائے۔

(۴)

بھنورے گھوڑا لیا کاڑ[۱] نورانی بندہ　　گھوڑے اُپر بیٹھا اللہ کا بندہ
چلا مدینے شریف اللہ کا بندہ　　رستہ میں حضرت علی ملے شکار کھلندہ
گھوڑا شاہ جُنید کا کہاں لیئو جاندہ　　جاؤں مدینہ شریف کو فریادی بندہ
شاہ روم مصر کا بادشاہ بیر مانگ نہیں دیندا　　رستہ میں تو داؤ ملا کہیں جانیندہ

[۱] باؤلی　[۲] نکال　[۳] کھیلنے والا　[۴] جاتے ہو　[۵] زبردست　[۶] جانے نہیں دیتا

حضرت علیؓ کے حکم سے پریاں حاضر ہوئیں اور داؤد کو پھول پہنا کر اور مہندی لگا کر دولہا بنائیں اور داؤد کو حضرت علیؓ اپنے ہمراہ جلد لیکر چلے۔

(۵)

نارا مارا علیؓ نے میدان کے مانئ[۱]　　گجرے لئے ہاتھ میں چلی پریاں آئی
ہاتھوں کو مہندی لگی ہوا حکم خدائی　　اب داؤد گھوڑے چڑھو تم اپنے بیاہی[۲]
نفل دوگانہ پڑھ لئے شکر منائی　　گھوڑے اُپر بیٹھ گئے نے بار[۳] لگائی

[۱] اندر یا میں　[۲] دولہن　[۳] دیر

حضرت علیؓ اپنے ہمراہ داؤد کو سخت دھوپ اور لُو میں لیکر بجانب شہر مصر راہی ہوئے، شہر مصر میں شاہ روم کے لڑکے کے شادی کی تیاری ہو رہی تھی، کسی اجنبی کو بلا اجازت شہر کے حدود میں داخلہ کی ممانعت تھی۔ یہ لوگ مصر کے ایک زنانی شاہی باغ میں پہنچے جہاں مرد کا گزر و دخل نہ تھا۔ مالن باغ کی نگہبان تھی جو باغ کے دروازے میں بیٹھی تھی، باغ کے اندر داخل ہونے سے روک دی جس کی وجہ حضرت علیؓ نے مالن کو کچھ نذر کرنے داؤد سے ارشاد فرمایا، لیکن داؤد کے بجز رتھ کے پاس پائی نہ تھی، اپنی حالت پر آنسو بہایا، اور افسوس کے ساتھ کہنے لگا کہ میرے باپ جو بادشاہ تھے اور جن کے پاس دولت تھی وہ تو داخل بہشت ہو گئے، رہ گئی ماں، وہ تو بیچاری چکی پیس کر بسر کر رہی ہے۔

(۶)

دھوپ پڑے دھرتی تپے تو چلے ۔۔۔ چلدئیے شہر مصر میں دو یار جو کیلے
جاپہونچے تھے مصر میں حشمت والے ۔۔۔ مالن بیٹھی باغ کی دروازہ ملے
حضرت سمجھے یار نہیں دو دی کھولے ۔۔۔ لے دے اس کے نذر کچھ ہوتیرے پلے
اتنی سن داؤد نے تس آنسو ڈھلے ۔۔۔ جو ہم ہوتے بادشاہ کیوں آتے اکیلے
میری ماں پیسے پیسے میں رب کے حوالے ۔۔۔ باپ چلے گئے بہشت میں حشمت والے

زمین ۱ جوڑ ۲
پاس ۳ ہے ۴
دروازہ

جب شاہ داؤد کو حضرت علیؓ نے رنجیدہ پایا تو خدا سے دعا کی، داؤد نے حضرت کی ایماء سے خدا کا نام لے کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک اشرفی ملی، وہ اشرفی مالن کو دی گئی۔ مالن اشرفی پاکر خوش ہو دی اور باغ کا دروازہ کھول دیا اور انھیں اندر لے گئی۔ حضرت علیؓ نے مالن کو اسلام سے مشرف فرمایا۔ مالن دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہی اپنا کام تک بھول گئی۔ اس دن شہزادی کے لئے پھول چنے اور نہ گجرے گوندھے۔ حضرتؓ نے ہی گجرے گوندھے اور ایک چٹھی شہزادی کے نام لکھ کر گجرے میں لگائی اور چٹھی میں تحریر فرمایا کہ تیرا پہلا منگیتر باغ میں آیا ہوا ہے، اب تجھ کو شاہ روم کے لڑکے سے بیاہ ہوکر نہ جانا چاہئے بلکہ اسی سے نکاح کرلینا چاہئے۔

(۷)

اشرفی لیکر ہاتھ میں مالن شرمائی ۔۔۔ باغ دروازہ دیا کھول نے دیر لگائی
حضرت نے مسئلے کہے حدیث کی مالن ریجھائی ۔۔۔ نور الٰہی بھر دیا مسلمان بنائی
نہ توڑے پھول نہ گوندھے ہار سب بھول گئی ۔۔۔ حضرتؓ ہار گوندھے کر کے چترائی
باپڑھو بیٹی شہزادی میری چٹھی آئی ۔۔۔ آیا تیرے باغ میں تیرا پہلا سائیں
جو تو جاوے روم میں جانے دولہا نہیں ۔۔۔ آؤ جی پہچان کے ہوا حکم خدائی

پڑھو ۵ دلہا ۶

مالن حسب معمول پھول کے گجرے شہزادی کے پاس لے گئی تو شہزادی نے اس میں چٹھی پاکر خلوت میں جاکر پڑھی اور مالن کو ڈرا دھمکا کر سارا حال دریافت کرلیا اور فوراً اپنے وزیر یعنی ابراہیم کے نام ایک چٹھی اور حضرت علیؓ کی چٹھی کا جواب لکھ بھیجا کہ شہزادے داؤد کو باغ میں تنہا نہ چھوڑئیے گا، میں حسب الحکم ضرور اس سے ہی شادی کرلوں گی چاہے کچھ ہو۔

(۸)

ابراہیم وزیر تو ہے فرزانہ ۔۔۔ حضرت علیؓ ہے باغ میں دو جا پروانہ
بیٹھے رکھو باغ میں نہیں اور ٹھکانا ۔۔۔ ان نے کو چھوڑ کہیں اور کہیں جانا
مل جاؤں اسکے نام پر بیاہ بدل جاؤ زمانہ

جب شادی کی تاریخیں قرار پائیں تو شاہ روم نے شادی کے لئے مصر جانے سے قبل نجومیوں سے شادی کے متعلق آنے والے واقعات دریافت کئے تو نجومیوں نے بیان کیا کہ وہاں داؤد اور حضرت علیؓ تشریف رکھتے ہیں چونکہ

وہ بیوہ کا لڑکا ہے اُس کا مقابلہ نہ کرنا چاہئے ، تجھ کو بہ آسانی کسی اور جگہ لڑکی مل سکتی ہے لیکن اُس کو کوئی اور لڑکی نہیں مل سکتی اس لئے مناسب ہے کہ اُس لڑکی سے بیاہ کا ارادہ ترک کردیا جائے ۔

(۹)

کھڑے نجومی شاہ کے سلام سُنائی مانگ بیاہ غریب کی تونے شرم نہ آئی
تجے مل جائیں بہت سی اونھیں ملتی نا ہیں مصر میں بیز گرد علیؓ کا ہیں سُنائی
وہ بیوہ کا پوت ہے اُسے ملتی نا ہیں

جب شاہ روم نے نجومیوں سے یہ سُنا کہ وہ لڑکی داؤد کو ہی ملے گی تو اپنی کثیر فوج ہاتھی گھوڑے پیدل و سوار لے کر مصر کا رُخ کیا تاکہ اُسی لڑکی سے شادی کرلائے ۔ وہاں پہنچنے کے بعد نجومیوں نے کہا کہ تیرا دشمن وہی داؤد اسی تیری فوج میں بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے (چونکہ باوصف حضرت علیؓ کی ممانعت کے داؤد تماشا دیکھنے باغ سے باہر نکل کر شاہ روم کی فوج میں آگیا تھا) اور حضرت علیؓ بھی اس مقام پر تشریف لائیں گے تو یہ سُن کر بادشاہ روم کو یقین نہ آیا اور تحقیق ہونے تک نجومیوں کو قید میں رکھا ۔ داؤد کی تلاش و گرفتاری کے لئے حکم دیا اور چاروں طرف پہرہ مقرر کردیا ۔

(۱۰)

کھڑے نجومی شاہ کے سلام سنائی ہم کرے بہت سی تو مانے نا ہیں
بیٹھا تیری فوج میں تیرا دشمن بھائی بیگم جا ، شاہ داؤد کو تونے ملتی نا ہیں
یہاں شیر خدا آرہے ہیں یو دھوم مچائی پکڑی نجومی کئے قید دی مشکل چڑھائی
اُنا حضرتؓ کو دیکھ نہ لیوں چھوڑ دنگا نا ہیں پہرہ کردیا تعنات دیا حکم چڑھائی
اُس داؤد کو پکڑ لو کیوں دیر لگائی

تلاش سے داؤد کا پتہ نہ چلا تو اُس کی تصویر منگوا کر شناخت کرنے لگا ، تصویر کی وجہ داؤد گرفتار ہوگیا اور بادشاہ روم جو ترکی ظالم بادشاہ تھا ، داؤد کو پکڑ کر گٹھڑی بنائی اور فوج کے ایک مست ہاتھی کو داؤد پر چھلینے اور مار ڈالنے کے لئے چھوڑ دیا ، لیکن ہاتھی داؤد کو دیکھ کر سلام کیا اور پیشانی زمین پر ٹیک دی اور اُس گٹھڑی کو سونڈ سے اٹھاکر سر پر رکھ لیا ۔ بہرحال یہ دیکھ کر ترک بادشاہ روم خوف زدہ ہوا ، اُس گٹھڑی کو ایک کنویں میں ڈال دیا ، اور اُس کو پتھر کی سلوں سے پاٹ کر مُہر لگا دی ، اور کہا کہ اب دُنیا میں تیرا حمایتی کوئی ایسا نہیں جو تجھے بچائے ، اب اِسی کنویں میں سڑ گل کر مر جائے گا ۔

(۱۱)

دروازہ بنے کمان کا بڑی عقل بتائی چاروں طرف فوج کھڑی ہوگئی نہیں دیر لگائی
ایک ایک کو پکڑ کے پھر باہر نکائی اُس لڑکے شاہ داؤد کی تصویر ملائی
اُس لڑکے کو پکڑ لیا ظالم ترکائی اُس لڑکے کو پکڑ کے گٹھڑی بندھوائی
خونی ہاتھی دیا چھوڑ نہیں دیر لگائی ہاتھی مجرے کر رہا ہے سیس جھکائی اٹھایا پیشانی

گھڑی لیکر سونڈ میں سیرا اوپر لٹکائی | دیکھے روم کا بادشاہ لرزے تھرکائی
گھڑی اٹھائی ہاتھ میں کنواں گروائی | اور بیل جھٹک دی تہ لگائی | ڈھانک دی | مُہر
مہر لگائی اپنے ہاتھ کی ناہیں دیر لگائی | ایسا تیرا کون ہے دنیا کے ماہی | درمیان
لو سڑکے مرے گا کنوئیں کے ماہی

مالن کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے سارا قصہ شہزادی مصر کو سُنایا جس سے وہ بے حد پریشان ہو کر ایک چٹھی حضرت علیؓ کے نام لکھی کہ افسوس کی بات ہے کہ آپ تو بڑے بہادر اور جگہ دار اور مشہور ہیں لیکن آپ کو کچھ خیال نہ آیا کہ آپ نے گویا اپنے ہاتھوں داؤد کو کنوئیں میں گرا دیا۔ میں حشر کے دن آپ کی دامن گیر ہوں گی۔ اور اگر وہ (داؤد) مرجائے تو دُنیا میں آپ کی ہنسی اڑاؤں گی۔

(۱۲)

بیگم چٹھی لکھ دی کرکے چترائی | بڑے بہادر علیؓ تھے کچھ سمجھی ناہیں | وولعن
اپنے ہاتوں کنواں میں دیا گروائی | لے پکڑوں جناب میں چھوڑوں گی ناہیں
جو مرگیا بادشاہ تیری کروں ہنسائی | وولعہ

جب حضرت علیؓ کے پاس شہزادی کی چٹھی پہنچی تو آپ نے تکبیر کا نعرہ لگایا اور نیزہ گاڑ دیا۔ مالن سے اُس باؤلی کا پتہ دریافت کیا جس میں داؤد کو ڈالا گیا تھا۔ مالن نے اُس باؤلی کا پتہ دیا۔ تب حضرتؓ نے باؤلی کے پاٹے ہوئے پتھروں پر مصلا بچھا کر نماز دوگانہ پڑھی اور آواز دی کہ اے لڑکے اگر تو کنوئیں میں زندہ ہے تو جواب دے، ورنہ اگر قضاء الٰہی سے مرگیا ہے تو پھر کچھ نہیں۔ حضرتؓ کی آواز سُن کر لڑکے نے اندر سے جواب دیا کہ حضرتؓ یہ کنواں نہیں ہے بلکہ باغ ہے یہاں پریاں مجھے جھولا جھلا رہی ہیں اور اقسام اقسام کا میوہ کھلا رہی ہیں۔ یہ ایسا باغ ہے کہ آج تک میں نے اپنی عمر میں دیکھا نہیں۔ اُس وقت حضرتؓ نے باؤلی کی سِل پر اپنا نیزہ مارا جس کے اثر سے شاہ روم کی فوج کے نو سو گھوڑے اور نو سو سپاہی کٹ کر مر گئے۔ بادشاہ روم بے حد پریشان ہو گیا۔ نجومیوں نے شاہ کو سمجھایا۔

(۱۳)

الف نام اللہ تو ہی جو رچی الٰہی | نیزہ گاڑ کر علیؓ نے دیا باغ ہلائی
مالن کونسا غار کنواں ہے مجھو دے بتلائی | مالن حضرتؓ کو لے چلی نہیں دیر لگائی
سِل کے اوپر آن کے دیا مصلا بچھائی | نفل دوگانہ پڑھ کے لیا شکر منائی
آواز دی حضرت علیؓ نے لڑکا بولا ناہیں | جو بچہ زندہ ہو کنوئیں میں تو آواز سنائی
جو مرگیا ہو قضا سے ہوا حکم خدائی | اتنا سُن کے لڑکے داؤد نے سلام سُنائی
حضرتؓ کنواں نہیں یہ باغ ہے یہاں پریاں آئی | مجھے پریاں جھولا دی رہی سب میوہ لائی
کبھی نہ گذری جگت میں اتنی عمر جو پائی | حضرتؓ نے نیزہ مارا سِل پڑی آسمان تھرائی
پڑی روم کی فوج میں مچ گئی دُہائی | نو سو گھوڑے کٹ گئے نو سو سپاہی

بولے روم کا بادشاہ کیا آفت آئی　　　　کھڑے برہمن سامنے سلام سنائی

پھر جب حضرت علیؓ نے داؤد کو باؤلی سے باہر نکالا تو ایک چٹھی کے ذریعہ شہزادی کو اطلاع دی کہ میں نے تیرے دُلھا کو باؤلی سے باہر نکال لیا ہے وہ اب باغ میں بیٹھا ہوا ہے اُس کی نسبت کوئی فکر نہ کر۔ اب جلد یہاں باغ میں آجا شاہ روم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۴)

حضرتؓ چٹھی لکھے کرکے چترائی　　　　باپو[۱] بیٹی شداد کی ہوا حکم خدائی　　　　[۱] پڑھو
کنویں سے باہر لیا کاڑیوں رب الٰہی　　　　تیرا دُلھا بیٹھا باغ میں میں نے دیا سنائی
تم جلدی آجاؤ باغ میں کیوں دیر لگائی　　　　اس روم کو بادشاہ سے کچھ ڈرنا ناہی

جب حضرت کی چٹھی شہزادی کو ملی تو اُس نے اپنی باندی اور سہیلیوں کو جو اُس کے ساتھ رہا کرتی تھیں آنکھ مچولی کھیلنے کے لیے کہا اور چھپ کر ایک مقام کو چھونے کے لیے شرط لگائی۔ کھیل شروع ہوا، سب چھپ گئیں تو شہزادی دروازہ لگاکر آہستہ سے ڈولی میں سوار ہو باغ میں پہنچ گئی اور حضرت علیؓ کے قدمبوس ہوکر اسلام سے مشرف ہوئی اور کہا کہ ہم لوگوں کو جلد بغداد شریف جانا چاہیے ورنہ ترکی ظالم بادشاہ روم ہم کو باغ ہی میں روک دے گا۔

(۱۵)

بیگم ڈولا بیٹھ کے باغچے آئی　　　　بیگم پوٹ[۲] جو ئیے رہی تم کھا ڈڈائی[۳]　　　　[۲] مخرج　[۳] آنکھ مچولی
بیگم دو ڈی پہنچ دی　　　　باندھی نظر نہ آئی　　　　[۴] دروازہ
اور ھر اُدھر پھر گئی　　　　جلدی معر[۴] ہی آئی
بیگم ہاتھ اُٹھاکر دیکھ لی کوئی نظر نہ آئی　　　　بیگم دوڈی چھوڑ کے باغچے آئی
حضرت علیؓ کے قدم میں سر لیا جھکائی　　　　تم پیالہ لو دین کا دو شرح پڑھائی
جلدی چلو بغداد شریف کو ہیں دیا سنائی　　　　یہ ہی روم کا بادشاہ ظالم ترکائی
تم کو جلدی ہیر[۵] کی باغ میں جاؤ دے تا ہی　　　　اتنا سن چکے حضرت۔ بیگم سمجھائی　　　　[۵] روکنا

شہزادی کے مشورے پر حضرت علیؓ وہاں سے بغداد شریف چلنے تیار ہوئے چنانچہ حضرتؓ اپنے دُلدُل پر سوار ہوئے اور گھوڑے پر داؤد نے شہزادی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ جب ایڑ لگائی تو دُلدُل ایک جست میں بائیس ہاتھ اور گھوڑا تیرہ ہاتھ کودا۔ جب شاہ روم نے دیکھا کہ شہزادی کو لیکر داؤد جارہا ہے تو اُس نے کہا کہ ہم جس کو بیاہنے آئے تھے وہ بیاہ نہ ہوسکا۔ اب خواہ میری فوج ساری کٹ جائے لیکن تجھ کو جانے نہ دوں گا بلکہ مار دوں گا۔

(۱۶)

حضرت کا دُلدُل بائیس ہاتھ کودگیا گھوڑا کودا تیرہ　　　　دیکھے روم کا بادشاہ اُٹھ گیا ڈیرہ

بگڑ لئے جار ہاہے سا تھ میں دشمن مرا میرے آگیا نظر میں جس نے کنوئیں میں گیر گرایا
تو چلایا بیگم لیکے بیاہ کمو دیا ہمرا مجھ کو ماروں جیہ کے جیا ہے لٹ جاؤں ڈیر گھیر کے

جب شاہ روم نے داؤد کو شہزادی سے کر جاتے ہوئے دیکھا تو شاہ نے داؤد پر گولہ باری کا حکم دیا حضرت علیؓ نے داؤد کے گھوڑے کے اطراف اسم اعظم پڑھ کر لکیر کھینچ دی تاکہ گولہ باری کا کوئی اثر نہ ہو لیکن داؤد نے غصہ میں اس لکیر کے حصار سے باہر ہو گیا جس کی وجہ تو گولہ لگ گیا اور وہ مر گیا۔ شہزادی اس واقعہ سے متاثر ہو کر وہ بھی حصار سے باہر داؤد کے پاس آئی جس کی وجہ اس کے گولہ لگ گیا اور وہ بھی مرگئی۔ دلہا دلھن کی بے وقت موت سے حضرتؓ کو افسوس ہوا کہ بغیر نکاح کے ہی دونوں مر گئے۔ اس وقت خدا سے دعا کی کہ یا اللہ نکاح تک کم از کم چار گھڑی کے لئے انھیں زندگی بخش۔ خدا نے سن لی اور زندگی عطا کی۔

(۱۷)

کماں تو دی علیؓ کی کچھ سمجھا ناہی گولہ لگ گیا داؤد کے گئے پران چکائی لکیر مرگیا
بیگم اچھلی کارسے لڑکے پر آئی دوسرا گولہ لگ گیا بیگم کے تائی
دونوں کا ہو گیا خاتمہ یوں کچھ الہی آکے حضرت علیؓ نے چھاتی لگائی
اے اللہ بے شرح دو مرگیا تیری خدائی چار گھڑی کی زندگی اللہ سے پائی

حضرت علیؓ نے بغرض نکاح کھجور اور پھول وغیرہ لانے کے لئے اسی باغ میں تشریف لے گئے۔ اس اثنا میں دوسری راہ سے ان لوگوں کے لئے کھانا لے کر مالن یہاں پہنچی۔ حضرتؓ نے جب باغ میں مالن کو موجود نہ پایا تو اس کے انتظار میں باغ میں ٹھیرے رہے (چونکہ بلا اجازت باغ سے کھجور و پھول توڑنا مناسب خیال نہ فرمایا) ایک فقیر اس وقت وہاں پہنچ کر سوال کیا کہ مجھ پر تین فاقے گزر چکے ہیں، مجھے کھانا کھلایا جائے (یہ فقیر دراصل فرشتہ تھا جس کو خدا نے زندگی بخشنے بھیجا تھا) تو باوصف خود ان لوگوں پر کئی فاقے گزرنے کے اپنا کھانا کھلا دیئے، تو فقیر نے شکر ادا کر کے ان دونوں کو سو سو برس کی عمر عطا کی، اور کہا کہ تجھے موت نہیں آئے گی اور وہاں سے غائب ہو گیا۔

(۱۸)

لے دیگچی ہاتھ میں جب پہلے پائی صاحب کھانا کھا کے کیا شکر منائی
عمر جو سو سو برس کی انھیں دیا فرمائی بیٹے شاہ جنید کے کبھی مرنے ناہی
اتنا سائیں کہہ کے پھر نہ دے دکھائی

مالن کی واپسی کے بعد حضرت علیؓ نے کھجور و پھول لے کر واپس تشریف لائے، اثنا راہ میں حضرت علیؓ کو ملال ہی تھا کہ میں نے خدا سے صرف چار گھڑی کی ہی زندگی مانگی تھی لیکن اتفاق سے دیر ہو گئی، افسوس کہ پھر وہ بغیر نکاح کے ہی مر گئے ہوں گے۔ لیکن یہاں آکر دیکھا تو انھیں زندہ پایا۔ حضرتؓ نے متحیر ہو کر داؤد سے دریافت فرمایا کہ تو نے یہ کیا عمل کر دیا اور کیسے زندہ رہ گیا، تو داؤد نے حضرتؓ سے سارا قصہ کہہ سنایا کہ ایک فقیر آیا تھا، اس کو میں نے اپنا کھانا جو مالن لائی تھی

کھلایا تو اُس نے ہمیں سَو سَو برس کی عُمر دے گیا۔

(۱۹)

بیٹے شاہ جُنید کے کیا عمل[۱] کمایا　　اُجڑا گھر جُنید کا آج کس نے بسایا　　۱ عمل کیا
اِتنا لڑکا سُن چکا جواب سُنایا　　حکم ہوا جناب سے ایک سائیں آیا
سالن کھانا لائی ہم نے نہیں کھایا　　عمر دے گیا سَو سَو برس کی وید[۲] نہیں آیا　　۲ مرنے کا وقت

داؤد پھر حضرتؓ کی کلیہ کے حصار سے باہر نکل کر شاہ مصر کی فوج پر تلوار کھینچ کر ٹوٹ پڑا اور بڑے زبردست کابلی روہیلوں ایک سو اٹھارہ اور شاہ روم کے بیٹے کو جو شہزادی سے شادی کرنے آیا تھا مار ڈالا۔

(۲۰)

لڑکا نکلا تتار[۱] سے دل کیا دلیرا　　روم کی فوج میں جا پڑا کھینچا شمشیرا[۲]　　۱ لکیر ۲ تلوار
بیٹا مارا روم کا بندھا سہرہ والا　　گلچہ[۳] مارا کھیت میں ایک سو اٹھارہ　　۳ کابلی
حضرت علیؓ بھی بولے اب کرو ٹالا

حضرت علیؓ اِن دونوں کو لے کر میدانِ جنگ سے مصر تشریف لے گئے اور شداد شاہ مصر سے کہا کہ اب جلد نکاح پڑھا دو، تاکہ ہم لوگ بغداد شریف جلد واپس جا سکیں۔ چونکہ ہم لوگوں نے بے حد تکلیف اٹھائی ہے۔

(۲۱)

حضرتؓ چلے دَلتوں[۱] سے نہیں دیر لگائی　　جلدی آ گئے مصر میں ہو گئی روشنائی　　۱ فوجیں
شداد بادشاہ کو بولے اب سمجھو بھائی　　جلدی نکاح کرو ہم کو دیا سُنائی
ہم جلدی جائیں گے بغداد شریف میں ٹی آفت آئی

چنانچہ قاضی مُلا بلوائے گئے اور وکیل، گواہ رکھ کر نکاح کی تکمیل ہوئی اور بے حد خوشی منائی گئی اور بعد نکاح وہاں سے حضرت علیؓ دُلہا دُلھن کو لے کر نکل گئے۔

(۲۲)

قاضی مُلا آ گئے بڑی دُھوم مچائی　　شاہد وکیل کھڑے کرے نہیں دیر لگائی
حکم دیا شداد نے نکاح فرمائی　　لڑکے کی شادی میں بڑی خوشی منائی
وہاں سے حضرتؓ لیکے نکل گئے کچھ دیر نہ لگائی　　گھوڑوں پر سوار جو ہو گئے لیا ٹھکر منائی

حضرتؓ نے داؤد اور شہزادی کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور گھوڑے پر تھاپ ماری تو صرف تین گھنٹے میں بغداد شریف پہنچ گئے۔ داؤد کا چچا آمن بادشاہ دیکھا کہ داؤد شہزادی لے کر آ گیا تو اُس کو تعجب ہوا کہ آخر یہ لایا کیسے، کیوں مارا نہ گیا؟ داؤد کی ماں چکّی پیستے اور روتے روتے اندھی ہو گئی، شہزادی بہو بن کر گھر میں آئی تو خدا کی قدرت سے اس کو بینائی عطا ہوئی اور

سب خوش ہوئے ۔ حضرت علیؓ نے اب واپس مدینہ شریف جانے کی اجازت چاہی تو داؤد حضرتؓ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ میرا چچا امن نے میرا تخت و تاج ، محل و فوج اور دھن دولت ظلم سے لے لی ہے وہ واپس دلوائی جائے تو مناسب ہے ۔

(۲۳)

الف نام اللہ تو ہی جو رچی الہی　　لڑکے کی آنکھ دے سچ دتی لگوائی
گھوڑے پہ تھاپ دیدی نہیں دیر لگائی　　سفر کیا تھا بہت شتیر فدائی
تین گھنٹے میں آگئے اپنی بستی کے ماہی　　دیکھے امن بادشاہ دل سوچ پائی　　اندر[۱]
لڑکا شادی کرکے آگیا کس نے مار نا ہی　　اس کی ماں چکی پیس کے اندھی ہوجائی
جب بیگم آئی محل میں بڑی خوشی منائی　　حکم ہوا جناب کے دونوں آنکھیاں کھل جائی
حضرت علی تبھی بولتے لڑکے کے تائیں　　لڑکے تم دید و حضرتؓ نے مدینہ جائی
ہاتھ جوڑ لڑکا کہے حضرتؓ کے تائیں　　حضرتؓ میرا چچا امن بادشاہ ظالم تر کہائی
میرا محل لوٹ لیا سب مایا کمائی　　بارہ ہزار میری فوج ہے یہ دیتا نا ہی　　دھن دولت[۲]

حضرت علیؓ ، امن بادشاہ کے محل میں تشریف لے گئے اور اس کو کہا کہ داؤد کا تخت و تاج اور محل و دولت سب واپس کر دے ، ورنہ مجبوراً جنگ کرنی ہوگی ۔ امن بادشاہ نے حضرتؓ کو جب دیکھا اور حکم سنا تو بخوشی داؤد کو سینہ سے لگا کر تخت و تاج حوالہ کر دیا ۔ حضرت علیؓ وہاں سے واپس مدینہ شریف تشریف لے گئے ۔ اس طرح شاہ داؤد کا قصہ تمام ہوا ۔

(۲۴)

حضرتؓ لڑکے کو لئے چلے دیوڑھی کے ماہی[۳]　　حضرتؓ دیکھے امن کو دل سوچ پائی　　آندر یا میں[۳]
حشمت ساری دیدئے بس دیا سنائی　　جو تو زور جائے گا یہاں ہوئے لڑائی
امن نے لڑکا لیا گود میں لیا چھاتی لگائی　　داؤد تجھ کو کرد دل بادشاہ میں بنوں سپاہی
حضرتؓ ساری چھی کر گئے جب کری چڑھائی　　چلے مدینہ شریف کو نہیں دیر لگائی
قصہ داؤد کا دیا حضرتؓ نے بنائی

محمد جمال الدین حیدر

غزل

محبت میں خزاں بھی اک بہارِ جاودانی ہے
شباب شعلہ ساماں ہی امینِ کامرانی ہے

کسی کے غم کی میرے دل پہ کتنی مہربانی ہے
کہ میں ہوں شب کا سناٹا ہے اشکوں کی روانی ہے

جو آنسو دردِ فرقت میں نگاہوں سے ڈھلکتا ہے
وہی غم کا فسانہ ہے، وہی دل کی کہانی ہے

محبت میں جو زندہ ہے وہ ناکامِ محبت ہے
رہِ اُلفت میں مٹنا ہی حیاتِ جاودانی ہے

ترے رنگین جلووں کی یہ حشر آرائیاں ! توبہ
نقابِ رُخ کے ہر اک تار میں رقصاں جوانی ہے

بہاریں رقص کرتی ہیں قفس کے گوشے گوشے میں
مجھے رنجِ اسیری ہی نشاطِ جاودانی ہے

نہ دن کو چین آتا ہے، نہ شب کو نیند آتی ہے
کسی کے حُسنِ رنگیں کی یہی تو اک نشانی ہے

نہ جانے کس کی نظروں کا فسوں ہے آج کل انورؔ
خموشی میں تکلم ہے، زباں میں بے زبانی ہے

منظور احمد انورؔ قریشی

تنقید و تبصرہ

۱۹۴۵ء کی منتخب نظمیں

مرتبہ ادارۂ ادب لطیف لاہور۔

ادارۂ ادب لطیف کی جانب سے ہر سال اس قسم کے دلچسپ مجموعے شائع کئے جا رہے ہیں۔ زیرنظر مجموعہ انتخاب اور ترتیب دونوں کے لحاظ سے گذشتہ مجموعوں سے بہتر ہے۔ اس قسم کے مجموعوں کی اشاعت سے ہمارے ادب کی رفتار کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ یوں تو اکثر و بیشتر منتخبات ناقص ہوتے ہیں اور ان میں صوبہ جاتی تعصب اور جانب داری کی جھلکیں نظر آتی ہیں، اور بعض میں تو ذوق کی کمی بھی دکھائی دیتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس قسم کے منتخبات تاریخ ادب کی ترتیب و تدوین میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ زیرنظر انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر مہینے اردو کے رسائل میں جو بہترین نظمیں چھپی ہیں ان کو اس مہینے کے عنوان ہی کے تحت درج کیا گیا ہے، اور مرتبین کا دعویٰ ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نظموں کا انتخاب شعرا کا نام دیکھ کر نہیں کیا گیا بلکہ نظمیں پڑھنے کے بعد شاعر کا انتخاب کیا ہے، اور جس کسی نے کوئی کام کی بات کہی ہے اسے نظرانداز نہیں کیا۔ سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی گیتوں کا انتخاب مجموعے کے ساتھ ہی شامل کیا گیا ہے۔

مجلہ گلبرگہ

مدیر مولوی محمد نصیرالدین صاحب ایم اے۔ بی ٹی۔

گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے ایک رسالہ شائع ہو رہا ہے جس کی تیسری جلد کا تیسرا شمارہ اس وقت پیش نظر ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے پرنسپل اور مدیر مولوی نصیرالدین صاحب ایم اے اپنے طلبا میں اردو ادب کا بہت اچھا ذوق پیدا کر رہے ہیں، اور توقع ہے کہ یہ رسالہ اپنی دلچسپیوں اور افادیت میں اسی طرح اضافہ کرتا رہے گا۔ اس شمارے میں بھی دور کے اردو ادب پر جو مضمون لکھا گیا ہے وہ خاص طور پر قابل ستائش ہے۔

انور نامہ

مصنفہ میر محمد اسمٰعیل خاں ابجدی۔ مرتبہ مولوی محمد حسین محوی جونیر لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔

یہ کتاب مدراس یونیورسٹی کے سلسلۂ اسلامیات کی ایک کڑی ہے، اور در اصل کلیات ابجدی کا پہلا حصہ ہے۔ ابجدی، نواب محمد علی خاں والاجاہ اول والی ارکاٹ کے دربار میں ملک الشعرا تھے۔ وہ علاقہ مدراس کے قصبہ وجنگل پیٹھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے آبا و اجداد بیجاپور کے رہنے والے اور مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ کے اعزہ میں شامل تھے۔ ابجدی نے اردو اور فارسی میں تقریباً دس کتابیں لکھی تھیں جن میں "انور نامہ" اس لئے بھی اہم ہے کہ یہ نواب والاجاہ کے معرکوں پر لکھی گئی ہے۔ اس طرح سے اس کتاب کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے اور مولف نے فارسی کی مشہور رزمیہ نظموں کے انداز میں اس کو مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں مترجم نے چند صفحات کا دیباچہ اردو میں قلمبند کیا ہے جس میں ابجدی کے حالات اور تصنیفات پر اجمالی طور پر نظر ڈالی ہے۔ ضرورت تھی کہ کتاب کو مرتب کرتے وقت تاریخی واقعات کے متعلق ضروری حواشی اور تشریحیں بھی دی جاتیں۔ بحالت موجودہ یہ کام اس لئے قابل قدر ہے کہ اس سے دکن کے ایک دور افراتفری کی نسبت ضروری تاریخی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

تحلیل نفسی اور تعبیر خواب

مصنفہ سگمنڈ فرائڈ۔ ترجمہ عبدالحی جمیل ایم۔ اے۔ ادارۂ دانش و حکمت۔ حیدرآباد۔

اردو کے جدید ادبی رجحانات میں سگمنڈ فرائڈ کی تحریروں اور تخیل کا خاص اثر پڑ رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کی اصل کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کر دیا جاتا، اور خوشی کی بات ہے کہ عبدالحی صاحب نے اس کی تکمیل کر دی ہے۔ لیکن اس

کتاب کے ساتھ خود مصنف اور اس کی دوسری تصنیفات سے متعلق ضروری معلومات کا اندراج بھی کیا جانا ضروری تھا۔ اگر اس کے دوسرے ایڈیشن میں یہ اضافہ کردیا جائے تو اُردو داں، اور خاص کر وہ لوگ جو فرائڈ کی اہمیت اور اس کی تحریروں کی خصوصیات سے ناواقف ہیں اس کتاب سے پوری طرح مستفید ہوسکیں گے۔ یہ کتاب چار ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے مقدمہ ہے جس میں نفسیات پر بحیثیت سائنس بحث کی گئی ہے، پھر پہلا باب شروع ہوتا ہے جو تحلیل نفسی اور تعبیر خواب سے بحث کرتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے ابواب میں تعبیر خواب کی وضاحت کی گئی ہے، اور چوتھا باب تلازم اختیاری کے لئے وقف ہے۔ کتاب اگرچہ ایک نفسیاتی موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن دوسرے تعلیم یافتہ افراد بھی اس کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔

شیطان از قیس رامپوری۔ ناشر ہندستانی پبلشرز دہلی

اس ناول میں قیس صاحب نے یو۔ پی کے امیروں اور نوابوں کی کمزوریاں بے نقاب کی ہیں۔ خاندانی امیروں کے خبط، اور ان کی خود غرضیوں اور بدنفسیوں کو بڑے عمدہ پیرایے میں نمایاں کیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایسے گھرانوں کی مسلمان خواتین کے اعلیٰ کردار کو واضح کیا جائے۔ ناول کی ہیروئین ایک اعلیٰ گھرانے کی ایک ایسی پاکباز خاتون ہے جو اپنے خاندان کے ظالم اور خود غرض امیروں کے مقابلہ میں اپنی شرافت اور ایثار نفسی کا اعلیٰ ثبوت دیتی ہے۔

اس ناول کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے اور کردار نگاری فنی نقطۂ نظر سے قابل تعریف ہے۔ اُردو کے جدید ناولوں میں اُمید ہے کہ اس کو کافی مقبولیت حاصل ہوگی۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر محمد ابو اللیث صدیقی۔ ناشر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔

یہ ضخیم کتاب جو ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے بطور مقالہ قلمبند کی گئی تھی، اور اب مسلم یونیورسٹی کی طرف سے وہاں کے سلسلۂ مطبوعات میں شایع کی گئی ہے۔ یہ کتاب (۱۰) ابواب میں تقسیم کی گئی ہے، جن میں پہلا باب تمہیدی ہے اور اس میں لکھنؤ کے حکمرانوں کے مختصر سے حالات درج کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں لکھنؤ کے تمدن پر نہایت ہی اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور ایران کا جو اثر لکھنوی معاشرت اور ادب و شاعری پر پڑا ہے اس کی طرف سرسری طور پر اشارے کئے گئے ہیں۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر عبدالحلیم شرر نے ایک مبسوط کتاب قلمبند کی تھی جو "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے چھپ چکی ہے اور بعض جامعات میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر ابو اللیث نے اس باب کی تیاری میں اس سے استفادہ نہیں کیا۔ ورنہ یہ باب اتنا مختصر رہنے پاتا۔

زیر نظر کتاب کا تیسرا باب اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ لکھنویت کیا ہے اور دراصل اس امر کی چھان بین میں مرتب نے صحیح ذوق سے کام لے کر لکھنویت کے تعین کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ چوتھے باب میں اودھ کے حکمرانوں کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ پانچواں باب دہلی کے ان شعراء کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو وہاں سے ہجرت کرکے لکھنؤ چلے آئے اور دراصل ان ہی کی آمد اور قیام لکھنؤ کے باعث لکھنؤ کا ایک جداگانہ دبستان شعروسخن وجود میں آیا۔ ایسے شعراء میں تقریباً چودہ اساتذۂ سخن کے حالات اور ان کی خصوصیات کلام پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان ہی میں اُردو کے مشاہیر سخن مثلاً میر، سودا، میر حسن، سوز، جرات اور انشاء و مصحفی جیسے شاعر شامل ہیں۔ یہ باب بہت طویل ہے اور سو سے زیادہ صفحات اس کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد دو باب ناسخ اور آتش اور ان کے سلسلے کے شاعروں سے بحث کرتے ہیں۔ آٹھواں باب سلسلۂ مصحفی سے متعلق ہے۔ نویں باب میں لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر نظر ڈالی ہے، اور چونکہ اس موضوع پر شبلی نعمانی کا موازنہ انیس و دبیر ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے مصنف نے کوشش کی ہے کہ

اپنی کاوش کے ذریعہ سے اس میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ اس کتاب کا آخری باب آخری دور کے لکھنوی شعراء کے لئے وقف ہے۔ ان میں بعض ایسے شعراء بھی شامل ہیں جو ابھی زندہ ہیں اور ان کے متعلق اظہار رائے میں مصنف نے کافی بے باکی اور حسنِ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں دو ضمیمے بھی شریک ہیں۔ ایک لکھنؤ کے بعض غیر معروف شعراء سے بحث کرتا ہے اور دوسرے کے ذریعہ سے لکھنوی شعراء کے سلسلوں کو شجروں کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں فہرست ماخذات بھی شریک ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے آخر میں کوئی اشاریہ درج نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ تحقیقی کتابوں میں اس کا ہونا ضروری ہے اور اشاریے کے شمول کے بغیر کتاب کی افادیت نصف کے قریب گھٹ جاتی ہے۔

جلیل نمبر مجلۂ عثمانیہ

از حسن الدین احمد ایم۔ اے۔

امام الفن نواب فصاحت جنگ جلیل مرحوم لکھنؤ کے دبستان سخن کے آخری بڑے شاعروں میں سے تھے، اور اعلیحضرت آصف جاہ سابع سلطان الشعراء کے استاد ہونے کی حیثیت سے ان کا رتبہ عہد حاضر کے اساتذۂ سخن میں بہت بلند تھا۔ ان کی وفات کے بعد سے اب تک اردو زبان کے مختلف رسائل وجرائد نے ان کے متعلق اپنے اپنے خاص نمبر شایع کئے ہیں لیکن طلباء جامعہ عثمانیہ کے ترجمان مجلۂ عثمانیہ کا زیر نظر شمارہ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ان تمام خاص نمبروں پر فوقیت رکھتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بجائے خود حضرت جلیل پر ایک مستند کتاب ہے جو آنے والی نسلوں کو حضرت جلیل سے متعلق اُن کے معاصرین کے افکار و آراء کا ایک بہترین ذخیرہ ثابت ہوگی۔ اس مجموعہ میں چالیس سے زیادہ مضامینِ نظم و نثر شریک ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ایسے اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں جو جلیل سے ذاتی طور پر واقف تھے اور جن کی قلمبند کردہ معلومات اور خیالات آئندہ حیاتِ جلیل کے مرتب کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔ یہ مجموعہ با تصویر شایع ہوا ہے، اور اس کے مرتب کرنے میں مولوی حسن الدین احمد صاحب نے بڑی تلاش وجستجو اور سلیقے سے کام لیا ہے۔ پنجاب کے مشہور مصور خان بہادر عبد الرحمن چغتائی نے جلیل کے ایک شعر کا رنگین مرقع تیار کر کے اس کی زیب و زینت میں اضافہ کیا ہے، اور خود امام الفن کی بڑی اچھی تصویریں بھی جمع کر دی ہیں۔ ایک تصویر ایسی ہے جس میں اعلیحضرت سلطان الشعراء اور استاد السلطان حضرت جلیل دونوں موجود ہیں۔ ایک تصویر ایسی بھی ہے جس میں حضرت جلیل کے ساتھ حیدر آباد کے عہد حاضر کے دوسرے مشاہیر شعراء مثلاً نواب مفتی ضیاء یار جنگ بہادر ضیاء، نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، نواب تراب یار جنگ بہادر سعید، نواب قدرت نواز جنگ بہادر، نواب شہید یار جنگ بہادر شہید اور دیگر اصحاب اور جلیل صاحب کے خاندان کے افراد بھی شریک ہیں۔ اس مجموعہ کے مضامین میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ نواب ہوش یار جنگ بہادر کا مضمون "جو جانشین امیر مینائی" کے عنوان سے شریک ہے بہت دلچسپ ہے۔ حکیم الشعراء حضرت امجد حسین امجد کا قطعۂ تاریخ بھی قابل ذکر ہے، اور رسالے کے آغاز میں خود اعلیحضرت سلطان العلوم کا ارشاد فرمایا ہوا وہ مادۂ تاریخ رحلت بھی درج کیا گیا ہے جو حضرت جلیل کے لوح مزار پر کندہ کیا گیا ہے۔ دیگر مضامین میں "حضرت جلیل کا رنگ تصوف وحکمت" از مفتی تمیم الدین صاحب اور "نظریۂ حسن وعشق" از تمکین کاظمی صاحب اور "حضرت جلیل کی اصلاحیں" از یونس احمد صاحب اچھے پایہ کے مضامین ہیں۔

لائق مرتب نے مختلف اصحاب سے جلیل کے کلام پر مختلف پہلوؤں مثلاً غزل گوئی۔ نعت گوئی۔ تاریخ گوئی۔ خمریات اور جدید شعری رجحانات وغیرہ پر بھی کافی مفید اور پُر از معلومات مضامین قلمبند کرا کے اس مجموعہ میں درج کئے ہیں۔ اس کی اشاعت سے اردو شعر و سخن کی کتابوں میں ایک قابل ذکر اضافہ ہوا جس کے لئے مرتب قابل مبارک باد ہیں۔

مرقع علم الصحرا

از عبد الحمید خاں مددگار ناظم جنگلات ملک سرکار عالی مطبوعہ دار الطبع حیدر آباد۔

یہ کتاب حیدر آباد کے محکمۂ جنگلات کے علم دوست ناظم

مولوی سید عبدالواحد صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے اور اس کے آغاز میں انھوں نے ایک پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مرتب ایک واقف کار اور صاحب ذوق عہدہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کو پانچ بابوں میں تقسیم کیا ہے اور ان سے پہلے ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں اس امر کو خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ جنگل قومی دولت ہوتے ہیں اور ان کا وجود زندگی کے لئے لازمی ہے۔ پہلا باب تربیت صحرا کے لئے وقف کیا گیا ہے، اور یہ کافی طویل ہے۔ اس میں درختوں کے اگانے کے طریقے اور اصول بہت عمدہ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں صحرا کے مصرف سے بحث کی گئی ہے، اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ صحرا کی پیداوار کتنی قسم کی ہوتی ہے اور اس کا استعمال کن کن طریقوں سے ہونا چاہئے۔ تیسرا باب فن تعمیر کے عنوان سے لکھا گیا ہے، اور اگرچہ عنوان مناسب نہیں ہے تاہم اس کے تحت یہ دکھایا گیا ہے کہ جنگلوں میں سڑکیں کہاں کہاں اور کس قسم کی بنائی جائیں، اور ان کے ذریعہ سے صحرا سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں عمارتوں کی تعمیر، ان کی داغ دوزی اور ان سے متعلقہ مختلف اجزاء کا اندازہ اور وزن وغیرہ سمجھایا گیا ہے۔ چوتھا باب دراصل دفتری ضروریات سے متعلق ہے اور اس میں صحرا کے قوانین، ضابطے اور دستور العمل وغیرہ پیش کر دئے گئے ہیں۔ ان سے نہ صرف اس محکمہ کے ملازمین استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کو صحرا سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہوتا ہے۔ پانچواں اور آخری باب صحرا سے متعلق متفرق معلومات پیش کرتا ہے۔ اس میں اوزان اور پیمانوں کے ضابطے، لکڑیوں وغیرہ کے نرخ نامے، حفظان صحت اور دیگر تحت جات شریک کئے گئے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جو دراصل ایک فرہنگ اصطلاحات ہے جس میں انگریزی فنی اصطلاحوں کے اردو مترادفات دکھائے گئے ہیں۔ یہ فرہنگ بہت ہی مفید اور ضروری تھی۔ اس کے مطالعہ سے عوام بھی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے معمولی درختوں مثلاً جامن، آم، املی، بھلاواں، بیل پھل، پلاس، پانگرہ، دھتورہ، ریٹھا اور سیتاپھل وغیرہ کے فنی اصطلاحی نام کیا ہیں۔

اس کتاب کی زبان میں دفتریت زیادہ پائی جاتی ہے اور جگہ جگہ مقامی لب ولہجے کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن ان نقائص کے باوجود یہ کتاب اردو دنیا کے لئے ایک غیر معمولی نعمت ثابت ہوگی۔

تاریخ زبان عربی از ڈاکٹر عبدالمعید خان۔ ناشر ادارۂ اشاعت علوم و فنون حیدرآباد۔

یہ ۵۴ صفحات کا ایک مضمون ہے جس میں عربی زبان کے لسانیاتی ارتقاء پر نظر ڈالی گئی ہے اور مختلف زمانوں مثلاً عہد جاہلیت۔ عہد اسلامی۔ عہد اموی۔ عہد عباسی اور اس کے بعد سے اب تک اس زبان نے جو جو ترقیاں یا تبدیلیاں حاصل کیں ان کو اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر ایک بہت بڑی کتاب لکھی جا سکتی ہے اور ضرورت ہے کہ لکھی جائے۔ اس کتاب کے آخر میں امکنہ اور اسماء کے دو مختصر اشاریے بھی شریک ہیں جو اس کی افادیت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر عبدالمعید خان صاحب یا عربی کے کوئی اور فاضل اس موضوع پر آئندہ ایک مبسوط کتاب لکھ کر موضوع کی اہمیت کا حق ادا کریں گے۔ بحالت موجودہ یہ چھوٹی سی کتاب بھی اپنے اندر کافی افادیت رکھتی ہے۔

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵۰
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس
بچوں کے لئے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
زیر ادارت
معین الدین احمد انصاری
بی ۔ ایس ۔ سی ۔ (علیگ)

جلد (۹) | بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۶ء | شمارہ (۹)

فہرست مضامین

آپ کی ہماری باتیں

سب رس کے لئے گزشتہ چند مہینے ایسے گزرے کہ وقت پر شائع نہ ہوسکا۔ ہم انتہائی کوشش کرتے رہے کہ ہمارے سب رسی بھائیوں اور بہنوں کو انتظار کی تکلیف نہ ہو۔ بہت سے بچوں نے ہماری اس دشواری کو محسوس کیا اور ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جن بچوں کو اب بھی شکایت ہے کہ رسالہ وقت پر شائع نہیں ہوتا انشاءاللہ ان کی یہ شکایت بہت جلد دور ہوجائے گی۔ اب ہمیں ایک اچھا کاتب مل گیا ہے اور پریس والوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ ننھے پڑھنے والوں کو زیادہ انتظار کی تکلیف نہ دیں گے۔ کاتب اور پریس کی شکایت کی نوبت تو شائد اب نہ ہوگی۔ لیکن ہمیں آپ سے شکایت ہے خصوصاً سب رسی بھائیوں سے ہم نے گزشتہ مہینے اعلان کیا تھا کہ جو سب سے زیادہ مضامین بھیجے گا ہم اسے انعام دیں گے۔ اس دوڑ میں لڑکیاں بہت آگے ہیں اور لڑکے صرف کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ بھئی بڑے شرم کی بات ہے ہم تو سمجھتے تھے کہ لڑکے پیش پیش رہیں گے اور لڑکیاں ان کی برابری نہ کرسکیں گی۔ مگر معاملہ بالکل الٹا نکلا۔ نومبر تک ہم مہلت دیتے ہیں اب بھی لڑکوں کے لئے موقع ہے کہ وہ کوشش کرکے یکدم سے آگے بڑھ جائیں۔ لڑکیوں کو بھی ایک اور موقع مل گیا کہ وہ لڑکوں کو بڑھنے نہ دیں۔ دسمبر میں ہم اعلان کریں گے کہ مضمون نگاری کی اس دوڑ میں کون اول آتا ہے۔ بہت سے بچوں نے ہمارے پاس نظمیں بھی بھیجی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اشعار کہنا کوئی آسان کام نہیں مگر کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ ابتدا میں شعر موزوں نہیں ہوتے لیکن مشق ہوجانے پر رفتہ رفتہ آپ اچھے اشعار کہنے لگیں گے۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنے کی کوشش کیجئے اور ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ ہم نظموں کے لئے مقابلہ کا اعلان نہیں کرتے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں بھی لڑکیاں سبقت لے جائیں اور لڑکوں کو بری طرح زک اٹھانی پڑے۔

معین الدین احمد انصاری

ننھے جاوید سے

محمد جاوید اقبال میرا بھانجا ہے لیکن جاوید سے مراد آج کے وہ تمام ننھے ہیں جو کل بڑے ہوں گے اور جن سے قوم اور ملک کا اقبال بلند ہو گا۔ پیارے جاوید۔ تمہارا نام کتنا پیارا ہے۔ تمہیں معلوم ہے تمہارے نام کے کیا معنی ہیں۔ لو سنو۔ محمدؐ ہمارے پیغمبر اور سب سے بڑے آدمی کا نام ہے۔ جاوید کے معنی ہمیشہ زندہ رہنے والے کے ہیں اور اقبال ترقی کو کہتے ہیں۔ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ تم اس دنیا میں کیسے بڑے آدمی بن سکتے، کیسے ہمیشہ زندہ رہ سکتے اور کیسے ترقی کر سکتے ہو۔ اس دنیا میں جس میں ہم تم رہتے بستے ہیں، لوگ آتے جاتے ہیں۔ تمہارے پڑدادا اور پڑنانا اس دنیا میں آئے اور گئے بھی۔ تمہارے پڑنانا نے (۶۵) سال کی عمر پائی تھی، کہ اس دنیا سے چل بسے۔ پڑدادا بھی (۷۰) سال کی عمر ہی جاتے رہے۔ اسی طرح لوگ سو ایک سال تک جئیں گے اور پھر اس دنیا سے سدھاریں گے۔ ہم بھی ایک نہ ایک دن اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ اب تم پوچھو گے کہ ماموں جان تو پھر اس مختصر سی زندگی میں وہ کونسی چیز ہے جس سے ہم ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ تو سنو دنیا میں نام پیارا نہیں کام پیارا ہے۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ تمہارا کتنا اچھا نام ہے۔ اُن کی نظر تمہارے کام پر ہوتی ہے۔ وہ دیکھیں گے کہ تم نے اس دنیا میں کیا کیا۔ جاوید یہاں تم سوال کرو گے کہ کام سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ کام سے میری مراد ایسے کام ہیں جن سے خود کو نہیں دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ یہ دنیا ایک گھر ہے۔ کیا تم اس گھر کے سنوارنے میں حصہ نہیں لوگے۔ اگر چاہو تو تم بھی اپنے کام سے اس دنیا کو سنوار سکتے ہو۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں۔ تمہیں مصیبت اٹھانی پڑے گی۔ اگر تم دنیا میں کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو

پہلے ہر آنے والی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جب تم مصیبت سہنے کے قابل ہو جاؤ گے تو دنیا میں مشکل سے مشکل کام کر سکو گے اور پھر یہ کہہ سکو گے کہ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ تم مصیبت کی اندھیری گلیوں سے گزر جاؤ گے، تو تمہیں راحت کی صاف اور سیدھی سڑک دکھائی دے گی۔ اس لئے تم مصیبت سے نہ گھبراؤ بلکہ اس کا دلیری سے مقابلہ کرو اور اسی وقت تم دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ یوں تو آدمی اپنے لئے سب کچھ چاہتا ہے اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہی بڑا آدمی کہلائے اور لوگ اس کی قدر کرنے لگیں۔ لیکن تمہیں معلوم ہے بڑا آدمی کون ہوتا ہے؟ بڑا آدمی وہ نہیں جس کے ہاتھ پیر بڑے ہوں یا جو دولت رکھتا ہو۔ بڑا آدمی تو وہ ہے جو اپنی پروا کئے بغیر دوسروں کی بھلائی چاہتا ہو۔ خود مصیبت سہہ کر اوروں کی راحت کا خیال رکھتا ہو۔ آپ آگ میں جل کر دوسروں کو آگ سے بچاتا ہو۔ جاوید اگر چاہو تو تم بھی بڑے آدمی بن سکتے ہو۔ اگر بڑے آدمی بننا چاہتے ہو تو سب سے پہلے مصیبت کا مقابلہ کرو اور پھر اپنے فائدہ سے زیادہ دوسروں کے فائدے کی فکر کرو۔ دنیا میں جتنے بڑے لوگ گزرے ہیں سبھوں نے کڑی سی کڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں اور جب تک انھوں نے دوسروں کی خاطر مصیبت نہیں اٹھائی دنیا نے ان کو بڑا نہیں مانا۔ آؤ ہم تمہیں ہمارے سب سے بڑے آدمی کی مثال سے سمجھائیں کہ بڑائی کس چیز کا نام ہے۔ آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب کے رہنے والے آپس میں ہمیشہ جھگڑتے تھے، دنیا کی تمام برائیاں ان میں تھیں۔ جب لڑکی پیدا ہوتی تھی تو ماں باپ اسے زندہ دفن کر دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک لڑکی کا پیدا ہونا برا خیال کیا جاتا تھا لوگ شراب پیتے اور بہکی بہکی باتیں کرتے شراب پی کر وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور پھر خاندانوں میں لڑائیاں چھڑ جاتیں۔ ذرا سی بات پر

تلواریں کھنچ جاتیں۔غرور کا یہ حال تھا کہ بعض لوگ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھتے۔
اسی لئے وہ غریبوں کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔جو دولت کا مالک ہوتا سب اسی کے گیت گاتے
لیکن اس برائی کے زمانہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جنھوں نے لڑائی کو اخاد سے بدل دیا۔
انھوں نے کہا کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔امیر غریب عورت مرد سب برابر ہیں اس لئے
کہ ان سب کو ایک خدا نے پیدا کیا ہے، جو سب کا پالنے والا ہے۔اس نے جب یہ کہا کہ امیر غریب
عورت، مرد سب برابر ہیں اور سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو عرب کے امیر
ان کے دشمن ہوگئے۔انھوں نے محمدؐ عربی پر پتھر پھینکے، مارا پیٹا، بیچ بازار میں ان کو ذلیل کیا۔
جب انھوں نے ایک نہ سنی تو دولت کا لالچ دیا لیکن جب دولت کو بھی ٹھکرا دیا گیا، تو وہ اور
ستانے لگے۔غرض ہر طرح کی تکلیف دی گئی۔لیکن اس بڑے آدمی نے ان مصیبتوں کا ڈٹ کر
مقابلہ کیا۔وہ برابر اعلان کرتے رہے کہ امیر و غریب سب برابر ہیں۔آج محمد صلعم زندہ نہیں ہیں۔
لیکن ان کے کام زندہ ہیں۔آج بھی دنیا کے ہر حصے میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔
اور ان کے نام لیتے والے دنیا کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

جاوید اسی طرح تم بھی بڑے آدمی بننے کی کوشش کرو۔اگر تم یہ چاہتے ہو کہ دنیا
میں کوئی کام کر جاؤ۔اس طرح تم یقیناً نام پاؤ گے۔دنیا تمہیں بھلائے نہیں بھلا سکتی۔
اگر تم خود مصیبت اٹھا کر دوسروں کی خدمت کرو گے تو تم نیک نام ہو گے۔جاوید اقبال کہلاؤ گے
اور اس دو روزہ دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہو گے۔

اگر تم نیک نامی چاہتے ہو تو سب سے مل جل کر رہو۔بڑوں کی عزت اور چھوٹوں
کی قدر کرو۔دیکھو تمہارے ماں باپ تمہارے لئے کتنی مصیبتیں اٹھا کر تمہیں پالتے ہیں۔
وہ محنت کر کے تمہیں کھلاتے ہیں۔تم ان کے احسانوں کو ضرور یاد رکھو۔اگر تم دنیا کی دولت بھی

لاکر ماں باپ کے احسانوں کا بدلہ چکانا چاہو تو تم ان کا معاوضہ ادا نہ کرسکو گے۔ دنیا کی دولت سے زیادہ قیمتی چیز ماں باپ ہیں تم ان کی قدر کرو اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ اگر تم سب سے اچھے رہو گے تو دنیا والے تمہیں یاد کریں گے اور تمہارے ماں باپ کا بھی نام لیں گے۔

جاوید۔ ماں باپ کے بعد اگر کوئی شخص زیادہ عزت کے قابل ہے تو وہ تمہارے استاد ہیں۔ یاد رکھو جس طرح تمہارے ماں باپ تمہیں کھلا پلا کر بڑا کرتے ہیں اسی طرح تمہارے استاد تمہارے ذہن کو طاقتور بناتے ہیں۔ تمہیں جسم و دماغ کے بڑا بنانے والوں کا احسان ماننا چاہیئے۔ استاد تمہیں پڑھانے آئیں گے۔ وہ تمہیں بتائیں گے کہ دنیا کیا ہے؟ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ یہ چاند سورج کیا ہیں؟ استاد ہی کی مدد سے تم چاند سورج تک پہنچنے کی کوشش کرو گے۔ تم اسی وقت یہ سب کچھ سمجھ سکو گے جب پڑھنے لکھنے لگو۔ جاوید یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ بغیر پڑھے لکھے تم دنیا میں کچھ بھی کام نہیں کرسکتے۔ جانور اور انسان میں بس یہی ایک فرق ہے، کہ جانور پڑھنا لکھنا نہیں جانتا اور انسان پڑھ لکھ سکتا ہے۔ اسی لئے ہر انسان کے لئے پڑھنا لکھنا ضروری ہے۔ ایک بڑے شاعر سعدی نے کہا ہے کہ "بے علم آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا"

اسی لئے جاوید ابھی سے تم پڑھنے میں دھیان لگاؤ۔ آگے چل کر تم اپنے ساتھیوں میں نہیں بلکہ دنیا والوں میں نام پیدا کرو گے۔ اس وقت ہم سمجھیں گے کہ محمد جاوید اقبال جیسا نام ہے ویسے ہی اس کے کام بھی ہیں۔

پیارے بچو! تم بھی اچھے کام کرو گے تو دنیا میں نیک نام ہو گے۔

محمد ثناء اللہ

(حیدرآباد ریڈیو سے پڑھا گیا)

حبِّ وطن

ہم دیکھتے ہیں کہ چڑیا کسی درخت پر گھونسلا بناتی ہے، تو اس میں شام کو آکر بسیرا لیتی ہے۔ خواہ وہ تمام دن کسی بھی مقام پر رہے۔ اسی طرح ایک شیر یا چیتا بھی دن بھر روزی کی تلاش کے بعد شام کو آرام لینے کے لئے اپنے مقام یعنی غار یا گوٹھ ی میں آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خواہ پرندہ ہو یا چرندہ یا درندہ اس کو اپنے مقام رہائش سے انس و محبت ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا جانور اس مقام پر آکر قبضہ جمائے تو لڑائی ہوتی ہے اور اس مقام رہائش کے لئے وہ جان تک دیتے ہیں۔ تو سوال ہوتا ہے کیا آدمی جس کا اشرف المخلوقات میں شمار ہوتا ہے اس کو اپنے گھر سے محلہ سے اور ملک سے محبت نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی، یہی چیز حب وطن ہے۔ ہر انسان کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے خواہ وہ فرنگی ہو یا ہندوستانی یا جاپانی۔ ہر ایک کو اپنی مادرِ وطن سے محبت کا ہونا فطری چیز ہے۔ وہ اس کی ترقی کے لئے حتی کوشش کرتا ہے اور اگر دوسرا ملک اس کے وطن پر قبضہ کرنا چاہے تو دامے، درمے سخنے ہر طرح قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا میں ہزاروں جنگیں ہوئیں اور ہر جنگ میں اس قوم نے فتح پائی جس میں یہ جذبہ حب الوطنی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کیونکہ وہ وطن کے لئے جان تک کی بازی لگا دیتی تھی۔ اس وجہ سے کامیابی ہوتی تھی اور جن میں یہ جذبہ کم ہوتا تھا ان کو شکست۔

الغرض اس زمانے میں بھی دنیا کا کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہاں کے لوگوں میں جذبہ حب الوطنی نہ پایا جائے اور یہ جذبہ اس وقت پیدا ہوسکتا ہے، جب کہ آپس میں اتفاق ہو۔ کسی ملک میں بعض امیر ہوتے ہیں اور

بعض غریب۔ امیر روپے پیسے سے مدد کرے اور غریب محنت کرے۔ اس طرح سے ہر شخص کو یہ چاہئے کہ اپنے ملک کو اور ملک والوں کو کسی طرح سے بھی فائدہ پہنچائے۔ اگر ہم دیگر ممالک پر غور کریں اور ہندوستان کے حالات کا مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ دوسری قومیں ترقی کی پہلی سیڑھی پر پہنچ چکی ہیں اور ان کا شمار بڑے بڑے ملکوں میں کیا جارہا ہے - یہ محض جذبۂ حب الوطنی ہی کی وجہ سے ہے۔ وہاں پر امیر لوگ روپے پیسے سے اپنے ملک میں مدرسے کھولتے ہیں اور شفاخانے بنواتے ہیں اور دوسری ہر طرح کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور وہاں کے غریب بھی۔ اپنے ملک کے لئے رات دن محنت کرتے ہیں۔

احمد اللہ بیگ

نظام الملک آصف جاہ اوّل مولوی سید مراد علی صاحب طالع اردو فاضل نے بانی سلطنت آصفیہ کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ زندگی عوام اور طلبہ کے لئے سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے ہیں ان کو ادارہ نے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ صفحات ۴۰ مع تصویر نظام الملک آصف جاہ قیمت (۶ر)

نظام الملک آصف جاہ ثانی ادارہ ادبیات اردو نے سلاطین آصفیہ کے سوانح کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کی دوسری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "نظام الملک آصف جاہ اول" اتنی مقبول ہوئی کہ ایک سال کے اندر اس کا دوسرا ایڈیشن چھپوانا پڑا۔ اس باتصویر کتاب میں مولوی مراد علی صاحب طالع نے تاریخی واقعات کو طالب علموں اور عوام کے لئے نہایت دلچسپ اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ صفحات (۳۲) قیمت صرف ۴ر

محسنینِ اُردو

یوں تو ہر مضمون نگار اور مصنف کا اُردو پر احسان ہے لیکن اردو زبان کی ترقی کے ذمہ دار چند ایسی ہستیاں ہیں جن کو اُردو زبان کا محسن کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان میں قابلِ ذکر میری نظر میں یہ وہ ہستیاں ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے :—

۱۔ محمد قلی قطب شاہ یہ سلطنت گولکنڈہ کا چوتھا بادشاہ تھا۔ اس کو تمام زبانوں سے زیادہ اردو زبان سے محبت تھی۔ علم و فضل اور شعر و شاعری میں اتنا ماہر تھا کہ دوسروں کی رہبری کیا کرتا تھا۔ اس کا کلام (۱۸۰۰) صفحات پر مشتمل ہے جن میں پورے ایک لاکھ اشعار ہیں۔ یہی بادشاہ اردو کا سب سے پہلا تاجدار شاعر ہے۔ اس نے شاعری کے تمام عنوانات مثلاً سلام، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیے، منظر نگاری اور تعلیم و تلقین پر قلم فرسائی کی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے بہت سارے واقعات کو شعریت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اُردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان بادشاہ گزرا ہے۔

۲۔ سر سیّد احمد خاں سر سیّد ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ انہی کی کوششوں نے اردو زبان و ادب کو ایک نئے راستے پر لایا۔ انھوں نے ہمیشہ اس کی کوشش کی کہ ہندوستانیوں اور یوروپی قوموں میں ملاپ ہو جائے۔ تاکہ اہل ہند فرنگی تہذیب سے واقف ہو سکیں۔ ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید لکھی جس میں دہلی کے آثار قدیمہ کا تذکرہ ہے۔ اس کاوش کے صلہ میں انھیں ایشیاٹک سوسائٹی میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی اور وہ اس انجمن کے آنریری فیلو مقرر ہو گئے۔ اس زمانے کے لوگوں نے ان کی بہت مخالفت کی۔ لیکن وہ اپنے کام میں برابر لگے رہے۔ انھوں نے ۱۸۶۲ء میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام

سائنٹیفک سوسائٹی تھا۔ ایک اُردو رسالہ تہذیب الاخلاق بھی ۱۸۷۲ء میں جاری ہوا۔ ان کا طرز تحریر بہت سلیس اور سادہ ہے اور دوسرے تمام انشا پردازوں نے یہی طرز اختیار کیا۔ یہاں تک کہ ان کے مخالفوں نے تک اس طرز کو پسند کیا۔ آپ نے ۱۸۹۸ء میں رحلت کی۔

۳۔ محمد حسین آزاد آزاد ایک بے چین دل و دماغ لے کر ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے تھے ۱۸۷۶ء میں انھوں نے پنجاب کے ناظم تعلیمات ہال رائیڈ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اردو کے قدیم طرز کو بدلنے میں ان کی مدد کریں۔ انھوں نے کئی مشاعرے منعقد کئے جن میں مصرعہ کی بجائے موضوع دیا جاتا تھا۔ انھوں نے بچوں کے لئے کورس کی کتابیں لکھی تھیں۔ ان کی زبان میں لطافت بہت تھی۔ ان کی ایک کتاب "آب حیات" مشہور ہے جس میں شاعروں کا تذکرہ ہے وہ خود بھی شاعر تھے۔ ان کو اپنے بچوں سے بہت محبت تھی۔ خصوصاً اپنی لڑکی سے تو انھیں اس قدر محبت تھی کہ اُسے اردو، فارسی، عربی کا عالم بنا دیا تھا۔ لیکن جب اس لڑکی کا عالم شباب میں انتقال ہوگیا تو بالکل دیوانے ہوگئے تھے اور اسی جوش دیوانگی میں انھوں نے کہا تھا کہ "میرا دل ٹوٹ گیا، میری تصنیفات ضائع ہوگئیں"۔ ان کے پوتے کیمبرج یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار ہیں۔ آزاد کو شبلی "خدائے سخن" کہتے تھے۔ فن تنقید کے بھی زبردست ماہر تھے۔

مولانا الطاف حسین حالی ادیب اور شاعر دونوں حیثیتوں سے حالی مشہور ہیں۔ طرز بیان بہت سادہ ہے اور اس میں روانی پائی جاتی ہے۔ حالی پہلے قومی شاعر ہیں "مسدس حالی" ان کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے جو سرسیّد کی خواہش پر لکھا گیا۔ اس کتاب کے متعلق سرسید نے کہا تھا کہ "جس دن خدا مجھ سے دریافت کرے گا کہ اتنے دن دنیا میں رہ کر میرے لئے کیا لایا؟ تو میں جواب دوں گا کچھ نہیں! بس حالی سے مسدس

لکھوا دیا ہوں"۔ یہ وہ ادبی کارنامہ ہے جس نے اُردو میں انقلاب برپا کیا۔ بقول شخصے "اگر حالی قومی شاعری کا اسی وقت آغاز نہ کرتے تو اقبال جیسے شاعر کو پیدا ہونے میں دیر لگتی"۔ ان کو جو چیز دوسرے اُردو شاعروں سے ممتاز رکھے گی وہ عقل اور خیالات کا توازن ہے۔

اُردو شاعری میں آج جو سیدھا پن اور فطری انداز پایا جاتا ہے اس کے موجد حالی ہیں۔ اُن کی تمام کتابوں نے شہرت حاصل کی جن میں مجالس النساء، مقدمۂ شعر و شاعری اور مسدس مشہور ہیں۔ اوّل الذکر تصنیف پر انھیں گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے چار سو روپے انعام ملے تھے۔ مقدمۂ شعر و شاعری نے حالی کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ یہ اُردو ادب میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔ مسدس میں انھوں نے مسلمانوں کی قدیم و جدید حالت کا مقابلہ کیا ہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

۵۔ شبلی نعمانی | یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو کو ترقی یافتہ زبانوں کے برابر لا کھڑا کیا اور اردو کو صحیح معنوں میں ایک علمی زبان بنایا۔ آپ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ بعضوں نے انھیں اُردو کا سب سے بڑا ادیب قرار دیا ہے۔ اہل لکھنؤ کا طرز بیان اہل دہلی سے بہت مختلف تھا۔ لیکن شبلی نے دونوں طرزوں کو ایک کرکے ایک نئی طرز ایجاد کی جس پر ہر جگہ کا رہنے والا کامیابی کے ساتھ قلم فرسائی کرسکتا ہے۔ ان سے پہلے انشاء پردازوں نے جو زبان استعمال کی تھی اس میں یا تو دہلی کے محاوروں کا استعمال تھا یا لکھنؤ کے۔ لیکن انھوں نے جس طرز میں لکھا وہ سب لوگوں کے لئے مناسب ہے۔ ندوہ، دارالمصنفین، شبلی اکیڈیمی ان کی یادگاریں ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

نذیر احمد | ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ کئی اصلاحی ناول ان کی یادگار ہیں جن میں توبۃ النصوح

بہت مشہور ہے۔ اپنی کتابوں میں انھوں نے قوم کی مسیحائی کی ہے۔ ان کی تقریریں جادو کا اثر رکھتی تھیں۔ وہ دہلی کی زبان کے دلدادہ تھے۔ ان کی اکثر کتابیں اسی زبان میں ہیں انھوں نے ہر رنگ میں نظمیں کہی ہیں۔ نذیر احمد اردو ادب میں اپنے قصوں کی بدولت زندہ رہیں گے اور ان کی شاعری ان کی وجہ سے زندہ ہے۔ ۱۹۱۲ء میں سفر آخرت کیا۔

۷۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب | یہ اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ لیکن زندگی میں ان کی کوئی قدر نہ ہو سکی۔ انھوں نے میر کی طرز میں شاعری کی۔ ان کا کلام ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ غالب جدید خطوط نگاری اور نثر کے بانی قرار دیئے گئے ہیں۔ آپ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء میں رحلت کی۔

۸۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال | اقبال ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن ہی سے شاعری کی طرف رغبت تھی۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک تین سال فرنگستان میں بسر ہوئے اور وہیں ان کی شاعری نے زبردست پلٹا کھایا۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "بانگ درا" ۱۹۲۴ء میں شایع ہوا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک فارسی میں شاعری کی۔ لیکن "مخزن" کے ایڈیٹر سر عبد القادر کی توجہ دلاتے پر کہ "گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" پھر اردو میں جولانیاں دکھانی شروع کیں۔ وہ صحیح معنوں میں شاعری کے پیغمبر تھے ایسا شاعر پھر ہمیں شاید ہی ملے۔ ان کا ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا۔

۹۔ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی جلالت الملک میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

۱۹۱۱ء سے سریر آرائے سلطنت ہیں۔ اپنے والد ماجد کی تربیت نے آپ کے جوہر قابل کو چمکایا۔ آپکے سلام، نظمیں، مرثیے، قطعات اور غزلیات بلند پایہ ہوتی ہیں آپ کی تقریریں اور

فرامین مبارک کی اُردو لاجواب ہوتی ہے ۔ آپ کو اُردو سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔اس کا ثبوت جامعہ عثمانیہ اور اس کے ملحقہ اداروں کا قیام ہے ۔ جامعہ کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے اور اس قلیل مدت میں جامعہ نے دوسری جامعات کے مقابلے میں اپنے لئے بہت بلند جگہ پیدا کرلی ہے۔ آج فرخندہ بنیاد میں علم وعمل کی جو روشنی نظر آتی ہے وہ اسی جامعہ کا طفیل ہے اور اس کا سہرا حضور پُرنور کے سر ہے ۔ آج دنیا میں اردو کے سب سے بڑے محسن آپ ہی ہیں۔

دیکھو بادل گِھر کر آئے

محمد فیروز الدین صدیقی

دیکھو بادل گِھر کر آئے

رنگ سہانا ساتھ ہیں لائے

پانی برسا رم جھم رم جھم
بجلی چمکی چھم چھم چھم

دونوں مل کر ناچ دکھائے

دیکھو بادل گِھر کر آئے

باغوں میں کلیوں کو کِھلائے　　پیڑوں کو وہ سبز بنائے
دیکھو بادل گِھر کر آئے　　پھولوں میں وہ رنگت لائے
مور بھی تم کو ناچ دکھائے　　ناچے گائے شور مچائے

رنگ سہانا ساتھ ہیں لائے

تسنیم کوثر (شوراپور)

اتحاد

پیارے بچّو! آپس میں مل جل کر محبت و خلوص سے رہنے اور کام کرنے کا نام اتحاد ہے۔ اسی محبت ہی کی وجہ سے انسان اطمینان و سکون سے زندگی بسر کرسکتا اور ترقی کرسکتا ہے۔ بغیر اتحاد کے انسان دنیا میں ترقی نہیں کرسکتے اور دوسرے ممالک پر فوقیت نہیں پاسکتے اور نہ وہ دنیا کے اہم مسائل میں کوئی جگہ پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر جگہ خلوص و محبت اور اتحاد لازمی ہے جو ملک کی خوش قسمتی کا باعث ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک کی مختلف جماعتوں میں تو کیا بلکہ ہمارے گھر والوں اور خاندان والوں میں تک خلوص و محبت رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے اور آئے دن ایک گھر کے رہنے والے یا ایک ہی خاندان کے افراد آپس میں معمولی اور غیر اہم باتوں پر ایک دوسرے کے رنج و تکلیف کا باعث ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی مصیبت پر اس طرح انجان ہوکر دور بھاگتے ہیں جس طرح لاحول سے شیطان بھاگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترقی یافتہ ممالک اور اُن کے افراد ہمارا اور ہمارے ملک کا مذاق اڑاتے اور اُسے ہر طرح پست خیال کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے اندرونی نفاق اور جھگڑوں کو فوراً دور کریں اور اپنی تیز رفتار ترقی کی مثال سب پر روشن ہوجائے۔ یہ ہمارا فریضہ ہے کیونکہ ہم آئندہ بننے والے شہری ہیں۔ غور کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جہاں ایک گھر ایک ہی خاندان اور ایک ہی وطن کے لوگوں میں آپس میں محبت و ہمدردی اور اتحاد نہ ہو، جہاں ایک ہی برادری میں امیر اور غریب، بڑے اور چھوٹے کا فرق نمایاں ہو وہاں ملک بھر میں جو ایک وسیع براعظم ہے اتحاد و اتفاق کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ ہم ہی پر ملک کی آئندہ خوش حالی اور ترقی کا دارومدار ہے اگر اب بھی

آپس میں خلوص و ہمدردی پیدا نہ کریں اور مل جل کر اپنا ہر معمولی اور ہر عظیم الشان مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں تو دوسروں کا ہماری ہنسی اڑانا اور ہمیں پست سمجھنا بالکل بجا ہے اور ایسی صورت میں آئندہ ہماری ترقی کا خواب صرف چند منٹ کے لئے راحت کا باعث بن کر رہ جائے گا۔

اس لئے عزیز بچو! ہم آئندہ ہونے والے نامور شہری اور ترقی پسند ملک کے جانثار ہیں اور اتحاد و آزادی کی تمام امیدیں ہم سے ہی وابستہ ہیں جو ہماری متحدہ کوشش اور خلوص و ہمدردی پر منحصر ہیں جس کے لئے ہم سب سے پہلے اپنے گھر اور اپنے خاندان سے نفاق اور رنج کے زہریلے درخت کی جڑیں کاٹ کر فوراً پھینک دیں اور اپنے خاندان اپنے شہر اور اپنے وطن کے ہر فرد سے محبت اور خلوص سے پیش آئیں اور اُن کی مصیبتوں میں اُن کی مدد کرنے والے بنیں۔ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرتے ہوئے ان کو نیک راہ بتلائیں اور خود بھی نیکی کی راہ اختیار کریں۔ اپنے سے کمتر اور غریب خاندان والوں اور ہم وطنوں کو ہرگز حقارت و غرور سے نہ دیکھیں کیونکہ وہ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور آخر ہماری ہی طرح اس دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں........ اس چند روزہ زندگی میں اگر خدا نے ہمیں حسن، دولت، اثر و رسوخ دیا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ ہم خدا کے دوسرے بندوں کو جو ہماری ہی طرح انسان ہیں لیکن خدا کی فیاضی سے عارضی طور پر محروم ہو گئے ہیں۔ اس طرح حقارت سے دیکھیں اور ان کی تکالیف کا خیال نہ کریں۔ یاد رکھو کہ ہماری زندگی ہماری دولت، اور ہمارا حسن اسی خدا کا دیا ہوا ہے جس نے غریب انسان کو بھی پیدا کیا اور جس وقت خدا چاہے وہ ہم سے سب واپس لے سکتا ہے۔

پیارے بچو! اسی وجہ سے ہمارا پہلا فرض ہر شخص اور ہر طبقہ سے اتحاد و محبت

اور رواداری سے پیش آتا ہے۔ اور اسی اتحاد سے ہم مل جل کر ترقی کر سکتے اور دوسرے ممالک کو حیرت زدہ بنا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے لئے آسان ہے کہ ہم اپنے ملک کی حفاظت کریں جس پر دشمنوں نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ اب ہمارا سب سے پہلا قدم پہلا عمل اور پہلا نعرہ ہو "اتحاد! اتحاد!!" اُس کے بعد۔ آزادی! آزادی"!!

برسات کی خوشی میں

سید عبدالرحمٰن حسینی طاہر

پودے لہک رہے ہیں
غنچے مہک رہے ہیں
بلبل چہک رہے ہیں
خوشیاں منا رہے ہیں
برسات کی خوشی میں

بادل وہ گھر کے آئے
خوشیوں کو ساتھ لائے
بھونروں نے گیت گائے
نغمے سنا رہے ہیں!
برسات کی خوشی میں!

ہیں بن میں مور رقصاں
طائر بھی ہیں پر افشاں
بچے بھی ہو کے شاداں
تانیں اڑا رہے ہیں
برسات کی خوشی میں

آؤ ہنسیں ہنسائیں!

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۲
نشان ٹپہ برطانیہ ۲۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

جلد ۹ — بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء — شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے دستگیری پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

نیا ہندوستان

آج ان پر [illegible] کھیل [illegible] ایسی [illegible] خوشی، بلکہ اس [illegible] تعلی [illegible] تھی ۔ [illegible] زیادہ بہتا ہوا [illegible] کا خون [illegible] سے زیادہ [illegible] پیش کر رہے تھے۔ نہیں [illegible] ہوا [illegible] جانے جی [illegible] نہیں [illegible] انسانی لاشوں کو دیکھ کر تعجب ہوا [illegible] ایک بھائی دوسرے بھائی کو اس [illegible] نکلے ہے ——— آج تک کسی جگہ [illegible] بھائیوں سے [illegible] بھائیوں سے [illegible] وہ [illegible] کے خون سے [illegible] ہونے کے لئے میدان [illegible] وہ [illegible] اپنے ہی بھائی کے خون میں شرابور ہے۔ [illegible] کیا ہی ہوا ایسے [illegible] ہوکر اپنے حریف کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں ۔۔؟ [illegible] اپنے ہی بھائیوں پر ظلم کیا۔ آج کیا اپنی طاقت [illegible] کرنا ہماری [illegible] ہے؟

[illegible] بڑی معصوم آنکھیں [illegible] سرگزشت [illegible] ہو گیا ہے [illegible] اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلنا کتنا انسانیت سوز عمل ہے۔

یہ مختصر داستان اس بہادر لڑکے کی ہے جو آخر [illegible] تک دو بڑی قوتوں کو ان کی غلط کاریوں سے روکنے کی کوشش کرتا رہا اور جس نے دو بچھڑے ہوئے بھائیوں کے درمیان صلح و محبت کا پرچم لہرانے کی کوشش کی ہوئے جا رہی [illegible] دو عظیم قوتیں ۔۔۔ مگر وہ خود فنا ہو گیا۔ اس کا [illegible] بہادرانہ عمل [illegible] کا معصوم خون [illegible] ہوگا [illegible] وہ بچہ کا [illegible]

روز بروز حالات [illegible] کوئی دن ایسا نہیں [illegible] لاشوں کے ڈھیر [illegible] زخمی اور [illegible] سب ایک [illegible] عجیب [illegible] رات [illegible] کر رہی تھی اور [illegible] ہر ایک لاش [illegible] خون [illegible] کو دیکھتا [illegible] بھائی [illegible] آگے بڑھتا جاتا۔ اس کے نزدیک ہندو اور مسلمان دونوں برابر تھے۔ کسی ہندو لاش کو دیکھ کر بھی [illegible] آنسو بہہ نکلتے اور کسی مسلمان لاش کو دیکھ کر [illegible] وہ رو پڑتا۔ کیونکہ دونوں ہی اس کے بھائی تھے۔ یونہی رنجیدہ اور [illegible] وہ [illegible] جہاں کہیں کسی زخمی [illegible] کی آواز سن کر وہ [illegible] اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے اٹھا کر اسے ہسپتال پہنچاتا۔ یہ عارضی اسپتال اس بستی کے جوانوں نے مل کر دو دن [illegible] میں قائم کیا تھا کیونکہ بستی کے دوسرے مقامات کی طرح ہندو اور مسلمانوں میں اس خونخوار دیوانگی کا اظہار نہیں ہوا تھا اور نہ لوٹ مار اور خونریزی کے واقعات ہوئے۔ بلکہ ہندو مسلمان مل کر اپنے ہم وطن بھائیوں کی خدمت کرتے تھے اور ان کا مشن تھا اپنے غریب اور لاچار بھائیوں کی خدمت۔ وہ بلا تفریق مذہب سب زخمیوں کی یکساں خدمت کرتے اور زخموں کی زیادتی سے مرجانے والوں کی لاشوں پر آنسو بہاتے

جمیل ان میں سب سے زیادہ معصوم تھا۔ اس کے چہرے سے معصومیت [illegible] بے شمار تکلیفیں اٹھا چکی تھیں [illegible] وحشت [illegible] انگریزی [illegible] کو دیکھ کر [illegible] آنکھوں سے [illegible] اسے اپنے [illegible] سے [illegible] محبت [illegible] [illegible] تشبیہ [illegible] جانتے ہیں اور [illegible] ... پر [illegible] یہ سوچے بغیر کہ [illegible] نقصان کتنے ہوں گے۔

[illegible] جمیل [illegible] حیرت [illegible] اپنے ہم وطن بھائیوں کی لاشوں پر [illegible] جا رہا تھا کہ اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ [illegible] لاشوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کرا سکتے ہیں۔ [illegible] یہ منظر دیکھ کر [illegible] بغور ان لاشوں کو دیکھنے لگا۔ ان کے جسم زخموں سے چھلنی تھے اور چہرے سے [illegible] بہہ رہا تھا۔ ایک طرح کا خون [illegible] ایک ہی طرح زخموں سے رس رہا تھا پھر یہ تفریق کیوں ہے ۔۔۔؟

اور پھر جیسے [illegible] نے اس تفریق کی وجہ سمجھ لی۔ وہ بڑبڑایا [illegible] تو یہ تھا قصور نہیں [illegible] ڈیڑھ سو [illegible] میں جب ایک بڑی [illegible] آئی تو وہ [illegible] ایک دوسرے سے لڑ پڑے یہ سوچے بغیر کہ [illegible] تو بہت کچھ حاصل کر لیتے۔ اور آج [illegible] کا [illegible] تو [illegible] ایک معمولی سی [illegible] ۔۔۔ مگر میرے نادان ساتھیو! تم اب بھی [illegible] مظلومیت کا بدلہ لے سکتے ہو۔

[illegible] نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس [illegible] [illegible] کی [illegible] وہ [illegible]

اس [illegible] تھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] لاش [illegible] [illegible] [illegible] سر پر ترکی ٹوپی تھی [illegible] [illegible] سرخ خون [illegible] [illegible] تحریر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بلکہ [illegible] [illegible] آزادی کی [illegible] پڑے تھے۔

[illegible] تاریکی میں لاشوں کے درمیان [illegible] [illegible] تھا۔ اب بھی جمیل کے [illegible] [illegible] نشان لاشیں [illegible] بھائیوں کی [illegible] [illegible] جمیل [illegible] اس [illegible] معصوم لاش کو [illegible] اور [illegible] چند سال بعد کے ہندوستان کی [illegible] ہندوستان کی بنیادیں ہندوؤں اور مسلمانوں [illegible] دونوں کا [illegible] [illegible] [illegible] حکومت [illegible] [illegible] ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتا تھا [illegible]

جمیل [illegible] کے خیال تک پہنچ

اس طرح محو تھا کہ اسے بلوائیوں کے پہنچنے کی خبر اس وقت ہوئی جبکہ وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ زرد چہروں کا ایک ہجوم جن کی صورتیں دیوانگی، بہیمیت اور خونریزی کی ہوس سے انتہائی بھیانک ہو گئی تھیں۔ سروں سے بلند بیشمار تلواریں، برچھیاں اور لاٹھیاں اور تباہی مچانے کے لئے بیقرار ہاتھ۔ یکایک دوسری سمت سے اسی طرح کے چہروں کا ایک طاقتور انبوہ چمکتی ہوئی تلواروں اور لہراتی ہوئی لاٹھیوں کا ناچتا ہوا انبوہ ــــ بے تحاشا دوسرے گروہ پر ٹوٹ پڑا اور پھر دم کا شور ہے پڑی لاشیں بچھ گئیں۔ بیدردی سے قتل کرنے والوں نے تبیل کو بھی گھیر لیا اور ایک ساتھ اس کے سینے کو ہندو اور مسلمان تلواروں نے چھلنی کر دیا۔ وہ منہ کے بل لاشوں پر گر پڑا اور وہ دل جو دونوں جماعتوں کی محبت میں ایک ہی طرح سے دھڑکتا تھا ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ آنکھیں جو دونوں جماعتوں کی تباہی پر یکساں آنسو بہاتی تھیں ان ہی کے ہاتھوں زندگی کا نور کھو چکیں۔ اور وہ بہادر ہاتھ جو دونوں بھائیوں کی خدمت کرتے تھے ہمیشہ کے لئے بے جان اور سرد ہو گئے مگر ان تمام لاشوں کے درمیان پڑی ہوئی وہ بہادر لاش اب بھی محبت کا سبق دے رہی تھی۔ چاروں طرف سرخ لہو بہہ رہا تھا۔ اس سرخ سرخ خون میں ترکی ٹوپی اور گاندھی کیپ ڈوب گئی تھی اور دور ــــ افق کی ضو سے سرخ سویرا جھانک رہا تھا۔

نجمہ سمیع

تصحیح :- جولائی و اگست ۱۹۴۶ء کے شمارہ سب رس میں "ستان دوم کنڈا" کے مضمون کے تحت صفحہ (۶۷) سطر ۱۳ میں "سو جشور راؤ" کی بجائے سہواً "رامیشور راؤ" چھپ گیا ہے۔ جسکی تصحیح فرمالی جائے۔

ادارہ

غریب کا دل

"ماں! ایک گھونٹ پانی!" بیمار بیٹے نے کراہتے ہوئے کہا۔

اس آواز کے ساتھ ہی سلیمہ تڑپ کر اٹھی۔ ایک پیالے میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور بیٹے کے حلق میں دھیرے دھیرے ٹپکایا۔ بچے کی تکلیف اور بے چینی اس سے دیکھی نہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور اس کا دل کسی نامعلوم خوف کے بوجھ سے ڈوبنے لگا۔ آج سترہ دن ہوئے کہ اس کا بچہ موتی جھرہ بخار میں مبتلا تھا۔ دوا کو کون پوچھے یہاں تو ضروریاتِ زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اور پھر دیہات کا مقام جہاں حکیم اور ڈاکٹر نایاب ہوتے ہیں اور جو ہوں تو ان کی زرپرستی کب انہیں اتنی اجازت دیتی ہے کہ غریبوں کا مفت علاج کریں۔ اس میں شک نہیں کہ شہروں کی بہ نسبت دیہات میں انسانیت اپنے کامل عروج پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سادہ لوح لیکن ہمدرد پڑوسی ہر وقت بچے کی تیمارداری میں ایسا ہی حصہ لیتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی بچہ ہے۔ لیکن صرف ہمدردی ہی سے اگر مریض صحت یاب ہونے لگیں تو یہ فلک بوس ہسپتال آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ سب کی یہی متفقہ رائے تھی کہ بچے کو شہر لے جا کر وہاں کے ہسپتال میں شریک کروا دیا جائے۔ سلیمہ بڑی الجھن میں تھی۔ شہر کے ہسپتال میں کیسے شریک کروائے۔ بیچاری اپنی مفلسی کے اس اہم معاشی مسئلہ کو وہ کیسے حل کرے یہ اس کے امکان سے باہر تھا۔ وہ ابھی اسی ادھیڑبن میں تھی کہ اس نے سنا کہ شہر سے کوئی قابل ڈاکٹر رام داس نامی آئے ہیں جو ہر قسم کے زہریلے بخار کا علاج کرنے میں [illegible] مہارت رکھتے ہیں۔ اور ان کا مکان بھی کوئی دور نہیں یہی چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا۔ چار پانچ میل کا فاصلہ دیہات والوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس فرحت افزا خبر کو سن کر اس کو کتنی مسرت ہوئی اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جنہیں خود بھی کبھی اس قسم کا تجربہ ہوا ہو۔ امید کی ایک ہلکی سی کرن اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اور وہ خوش آئند تخیلات میں کھو گئی۔ اب ایک گونہ اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ تمام رات گزری لیکن شب کی بے چینی [illegible] وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ اور معصوم تو شگفتہ کلی ہی تھی جس نے زندگی کی ابھی صرف تین ہی بہاریں دیکھی تھیں۔ آج سلیمہ کو وہ رات [illegible] یاد آ رہی تھی جب کہ ندیم اب کی طرح تپ رہا تھا۔ اس کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ اس وقت قاسم زندہ تھا۔ بارہا ان دونوں نے مل کر کس طرح [illegible] کاٹا تھا۔ یہ بھی کیوں نہ ہو؟ اس کو جب دو آدمی مل کر بانٹ لیتے ہیں تو وہ کتنا ہلکا ہو جاتا ہے۔ [illegible] پریشانی کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ جب کبھی سلیمہ مامتا سے مجبور ہو کر زار و قطار رونے لگتی تو عین اسی وقت قاسم اس کی گریہ وزاری کو اس کے خدا پر ایقان اور اعتقاد کی کمی کے فقدان پر محمول کرتا۔ عورت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی تازیانہ نہیں۔ سلیمہ فوراً اپنے ہوش میں آ جاتی۔ اور بارگاہِ الٰہی میں گھنٹوں سربسجود ہو کر دعائیں مانگا کرتی۔

لیکن آج —— آج —— وہ تنہا تھی۔ اس کا دنیا میں سوائے اس بچے کے اور کوئی نہ تھا۔ آج [illegible] ماضی کی ساری باتیں دھیرے دھیرے یاد آ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میری قسمت ہی میں شاید دکھ لکھا ہوا ہے۔ قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ پہلے [illegible] کی موت کا فتویٰ ملا۔ اور اس کے بعد بیٹے کی زندگی سوتیلی ماں کی موجودگی میں [illegible] رہتی ہے وہ اہلِ دنیا سے پوشیدہ نہیں۔ دنیا بھر کی تکلیفیں [illegible] مظالم برداشت کیے۔ اب دو سال [illegible] خوش نصیب ہوا تھا کہ زندگی نے پھر ایک پلٹا کھایا۔ [illegible] زندگی کے باغ میں بہار کے جھونکے آئے ہوئے [illegible] شہر میں طاعون کی وبا پھیلی [illegible] [illegible] سے نکلتے۔ آہ! میرا قاسم بھی اسی منحوس وبا کا شکار ہو گیا۔ اور میری

کشتی حیات کو حوادث کے منجدھار میں چھوڑ کر مصائب و آلام کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تن تنہا چھوڑ گیا۔ اس کو اولاد کی تمنا تھی۔ [illegible] وہ تمام زندگی کی ایک بہار بھی دیکھنے نہ پایا تھا کہ موت کی پرسکون [illegible] میں روپوش ہو گیا۔

ندیم کی پرورش اس طرح ہوئی اور تعلیم کا [illegible] اٹھائے گا [illegible] حالات سے جو سلیمہ کو گھنٹوں پریشان رکھتے لیکن سلیمہ ایک خوددار عورت تھی [illegible] مستقل مزاجی کا دامن [illegible] نہ چھوڑا۔ اپنی کفایت شعاری [illegible] سے اپنی [illegible] بچے کی کشتی حیات کو ساحل مراد تک پہنچا دینے کے لیے [illegible] لیکن اس بیماری سے اس [illegible] تھا۔ [illegible] کا روگ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہوا [illegible] سلیمہ تنہا تھی وہ کیا کرتی [illegible] [illegible] کرکے علاج کروانا اس کے امکان سے باہر [illegible] اس کی کل کائنات تھی [illegible] کے تقاضے سے تنگ آ کر [illegible] اور زیورات وہ بھی پہلی تنگدستی کا شکار ہو گئے [illegible] کے پاس اگر کچھ تھا تو عقیدت کے چند [illegible] عاجزانہ التجائیں محبت کا بحر بیکراں۔

[illegible] کی تشریف [illegible] کے بال [illegible] ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچیں [illegible] اور جلد واپس ہونے کی توقع نہیں [illegible] لیکن [illegible] آج کل کے ڈاکٹروں اور طبیبوں سے توقع [illegible] کا [illegible]

ہندوستان کا معاشی سوال عجیب تھا۔ ایک نے تو علانیہ سامنے کی کرسی سے مخاطب ہو کر (انگریزی میں) اس کی ہیئت کذائی، مفلسی اور اس کا اپنے ساتھ لے چلنے کے لیے مصر ہونے پر نہایت ہی ظریفانہ انداز میں خوب خوب مضحکہ اڑایا۔ اور اس پر رش کے فلک شگاف قہقہے ہونے پر [illegible] تھے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ ان کی [illegible] سینکڑوں مصیبتوں سے زیادہ پُر خطر مصیبتوں سے آفت زدوں سے زیادہ [illegible] سے ہوتی ہے۔ ان کے حسن سلوک پر [illegible] نے کیا خوب کہا ہے

ہوں جس کے سبب سے چند نقدی گھٹے
[illegible] کی نظر بری ہوں

[illegible] کیسے اس کلیہ سے مستثنیٰ رہ سکتی تھی [illegible] کے ہم جنس [illegible] سلیمہ [illegible] سے پاش پاش ہو گیا۔ [illegible] وہ انگریزی [illegible] لیکن [illegible] سکتی تھی۔ وہ ایک قیافہ شناس تھی [illegible] قیافہ شناس [illegible] سلیمہ ہی پر موقوف نہیں ہر ہندوستانی عورت بہترین قیافہ شناس ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسے ماحول میں رہتی ہے جہاں ہر وقت اسے زمانے کے تیور پہچاننے ہوتے ہیں لیکن اس [illegible] سلیمہ [illegible] ایک مرتبہ وہ پھر رام داس کے ہاں گئی لیکن کوٹھی کے اندر داخل ہونے کے قبل ہی دربان نے روکا اور [illegible] لہجہ میں پوچھا "کون ہے؟" اور پھر سلیمہ کو دیکھ کر (مضحکہ خیز انداز میں) "اجی خالہ! آپ کس واسطے یہاں تشریف لائی ہیں؟" "ڈاکٹر صاحب کے پاس آئی ہوں۔" [illegible] ایک چونی ہم تمہیں جلد ڈاکٹر صاحب [illegible] نہیں [illegible] بیٹھے ہیں۔ اتنی [illegible] کا کام ہے؟

[illegible] ان [illegible] سوز سوالات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی مفلسی اور بیمار ندیم کی تصویر کھنچ گئی۔ [illegible] آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گلوگیر آواز میں جواب

دیا ہوں تنگ کرتے ہو بھائی! میں خود ہی مصیبت [illegible] وہ بولا میرے پاس تو دوا اور ٹیکسی کے لئے بھی پیسے نہیں۔ تو پھر یہاں سے دوا لے؟ چھوٹو۔ دو بابا! میں غریب ہوں اور [illegible] لیکن چوکیدار کے [illegible] پرست دل پر اس التجا کا کوئی اثر ہو [illegible] اور ہوتا بھی کیونکر کیونکہ انسان جب ایک دفعہ نیکی کے راستے سے ہٹ جاتا ہے اور اسے جلدی کوئی راہبر نہ ملے تو پھر اس کا راہ پر آنا محال ہو جاتا ہے۔ وہ گناہوں کی پوٹ بن جاتا ہے اور پھر اسے کوئی قوت بچا نہیں سکتی۔ اس نے [illegible] دی اور درست پھاٹک کے دروازے کو بند کر لیا۔ [illegible] [illegible] آخر [illegible] کیوں ایک بوڑھی کے بیٹے کا دل ہوتا گیا۔ وہ [illegible] لال کی زندگی [illegible] [illegible] کھولو۔ پھاٹک کھولو [illegible] چوکیدار [illegible] [illegible] ہتھیلی میں [illegible] ہوئے کہا۔ چوکیدار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے کہا۔ آؤ۔ ہاں جی! میں تمہیں راستہ بتا دوں۔ سلیمہ چوکیدار کی رہنمائی میں ڈاکٹر صاحب تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر صاحب بہت مصروف تھے۔ [illegible] [illegible] میں [illegible] ابھی آتا ہوں۔

جلدی کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب مرا [illegible] کی کش مکش میں ـــــ اس کی آواز حلق میں اٹک [illegible] اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آہ ممتا! موت کے [illegible] ہی سے اس کی روح لرز اٹھی۔ اس [illegible] وہ اپنے لال کے متعلق کیسے استعمال کرے۔ بالآخر سب سے [illegible] ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف توجہ کی۔ کیفیت پوچھی۔ اور نسخہ لکھ دیا۔ لیکن مریض کو دیکھنے کی التجا کی گئی تو [illegible] کہ اس وقت موٹر موجود نہیں ہے اور [illegible] [illegible] دے سکو گی؟ سلیمہ کا دل اس سوال سے پاش پاش ہو گیا۔ فیس ـــــ وہ اپنے بچے کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دے گی۔ لیکن وہ کیا کرے۔ مفلسی [illegible] کے عقدے کو وہ کیسے حل کرے۔ ممتا آہ ظالم ممتا نے پھر ایک مرتبہ منت و سماجت کروائی خوشامد کروائی تھی

ترس [illegible] ہاں سر [illegible] ایک انسان نہ شیطان کے آگے [illegible] ہوا تھا۔ آہ عورت مجسمہ خودداری [illegible] بات کی چوکھٹ پر [illegible] ظالم ناخدا ترس رام داس [illegible] طرف تکتی ہی [illegible] وقت [illegible] آج تک [illegible] اور موٹر میں بیٹھ کر چلے گئے [illegible] ـــــ [illegible] دل شکستہ [illegible] کا غم [illegible] [illegible] کرتی رہی۔ وہ [illegible] خیال [illegible] تھی کہ معاً اسے اپنے بیٹے کا خیال آیا [illegible] اتنی دیر سے ماں ماں پکار کر [illegible] آہوں کے [illegible] سرعت [illegible] لڑکھڑاتے ہوئے قدموں، نمناک آنکھوں اور [illegible] وہ گھر پہنچی لیکن [illegible] شمع حیات گل ہو چکی تھی۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں سکون ہی سکون ہے۔ ابدی سکون جہاں امیر غریب میں کوئی امتیاز نہیں جہاں [illegible] سماج کا کوئی خوف نہیں ـــــ جہاں خودغرض رشتہ دار، مطلبی دوست و احباب کا گزر نہیں۔

پڑوسن جس کی حفاظت میں وہ بچہ کو دے گئی تھی بچہ پر جھکی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ سلیمہ نے اس کی سرد پیشانی اور نیلے ہونٹوں کو محسوس کیا اور ان پر مہر مادری کی مہر لگا دی۔ وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی، دیر تک اس کے ہاتھوں کو چومتی رہی، زرد رخساروں کے بیشمار بوسے لئے ـــــ پھر ایک وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور پھر گھر سے باہر نکل گئی ـــــ وہ پاگل ہو گئی ـــــ اس [illegible]

جس کے لیۓ اس نے دنیا کے بیدردانہ مظالم سہے تھے۔ اپنے ہی عزیزوں کی لعن طعن سنی تھی۔ آہ! وہ جا چکا تھا۔ اس کی زندگی کا آخری سہارا شوہر کی موت کے بعد عورت کی زندگی کا آخری سہارا اس کی اولاد ہوتی ہے۔ اگر عورت اس کو بھی کھو دے تو وہ خودکشی نہ کرے تو اور کیا کرے۔ تھوڑی دیر تو وہ موت کے بعد سے سکتہ سا ہو گیا تھا لیکن لوگوں نے جب بار بار اس کی توجہ بچے کی طرف منعطف کروائی تو وہ اپنے ہوش میں آ گئی تھی اور بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ کر اتنا روئی کہ عرش والے بھی ششدر ہو کر رہ گئے ہوں گے لیکن آج وہ کس کے لئے زندہ ہے۔ کیا پایا اس نے؟ اس دنیا کے لیے جس نے اسے ٹھکرایا تھا جس نے اس کے دکھ میں اپنی زبان کے تیر و نشتر چلا چلا کر دو بھی اضافہ کیا تھا جو اس کے شوہر اور بچے کی موت کا باعث بن گئی ہو۔ وہ سوسائٹی کے اصولوں سے واقف تھی۔ اس کی نامی اس کی چیخیں "فضا میں ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ جو تمام ظالم سماج پر ایک طنز تھی۔ آہ ہا ہا! میرے لال! تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے"۔ "اچھا کیا، بہت اچھا کیا، ورنہ تمہارے باپ اکیلے رہ جاتے گھبراؤ نہیں میں بھی تمہارے پیچھے آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک موٹر کے سامنے آ گئی۔ موٹر کی رفتار بہت تیز تھی لیکن سلیمہ کے دل کی رفتار اس سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ ڈرائیور نے کئی ایک ہارن دئے آخر میں مغلظات پر اتر آیا۔ بہری ہے یا قضا کھینچ کے لائی ہے گھنٹہ بھر سے ہارن دے رہا ہوں سنتی ہی نہیں۔ مرنا ہے تو زہر کھا کر مر۔ تم ہمیں کیوں کوتوالی کے پھندے میں پھنساتی ہے۔

موٹر پر بیٹھے والے حضرات نے جو یہ شور و غل سنا کر جھانکا اور ڈرائیور سے کہا۔ چلاؤ بھی یار، تم بھی نرے ڈرپوک اور پرلے درجے کے بیوقوف ہو۔ اگر اسے اپنی جان کی پرواہ ہوگی تو خود ہی ہٹ جائے گی۔ عموماً عورتیں بہت سخت جان ہوتی ہیں تم دیکھ لینا اس کے چوٹ بھی نہ آئے گی۔ لیکن افسوس کہ ان کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ اور اس بیچاری کی روح پہیے کے ایک زوردار گھماؤ کے ساتھ ہی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس میں قوت ہی کیا تھی۔ مسلسل فاقہ کشی اور سونے پر سہاگہ بچے کی تیمارداری اور پریشانی اور اب ایک ہلکی سی ضرب بھی اس کے رابطۂ زندگی کا تار تار کرنے کو کافی تھی۔ وہ اس پاپی بے رحم دنیا سے جا چکی تھی۔ اپنے معبود حقیقی کے پاس۔ ستم کی فریاد کرنے کے لئے ۔۔۔ کہ اس دنیا میں کسی دکھیا غریب کی موت بھی سرمایہ داروں کے لئے تفریح ہے۔ وہ اپنے معبود سے اس ناانصافی اور ستم کا شکوہ کرے گی۔ جنٹلمین صاحب کے ساتھ ایک میم صاحبہ بھی تشریف فرما تھیں جو چیخ کی دلدوز آواز کے ساتھ ہی اوہ! مائی گاڈ! کہہ کر جھانکیں اور پھر یہ دیکھ کر کہ چیخنے والی کا ساز حیات خاموش ہو چکا ہے، "اوہ! پور تھنگ ڈائیڈ (غریب بیچاری مر گئی) کہہ کر ایک ادائے نسوانیت سے اچھلیں تو ان جنٹلمین کی عینک کو بھی اپنے ساتھ لے گھسیٹا۔ پھر خجل کر ڈرائیور کو کہا کہ موٹر کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی جائے تاکہ مقام واردات پر پولیس اور پبلک جمع نہ ہونے پائے۔ موٹر کے پہیے ایک سماج کی ٹھکرائی ہوئی بیوہ کو کچل کر پھر تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ یہ ہے ہماری سماج کا سلوک کمزور اور بے بس ہستیوں کے ساتھ۔

بقول نور تحسین صاحب:-

"وہ سماج جو طاقتور کے سامنے دم نہ مارے
اور کمزور کو آنکھیں دکھائے۔ یہاں تک کہ
اس کا جینا دشوار کر دے۔ قابل صد نفرین ہے
وہ سماج جو انسانی حقوق کو غصب کرے خواہ
وہ صنف نازک کے حقوق ہی کیوں نہ ہوں"

کب تک ہماری سماج کمزوروں پر ظلم کرے گی۔ آخر کب تک سوسائٹی ایک بیوہ اور یتیم کے ساتھ یہی سلوک روا رکھے گی۔ اے سماج کے ٹھیکیدارو! کیا تمہارے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل نہیں؟ اگر ہے تو تمہیں احساس کیوں نہیں۔ کیوں ایک ہی محلے کے رہنے والوں میں مفلسی اور تونگری کا اتنا زبردست تفاوت ہے۔ کیوں ایک گھر میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور کیوں اس کے مقابل کی ہی زندگی سسک سسک کر آہیں بھر بھر کر دم توڑ رہی ہے۔ کیوں ایک فرقہ عیش و طرب میں، ناز و نعم میں زندگی گزارتا ہے تو دوسرا کیوں اس قدر مفلوک الحالی، پریشانی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتا ہے۔ کیوں خدا کی مخلوق کے دل میں جسے دنیا عیسیٰ مسیح سمجھتی ہے جذبۂ ہمدردی نہیں، ایثار نہیں۔ کیوں وہ ایک نادار مریض کو مفلس مریض پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے نا کہ وہ فیس نہیں دے سکتا۔ صحت یاب ہونے کے بعد ایٹ ہوم نہیں دے سکتا۔ ریڈیو سیٹ یا موٹر بطور تحفہ نہیں دے سکتا۔ لیکن کیا حقیقت اور انصاف پسند طبیبوں کا یہی لائحۂ عمل ہے کہ وہ جسے چاہیں از سر نو حیات بخش دیں اور جسے چاہیں موت کی پُرخار وادی میں قبل از وقت دھکیل دیں انسانی زندگی کو ایک کھیل سمجھیں۔ بولو! کیوں تمہاری حمیت اتنی گر گئی ہے کہ تم سیم و زر کے چند ٹکڑوں کی خاطر انسانی زندگی کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتے ہو۔ کیا تم کسی کے باپ، بھائی، بیٹے نہیں ہو؟ اگر ہو تو پھر تم میں دوسروں کے درد کا احساس کیوں نہیں۔ کیا تم انسانی زندگی کے رگ و ریشے سے اسلئے واقف ہوتے ہو کہ اس کا علم تمہیں تلاش معاش سے بے نیاز کر دے۔ میڈیکل کالج میں شریک ہونے سے قبل تمہیں

[illegible] سامنے کہ [illegible] روزی کمانے کا ذریعہ [illegible] سے کہیں زیادہ مخلوق خدا کی خدمت اور ہمدردی کا ہے۔ جا! ہم [illegible] ایک [illegible]

گھر کے جھگڑے

آج کل جدھر دیکھئے جھگڑے نظر آتے ہیں کہیں مزدور اور سرمایہ دار جھگڑ رہے ہیں تو کہیں مظلوم اور ظالم میں کشمکش جاری ہے۔ ایک طرف حاکم و محکوم میں رسہ کشی ہو رہی ہے تو دوسری طرف زبردست و زیردست میں جنگ ہو رہی ہے غرض ہر طاقت دوسری طاقت سے برسرِ پیکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا یہ کارخانہ جھگڑوں کا بازار بن گیا ہے۔ جھگڑوں کا بانی ابلیس ہے جس نے ابتدا میں یہ جھگڑا شروع کیا تھا اور شاید دنیا شیطان کے بہکانے میں آگئی ہے۔ دنیا جھگڑوں کا گھر ہے لیکن اس وقت دنیا کے جھگڑوں سے زیادہ توجہ کے محتاج گھر کے جھگڑے ہیں۔ آئیے اب ہم اپنی روزمرہ زندگی کا جائزہ لیں — جب ہم لوگ اپنی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میاں بیوی میں ٹھنی ہے تو کہیں ساس بہو میں اُلجھن پڑی ہے کسی جگہ داماد و خسر میں کھنچاؤ ہے تو کہیں باپ بیٹوں میں ان بن ہے۔ ادھر چھوٹے بھائی بڑوں میں جوتی پیزار چل رہی ہے تو اُدھر پڑوسیوں میں تو تو میں میں ہو رہی ہے۔ اسی لئے ہمیں جھگڑوں کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ہے۔ یہ جھگڑے آخر ہوتے کیوں ہیں؟ پھر یہ کیسے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔

اگر ہم ان جھگڑوں کے اسباب پر غور کریں تو اُن کی تہ میں انسان کی معمولی کمزوریاں نظر آئیں گی۔ جہالت فساد کی جڑ ہے۔ اسی سے انسان میں غصہ اور نفرت، بدکلامی اور بدسلوکی، غلط فہمی اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے پہل آپ کو یقین نہ آئے گا کہ کیا واقعی جہالت انسان کو اتنا نقصان پہنچا سکتی ہے! آپ نے بڑی بوڑھی عورتوں سے یہ کہانی ضرور سنی ہوگی کہ کس طرح ایک جاہل آدمی نے طیش میں آکر اپنی بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ کوئی صاحب مونچھوں پر تاؤ دیتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی اس حرکت کو کسی خان صاحب نے دیکھ لیا۔ کہنے لگے "میاں تمھیں کیا حق ہے کہ میرے آگے مونچھوں کو تاؤ دیں"۔ راہ چلتے نے جواب دیا "خان صاحب! جس طرح آپ مونچھیں رکھ سکتے ہیں ویسے میں بھی مونچھیں رکھنے کا حق رکھتا ہوں۔ رہا میرا مونچھوں کو تاؤ دینا، بھئی آپ ہی بتائیے اس سے آپ کو کیا نقصان پہنچا؟" اتنی سی بات پر خان صاحب طیش میں آگئے۔ کہنے لگے "میرے سامنے مونچھوں کو تاؤ دینے کی ہمت۔ اگر ہمت ہے تو آؤ، دو دو ہاتھ کر لیں"۔ یہ کہہ کر خان صاحب نے اپنی تلوار میان سے نکال لی۔ ہوشیار راہ گیر نے خان صاحب سے کہا "بھائی! میں آپ کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں، لیکن اگر ہم دونوں میں سے کوئی کٹ مرے تو اُس کی بیوی اور بچے یتیم ہو جائیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے دونوں اپنی اپنی بیویوں اور بچوں کو قتل کر دیں اور اس کے بعد جی کھول کر لڑیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دونوں نے اپنی بیویوں اور بچوں کو قتل کیا ہے، طے پایا کہ قتل کرنے کے بعد خون میں کپڑا رنگ لیں"۔ غرض دونوں اسی مقام پر واپس آنے کا وعدہ کر کے چل کھڑے ہوئے۔ خان صاحب جذباتی تھے۔ سیدھے گھر گئے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس بے گناہ بیوی اور معصوم بچوں کی جانیں لیں۔ خان صاحب غصہ کی آگ کو خون کے دھارے میں بجھا کر اسی مقام پر آ پہنچے۔ خان صاحب کا حریف بھی اُس وقت تک آچکا تھا۔ وہ بڑا چلتا پرزہ تھا۔ اُس نے کبوتر کے خون میں کپڑا ڈبویا، اور اِدھر اُدھر گھوم کر پھر وہیں آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ دونوں نے شہادت کے طور پر خون میں لتھڑا ہوا کپڑا دکھلایا۔ خان صاحب کو یقین آگیا کہ اُس نے بھی میری طرح اپنی بیوی اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا لیکن اس راہ چلتے کو معلوم تھا کہ خان صاحب جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ ضرور انھوں نے اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کر دیا ہوگا۔ اب اُس نے خان صاحب سے سوال کیا کہ بھائی یہ تو بتائیے کہ

ہم دونوں میں جھگڑا کس بات کا ہے؟ خان صاحب نے جواب دیا کہ ”مجھے آپ کا مونچھوں کو تاؤ دینا پسند نہیں“۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زید نے خان صاحب سے کہا ”تو لیجیے میں خود اپنی مونچھیں نیچی کئے دیتا ہوں“۔ اتنی سی بات پر خان صاحب خوش ہو گئے اور یہ سمجھ کر کہ میری جیت ہوئی ہے، راہ چلنے کو چھوڑ دیا ...... اب آپ ہی بتائیے کہ حقیقت میں جیت کس کی ہوئی؟ کیا جہالت نے بیوی بچوں کو قتل نہیں کروایا؟ کیا جہالت نے غصہ کی آگ کو بھڑکا کر خون سے اپنی پیاس نہیں بجھائی؟ ... غرض یہ ہے کہ ہمیشہ جہالت ہی نے خاندانوں کو تباہ و تاراج کیا ہے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ بعض تعلیم یافتہ حضرات اور خواتین میں بھی جہالت پائی جاتی ہے۔ تعلیم پانے کے بعد بھی بعض لوگ اپنے کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں اور اس احساس برتری سے جھگڑے ہوتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب اولاد والدین کو نیچی نظروں سے دیکھنے لگے، جنھوں نے خون پسینہ ایک کرکے تعلیم دلوائی، تو گھر کے نظام میں انتشار ہونا ضروری ہے۔ تعلیم دلوانے والے والدین کو کمتر سمجھنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہاں جہالت جھگڑوں کی بانی ہے۔

جہالت کا ایک لازمی نتیجہ غصہ ہے، جس سے جھگڑا پیدا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان غصہ میں آتا ہے تو اس کے جذبات ذہن پر غالب آجاتے ہیں۔ عقل سے زیادہ جذبہ کام کرنے لگتا ہے۔ ایسے وقت انسان اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ غصہ سے انسان بددماغ ہو جاتا ہے، وہ ذرا سی بات پر جھگڑنے لگتا ہے۔ غصہ ایک آگ ہے جو گھر کے سکون کو تنکے کی طرح تھا... ... لا دیتی ہے۔

خاص طور پر معمولی باتوں ہی پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ اکثر گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ میاں بازار سے بڑی محنت کر کے بیوی کے لئے کپڑے خرید کر لاتے ہیں، لیکن بیوی میاں کی دوڑ دھوپ کی قدر کرنے کی بجائے کپڑوں کو ناپسند کر دیتی اور بلا سوچے سمجھے یہ کہہ دیتی ہے کہ ”تم سے تو کبھی مال خریدنا نہ آیا“۔ ظاہر ہے کہ شوہر پر اس کا رد عمل برا ہوگا، اور وہ یا تو بیوی کے لئے آئندہ کوئی چیز نہیں خریدے گا، یا اس سے نفرت کرنے لگے گا، جس سے جھگڑوں کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ شوہر جب دفتر سے تھکا ماندہ گھر واپس آتا ہے تو بیوی گھر کا دکھڑا شروع کر دیتی ہے کہ فلاں نے یوں برا بھلا کہا، پڑوسن کے بچے نے ان کے بچے کو خوب پیٹا، گھر میں بڑے بچے نے چھوٹے بچے کو تھپڑ رسید کیا، وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام دکھڑوں کو سن کر میاں کا بدمزاج ہو جانا یقینی ہے۔ یہ بدمزاجی گھر کے سکون کو ختم کر دیتی ہے۔

بعض اوقات گھر کے جھگڑے بے توجہی سے شروع ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میاں گھر سے باہر جا رہے ہیں، ایسے وقت اگر بیوی ان سے پوچھے کہ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اور اگر میاں یہ جواب دے کہ ”ہم کہیں بھی جا رہے ہیں آپ کو اس سے کیا!“ تو یہ معمولی بے توجہی میاں بیوی کے تعلقات کو بری طرح متاثر کرے گی اور دونوں میں رنجش پیدا ہونا یقینی ہے۔ اسی طرح اگر ماں بیٹے سے یہ پوچھے کہ ”بیٹا، تم کونسی کتاب پڑھ رہے ہو؟“ اور اس کا بیٹا اگر یہ کہہ دے کہ ”یہ کتاب آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی، پھر کیا بتاؤں“ تو اس بے توجہی سے جھگڑوں کی بنیاد پڑے گی۔

گھر کے اکثر جھگڑے بدگمانی سے ہوتے ہیں۔ ساس بہو کے جھگڑے اسی بدگمانی کا نتیجہ ہیں۔ ماں سمجھتی ہے کہ جب سے بہو آئی ہے، اس کا بیٹا جس کو اس نے پال پوس کر بڑا کیا، چھن گیا۔ اس کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اب اس کا بیٹا اس سے زیادہ بیوی سے محبت کرتا ہے، اس لئے وہ بہو سے بدگمان ہو جاتی ہے کہ اس نے لگا بجھا کر اس کے بیٹے کو اپنا بنا لیا۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ ساس اپنے مقابلے میں بہو کو کم سمجھ اور کمتر سمجھتی ہے، جس سے بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔ بہو دیکھتی ہے کہ نئے گھر میں شوہر کے سوا سب اس کے لئے نئے ہیں، اس لئے وہ شوہر ہی کے آگے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی ہے۔

بعض اوقات شوہر کے ظلم پر بہو ساس سے [illegible] تو بھی بڑی ہے [illegible] سے تعلقات روز بروز بگڑتے جاتے ہیں۔ اگر بہو اپنے شوہر سے زیادہ ساس کی دلجوئی کرے اور اسی طرح ساس بہو کو اپنے بیٹے سے زیادہ چاہنے لگے تو گھر کے جھگڑے بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

گھر کے جھگڑے چھوٹی بڑائی سے بھی ہوتے ہیں۔ اکثر بیبیاں سسرال میں بڑی [illegible] بنتی ہیں جیسے میکے میں وہ سونے کے جھولے میں جھول رہی تھیں۔ اگر بیوی سسرال کی بجائے میکے کو اپنا گھر سمجھے تو اس گھر میں ضرور جھگڑے ہوں گے۔ جب بیوی میکے ہی کی بڑائی کرتی ہے تو میاں اس بڑائی سے رنج ہو کر میکے اور بیوی سے بدظن ہو جاتا ہے اور گھر جھگڑوں کا مرکز بن جاتا ہے۔

جھگڑوں کا ایک اور سبب فضول خرچی ہے۔ فضول خرچی انسان کو مقروض بنا دیتی ہے اور قرض انسان کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ اکثر گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ میاں کی [illegible] سو روپیہ ہے اور ان کی بی بی اپنی آرائش و زیبائش پر فضول خرچی کر رہی ہیں۔ یہ فضول خرچی پہلے پہل برداشت کر لی جاتی ہے اور جب وہ اپنی حد سے گذر جائے تو میاں بیوی کے تعلقات کا بگڑنا یقینی ہے۔

جھگڑوں کا ایک اہم سبب جھوٹ ہے، وہ رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ جھوٹ، جھوٹ کا گھر ہے۔ لگائی بجھائی اس کا پیشہ ہے۔ سسرال اور میکے کی لڑائیاں اسی سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر بیوی اپنے ماں باپ کو غلط طور پر یقین دلا دے کہ شوہر اور ساس اس پر ظلم کر رہے ہیں، اور اگر اس کے ماں باپ ان جھوٹی باتوں کو سچ مان لیں تو سسرال اور میکے میں جھگڑے ہونا ضروری ہیں۔

جن گھروں میں جھگڑے ہوتے ہیں، وہاں دیکھا گیا ہے کہ لڑکے گھر میں نہیں رہتے بلکہ اپنا سارا وقت باہر گزارتے ہیں۔ غرض جس گھر میں سکون نہیں، وہ گھر نہیں جہنم ہے۔

سعید و سلطانہ

(دنیا سلکی نشر گاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا)

فیضِ نگاہ

مریخ و مشتری و قمر دیکھتا ہوں میں
ہے ارض میں! یہ آج کدھر دیکھتا ہوں میں

اہل نگاہ ہونا کوئی توقیر ہی کیا؟
فیض نگاہ ہے کہ [illegible] دیکھتا ہوں میں

افتادگی قطرۂ شبنم کا یہ اثر!
سارے چمن پہ رنگ دگر دیکھتا ہوں میں

سب تیرگی میں نور سحر دیکھتے ہیں اور
روشن تیری [illegible] سحر دیکھتا ہوں میں

ہوتی نہیں نگاہ محقق بہ طرز عام
ہر چیز کو بہ طرز دگر دیکھتا ہوں میں

پیہم ہر ایک شے پہ ادائے نمود حسن!
کہتے ہیں دیکھ [illegible] دیکھتا ہوں میں

پایان کار ہی ہو آغاز کار کیوں؟
سارا نظام زیر و زبر دیکھتا ہوں میں

گرم ستیز شبنم برگ سمن سے آج!
خورشید تابدار سحر دیکھتا ہوں میں

منزل مرے قدم پہ قربان جائے کیوں؟
منزل پہ آ کے اور ادھر دیکھتا ہوں میں

اف! اہل ہند اور نہیں ساتھ اے قمر
کس پر پڑی ہے تیری نظر دیکھتا ہوں میں

قمر

خواتین کے مسائل

انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے قدرت نے مرد اور عورت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ ہماری زندگی کی گاڑی دونوں کے تعاون عمل سے چلتی ہے۔ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ لیکن ہر ایک کی ذمہ داری بالکل علیحدہ ہے۔ جس طرح ان کی ذمہ داری مختلف ہے اسی طرح ان کے مسائل بھی جدا جدا ہیں۔ مرد کے ذمہ روزی حاصل کرنا ہے جس پر رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، غرض کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا دارومدار ہے۔ اگر مرد فکر معاش نہ کریں تو پھر زندگی کے نظام میں خرابی پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے مرد اپنا سارا وقت روزی فراہم کرنے میں صرف کرتے ہیں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ روزی فراہم کرنے کے علاوہ دوسرے معاملوں پر توجہ کریں۔ اس لئے خواتین پر یہ اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مرد کی کمائی کو ایسے سلیقے سے صرف کریں کہ گھر کی اور باہر کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ یعنی نہ صرف اپنے بچوں اور دوسرے متعلقین کی وقتی ضرورتیں پوری ہوں، بلکہ ناگہانی مشکلوں دکھ درد، شادی بیاہ، بے کاری و بے روزگاری، خیر خیرات وغیرہ کے لئے بھی حسب حیثیت انتظام رہے۔ خواتین کی یہ ذمہ داری اس قدر اہم ہے کہ اکثر خاندانوں کی خوش حالی و تباہی ان کی خوش انتظامی و بدانتظامی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ روزمرہ کے تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو عورتیں اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا طریقہ جانتی ہیں، ان کے مرد اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ روزی کمانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جو کوئی اس طرح اپنے کام میں لگا رہتا ہے وہ اپنے پیشہ میں کافی ترقی کرتا ہے۔ گھر کے باہر بھی وہ عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا اور گھر کے اندر اپنے اہل و عیال کو خوش و خرم دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی گھر دنیا میں جنت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن جو عورتیں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا طریقہ نہیں جانتیں ان کی وجہ سے بھرے گھر بھی چند دنوں میں خالی ہو جاتے ہیں اور ان کے مردوں کی کمائی میں روز بروز کمی ہونے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ بے کاری و بے روزگاری، دکھ بیماری، افلاس و محتاجی کا منہ دکھاتی ہے، اور وہ بھرے گھر جیتے جی جہنم بن جاتے ہیں۔

خواتین کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ انتظام خانہ داری کا ہے، اور نظام خانہ داری کی درستی ہی سے زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔ اس کی بالکلیہ ذمہ داری خواتین پر عاید ہوتی ہے۔ خواتین کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنے گھر کا ایسا انتظام کریں کہ زندگی خوشگوار بن جائے۔ بظاہر یہ مسئلہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن ذرا سی ہوشیاری اور اصولوں کی پابندی سے کام لیا جائے تو یہ مشکل نہایت آسان ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ گھر والوں کی حیثیتیں جدا جدا ہیں اس لئے گھروں کے انتظام کی نوعیتیں بھی مختلف ہیں۔ مثلاً جن گھروں میں نوکر چاکر، خادمائیں، مامائیں ہوتی ہیں، ان گھروں کی گھر والیوں کی ذمہ داریاں ان گھر والیوں سے علیحدہ ہوتی ہیں جن کو گھر کا سارا کام کاج خود کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض گھر ایسے بھی ہیں جن میں صرف میاں بیوی ہیں، اور بعض گھر رشتہ داروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تاہم نظام خانہ داری کی کامیابی چار چیزوں پر منحصر ہے، وقت کی پابندی، کفایت شعاری، قناعت، خوش خلقی، یہ گویا نظام خانہ داری کے چار ستون ہیں جن پر خانہ داری کی عظیم الشان عمارت قایم ہے۔ اگر اس میں سے کوئی ایک ستون بھی کمزور ہوگا تو جلد یا بدیر سارا نظام خانہ داری خطرہ میں پڑ جائے گا۔

نظام خانہ داری کی کامیابی کے سلسلہ میں وقت کی پابندی نہایت ضروری امر ہے، لیکن وقت کی پابندی طرح

بہنوں کو نہایت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جب بہنوں سے اس کے متعلق کہا جاتا ہے تو اکثر بہنیں کہہ دیتی ہیں کہ ایک سر ہزار سودے، ایک دو کام ہوں تو کوئی وقت کی پابندی کر سکتا ہے، یہاں تو ایک جان اور سو کام۔ وقت کی پابندی کی جائے تو کیوں کر؟ یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن ہماری بہنوں کو جان لینا چاہیے کہ مختلف کاموں کے لئے اگر وقت کو تقسیم کر دیا جائے تو اس سے نہ صرف سب کام وقت پر تکمیل پائیں گے بلکہ ضروری آرام کے لئے فرصت بھی مل جائے گی۔ اکثر کام ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ وقت پر نہ ہوں تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے، اور عموماً ایسے خطرناک نتایج برآمد ہوتے ہیں کہ گھر کا چین اور آرام ہی چھن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ کوئی صاحب کسی دفتر میں ملازم ہیں اور ٹھیک دس بجے دفتر کی حاضری ہے، لیکن بیوی وقت پر کھانا تیار نہیں کرتیں۔ ایسی صورت میں یا تو وہ صاحب دیر سے دفتر پہنچیں گے یا بھوکے چلے جائیں گے۔ اگر دیر سے دفتر پہنچے تو ملازمت پر حرف آئے گا اور بھوکے چلے گئے تو بھوک کی حالت میں کام دلجمعی سے نہ ہوگا، اور اگر یہ صورت مستقل ہو گئی تو کیا عجب ہے کہ ملازمت ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے علاوہ اگر شوہر ہوٹل میں کھانے کا عادی ہو جائے تو نہ صرف وہ رقم جو گھر میں صرف ہونی چاہیے باہر صرف ہوگی، بلکہ صحت پر بھی بازاری کھانے کی وجہ برا اثر پڑے گا۔ اس لئے پابندی وقت نہ صرف اپنی آسانی و کامیابی کے لئے لازمی ہے بلکہ گھر کی خوش حالی کو برقرار اور شوہر کی کمائی کو قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

پابندی وقت کے بعد سب سے اہم اور ضروری چیز کفایت شعاری ہے، لیکن کفایت شعاری کے معنی بُخل نہیں۔ بُخل اور کفایت شعاری میں بہت بڑا فرق ہے۔ کفایت شعاری کا صحیح مطلب یہ ہے کہ قلیل سے قلیل آمدنی کو اس عمدگی سے صرف کیا جائے کہ تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں اور کوئی ضرورت باقی نہ رہنے پائے۔ روپیہ بچانے کی خاطر زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہ کرنا بخل سے لگ بھگ ہے۔ کفایت شعاری میں صرف اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ پیسہ کی چیز سوا پیسہ کا کام دے۔ عام طور پر گھر کی معمولی چیزیں جس کو ناکارہ سمجھ کر ضایع کر دیا جاتا ہے اگر سمجھ بوجھ سے کام لے کر ان کو کارآمد بنائیں تو بہت کچھ بچت ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ بیان کرتی ہوں: ایک بہن کو دیکھا کہ ان کے پاس وضو کرنے کی ایک چوکی پائے بوسیدہ ہونے کی وجہ ٹوٹ گئی تھی۔ خادمہ نے رائے دی کہ اس کو جلا دیا جائے، ناحق کوڑا جمع کرنے سے کیا فایدہ۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اگر کوئی بڑھئی ادھر سے گزرے تو بلا لینا، چنانچہ انھوں نے اس ٹوٹی ہوئی چوکی کے کارآمد تختوں سے چراغ رکھنے کی تپائی اور آٹا گوندھنے کے جو کھٹے تیار کر لئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خادمہ کے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو اس کی لکڑی زیادہ سے زیادہ دو پیسے کے ایندھن کا کام دیتی، لیکن چار چھ آنے خرچ کر کے اسی لکڑی سے کارآمد چیزیں تیار کر لی گئیں۔ غرض اس طرح چیزوں کو بے کار ہونے سے بچانے اور بے کار چیزوں کو کارآمد بنانے کا نام کفایت شعاری ہے۔ اس سلسلے میں ہماری بہنیں بڑی غفلت برتتی ہیں اور بے کار چیزوں کو کارآمد بنانا کسرِ شان سمجھ کر خواہ مخواہ اسراف میں مبتلا ہو جاتی ہیں، جس کا اثر مردوں کی آمدنی پر پڑتا ہے اور وہ ان کی لاپروائی سے مقروض ہو جاتے ہیں جس کی وجہ ان کو سخت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ ہماری بہنوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو قرض میں مبتلا نہ ہونے دیں اور جو کچھ آمدنی ہو اسی کو اس سلیقہ سے صرف کریں کہ گھر کی جملہ ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

کفایت شعاری کے بعد قناعت ہی سچی مسرت کی کنجی ہے۔ قناعت کے نہ ہونے سے عورتوں اور مردوں کا اطمینان و سکون چھن جاتا ہے اور زندگی کا لطف ہی جاتا رہتا ہے۔ اکثر بہنیں اپنے سے زیادہ حیثیت والی خواتین کو دیکھ کر خود بھی ان جیسی بننے کی آرزو کرتی ہیں، لیکن چونکہ ان کے شوہروں کی آمدنی بڑھیا حیثیت کی چیزیں فراہم

کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اسی لئے ان بیویوں میں بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی بدسلیقگی سے گھر کے نظام پر پڑتا ہے، جس کی وجہ اچھے خاصے بنے بنائے گھر بگڑ جاتے ہیں۔ اس لئے ہماری بہنوں کو یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ دنیا میں کثرت ان لوگوں کی ہے جن کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے ٹکڑا اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا نہیں اس لئے شکر کا مقام ہے کہ وہ عزت کے ساتھ روکھا سوکھا کھا لیتی ہیں اور موٹا جھوٹا پہن لیتی ہیں۔ ہماری بہنوں کا فرض ہے کہ مردوں کی محنت و جاں فشانی اور خود اپنی انتہائی خوش نظمی و کفایت شعاری کے بعد جو کچھ انہیں حاصل ہوا ہے اس پر اللہ کا شکر کریں اور اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ اگر کم حیثیت والی بہنیں بڑی حیثیت والی بہنوں کو دیکھ کر خود بھی حرص کرنے لگیں تو زندگی کی حقیقی لذت، جو قناعت میں پوشیدہ ہے مفقود ہو جاتی ہے لیکن قناعت کے معنی یہ نہیں کہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ سچی قناعت تو یہ ہے کہ محنت، کوشش اور کفایت شعاری کے بعد جس حالت میں رہیں اس کو غنیمت سمجھیں۔

پابندئ وقت، کفایت شعاری و قناعت کے ساتھ اگر خوش خلقی نہ ہو تو نظام خانہ داری کی کامیابی خطرے میں پڑ جائے گی۔ گو بظاہر خوش خلقی کا تعلق خانہ داری سے زیادہ اخلاقیات سے متعلق نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوش خلقی نہایت ضروری چیز ہے۔ ہماری بہنوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر وہ محنت سے کام کریں، وقت کی پابندی کا خیال رکھیں، کفایت شعاری اور قناعت پر بھی عمل کریں، لیکن اگر مردوں اور گھر والوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش نہ آئیں تو ان کا سب کچھ کیا دھرا اکارت ہو جائے گا کیونکہ ان کی بدخلقی سے مردوں کا اور دوسرے گھر والوں کا دل ٹوٹ جائے گا اور اس کا اثر مرد کی کمائی پر بھی پڑے گا۔ مرد کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا اور اس کی دلجوئی کرنا اس کو دوسرے دن کی محنت کے لئے تازہ دم کرتا ہے۔ جو بہنیں خوش خلقی برتتی ہیں ان سے نہ صرف ان کے شوہر بلکہ تمام گھر والے اور ملنے جلنے والے سب ہی خوش ہوتے ہیں اور ہر ایک کو ان سے مل کر مسرت ہوتی ہے۔

(نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

ثریا جبین

حیوان سے انسان تک!

(حیاتیات کی روشنی میں)

آج سے لاکھوں برس پیشتر کا ذکر ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام و نشان تک نہ تھا اور زمین اس قدر گرم تھی کہ اس پر کوئی جان دار زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ زمین کی حرارت میں انتشار ہوتا گیا اور اس کا درجۂ حرارت کم ہو گیا جس سے اس کی سطح سرد ہو کر سکڑنے لگی۔ اس لیے اس پر بڑی چٹانیں اور دراڑیں پڑ گئیں۔ کچھ مدت کے بعد ہوا سے بخارات نے پانی کی شکل اختیار کر کے ان گڑھوں اور نشیبی حصوں کو پُر کر دیا۔ اب زمین اس قابل ہو گئی کہ اس پر زندگی کے وجود کا آغاز ہو سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ زندگی پانی کے اندر وجود میں آئی اور اس کی ابتدا قدیم کے سمندروں میں ہوئی کیونکہ یہی حصے سب سے پہلے ٹھنڈے ہوئے۔

ماہرین علم ارتقا کا خیال ہے کہ مادۂ حیات [illegible] یعنی وہ مادہ جس سے کہ زندگی وجود میں آئی بے جان مادہ میں کیمیاوی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ مادہ حیات دراصل ایک پیچیدہ ترین مرکب ہے جو کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، گندھک وغیرہ عناصر پر مشتمل ہے۔

ابتدا میں جان دار صرف ایک خلیہ (Cell) پر مشتمل تھے۔ ان کی شکل و شباہت بکٹیریا یا جراثیم کی طرح تھی۔ بعض یک خلوی جراثیم جن کی زندگی ہوا، پانی اور پانی میں حل شدہ نمکوں پر قائم تھی یہی ادنیٰ اور ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قسم کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوئے۔ پھر ان میں سبزی پیدا ہوئی۔ یہی سبز مادہ ہے جس کی وجہ سے درختوں کے پتے سبز رنگ کے دکھائی دیتے ہیں۔ مادہ حیات کے کیمیائی عمل سے یہ سبز مادہ ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں حل شدہ معدنی اشیاء سے پودوں کی غذا تیار کرتا ہے۔ اس قسم کے ادنیٰ جراثیم سے عالم نباتات وجود میں آیا۔

بعض یک خلوی جراثیم کی قسم کے جان دار جن میں سبز مادہ پیدا نہ ہوا اور جس کے بغیر وہ اپنی خوراک تیار کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، انھوں نے اپنی غذا کا سامان بنا لیا۔ ان سبز مادہ نہ رکھنے والے جراثیم کی قسم کے جان داروں سے عالم حیوانات ظہور پذیر ہوا۔

مسلسل تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مادہ حیات کے عناصر کی ترکیب کیچڑ میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عالم حیوانی میں سب سے پہلی، ابتدائی اور سادہ ترین مخلوق جس کو امیبا (Amoeba) کہا جاتا ہے، کیچڑ یا ساکن پانی کے ذخیروں کی تہوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں نشوونما پاتا ہے۔

امیبا کی ساخت پر غور کیجیے۔ بالکل ادنیٰ، غیر ترقی یافتہ اور ابتدائی جان دار مخلوق ہے۔ اس کا جسم ایک خلیہ پر مشتمل ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ہر کام انجام دیتا ہے یعنی حرکت، غذا، ہضم اور تنفس۔ بے کار مادہ یعنی فضلہ جسم سے خارج کرتا ہے۔ بیرونی اثرات محسوس کرتا ہے اور تولید یا پیدائش سے اپنی نسل کو بڑھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تقسیم کار کا جو بنیادی اصول ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کے حیوانات میں پایا جاتا ہے امیبا اس سے محروم ہے۔ ابتدا میں امیبا، یا اسی قسم کے بعض دوسرے جان دار اپنی حالت پر قائم رہے۔ رفتہ رفتہ بعض اپنے ماحول کی تبدیلیوں کے باعث

بدلنے لگے۔ پس ان کے اندر کئی قسم کے جسمانی تغیرات رونما ہوتے گئے۔ چنانچہ طویل مدت کے بعد ایک خلوی جان داروں سے ایسی مخلوق معرض وجود میں آئی جن میں جسم متعدد خلیوں سے بنا ہوا تھا۔ امیبا کو اگر یک خلوی جان دار کہا جائے تو یہ "کثیر خلوی جان دار" ہوئے۔ یہ خلوی جان دار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنی بستیاں بنا کر رہنے لگے تاکہ بیرونی خطرات سے محفوظ رہیں اور زیادہ آسانی سے ترقی کے مدارج طے کرسکیں۔ یہ ابتدائی زندگی سالہا سال نئے نئے تغیرات اور نئی نئی تبدیلیوں کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس میں طرح طرح کی رنگینیاں اور گوناگوں قسمیں پیدا ہوتی گئیں۔ ایک خلوی امیبا سے بہت کثیر خلوی جان دار، حلقہ دار کیچوے اسفنج، مونگے، کیڑے مکوڑے، ریڑھ کی ہڈی والے ادنیٰ اور اعلیٰ حیوانات پیدا ہوتے گئے اور اپنے اپنے مخصوص ماحول میں زندگی گزارنے لگے۔ ماہرین علم حیاتیات نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کرلیا ہے کہ ایسا ہی مختلف مدارج ارتقا طے کرتا ہوا انسان کی ساخت اختیار کرلیتا ہے۔ گویا پیچیدہ ترین ساخت کا جان دار "انسان" سادہ ترین جان دار امیبا کی ترقی یافتہ شکل ہے!

غور کیا جائے تو سب جانور اپنی اندرونی ساخت کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہیں: (۱) "صلبی" یا ریڑھ کی ہڈی والے جانور۔

(۲) "غیر صلبی" یا ریڑھ کی ہڈی کے بغیر جانور۔

"صلبیے" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے، جو پسلیوں کے ڈھانچہ کا مرکزی سہارا اور مجموعہ ہوتی ہے۔

"غیر صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کا ڈھانچہ نہ ہو۔

علم حیاتیات کے سرسری مطالعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ وہ جان دار جن کے جسم ریڑھ کی ہڈی اور ڈھانچہ کے بغیر ہیں اور جنھوں نے صفحۂ ہستی پر ابتدائی ایام میں فروغ پایا نہایت ہی حقیر اور بے وقعت تھے۔ ان میں سے اکثر تو مٹ گئے کیوں کہ وہ نئے ماحول کے مطابق اپنی زندگی کو نہ ڈھال سکے۔ کچھ ایسے سخت جان اور ڈھیٹھ مزاج بھی ہیں جو اب تک اپنی ابتدائی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ بعض نے اپنی اشکال اور ساخت بدل لی تاکہ وہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں۔ ان جانوروں سے بتدریج ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ یہ اپنی بناوٹ اور قوائے جسم کے لحاظ سے غیر صلبی جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ریڑھ ان کی ترقی کی ایک نمایاں اور مستقل نشانی ہے۔ پس اس اعتبار سے ترقی یافتہ حیوانات کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ صرف پانی کے اندر رہنے والے جانور، مثلاً مچھلی۔
۲۔ خشکی پر اور پانی کے اندر رہنے والے جانور یا جل تھلیے، مثلاً مینڈک۔
۳۔ خشکی پر رینگنے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور، مثلاً چھپکلیاں، سانپ۔
۴۔ ہوا میں اڑنے والے جانور یا پرندے، مثلاً کوا، کبوتر۔
۵۔ دودھ پلانے والے جانور یا شیرخوار، مثلاً گائے، بندر، انسان۔

ریڑھ کی ہڈی والے یا صلبی جانوروں میں سب سے پہلے مچھلی ظہور میں آئی۔ یہ جانور صرف پانی کے اندر رہی رہے اور یہاں ہی سے زندگی بسر کرنے کا سامان پیدا کرتے رہے۔

رفتہ رفتہ ایک ایسا زمانہ آیا کہ خشکی (زمین) پر نباتات کی بہتات ہونے لگی تو بعض مچھلیاں پانی سے نکل کر کنارے پر آگئیں۔ جب زمین سے ان کا تعلق ہوا تو ان کے اعضا میں تغیر و تبدل ہونے لگا، اور وہ جانور عالم ظہور میں آئے جو خشکی اور پانی دونوں میں رہتے ہیں اور جن کو ہم جل تھلیے کہتے ہیں۔ مینڈک ان کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ جانور زندگی کے ابتدائی دور پانی میں بسر کرتے ہیں۔ مادہ مینڈک گڑھوں کے پانی میں انڈے دیتی ہے، انڈوں سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں

ان کا جسم بالکل مچھلی کی طرح ہوتا ہے۔ اس حالت میں اسے غوکچہ (Tadpole) کہتے ہیں۔ غوکچہ مچھلی کی مانند گلپھڑوں سے سانس لیتا ہے، کچھ عرصہ کے بعد غوکچہ کی جسمانی حالت میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ گلپھڑے سکڑ کر غائب ہو جاتے ہیں، دُم خوراک کے طور پر استعمال ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر جہاں دُم جسم سے جڑی ہوئی ہے، دو چھوٹے چھوٹے اعضا نمودار ہوتے ہیں، یہ پچھلی ٹانگوں کی ابتدا ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ اعضا لمبے ہو کر جوڑ دار بن جاتے ہیں، پھر ان پر انگلیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس دوران میں اگلے اعضا کی بالیدگی جلد کے نیچے شروع رہتی ہے اور آخرکار ان سے بھی بازو اور انگلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی موجودگی میں خشکی پر چلنے پھرنے اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مگر اکثر اوقات خوراک کی تلاش میں یا دشمنوں سے بچاؤ کی خاطر گڑھوں، کنڈوں اور نالیوں کے اندر آبی پودوں میں چھپ رہتا ہے۔ یہ جانور اپنی زندگی پانی اور خشکی دونوں جگہوں پر گزار سکتے ہیں، اسی لئے ان کا نام جل تھلیے ہے۔

جل تھلیے جانوروں کے بعد رینگنے والے جانوروں کا وجود ہوا۔ ان جانوروں کے ہاتھ اور پاؤں اس قدر کمزور اور مختصر ہوتے ہیں کہ ان کی رفتار سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیٹ کے بل رینگ رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے۔ مثلاً سانپ، اور وہ حقیقتاً اپنے پیٹ پر رینگ کر چلتے پھرتے ہیں۔

اب عالم حیوانی کے ارتقائی دَور میں ایک طویل مدت ایسی آتی ہے جبکہ رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور بکثرت ظہور پذیر ہوئے۔ یہ حیوانات دیکھنے میں بے حد خوفناک، جسمانی لحاظ سے لحیم و شحیم اور عادات کے مطابق بڑے ہی خون خوار اور پیٹو تھے۔ اکثر دریاؤں کے قرب و جوار میں اُگی ہوئی سبزی چٹ کر جاتے، یا سمندروں کے ساحلوں پر شکار کی گھات میں پڑے لیٹے رہتے۔ (Brontosaurus) یا (Thunder lizard) اس وقت کے رینگنے والے حیوانات کا سردار تھا، اور اپنے جسم کی لمبائی کے لحاظ سے، جو ۰۰ ۔ فٹ سے زیادہ تھی، آج تک سب سے طویل قامت حیوان مانا گیا ہے۔ اس کے رکازی ڈھانچے دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ حیوان اور اس کے بھائی بند اس قدر عظیم الجثہ تھے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ جسیم حیوان، ہاتھی بھی ان کے سامنے ایک چڑیا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ظلم و استبداد کی بے پناہ قوت کے باعث انھوں نے زمین پر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ادنیٰ چھوٹے اور عاجز جانور ہراساں اور پریشان ہو کر رہ گئے۔ مگر قدرت کا قانون زور اور زبردستی پر مبنی نہیں۔ یہ عظیم الشان جانور اپنی نامناسب جسامت کے باعث تنازع للبقا میں کامیاب نہ ہو سکے، اس لئے معدوم ہو گئے۔ ان کے مقابل میں وہی کمزور اور ناتواں رینگنے والے جانور مثلاً کچھوے، گرگٹ اور ننھی ننھی چھپکلیاں جنھوں نے زمانے کے ساتھ مطابقت کی آج بھی روئے زمین پر آرام و عیش کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

مچھلی، جل تھلیے اور رینگنے والے جانور، سرد خون والے جانور کہلاتے ہیں۔ سرد خون رکھنے والے جانوروں کا کوئی طبعی یا باقاعدہ درجۂ حرارت نہیں ہوتا، بلکہ ان کا درجۂ حرارت ان کے گرد و نواح کی ہوا کے مطابق بدلتا رہتا ہے یعنی سردیوں میں کم اور گرمیوں میں زیادہ۔ مذکورۂ بالا ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کے بعد پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کا ظہور ہوا۔ ان جانوروں کے جسم کا درجۂ حرارت صحت اور تندرستی کی حالت میں یکساں رہتا ہے یعنی اس میں کمی یا بیشی واقع نہیں ہوتی۔

زمین اپنے ارتقائی دَور میں اس وقت گرم اور مرطوب تھی، رینگنے والے جانوروں نے اپنے ماحول میں

تغیرات پائے تو ان میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ عظیم الجثہ چھپکلیاں یعنی ([illegible]) جو اب تک زمین پر اپنی حکمرانی کا سکہ جمائے بیٹھی تھیں آہستہ آہستہ مفقود ہونے لگیں۔ مگر چھپکلیوں کی وہ اقسام جن کی جسامت موزوں اور متناسب تھی زندہ بچ رہیں۔ انھوں نے گڑھوں اور بلوں میں چھپ چھپ کر یا سو کر گزارنے کا طریق اختیار کیا۔ ان میں سے بعضوں کے پر نکلنے لگے۔ چونکہ ان کے جسم ہلکے پھلکے اور کم وزن واقع ہوئے تھے اس لئے ان میں طاقت پرواز جلد آنے لگی۔ ابتدائی پرندوں کی جسمانی ساخت میں رینگنے والے جانوروں کی بہت سی خصوصیتیں موجود تھیں جیسے ندارد دُم گرگٹ کی طرح، انگلیاں ناخن دار، چمگادڑ کی طرح کا جھلی دار آلۂ پرواز اور جبڑوں میں بڑے بڑے نکیلے دانت تھے۔ اس قسم کے جانوروں نے ترقی کی اور وہ پرندے کہلائے۔

رینگنے والے جانور محفوظ جگہوں پر انڈے دیتے اگر بعد ازاں ان سے بے پرواہ ہو جاتے۔ پرندے اپنے انڈوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے، مادہ اور نر باری باری ان کو سیتے ہیں۔ انڈے سیہنا، بچوں کو دانہ بھرنا، پھر ان کو اڑنے کے طریقوں سے آگاہ کرنا تو بہت ہی جانفشانی کا کام ہے۔ انڈوں کی حفاظت، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تربیت عقل حیوانی کی وہ نشانیاں ہیں جو ابھی تک پختہ نہ ہوئی تھیں۔

زمین پر کش مکش حیات پوری سرگرمی سے کارفرما تھی۔ اس عہد میں نباتات کی نوعیت عہد حاضر کی نباتات سے بہت قریب ہو گئی۔ پانی کم ہو گیا خشکی کا رقبہ بڑھ گیا۔ رطوبت پسند نباتات ([illegible]) ناپید ہونے لگے۔ ان کی جگہ میلوں تک پھیلی ہوئی ہری بھری چراگاہیں منظر عام پر آ گئیں۔ ان ہی سرسبز میدانوں اور وادیوں میں چھپکلیوں، کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ ماحول کی تبدیلیوں نے بعض رینگنے والے جانوروں میں حیرت انگیز تغیرات پیدا کر دیے۔ اب ان کی ساخت ایسے حیوانات میں منتقل ہونے لگی جو انڈوں کی بجائے بچے جنتے تھے اور انھیں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتے تھے۔ یہ حیوانات دودھ پلانے والے یا شیرخوار جانور کہلاتے ہیں۔ دودھ پلانے والے جانور عالم حیوانی کے سرتاج ہیں۔ یہ حیوانات اپنی جسمانی، دماغی اور تونی کی خوبیوں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ وہیل مچھلی، کنگرو، دریائی گھوڑا، سُم دار مویشی، کترنے والے چوہے، گوشت خور درندے، کرم خور خارپشت، چمگادڑ، گینڈے، اور بندر نما حیوانات، مثلاً لنگور، گبن، اورنگ اوٹان اور چمپانزی، ان ترقی یافتہ حیوانات میں شامل ہیں۔

دودھ پلانے والے جانوروں کی خاص شناخت جو ان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز رکھتی ہے، ان کے تھن ہیں، جن کے ذریعہ مادہ اپنے بچوں کو دودھ پر پرورش کرتی ہے اور بچپن میں ان کو ہر قسم کے خطروں سے محفوظ رکھتی ہے۔ دودھ پلانے والے جانوروں کے خون میں حرارت ہوتی ہے۔ ان کے جسم پر بال یا اون کثرت سے موجود ہوتی ہے۔ بالوں کی جگہ بعض جانوروں کے جسم پر سخت اور مضبوط چھلکوں کی ڈھالیں چڑھی ہوتی ہیں۔ ماہرین علم حیوانات دانتوں کو جسم کا ایک اہم حصہ مانتے ہیں، کیونکہ دانتوں کی شکل اور ساخت سے ان جانوروں کی خوراک کی نوعیت کا پتہ بآسانی لگ جاتا ہے۔ شیرخوار جانوروں کے ہاتھ پاؤں ان کی ضروریات کے مطابق مختلف شکلوں کے بن گئے ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں اکثر نر اور مادہ کی صورت اور وضع میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ نر کسی قدر قدآور اور جسامت میں بڑا ہوتا ہے۔ بعض اوقات نر اور مادہ کے رنگ ایک دوسرے سے ذرا مختلف بھی ہوتے ہیں۔

ان ہی دودھ پلانے والے جانوروں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسانی شکل اختیار کر لی۔ عرصۂ دراز تک انسان

غیر متمدن رہا۔ اس کی زندگی ان وحشی جانوروں سے کچھ بہتر نہ تھی جن کا یہ شکار کیا کرتا۔ لاکھوں سال تک انسان وحشی جانوروں کی طرح غاروں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ ان ہی کی طرح لڑتا جھگڑتا اور چیختا چلاتا پھرتا رہا۔ غالباً آج سے ایک لاکھ سال قبل انسان میں گفتگو کی قوت پیدا ہوئی۔ اس میں نہ صرف منصوبے بنانے اور تدبیریں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے تبادلۂ خیالات کرلے اور اپنا مافی الضمیر ان کو بتا سکے۔ ان خصوصیات کی بدولت اس کو دنیا کے سب جانوروں پر غیر معمولی فوقیت اور سرفرازی حاصل ہوگئی۔ اس کی فطرت نے اب اسے مجبور کر دیا کہ وہ صحیح معاشرتی زندگی اختیار کرے جس سے کہ اس کے ذہنی اور دماغی قوتوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور بالآخر موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کی خلقت کی تکمیل عمل میں آئی۔

عبدالمجید

اُردو نامہ اس میں اُردو ادب سے متعلق ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں اور تنقید نگاروں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے درج ہیں جو خاص طور پر لکھوائے گئے۔ اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں بطورِ خاص حاصل کر کے شائع کی گئیں۔ ان میں قدیم اور جدید شاعری کے جو نمونے ہیں ان سے اُردو شاعری کے مختلف رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اُردو کے پروفیسروں کے حالاتِ زندگی اور علمی خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا گیا ہے جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ مشاہیرِ اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط کو پہلی دفعہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ یہ خطوط اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس میں کئی تصویریں بھی ہیں جو یا تو اُردو ادب کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ اور ارتقا پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے صفحات (۲۰۰) قیمت عا

بلاغت یہ کتاب فنِ شعر و انشا کے محاسن سے متعلق ضروری معلومات پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ معانی دوسرا بیان اور تیسرا علمِ بدیع سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر اُردو کے طلبہ کے افادے کے لئے مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب منشی فاضل، مولوی فاضل، اُردو فاضل سے مرتب کرائی گئی ہے صفحات (۵۶) قیمت صرف (۱۰/)

بہمنیہ دور میں زراعت و تجارت کی ترقی

ہندوستان زراعت کے اعتبار سے خاص خوبی اپنے میں رکھتا تھا، اور اس لئے ہر اسلامی فاتح کو ہندوستان سے جو محبت ہوتی تھی وہ محض اس کی زرخیزی کی وجہ سے تھی۔ بہمنیہ سلطنت میں مسلمانوں کی جاگیریں، انعام علی الوقف، انعام المعفا وغیرہ سب اس کی زرخیزی کی شہادتیں ہیں کہ وہ یہاں دل کھول کر زراعت کرتے رہے۔ بہمنیہ زمانے کے آثار اور بہمنی دور کی نہریں اور زراعت کا مختصر حال یہاں لکھا جاتا ہے تاکہ اس دور میں دکن کی زراعت اور مسلمانوں کی اس سے دلچسپی کا اندازہ ہو سکے۔

حال کے انکشافات سے عربوں کی بیسیوں تصانیف کا علم تاریخی دنیا کو ہو رہا ہے کہ عربوں نے زراعت پر خوب دل کھول کر محنت کی ہے۔ چنانچہ کتب خانۂ سلطانی واقع دارالخلافہ قسطنطنیہ سے ایک قیمتی نسخہ کتاب الفلاحۃ کا مصر میں آکر چھپا جس کا مصنف علامہ ابی ذکریا یحییٰ بن محمد بن احمد اشبیلہ ہے۔ اس کتاب کا ایک ہی ایڈیشن مصر سے نکلا ہی تھا کہ اس کا ترجمہ اسپینی، اطالوی، فرانسیسی زبانوں میں ہو گیا۔ فرانسیسی ترجمہ تو اصل عربی نسخہ ایک کالم میں اور ترجمہ دوسرے کالم میں ہے۔ اس نسخہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول تو یورپ کے جدید علم زراعت کی بنیاد اسی کتاب پر ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ابی ذکریا نے عربی میں یہ نسخہ لکھا تھا تو اس کی نقلیں یا اس کے جیسے اور علمائے زراعت نے ایسی اور کتابیں لکھی ہیں اور جبکہ سلطنت بہمنیہ میں عام زبان عربی ہی تھی اس قسم کی تصنیفات کا شائع یا مدون ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مذاق عام اور اشتیاق زمانہ نے یہ سامان یہاں بھی مہیا کر دیے تھے۔ اگرچہ کوئی خاص تصنیف علم فلاحت عہد بہمنیہ کی اس وقت تک شائع نہیں ہوئی مگر ان عربی رسائل کی موجودگی سے ان علمائے اسلام کا شغف معلوم ہوتا ہے جنھوں نے بہمنیہ سلطنت میں زراعت و فلاحت پر جاں سوزی سے کام کیا ہے جس کی کچھ کچھ جھلک فرشتہ کے اوراق سے ظاہر ہوتی ہے۔ فرشتہ سلطنت بہمنیہ کی زراعت کی ترقی کے بارے میں بیدر کی سرزمین کی قوت فلاحت بیان کرتا ہے کہ:-

"آب و ہوا میں زمین یہاں کی بہتر اماکن ہندوستان سے ہے۔ میں بلاد معظم ہندوستان کو دیکھا، لطافت و خوبی میں مانند اس مملکت کے نظر نہ آیا۔ زمین اس کی شنجرف سودہ کی طرح سرخ ہے اور اکثر میوہ خراسان اور عراق کا یہاں پیدا ہوتا ہے، از خواجہ محمود گاواں خواجۂ جہاں زعفران اور امرود اور قسم قسم کے انگور اس زمین سے حاصل کئے ہیں۔ ص ۴۱۶"

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ علمائے اسلام عہد بہمنیہ میں طریق زراعت و آبپاشی سے واقف تھے اور ان کو اسی قسم کی کتابوں سے مواد ملا تھا جو عربی زبان میں عربوں کے عین زمانۂ عروج کی تصنیفات و تحقیقات تھیں۔ اس لئے اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ ابی ذکریا کی کتاب جیسی دارالخلافتہ قسطنطنیہ سے آج پانچسو برس کے بعد دنیا میں آئی ہے، اس طرح پانچسو برس پہلے دارالخلافۂ بیدر کے سلاطین کے کتب خانہ میں ہوگی جس کو ضرور محمود گاواں خواجۂ جہاں یا کسی عالم نے دیکھا اور اس پر عمل کیا ہوگا۔ کیونکہ یوسف عادل خاں ترکی (شاہزادۂ عثمانیہ) خواجہ محمود گاواں کا معتمد علیہ و مشیر کل و فرزند لطفی تھا جس کے کتب خانہ میں نایاب کتابیں تھیں۔

عراق و خراسان کے میوے بادام، انگور، سیب، ناشپاتی، امرود، شہتوت، چلغوزہ، پستے، اخروٹ وغیرہ مشہور ہیں۔ اگر یہ سب سلطنت بہمنیہ میں بوئے جاتے تھے تو زراعت کی ترقی کا اس بات سے بہتر کیا ثبوت مل سکتا ہے؟ زعفران کی کاشت سرزمین بیدر کے لئے محض خواجۂ جہاں کی زراعت سے دلچسپی اور شوق کا ثبوت ہے اور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکام اور وزرا نے کس کاشت کاری اور باغبانی کے فن میں کتنی دلچسپی لیتے تھے اور اس کو کہاں تک ترقی ہو چکی تھی۔ ان کو اقسام غلہ اور میوہ کی کاشت سے بھی واقفیت تھی اور اس میں کمال رکھتے تھے۔ وہ جانوروں کی پرورش میں بھی ماہر تھے کھیتی کے تجربات کے لئے جداگانہ کھیتوں یا فارم کی تیاری سے بھی یہ پورے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

فن زراعت سے متعلق کیمیائی ترکیبیں، زمین سے کام لینے کے طریقوں، پرندوں اور چوپایوں کی پرورش اور ان کی بیماریوں کے علاج سے پوری طرح واقف تھے۔

سلطان علاء الدین ثانی بہمنی کا "باغ علائی" جس کی تعریف میں حکیم آزری جیسا مشہور شاعر کہتا ہے۔ ۵۰

گوئی کہ ماہ و مشتری از برج آسماں — تحویل کرد داند بہ باغ خدائیگاں

سلطان فیروز شاہ کا فیروز آباد بسانا اور قلعہ میں دریائے بھیمرا سے نہریں کاٹ کرلانا اور فیروزآباد میں طرح طرح کے گلشن اور باغات بنوانا، اس کے شوقِ فلاحت کا بیّن ثبوت ہے جو ہندوستان کے بہت کم بادشاہوں میں دیکھا گیا ہے۔

درختوں اور ترکاریوں کی کاشت اور ان میں پیوند وغیرہ لگانے کے بھی عجیب عجیب طریقے رائج تھے جن کے ذریعہ سے شیریں میوؤں کو اور زیادہ میٹھا، خوشبودار اور مفید بنایا جاتا تھا، یا ان سے مسہل کی دوا بنائی جاتی تھی۔ گلاب کے پھول کا رنگ حسب مرضی تبدیل کیا جاتا تھا یعنی زرد، لاجوردی اور سفید رنگ کا پھول بن سکے بے موسم سیب کے درخت میں ایسی ترکیب استعمال کی جاتی تھی کہ پھل پیدا ہوں تو ان پر کوئی عبارت یا تصویر بنی ہو۔ ناشپاتی اور امرود اور سیب کے پھلوں کو اپنی پسند کے مطابق جس شکل کا چاہیں بنا سکتے تھے، انھیں دانہ اور بے دانہ کرنا، ایک خوشہ میں مختلف رنگ کے دانے پیدا کرنا، اور انجیر کی ایک شاخ میں جدا جدا رنگ کے انجیر پیدا کرنا، بلکہ ایک ہی دانۂ انگور میں مختلف رنگوں کا ہونا، درخت خیری میں کئی رنگ کے پھول لانا وغیرہ۔ مختلف اقسام کی ترکاریوں کا بونا، مثلاً مولی، گاجر، شلجم کو بڑے بنانے کی ترکیب۔ غرض ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

احمد شاہ ولی بہمنی کے حوض محل میں پانچ پانچ ہاتھ کے کھجور کے درخت تھے جو ہر موسم میں رسیدہ ہوتے تھے، اور حکیم آذری نے سلطان کے مسہل کے لئے چند منٹوں میں ایسے انگور لا دئے کہ جتنے انگور کھائے اسی قدر دست آئے۔ (ملاحظہ ہو سوانح عمری حکیم آذری، مطبوعہ رسالۂ حکمت)۔

اب رہ رہ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی سرزمین تھی جہاں سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کا "حوض محل" تھا، اور علاء الدین ثانی بہمنی کا "باغ علائی" تھا، اور محمود گاواں خواجہ جہاں کے وہ زراعتی قطعات اور میوہ دار درختوں کا جھنڈ جہاں عراق کے میوے اور زعفران و انگور پیدا ہوتے تھے۔

(۲)

ہندوستان قدیم کے تجارتی تعلقات اہل فارس سے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی تہذیب و تمدن کا اثر ہندوستان پر بہت کچھ تھا۔ جب ایران پر عربوں کا قبضہ ہوا تو عربوں اور ایرانیوں نے مل کر اسلامی تہذیب و تمدن کو آگے بڑھایا۔ اگرچہ ابتداءً سندھ، مکران، کرمان پر قبضہ ہوا۔ مگر بعد میں زیادہ تر ایرانیوں ہی کا سلسلہ رہا۔ ہندوستان پر یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی کا قبضہ ہوا، اور اس کے بعد جو فاتح ہندوستان آئے وہ ایران کی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ سلاطین بہمنیہ ایرانی نژاد تھے، اور ایک عرصہ کے رسم و رواج اور تجارتی

تعلقات سے ان کا ملک متاثر ہو گیا تھا، اس لیے ان کے حدود مملکت میں بھی ایرانی تجارت کا اثر غالب تھا۔ ایران کی بندرگاہوں میں ہرمز، بصرہ اور مملکت دکن کی بندرگاہوں میں مصطفیٰ آباد، دربل، بلگام، مہایم، گوا مشہور تھا جہاں تجارتی جہاز آیا کرتے۔

اہل فارس بنو امیہ کے ابتدائی زمانے سے تجارت میں بڑے مشاق ہو گئے تھے اور پانچسو برس کی تجربہ کاری نے جہانیان جہاں گرد بنا دیا تھا۔ کبھی عماد الدین محمود گرجستانی بیدریں ذاتی جہازوں کا بیڑا قسم قسم اقسام کے مال سے لدا ہوا لاتے ہیں۔ کبھی عماد الدین محمود گاواں کے تجارتی جہاز دنیا بھر کی بندرگاہوں پر نظر آتے ہیں اور کبھی خود سلاطین بہمنیہ کے جہازوں سے درآمد و برآمد شدہ مال اتنا ہوتا تھا کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ملک التجار خلف حسن بصری کی تجارت کا وہ حال تھا کہ قسطنطنیہ سے لے کر چین تک ان کے جہازوں کا تانتا بندھا رہتا۔

بعض مشہور یوروپین اور چینی سیاح نے ہندوستان کی قدیم تجارت پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے اندرون ملک اور ساحلی کاروں منڈل کی تجارت پر بھی دو آنسو بہائے ہیں جن کا اقتباس اس موقع پر کچھ بیجا نہ ہوگا۔

جب ہندوستان کی تجارت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آگئی تو ایران اور ممالک عراق و عرب اس سے بے انتہا فائدہ اٹھانے لگے جس کو دیکھ کر اہل شام و عرب نے اسے اپنے ممالک میں فروغ دینے کی کوشش کی۔ جب مصر و شام خلیفہ کے ہاتھ آگئے تو اسکندریہ کے تاجروں کو روما اور یونان کے ساتھ تجارت کرنے کی ممانعت ہو گئی اور چونکہ مسلمانوں اور یونانیوں کے مابین ہمیشہ جنگ رہا کرتی تھی اس لئے اہل یونان بلکہ ان کے ساتھ اہل اطالیہ بھی ہندوستانی مال سے محروم ہو گئے۔ اس سے کچھ پہلے وہ چین سے ریشمی کپڑا چرا کر لائے اور ریشم کی تیاری کا حال بچشم خود دیکھا تو اپنے بادشاہ کے حکم سے چند سال چین میں رہ کر یہ کام سیکھا اور واپسی کے وقت ایک لکڑی کے اندر چند کیڑے رکھ کر قسطنطنیہ بھیجا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی آل عثمان کا قبضہ قسطنطنیہ پر نہ ہوا تھا۔ اس وقت شاہ قسطنطنیہ ان پادریوں کی مدد کر کے ریشم کا کارخانہ قایم کر دیا اور وہ مشرقی ریشم کی تجارت سے مستغنی ہو گئے۔ مگر ان پادریوں کو یہ معلوم تھا کہ دریائے جیحوں پر دو شہر ایسے آباد ہیں جو ہندوستان اور چین کے مال کی منڈیاں ہیں۔ چنانچہ بعض الوالعزم تاجروں نے ان مقامات میں اپنے آدمی بھیجے اور وہاں کا مال بحیرۂ خضر و دریائے سیرس کے راستے آنے لگا، اور دریائے سیرس سے یہ مال جو وسط ایشیا کے مال سے تبادلہ میں بحیرۂ اسود کو جاتا تھا؛ اور وہاں کا مال پھر ہندوستان آتا تھا جو اندرون ملک تک پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی انھوں نے مالابار میں ایک بستی قایم کی اور بنگال، سیام اور چین کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات قایم ہو گئے۔ اسلامی طاقت کے اس عروج کو یورپ کے صناع نہایت حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ وینس، قسطنطنیہ اور اسکندریہ کے مابین ابتدائے اسلام سے ہی تجارتی تعلقات قایم ہو گئے تھے، چنانچہ دوسری صدی ہجری میں ہندوستان اور چین کو اسلامی قافلے روانہ ہونے لگے اور پانچویں صدی ہجری میں نوادر یہ، ریشمی مخمل اور مسالے وینس میں پہنچنے لگے اور رفتہ رفتہ یہ شہر تجارت کی وجہ دولت سے مالا مال ہو گیا۔

خلفائے عباسیہ مصر کے زمانے میں مصر کا راستہ عیسائی اور مسلمانوں کی لڑائیوں کے اختتام پر کھل گیا اور سابق کی طرح پھر براعظم یورپ ہندوستانی تجارت سے مستفید ہونے لگا۔ وینس سے شہر جینوا میں بھی ہندوستانی مال آتا تھا، اگرچہ اس کی مقدار قلیل ہوتی تھی۔ ان ہر دو مقامات کے باہمی مقابلے کے زمانہ میں فلورینس ترقی پر تھا اور اس کی تجارت مشرقی ممالک کے ساتھ

بڑھتی جارہی تھی۔ جب مصر اور شام سلطان سلیم خان (معاصر سلطان احمد شاہ ولی بہمنی) کے ہاتھ آئے تو وینس اپنے ہمسایہ شہروں سے بڑھ گیا۔

مشہور جغرافیہ نویس مولانا آزری لکھتے ہیں کہ سلطنت بہمنیہ سے جو مال برآمد ہوتا تھا اس میں زیادہ تر چھینٹ، ململ، ریشمی دھاگے، تیل اور دیگر اقسام کے رنگ، الائچی، سیاہ مرچ، ہیرے، موتی، فولاد، ہاتھی دانت، ادویات، عطریات شامل تھے۔ بیدری ظروف بھی ایک حد تک ممالک غیر کو بھیجے جاتے تھے، جس کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی کبھی کبھی غلاموں یا غلام لڑکیوں کی تجارت ہوتی تھی، جو اشیاء درآمد کی جاتی تھیں ان میں اونی مخملی زرین کپڑے، قالین، بانات، پوستین، اصفہانی ہتھیار، عربی گھوڑے، مغزیات، میوہ جات، سونا، چاندی، فیروزہ، عقیق، یشب، ترکی، رومی غلاموں کی تجارت ہونے لگی۔ ایک اور مشہور سیاح کا بیان ہے کہ آم، نارنگیاں، کافور، صندل کی لکڑی بھی یہاں سے برآمد ہوتی تھی۔

وینس کا ایک گراں قدر امیر جو دسویں صدی کے شروع یعنی سنہ ۹۰۰ ہجری کے کچھ قبل (عہد محمد شاہ بہمنی لشکری) میں ممالک شرقی کی سیر کے لئے دھرآیا تو ہندوستان کے مختلف مسالوں کا ذکر کرتا ہے۔

جینوا کا سیاح پروتم سان سیٹ جو سنہ ۹۰۰ ہجری میں آیا تھا، ان قیمتی پتھروں اور مسالوں کا ذکر کرتا ہے جن کی تجارت ہوتی تھی۔ ان قیمتی پتھروں سے وہ ہیرے مراد ہیں جو مملکت بہمنیہ میں گولکنڈہ کے ہیروں کے نام سے سارے یورپ میں مشہور تھے، اور جن کی نسبت مارکوپولو اور دیگر سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ذکر کیا ہے۔ ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ سنہ ۸۸۰ ہجری میں جبکہ بہمنیہ سلطنت کے تحت قطب شاہ کا پرچم تلنگانہ اور ساحل مالابار میں لہراتا تھا تو اس وقت غیر ملکوں کے (۳۰۰) جہاز ساحل مالابار پر آتے تھے! اس کے علاوہ فرمانروائے کالی کٹ راجہ سامری نے جو خط شاہ پرتگال کو لکھا اس میں یہاں کی اشیاء برآمد و درآمد کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ:-

> "آپ کے خاندان کا ایک امیر واسکوڈی گاما میری سلطنت میں آیا اور مجھے اس کی ملاقات سے خوشی ہوئی۔ میری سلطنت میں الائچی، جائفل، ادرک، سیاہ مرچ اور قیمتی پتھر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آپ کے ملک سے سونا، چاندی، مرجان اور یاقوت درکار ہے۔"

یہ ظاہر ہے کہ علاقہ راجہ سامری اور ویسے کئی علاقے ڈیڑھ سو برس سے سلطنت بہمنیہ کے زیر نگیں تھے اس لئے ان علاقوں کی تجارت دراصل مملکت بہمنیہ کی تجارت تھی۔

(۳)

سلاطین بہمنیہ نے گرانی کی روک تھام کے لئے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان میں سے ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

جب سلطان علاء الدین بہمنی نے اشیاء خوردنی کی گرانی اور رعایا کی تکالیف محسوس کی تو نہ صرف اس مصیبت میں رعایا سے ہمدردی ظاہر کی بلکہ اپنی فیاضانہ طبیعت و رحم دلی سے وہ چند تاجروں کے فائدے کے لئے کروڑوں انسانوں کو بھوکوں مرتے نہ دیکھ سکا۔

قلمروئے بہمنیہ سے قحط و گرانی معدوم کرنے کی غرض سے سلطان نے اجناس خوردنی کے نرخ مقرر کر دیے تاکہ لوگوں کو خریدنے میں دشواری نہ ہو، اور اس بات کی خاص طور پر نگرانی رکھی کہ احکام سلطانی سے کوئی شخص سرمو انحراف

نہ کر سکے۔ خشک سالی اور کثرت باراں سے بعض مقامات کی فصلوں کو جو نقصان پہنچتا تھا اس کا بھی عام نرخ پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا۔ سلطان نے غلے کے سرکاری ذخیرے اور گودام بھی قایم کئے۔ یہ ذخیرے سلطنت کے ہر حصے اور پرگنے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں غلہ غیر ممالک کو برآمد نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے سلطان کو گرانی کے انتظام میں چنداں دقت بھی نہ تھی۔ کاشت کی زمینوں کا مالیہ نقد رقم کی بجائے اجناس کی شکل میں لیا جاتا تھا جو قحط کے زمانے میں سابق نرخوں پر فروخت کئے جاتے تھے تاکہ تاجروں کو نفع اندوزی کے مواقع حاصل نہ ہوسکیں۔

ایک دفعہ تاجروں نے سلطانی نرخ پر غلہ فروخت کرنے سے انکار کیا تو سلطان نے حکم دیا کہ کوئی شخص سلطانی ذخیرے کے سوا کسی تاجر سے غلہ نہ خریدے۔ چنانچہ سلطانی ذخائر سے تمام رعایا چھ ماہ تک ارزاں غلہ خریدتی رہی۔ ادھر تاجروں نے یہ دیکھ کر کہ اگر اور کچھ عرصہ تک یہی کیفیت رہی تو ہمارے غلے کے ذخائر کو دیمک چاٹ جائے گی اور تجارت کو نقصان پہنچے گا سلطان سے عفو تقصیر کی درخواست کی جو اس شرط پر منظور ہوئی کہ پہلے جس نرخ پر فروخت کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا اس سے بھی ارزاں نرخوں پر فروخت کرنے راضی ہو جائیں۔

ملک نائب نے تمام تاجروں کو طلب کر کے تنبیہ کی کہ سرکاری نرخ سے انحراف کرنے کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ طرفدار اور سرلشکر اس حکم کی تعمیل کا ذمہ دار تھا اس کا فرض تھا کہ ان سلطانی احکام کی پوری پوری تعمیل کرائے۔ محتسب نرخی یعنی مہتمان بازار، شقدار اور غیرہ، حوالدار پر لازم تھا کہ روزانہ کے نرخوں سے سلطان کو مطلع کرتے رہیں۔ سلطان نے خفیہ طور پر اپنے آدمی بھی صحیح کیفیت کے لئے نہ صرف دار الخلافت میں بلکہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں متعین کر رکھے تھے بلکہ ان کارپردازوں پر بھی نگران اور جاسوس مقرر تھے۔

اگر کبھی کوئی بات خلاف حکم ہوتی یا کسی فرد بشر کو نرخ معینہ کے مطابق کوئی چیز نہ ملتی تو محتسب و نرخی دونوں قتل کر دیے جاتے تھے یا ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر شہر میں ان کو گشت کرایا جاتا تھا۔ یہ عبرتناک سزائیں تھیں جو بہت کم دی جاتی تھیں۔ مگر ہیبت و رعب کا وہ سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ کوئی شخص کسی طرح کی کوئی سرتابی نہ کرتا۔ مزید براں تاجروں کو زیادہ قیمت کی توقع سے غلہ ذخیرہ کرنے کی (جس کو احتکار کہتے ہیں جو شرعاً حرام ہے) اجازت نہ تھی اور نہ کوئی شخص سستے داموں خرید کر مہنگے داموں بیچنے کا مجاز تھا۔ ایسے شخص کو بھی وہی سزا تھی جو نرخی و محتسب کے لئے مقرر تھی، بلکہ طرفدار اور سرنوبت بھی اس سزا سے نہیں بچ سکتے تھے۔

یہ بھی حکم تھا کہ کوئی تاجر یا بیوپاری فصل کاٹے جانے سے پہلے غلہ نہ خریدے۔ کاشت کاروں پر واجب تھا کہ غلہ کاٹنے کے بعد سب سے پہلے سرکاری محاصل کا غلہ ادا کریں اور اپنی ضرورت کا غلہ رکھ کر بقیہ کو قریب ترین بازار میں فروخت کریں، غلہ کا ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

سلطان علاء الدین خلجی نے نہ صرف انسداد گرانی کا انتظام کیا بلکہ اس بات کا بھی بندوبست کیا کہ تاجر غلہ کے اوزان اور پیمانوں میں کمی زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ وہ خفیہ طور پر بازار سے اجناس قیمتاً منگوا کر اپنے سامنے تلواتا تھا۔ وزن میں جنس جتنے چھٹانک کم ہوتی تھی اسی قدر گوشت فروشندہ کے جسم سے کاٹ لیا جاتا تھا۔

سید محمد بیدری

عربی ادب عہد بنی امیہ میں

(بسلسلہ گزشتہ)

قواعد کی ترتیب کے ساتھ ہی اس نے علامات حرکات اور اشارات شد کی طرف بھی توجہ کی لیکن اعراب ابھی ابتدائی حالت ہی میں تھے۔ یعنی اگر کسی لفظ کے حروف پر فتحہ، ضمہ، کسرہ ظاہر کرنا ہوتا تو اسے نقاط سے ظاہر کیا جاتا مثلاً فتحہ ظاہر کرنا ہوتا تو حرف کے سامنے نقطہ لگایا جاتا ضمہ کے اظہار کے لئے نقطہ حرف کے اوپر نقطہ لگایا جاتا۔ اور اسی طرح کسرہ کے لئے نیچے ہوتا۔

ابو الاسود کی یہ ایجاد زیادہ عرصہ تک عالم طفولیت میں نہ رہی بلکہ وقتاً فوقتاً اس میں اضافے ہوا کئے۔ پھر بھی اس کی اصلی ترقی عہد عباسیہ ہی میں ہوئی۔

عربی حروف ہجی کی اشکال میں بھی اسی زمانے میں تبدیلی ہوئی۔ عربی خط چونکہ سریانی اور نبطی سے پیدا ہوا تھا اسی لئے اس میں حروف بھی انہی زبانوں سے لئے گئے تھے۔ اسلامی عہد میں دوسری قوموں کو عربوں کے ان حروف کی تمیز کرنے میں دقت ہونے لگی۔ اسی لئے حجاج بن یوسف والی عراق نے عبدالملک بن مروان کے عہد میں عجمی حروف ہجی سے نقاط وغیرہ مستعار لے کر عربی میں جاری کئے۔ اس سے عربی خط کے سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی اور پہلی مرتبہ عربی حروف کی موجودہ شکل وجود میں آئی۔

تاریخ و جغرافیہ

جاہلیت میں تاریخ و جغرافیہ کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ اشعار میں ایام عرب کی رزمیہ داستانیں یا بعض مقامات کی تفصیلات مل جاتی ہیں۔ قبائل کے تعلقات امرا و سلاطین کے کارنامے اور ہری بھری چراگاہوں اور نخلستانوں کی تلاش میں جن جن مقامات پر انھیں خیمہ زن ہونے کے مواقع ملتے تھے ان کی مناظر کشی بس اس حد تک قدیم عربی شاعری سے مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کی حقیقی ابتدا خلفاء بنی امیہ کے عہد میں ہوتی ہے۔ اس عہد کی تاریخی کتابیں دو نوع کی ہیں۔ پہلی قسم میں مسلمانوں کی فتوحات، غزوات، اور بہادران اسلام کے سوانح حیات کے تذکرے ہوا کرتے اور دوسری قسم میں دیگر اقوام کی تواریخ شامل تھیں چونکہ خلفاء بنی امیہ کو دوسری قوموں کے طرز حکومت، سیاست اور حالات جاننے کا بیحد شوق تھا اسی لئے وہ انھیں جمع کرتے اور دوسری زبانوں سے ترجمے بھی کراتے تھے۔

حضرت معاویہ بن سفیان کو تاریخ سے اتنی دلچسپی تھی کہ رات کا بڑا حصہ وہ مورخین کی صحبت میں گزارا کرتے تھے جو انھیں ایام عرب کے علاوہ شہنشاہان ایران و یونان و روما کی عدل گستری اور تدبر کے قصے سنایا کرتے۔ جنگوں کے واقعات اور فن حرب کی عیاریوں کی داستانیں سننے کا بھی انھیں بے حد شوق تھا۔ مشہور سلاطین کی سوانح عمریاں اور ان کی زندگیوں کے عبرت خیز افسانے سنانے کے لئے ان کے پاس متعدد غلام مقرر تھے جو ان واقعات کو دوسری زبانوں سے مثلاً لاطینی، یونانی اور پہلوی زبانوں سے ترجمہ کر کے انھیں سنایا کرتے تھے۔

دوسری اقوام کی تاریخ سب سے پہلے معاویہ کے ایما پر عبید بن شریہ نے لکھی جس کا ذکر صاحب الفہرست نے بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن ندیم نے اس قسم کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جسے ابو مخنف الازدی نے لکھا تھا اور خود معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے خلفاء کی سیرت کو عوانۃ بن الحکم نے جمع کیا تھا لیکن ان میں سے اب کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوتی۔

تاریخی علم میں علم انساب کی ابتدا اس زمانے کے نہایت اہم کارناموں سے ہے۔ مختلف قبائل کے نسب ناموں

کوشش کرنے اور شمسوں کی تحقیق کرنے کا نمونہ اسی زمانے میں ہوا تھا۔ وہ بہت زیادہ بنی امیہ نے اس کی طرف بہت توجہ کی۔ وہ خود ایک کتبہ کا مالک تھا جس کو معاویہ نے اپنی امانت اور دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا جانشین ہونا تسلیم کیا تھا۔

جغرافیہ کا علم اس عہد میں بہت ہی ابتدائی حالت میں تھا۔ حضرت عمرؓ کو ہر مقام کی حالت آب و ہوا اور باشندوں کی کیفیات جاننے کا بڑا شوق تھا اور وہ خاص طور پر ان مقامات کے تفصیلی حالات منگوایا کرتے جہاں مسلمانوں کے قدم جم چکے تھے۔ مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں اس پر کافی طور پر بحث کی ہے۔

علوم دخیلہ

علوم دخیلہ میں وہ علوم شامل ہیں جن میں مسلمانوں نے دوسری قوموں سے لے کر عربی میں منتقل کئے جیسے یونان، روم، ایران اور ہند کے متعدد علوم و فنون سے پہلی بار عربی کا آشنا ہوئے ان میں زیادہ مشہور علم نجوم، فلکیات، علم کیمیا اور طب وغیرہ ہیں۔

خلفائے بنی امیہ ان علوم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے عالموں کی امداد بھی بے دریغ کیا کرتے تھے۔ اس خصوص میں خالد بن یزید کا نام بہت مشہور ہے۔ خالد بن یزید نے معاویہ ثانی کی وفات کے بعد خلافت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہا۔

خلافت کے حصول میں ناکام ہونے کے بعد اس نے علوم و فنون کے حاصل کرنے کی ٹھانی خصوصاً اس زمانے میں علم کیمیا کا لوگوں کو بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس دوسری زبانوں کے کئی عالم موجود تھے جن میں بعض راہب بھی تھے۔ ان کے ذریعہ بہت سی کتابیں یونانی ادب سے ادب عربی میں منتقل کی گئیں۔

علم نجوم کا بھی یہ بڑا شائق تھا چنانچہ اس نے نجوم کی دریافت اور تحقیق کے لئے متعدد آلات تیار کئے تھے۔ بلکہ بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں جن میں اس فن کی ایک مشہور کتاب کو جو اسی زمانے میں ماسرجویہ نے عربی میں ترجمہ کیا تھا حکومت کے کتب خانے میں داخل کر دیا گیا جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو مسلمانوں کے بیحد اصرار پر انھوں نے چالیس دن تک استخارہ دیکھ کر اس کتاب کو عوام کے حوالے کیا کیونکہ اس کتاب کو انقلابی کتب میں سے سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کو بھی اتنا شوق تھا کہ اس کو حاصل کئے بغیر نہیں رہے۔

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے کاتب (سکرٹری) سالم نے ارسطو کے رسائل کا ترجمہ عربی میں کیا تھا لیکن اب یہ کتاب آسمان ادب سے ناپید ہو چکی ہے اس زمانہ کی ان مشہور کتابوں سے بہت کم ایسی ہیں جو آج کل دستیاب ہو سکتی ہیں۔

قدیم علوم کا احیاء

عصر اموی کے علوم کی تعلیم کے تحت جہاں ہم نے جدید ادب کے آغاز کا تذکرہ کیا وہیں قدیم علوم کے حالات بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ بلکہ یہی بہت اہم ہیں کیونکہ جدید ادب ابھی اس منزل پر نہ پہنچا تھا کہ اس کی تفصیلات کی ضرورت درکار ہوتیں۔ یہی قدیم علوم تھے جو ابھی اپنی بہار دکھلاتے آ رہے تھے۔ قدیم علوم سے مراد وہ علوم ہیں جو جاہلیت سے مسلسل چلے آتے ہیں ان میں یہاں قابل تذکرہ لغت، شعر، خطابت اور کتابت ہیں۔

لغت میں اس عہد میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ وہی پرانا ڈگر جاری رہا سوائے اس کے کہ اسلام کی آمد سے بعض اصطلاحات اور محاوروں کا اضافہ ہوا جس کا تذکرہ خلفائے راشدین کے عہد میں آ چکا ہے۔ اب یہاں خطابت اور کتابت کی کچھ تفصیلات۔ بعض مشہور خطیبوں کے حالات اور کاتبین کے واقعات بیان

کر کے ہم اس عہد کی شاعری کی طرف توجہ دیتے ہیں جو نہایت اہم ہے اور جس پر اس باب کا خاتمہ کیا جائے گا۔

خطابت

خلفائے راشدین کے عہد کی خطابت پر بحث کرتے ہوئے ہم نے مختصراً لکھا ہے کہ اسلام کی آمد نے خطابت میں گویا ایک روح پھونک دی۔ مسلمانوں کے ہر طرف پھیل جانے سے دور دراز کے مقامات میں اسلام کی دعوت دینے کے لئے پرگو اور فصیح اللسان خطیبوں کی سخت ضرورت تھی دوسرے اس وجہ سے بھی خطیبوں کا وجود ناگزیر تھا کہ جاہلی روح جو اب تک مسلمانوں میں چلی آ رہی تھی کہیں اس میں تفرقہ نہ پڑ جائے اور ان کا شیرازہ اسی طرح مجتمع رہے۔ علاوہ ازیں علم کے عام ہو جانے اور ہر کس و ناکس کے علم کی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے بھی خطیبوں کی تعداد اس عہد میں زیادہ نظر آتی ہے۔ ہر شخص سحر بیان مقرر بننا چاہتا تھا خصوصاً صدر اول میں بعد کی جماعت بندی کے تحت بعض خطیبوں کی مدد [illegible] محسوس ہوتا تھا۔ اسلامی تعلیمات: نیز قرآن و حدیث کے اثر سے ان میں قند و نبات کی شیرینی اور جادو سے بڑھ کر اثر پیدا ہو گیا تھا۔ اس عہد کے بعد میں مشہور خطیبوں کے حالات درج کرتے ہیں۔ خلفائے راشدین کی خطیبانہ قابلیت کو کون نہیں جانتا۔ اسلامی دنیا کا بچہ بچہ آج ان کی تیر و نشتر سے زیادہ اثر کرنے والی تقریروں کا مداح ہے۔ ان کے بعد حضرت معاویہ بھی کچھ معمولی درجہ کے مقرر نہ تھے۔ بنو امیہ کی سلطنت کے قیام میں جہاں ان کی دور اندیشی مصلحت اور سیاست دانی کو دخل تھا وہیں پر خطرناک موقع پر حضرت معاویہ نے اپنی سحر بیانی سے مدد لینا بھی نہ چھوڑا۔

ان کے بعد سحبان وائل، زیاد ابن ابیہ، حجاج ابن یوسف، اور قطری بن الفجاءۃ بہت مشہور ہیں۔

سحبان وائل المتوفی ۵۴ھ

قبائل [illegible] کی شاخ

وائل سے سحبان کا تعلق تھا۔ ان کا نام سحبان بن زفر بن ایاس ہے۔ اور قبیلہ کی نسبت سے انہیں سحبان وائل کہا جاتا ہے۔ جاہلیت میں پیدا ہوئے لیکن ظہور اسلام کے ساتھ ہی ایمان لے آئے۔ معاویہ جو خود بہت بڑے مردم شناس تھے ساحرانہ طبیعت رکھتے تھے۔ سحبان کو کام کا آدمی دیکھ کر انہوں نے بحث کے لئے اپنے سے مخصوص کر لیا۔ معاویہ ہی کے عہد میں ۵۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سحبان نے اپنی لیاقت کی وجہ سے بہت جلد معاویہ پر اپنا اعتماد قائم کر لیا جس طرح شاعری ایک خداداد عطیہ ہے اسی طرح خطابت بھی خدا ہی کی دین ہے۔ جتنا اثر شاعر اپنے کلام کے ذریعہ حاضرین پر پیدا کرتا ہے۔ اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر خطیب اپنی جادو بیانی سے سامعین کے دلوں پر کرتا ہے۔ سحر بیان خطیب کے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ جنگل میں آگ سے زیادہ سریع، تیروں سے زیادہ تیز، صحرا کی تیز و تند ہواؤں کی طرح [illegible]۔ اور دلوں کو موہ لینے میں طلسم سے بڑھ کر تاثیر رکھتے ہیں۔ سحبان کی خطابت ان تمام خوبیوں سے مملو تھی۔

سحبان بلا تکان کہنے والے شخص تھے۔ اور یہ خوبی تھی کہ ان کی ساری تقریر میں نہ کوئی بات دوبارہ آتی اور ہر لفظ فصیح و بلیغ ہوا کرتا۔ ان کی تقریر کا کوئی حصہ مہمل اور بیہودہ نہ ہوتا۔ اس زمانے کے اکثر مورخین اور ہمعصر ادیبوں کی آراء کے بموجب ان کی خطابت کسی مافوق البشر ہستی کا کارنامہ سمجھی جاتی تھی۔ ان کے خطبات کے دوران میں سامعین کی سانس کی آواز تک بھی سنی جا سکتی تھی۔ اور اکثر تلاطم خیز سمندر کی

سلیح کی طرح لوگوں کے چہروں سے ظاہر ہوتا۔

ان کی تقاریر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ منہ سے کہتے نہ تھے بلکہ ان کے دل کے گوشوں سے آواز نکلتی تھی۔ خطابت کی دنیا میں ان کا نام آج بھی ضرب المثل ہے۔ ایک مرتبہ خراسان سے ایک وفد حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وفد کی گفتگو کا جواب دینے کے لئے معاویہؓ نے سحبان کو طلب کیا۔ اتفاق یہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ بہرحال کچھ دیر بعد جس حال میں تھے اسی حال میں معاویہ کے سامنے پیش ہوئے معاویہ نے حکم دیا کہ وفد کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ انھوں نے ایک عصا مانگا۔ لوگوں نے کہا کہ عصا لیکر کیا کروگے جبکہ تم امیرالمومنین کے سامنے ہو۔ انھوں نے فوراً کہا وہی کروں گا جو عصا لیکر موسیٰ نے اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا۔ معاویہ نے ہنس کر انھیں عصا دینے کو کہا۔ عصا کے سہارے کھڑے ہو کر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ظہر کے قبل سے لیکر عصر کی نماز کے وقت ہونے تک یہ مسلسل کہتے رہے نہ انھوں نے اس اثنا میں کھانسا نہ جمائی لی اور نہ ذرا بھی وقفہ لیا ـــــ بلا توقف کہتے ہی چلے گئے۔ وفد کے لوگ اور دیگر حاضرین مبہوت بنے ہوئے تھے۔ بس ان کے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے ہر لفظ قند و نبات سے زیادہ شیرینی لئے ہوئے پے درپے نکلتا تھا۔

اس خطبہ کو سن کر معاویہ نے کہا "پہلے تو نماز پڑھ لیجئے کیونکہ نماز کا وقت ختم ہو رہا ہے۔" لیکن سحبان نے انھیں روکنے سے منع کیا۔ معاویہ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر جوش سے کہا "تم عرب میں سب سے بڑے خطیب ہو" اس پر سحبان نے کہا "نہ صرف عرب بلکہ عجم اور جن و انس سب سے بڑھ کر۔"

سحبان اس دولت کے شائق نہ تھے۔ ورنہ معاویہ کے نزدیک ان کو سونے چاندی میں تلوانا کچھ بڑا کام نہ تھا۔ فصاحت و بلاغت، لہجہ کی دلنشینی، شاعرانہ انداز، سلاست ان کی خطابت کا ساتھ یوں وابستہ ہے جس طرح شاعری تخیل کے ساتھ وابستہ ہے۔

زیاد ابن ابیہ المتوفی ۵۳ھ

(حکیم حارث بن کلدہ ثقفی کی لونڈی)

ایک نہایت نازک اور حسین کنیز تھی جس کا نام سمیہ تھا اور انھیں کے پاس ایک خوشرو رومی غلام تھا جسے عبید کہتے تھے۔ حارث نے ان دونوں کی شادی کر دی تھی معلوم ہوتا ہے کہ ابوسفیان اس کنیز کی دلکشی پر والہ و شیدا ہو گئے تھے۔ کنیز نے بھی ممکن ہے ان کا ساتھ دیا ہو ـــــ بہرحال اس شادی سے ایک سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام زیاد رکھا گیا

شریف خون کی آمیزش اور عروق صالحہ کی کوشش نے زیاد میں اعلیٰ قابلیتوں کے پودے جو تر مہیا کر دیئے تھے۔ وہ ان گزرشتہ تھے اور زیاد نہ صرف حسن ظاہری میں بلکہ دولت علم سے بھی مالا مال ہو گئے۔ حتیٰ کہ ہمعصروں میں اپنی ذاتی لیاقت کی بنا پر انھوں نے بڑی عزت پیدا کر لی۔

سمیہ سے ابوسفیان کے تعلقات اس وقت تک تھے جب انھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اسلام قبول کر کے وہ ان سب چیزوں سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔ اس واقعے کا اظہار انھوں نے حضرت عمرؓ کے خوف سے ان کے عہد تک کسی سے نہ کیا تھا۔ ورنہ حضرت عمرؓ ان واقعات پر شرعی سزائیں دینے میں مطلق تامل نہ کرتے گو وہ عمل کفر کے زمانے ہی میں کیوں نہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ مہاجرین اور انصار کے ایک بڑے مجمع کے آگے زیاد نے ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ حضرت علیؓ اور حاضرین میں قریش کے بہت سے سربرآوردہ صحابی بھی موجود تھے۔ عمرو بن العاص نے

ان کی برجستہ اور دلکش تقریر سن کر کہا کہ "کاش یہ نوجوان قریش سے ہوتا کہ عرب اس کے عصا کو چومتے" اس پر ابو سفیان سے نہ رہا گیا اور انھوں نے اپنا واقعہ سب کے سامنے بیان کر دیا اور کہا کہ "حضرت عمرؓ کے خوف سے میں نے اب تک اس کا اظہار کسی سے نہ کیا تھا۔"

حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں زیاد نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت کی بدولت خزانہ کی نگرانی کا عہدہ حاصل کیا۔ یہیں سے ان کی ترقی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور معاویہ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد یہ نہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ ابتداً معاویہ نے انھیں اپنا بھائی کہتے ہوئے پس و پیش کیا۔ بلکہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ انھیں اپنی نسب میں شریک کر لیں۔ اگر زیاد معمولی قابلیت کے انسان ہوتے اور گمنامی میں رہتے تو معاویہ سے بعید نہ تھا کہ انھیں بالکل فراموش ہی کر دیں۔ جب معاویہ نے اپنی سلطنت کے استحکام اور دولت اموی کے قیام کے لئے زیاد جیسی شخصیتوں کی امداد کو ناگزیر سمجھا تو اس وقت نہیں وہ انھیں بھائی کہنے اور زیاد بن ابی سفیان کہہ کر خطوط لکھنے سے بھی باز نہیں آئے۔ یہ معاویہ کی مردم شناسی اور سیاست دانی کا نتیجہ تھا۔

معاویہ کے زمانے میں یہ بصرہ اور کوفہ کے گورنر بنائے گئے۔ اس خدمت کو جس عمدگی اور خوبی سے انھوں نے نبھایا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ صرف یہ شکایت کی جاتی ہے کہ یہ ذرا سخت گیر تھے۔ لیکن اس زمانے کی حکمت عملی کے لحاظ سے ان کی سخت گیری بالکل بجا تھی۔ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "زیاد ہی وہ مضبوط ستون اور مستحکم بنیاد تھے جس پر بنی امیہ کی عمارت کھڑی کی گئی۔"

زیاد نے حکومت کے طریقوں کو حضرت عمرؓ کی مثالوں سے سیکھا ہے۔ تاریخ میں یہ مشہور ہے کہ "زیاد نے حضرت عمر کی تقلید کی اور سختی دکھائی اور حجاج نے زیاد کی تقلید میں ناحق ہزاروں کا خون بہایا۔" یہ ظن اور شبہات پر سزائیں دیتے تھے۔ علانیہ جرم پر قتل اور خفیہ طور پر کرنے والوں کو سزا ملتی۔

ان کے زمانے میں مجرموں کی تعداد بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ ہر شخص ان کے نام سے لرزتا تھا۔ اپنی آخر عمر تک انھوں نے یونہی بسر کی۔ چھ مہینے کوفہ میں رہتے اور چھ مہینے بصرہ میں گزارتے بالآخر ۵۳ھ میں طاعون سے ان کا انتقال ہوا۔

خطابت میں سحبان وائل کی طرح ان کا نام بھی ہمیشہ آسمان شہرت پر مہر و ماہ کی طرح جلوہ گر رہے گا۔ حکومت کے اثرات لوگوں پر ڈالنے، بغاوتوں کو فرو کرنے اور ارکان حکومت کی "تالیف قلوب" کے لئے جتنا انھوں نے اپنی خطابت سے کام لیا ہے اتنا شاید ہی کسی اور نے لیا ہو۔ حجاج بھی اس میں شک نہیں اس معاملہ میں اپنی آتش بیانی سے کبھی باز نہ رہتا۔ لیکن واقعات کے مطالعہ سے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ حجاج نے زیاد ہی کی پیروی کی اور ان کے نقش قدم کو اپنا رہبر بنایا۔

"خطبۂ بتراء" کے نام سے ایک خطبہ "تاریخ خطابت" میں ہمیشہ کے لئے زیاد کے نام کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ کہتے ہیں کہ اس خطبہ میں انھوں نے نہ خدا کی تحمید بیان کی تھی اور نہ رسول اکرمؐ کی ثنا۔ ان امور کا اس زمانہ میں اتنا خیال کیا جاتا تھا کہ ان کے اس مشہور خطبہ کو خطبۂ بتراء کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "ناقص تقریر۔"

اس کے زمانے کا ایک مشہور شخص شعبی کہتا ہے۔ "منبر پر جب کسی بہترین تقریر کرنے والے کو میں نے کوئی دلنشین بات کہتے سنا تو دل یہی چاہتا کہ وہ اس کے بعد

اپنی گفتگو ختم کر دیتے کیونکہ یہ خوف ہوتا کہ اس کے بعد وہ اتنی عمدہ بات نہ کہہ سکے گا۔ لیکن جب زیاد خطبہ کے لئے کھڑے ہوتے تو لوگ چاہتا کہ یہ ہمیشہ کہتے ہی رہیں۔ کیونکہ ان کی ہر بات پہلی بات سے زیادہ شاندار، زیادہ فصیح، زیادہ دلنشین اور بہت ہی پُراثر ہوا کرتی تھی۔ اس سے ان کی خطابت کے خداداد ملکہ کی غیر معمولی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔

حجاج بن یوسف الثقفی ۹۵ھ

ابو محمد حجاج ابن یوسف الثقفی طائف میں گوشۂ گمنامی

میں پیدا ہوا۔ باپ کی سرپرستی میں ابتدائی تعلیم کا کچھ حصہ مکتب میں حاصل کیا۔ لیکن زمانے کی گردش اور خود اس کی فطری تجسس و اضطراب کی وجہ سے اسے بہت جلد درس گاہ سے نکل کر عملی دنیا میں قدم رکھنا پڑا۔ اس کی ذکاوت اور غور و فکر کا یہ نتیجہ تھا کہ روح بن زنباع جذامی نے جو عبدالملک بن مروان کے محکمۂ پولیس کا افسر تھا اسے اپنے کار کے دائرہ ملازمین میں داخل کر لیا۔ موقع شناسی اور دوراندیشی کی وجہ سے حجاج نے بہت جلد اپنا رسوخ پیدا کر لیا۔ ایک مرتبہ فوج کے ایک دستہ نے اطاعت سے انحراف کیا جس سے عام انتظام میں بے چینی پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ عبدالملک نے اس کی شکایت روح بن زنباع سے کی اس نے اس واقعہ کے رفع دفع کرنے کا انتظام حجاج کے سپرد کیا۔ اس نے اپنے حسن انتظام اور حکمت عملی سے نہ صرف منحرف شدہ فوجیوں کو راہ پر لایا بلکہ عسکری نظام میں وہ خوبی پیدا کی کہ کبھی شکایت کا موقع نہ ملا۔ اس سے اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ اس کی زندگی کا دوسرا دور حضرت عبداللہ بن زبیر کی خلافت مکہ پر فوج کشی کا ہے۔ عبدالملک اپنے تمام مخالفین پر غلبہ پانے کے خیال سے حجاج کو حکم دیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے ہاتھوں سے چھین لے۔ حجاج کی فطرت اور قسی القلبی کی شہادت تاریخ سے ملتی ہے۔ وہ بغیر کسی کی پروا کئے سنگباری کرتا گیا۔ اور مکہ پر کامل فتح حاصل کر لی۔ اور حضرت عبداللہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ عبدالملک کے ہاں اس کا رتبہ دوچند ہو گیا۔ عراق میں شیعوں کی شورش انگیزی اور خارجیوں کی شورش کا حال سن کر عبدالملک نے وہاں کی گورنری کے لئے حجاج سے زیادہ مناسب آدمی کسی کو نہ پایا۔ اور وہاں کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حقیقتاً یہ درست تھا اور جو ظلم حجاج نے اہل عراق پر کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں شاید ہی چنگیز کے سوا کہیں مل سکے۔

حجاج نے وسعت سلطنت میں بڑا حصہ لیا اور چین تک اپنی تلوار کی دھاک بٹھا دی۔ [illegible] کی اس نے ہمیشہ کے لئے فتح کی [illegible] اس نے عراق میں [illegible] گزاری اور [illegible] تحت اس نے جو شہر واسط نام سے بسایا [illegible] سنہ ۹۵ھ میں مرض [illegible] میں فوت ہوا۔

بظاہر فطرت حجاج [illegible] تقلب اور سنگدلی کیوں نہ ہو لیکن حکومت کی پابندی کے لئے اس کا قانون نافذ تھا سخت گیری میں اس نے زیاد کو بھی پیچھے دکھا دیا۔ تاریخ میں حجاج کی شخصیت کے متعلق کچھ بھی کہا جائے یہاں بلحاظ ادب ——— اور وہ بھی بلحاظ خطابت اس کی ہستی کو ہمیں دکھانا مقصود ہے۔ حجاج کے ابتدائی کارناموں سے لیکر آخری دم تک کے امور پر نظر ڈالئے تو اس میں اس کی ذکاوت اور بیدار مغزی کے ساتھ ساتھ جادو بیانی اور آتش نفسی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ لوگوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لینے سے جو مطلب تھا وہ اپنی آتش [illegible] مخالفین کے گرد و پیش کھڑے ہو کر اپنے دل نشین خطبے سے ان کی دشمنی کو بدل دیتی

کر تا تھا کچھ معمولی کارنامہ نہیں۔ عراق میں جہاں اس نے حجاج کے ظلم وستم توڑے تھے اور [illegible] بھی سے مخالفت معمولی نہ تھی۔۔۔ [illegible] گفتگو اور غضب آلود تقاریر کے آگے عوام تو کٹھ پتلیوں کی طرح اس کو تکا کرتے۔ یعنی مباحثہ میں شاید ہی کوئی اس سے بازی لیجا سکتا ہو گا۔

مالک بن دینار کہتا ہے "میں نے حجاج سے زیادہ مطالب کو واضح کرنیوالا [illegible] نہ پایا جب وہ خطبہ میں اہل عراق پر [illegible] کو [illegible] اور اس کی [illegible] نکتہ [illegible] کرتا تو میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ بالکل سچ کہتا ہے اور [illegible] وہ سچے لوگ ہیں"

کتابت

[illegible] اسلام کی پہلی صدی [illegible] کتابت اور انشا کی طرف [illegible] ہو چکا تھا مگر بالکل ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ عربی نثر اور اس کے خاص اسلوب [illegible] آغاز [illegible] سے ہوا [illegible] نظم کے ساتھ ساتھ اس کی [illegible] کو بھی [illegible] لیا [illegible] حکومت اصول [illegible] سلطنت کے امور [illegible] ادبی طرز نگارش کے نمونے بھی [illegible] کی کتابت میں ملتے ہیں [illegible] کی [illegible] خوبصورت ہیں۔ اگر عربوں نے [illegible] بھولی [illegible] اور [illegible] کی [illegible] اور [illegible] چونکہ اس کا آغاز [illegible] سے ہوتا ہے [illegible] ان کا اسلوب بھی آج کل کی عربی سے بہت کچھ مختلف ہے [illegible] شاندار [illegible] ترکیب اختصار اور مبالغہ کا فقدان ۔۔۔۔ اس زمانے کی تحریر کی خاص خصوصیات ہیں۔ ضمائر کے استعمال میں ابھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔ جیسے کہ بعد میں متکلم کے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے جانے لگے۔ عموماً ہر تحریر کی ابتدا "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے ہوتی جس کے بعد خدا کی حمد ہوتی ـــــ [illegible] کا اختتام بھی عام طور پر "والسلام" یا "والسلام"

کل سنت [illegible] ابتدا [illegible] ہوتا۔

[illegible] ابتدائی [illegible] اصولوں پر عربوں کے نازک خیال [illegible] نے زیادہ عرصہ ٹیکا لینا مناسب نہ سمجھا اسی لئے کچھ ہی عرصہ بعد ابتدائی رسائل میں حمد و ثنا کے طویل الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔ مخاطبت کے طریق بھی جہت بدل گئے۔

سجع اور مقفی [illegible] کتابت کی تاریخ میں [illegible] آیا [illegible] نثر کا [illegible] نظم سے بڑھ گیا۔ اس دور کے کاتبین میں [illegible] عبدالحمید بن یحییٰ کا اجمالی حال بیان کرکے اس کو ختم کرتے ہیں۔

عبدالحمید بن یحییٰ المتوفی ۱۳۲ھ

ابو غالب عبدالحمید بن یحییٰ شام [illegible] پیدا ہوا [illegible] اصل [illegible] ہونے کا [illegible] اس کا تعلق ضرور تھا۔ [illegible] کی وجہ سے اس نے [illegible] ترقی کی اور ہشام بن عبدالملک کے چچیرے بھائی سالم کا [illegible] اور [illegible] ہو گیا۔

ایک زمانے [illegible] علموں کی رہبری اور [illegible] کے لئے شہر شہر اور دیس دیس گھوما۔ اس کی شخصیت کا علم مروان بن محمد کو بھی ہو چکا تھا۔ مروان نے اسے اپنے ہی پاس رکھا۔ اور ان میں بڑی دوستی ہو گئی۔ جب مروان خلیفہ ہوا تو اس کے نصیب بھی جاگ اٹھے اور یہ سلطنت کا سکرٹری بن گیا۔

سیاسی پیچیدگیوں کی بنا پر جب مروان کے مسند خلافت پر [illegible] کی توقع نہ رہی تب بھی اس نے اس کا ساتھ [illegible] اس بات کا خوف تھا [illegible] قتل ہو گیا۔ عبدالحمید نے [illegible] دوسرے [illegible] ابن المقفع کے پاس [illegible] پناہ لی جو اس کا دلی دوست تھا۔

مخالفین کی ایک جماعت اس کی تلاش میں یہاں بھی پہونچی جس میں سے بعض لوگ ابن المقفع کے گھر میں گھس آئے۔

عبدالحمید اور ابن المقفع کی انتہائی دوستی کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب مخالفین نے گھر میں داخل ہو کر عبدالحمید کو طلب کیا تو یہ دونوں سامنے ہی موجود تھے ان کی وضع قطع صورت شکل اور چال ڈھال میں اتنی مشابہت تھی کہ توام بھائی معلوم ہوتے تھے۔ اب ان لوگوں کو یہ حیرانی پیش تھی کہ کہیں عبدالحمید کی بجائے دوسرا قتل نہ ہو جائے جب انھوں نے دریافت کیا کہ عبدالحمید کون ہے؟ تو ابن المقفع نے اپنے کو پیش کیا جس پر فوراً عبدالحمید نے آگے بڑھ کر دلیری سے ان علامات کو بیان کیا جس سے اس کا عبدالحمید ہونا ثابت تھا۔ مخالفین نے فوراً اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

عبدالحمید سے پہلے کتابت بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور عوام کے خیال کے بموجب کتابت کوئی شریف اور قابل احترام فن سمجھا نہیں جاتا تھا۔ اس نے ازسرِ نو کتابت کی داغ بیل ڈالی۔

تنوع مضامین اور جدت تخیل سے اسے مالا مال کیا۔ تحمیدات اور تخاطب کی تبدیلیاں بھی اسی کی دماغی پیداوار تھیں۔ ابتدائے رسایل میں خاص طرز کی عبارت تحریر کرنا اور اختتام بھی ایک مخصوص انداز میں کرنا یہ اسی کی جدت تھی۔

عبدالحمید کا انداز بیان نہایت شیریں اور سلیس ہوا کرتا۔ اس کے الفاظ میں ایک لوچ اور دلکشی ہوتی۔ حکیمانہ خیالات اور فلسفیانہ مضامین کی بھی اس کے پاس کمی نہیں۔ اس کی ندرت تحریر کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ابومسلم خراسانی نے عبدالحمید کی تحریر کو جو مروان کی طرف سے اس کی ہدایت کے لئے لکھی گئی تھیں پڑھنے سے انکار کیا کہ کہیں اس کے خیالات ہی نہ بدل جائیں اور اسی خوف سے انھیں آگ کی نذر کر دیا

عربی نثر کے آغاز میں عبدالحمید کی شخصیت اتنی گرانمایہ تھی کہ اسے بعد میں "عربی نثر کا باوا آدم" کہنے لگے۔

ابوالفضل

غزل

دیر و حرم کی بنیادوں پر آؤ نئے مینار اٹھائیں
صدیوں سے چھپنے والے کو ایک نئی منزل سے پکاریں

تیری لو بھی پوشیدہ ہے، اپنا عزم بھی خوابیدہ ہے
دھواں دھواں ہستی، بلندی کیسی جیتیں کیسی ہاریں

بندوں کو دھتکانے والے، کاش کبھی یہ سوچا ہوتا
سانسوں کی خیرات کے بدلے ہم دو جگ کا بوجھ سہاریں

پوجا کے بھوکے دیوتاؤ، تم ہی کوئی ڈھنگ سجھاؤ
رنگ اجاڑے، روپ بگاڑے، سب کچھ وارا، اب کیا واریں

تند ہواؤں کی شدت کو پل پل بعد بڑھاتے کیوں ہو؟
کب تک کالی لینی کو ہم بیچارے انسان سنواریں!

وقت ہے اک چکر میں خراماں، گھوم گھوم کر لوٹ آئے گا
اڈیں گی گھنگھور گھٹائیں، مہکیں گی بھرپور بہاریں

کہتے ہیں یہ بے نام اجالے، اب جاگیں گے قافلے والے
قلب افق میں کوندے بن کر ڈوب رہی ہیں راہگذاریں

فرش ہمارا، عرش تمہارا، آؤ غبارو، آؤ خیالو
تاروں کی روشن افشاں کو دھرتی کے ماتھے پہ اتاریں

احمد ندیم قاسمی

مہر و مہ و انجم

کچھ دنوں پیشتر میں عابد روڈ کی ایک دوکان پر قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ ابھی میری باری آنے بھی نہ پائی تھی کہ بارش شروع ہوگئی اور قطار میں کھلبلی مچ گئی۔ پناہ کے لئے سب دوکانوں کے سائبانوں میں ٹوٹ پڑے۔ میں بھی ایک کتب فروش کی دوکان کے برآمدے میں پناہ کے لئے دوڑا جب میں قطار سے نکل کر دوڑ رہا تھا وہیں بجلی کے کھمبے سے قریب ایک لفافہ پڑا ہوا ملا، جو نہ معلوم ڈاک میں حوالے کئے جانے کی بجائے وہاں کیسے گر گیا تھا میں نے اسے اٹھا لیا تاکہ ڈاک خانہ میں ڈال سکوں۔ سائبان میں جب میں نے لفافے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ سوائے لفظ بمبئی کے باقی تمام حروف بارش سے دھل گئے ہیں، اور ڈاک میں ڈالنے سے یہ خط صرف لاوارثی خطوط کے دفتر میں پہنچ کر ضائع ہو جائے گا۔ جب تک بارش ہوتی رہی، میں یہی سوچتا رہا کہ اس خط کو کیا جائے۔ معاً یہ خیال آیا کہ خط کو کھول کر کاتب کے پتہ پر واپس کر دیا جائے۔
گو اس خیال پر ضمیر نے ملامت بھی کی کہ اوروں کا راز کیوں جان رہے ہو؟ جانے کسی محبوب کا خط ہو، کسی بیوی نے اپنے شوہر کو خط لکھا ہو، یا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مہاجن نے اپنے قرضدار کو نوٹس دیا ہو! ان لمحوں میں مجھے ان شاعروں کی یاد بہت ستا گئی جو لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے۔ جب میں گھر لوٹا تو یہ خط پھر یاد آگیا، اور مجھے سندباد جہازی والے پیرِ تسمہ پا کی یاد آگئی۔ چونکہ یہ خط صبح سے میرے خیالوں پر چھایا ہوا تھا میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندازِ تحریر سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ کسی لڑکی نے لکھا ہے۔ کسی لڑکی کا خط پا کر جیسے میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔ آج میں بھی ایک لڑکی کی دل کی دھڑکن کو سن رہا ہوں، اس خط میں پیار کی باتیں ہوں گی، راز کی ملاقاتوں کا ذکر ہوگا، اندھیرے سے اجالے میں آنے کے احوال ہوں گے۔ میں نے جب القاب پڑھے میری یہ خیال آرائیاں دفعتاً کافور ہوگئیں۔ ایک بھتیجی نے چچا کو یہ خط لکھا تھا۔ اس خط میں مہر و مہ و انجم ہی کا ذکر تھا۔ مہ نے یہ خط لکھا تھا۔

"چچا جان! قدم بوسی اور ہزار احترام!

بہت دنوں سے آپ نے کوئی خط نہیں لکھا، اور نہ ہماری خیریت معلوم کی۔ اماں کہتی ہیں کہ ہم تینوں یتیم بہنوں کا آپ کے سوا اور کون سہارا ہے۔ وہ یہ فرماتی ہیں کہ اس بیوہ کے صرف آپ ہی پُرسانِ حال ہیں لیکن آپ نے بمبئی جانے کے بعد سے کوئی خط ہی نہ لکھا۔ ہمسایہ گھر والی آمنہ خالہ نے بتلایا کہ ان کے بھائی کے ہاں آپ کا خط آیا ہے کہ آپ کو بمبئی میں اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ کیا اس خوش خبری کے سننے کے ہم حق دار نہیں ہیں ---؟

اچھے چچا! آپ کو یہ سن کر بے حد تکلیف ہوگی کہ مہر کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اماں اس واقعہ سے اتنی دل گیر ہو گئی ہیں کہ رہ رہ کر انھیں پسینہ آجاتا ہے، اور وہ گھبرائی ہوئی دیوانوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔ گھڑی میں روتی ہیں، گھڑی میں دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فضا میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہیں۔ بہت درد بھرے لہجے میں کہتی ہیں کہ تقدیر نے مجھے یہی دن دکھانے کے لئے زندہ رکھا ہے۔ کل جب وہ کہہ رہی تھیں کہ "یہ تین لڑکیاں میرے سینے پر تین پہاڑ ہیں۔ ان تین پہاڑوں تلے میرا دم نکلا جا رہا ہے" تو انجم برا مان گئی اور کہنے لگی کہ اماں

اگر آپ کو ہمارا وجود اس قدر برا معلوم ہوتا ہے تو ہمیں زہر دے دو!" انجم بچپن ہی سے اُلٹی باتیں کرنے کی عادی ہے۔ وہ اماں کی باتیں سمجھ نہ سکی۔ اس کے اس جملہ پر اماں زار زار رونے لگیں، اور انجم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کہنے لگیں کہ "میری لختِ جگر تو نے کچھ سمجھا نہیں، میری بھولی بچی، میری گل جیسی نازک بچی، تجھے کیا معلوم!" پھر انجم بھی رونے لگی۔ چچا جان! اماں کو اس رسم کے ٹوٹ جانے کا سخت ملال ہے۔ کہتی ہیں کہ اس انتظار اور یاس بھری نگاہوں میں روشنی کی ایک کرن آ رہی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ مہر آپا کے منگیتر نے پرسوں کہلا بھیجا کہ مہر آپا کی عمر بہت زیادہ ہے اس لئے وہ بیاہ نہیں کر سکتے، البتہ انجم سے بیاہ کرنے تیار ہیں۔ اماں نے بہت دیر سوچنے کے بعد کہلا بھیجا کہ یہ ممکن نہیں۔ پھر وہ ہم سب کو اپنے کلیجے سے لگا لیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر ہمارے رخسار اور پیشانی پر بہنے لگے۔ اماں نے کہا کہ انجم کو اگر بیاہ دوں تو پھر میری دونوں بچیوں مہر و قمر کو کون بیاہے گا۔ تم دونوں کے متعلق یہ دنیا کتنے اعتراضات نہیں اٹھائے گی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ جو رسم ٹوٹ گیا اچھا ہی ہوا۔ آپ نے منگیتر صاحب کو دیکھا ہے نا! سر پر بگلوں کی طرح سفید بال ہو گئے ہیں بمشکل سے سر ڈھانک کر سپیدی چھپانا چاہتے ہیں۔ حنائی رنگ کی مونچھیں، خضاب کی مدد کا صاف پتہ دیتی ہیں، لیکن اس کے باوجود چاہتے ہیں کہ انجم سے بیاہ کریں۔ مہر آپا کو بھی اس رسم کے ٹوٹنے کا افسوس سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی کچھ بجھی بجھی سی، اداس اور خاموش معلوم ہوتی ہیں۔ جب سے شادی کی بات پکی ہوئی تھی ان کا رنگ جیسے نکھر رہا تھا، اور وہ خوش خوش دکھائی دے رہی تھیں، لیکن دفعتاً جیسے انھیں اب کچھ ہو گیا ہے! اماں مہر آپا کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چکی ہیں کہ اتنی دل گیر نہ ہو، لیکن لڑکی اور شادی کا تصور۔ اس افسوس کو اماں کی باتیں کیسے دور کر سکتی ہیں، آپ ہی بتلائیے نا؟

انجم اس سال میٹرک میں کامیاب نہ ہو سکی، وہ دو پرچوں میں ناکام ہو گئی۔ اس سال وہ اسکول نہیں جائے گی۔ گھر ہی میں وہ امتحان کی تیاری کر کے خانگی امیدوار کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتی ہے۔ بے چاری کامیاب ہو جاتی، لیکن اس کے پاس پڑھنے کے لئے کتابیں بھی نہ تھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ امتحان کے قریب کتابیں دلوائیں گی، لیکن مشیت کو ہمارا امتحان لینا مقصود تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری گزر بسر صرف ایک مکان پر ہے، جسے ہم نے کرایہ پر دے رکھا ہے، اور اس چھوٹے سے مکان میں معمولی کرایہ پر ہیں۔ ہمارے مکان کا چالیس روپے جو کرایہ آتا ہے، وہی ہماری زیست کا آسرا ہے۔ اس مکان میں بیمہ کمپنی کا جو منیجر تھا وہ ایک ہی رات میں مکان خالی کر کے بلا کسی علم و اطلاع کے معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ ایک مہینہ کا کرایہ کیا ڈوبا ہم سب کی دنیا ڈوبی۔ اماں کے ہاتھ میں چاندی کا جو آخری کڑا تھا وہ بیچ کر ہم نے ایک مہینہ کاٹا۔ اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو انجم کو کتابیں دلوائی جاتیں، اور شاید وہ رب العالمین کے صدقے کامیاب بھی ہو جاتیں، لیکن میں نے

آپ نے ابھی جو کہا کہ مشیت ہمارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ اماں انجم سے کہہ رہی ہیں کہ ابھی امتحان کو ایک سال باقی ہے۔ جب تک کسی اسکول میں نوکری کرلے، لیکن انجم اماں کی بات نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ بغیر سند والوں کو نوکری کے لئے سفارش کی ضرورت ہے، اور ہم غریب سفارش کہاں سے لائیں۔ پھر جب وہ ایک مرتبہ ملازم ہو جائے گی تو اس چکر میں وہ میٹرک بھی کامیاب نہ کرسکے گی۔

آپ کو آخر میں یہ خوش خبری سنانا چاہتی ہوں کہ میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرلیا ہے، اور اب بی۔ اے میں داخلہ بھی لے لیا ہے، لیکن مجھے کالج جانے سے ڈر سا لگتا ہے، مجھ سے کوئی لڑکی نہیں ملتی، مجھ سے کوئی دوستی نہیں کرتی، سب مجھ سے کترا کر بھاگتی ہیں۔ آپا ئیں بھی مجھے نہیں چاہتی ہیں۔ چونکہ میں تبلیا رومال پہنے کالج جاتی ہوں، میرے پاس اچھے کپڑے کہاں؟

چچا جان! میں نے سنا ہے کہ بمبئی میں جمعرات کے بازار میں سپید ساڑیاں وغیرہ سستی ملتی ہیں، اگر آپ سے ہوسکے تو میرے لئے مستعملہ سستی ساڑیاں اور قمیصوں کے لئے سستا ریشمی کپڑا بھجوائیے، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں پرانے سینڈل اور زنانی جوتے بھی فروخت ہوتے ہیں، اگر کوئی سستا جوتا مل جائے تو میرے لئے ضرور خرید یئے۔ پرسوں جب میں ننگے پیر کالج گئی تھی تو میری جماعت کی لڑکیوں نے بہت بری نظروں سے مجھے دیکھا۔ اگر وہ مجھے اسی طرح دیکھتی رہیں گی تو میں کالج جانا چھوڑ دوں گی۔ جب میں کالج جاتی ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ احساس کمتری میرا گلا دبوچ رہا ہے۔ میری غربت میری روح کو سلب کر رہی ہے۔ میری بیچارگی میری شرافت کا خاتمہ کر رہی ہے۔ لیکن یہ غریبی بھی عجیب ہے کہ پھر بھی ہم جیے جاتے ہیں۔

میں نے اتنا طویل خط آپ کو لکھ دیا لیکن اصل بات لکھنا ہی بھول گئی۔ اماں کہتی ہیں کہ آپ بمبئی جاتے وقت ان سے جو پاؤ تولہ کی طلائی انگوٹھی لیکر رہن کرائے تھے اب ان کو اس انگوٹھی کی سخت ضرورت ہے۔ چونکہ ہم سب کے کپڑے تار تار ہو چکے ہیں۔ ابا کے انتقال کے بعد سے کوئی کپڑے ہم بنوا نہ سکے، اور چار سال تک وہی پرانے کپڑے استعمال کرتے رہے۔ براہ کرم آپ توجہ فرمائیے، ہم پر احسان ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ میرے اچھے چچا خط کا جلد جواب دیں گے۔ قمر آپا اور انجم آپ کو قدمبوسی کہتی ہیں۔ اماں آپ کو دعا فرماتی ہیں۔"

آپ کی

مہر

یہ خط اس لئے میں نے چاک کیا تھا کہ کاتب کے پاس واپس کر دوں۔ لیکن واپس کرنے کی مجھ میں اب ہمت نہیں۔ کتنے ارادے، کتنی امیدیں، کتنی آرزوئیں اس خط میں ہیں جو یہ خط واپس پہنچ جائے تو تین لڑکیوں اور ایک ضعیف ماں پر

ایک اور بجلی گرے گی۔ یہ خط مہر و مہ و انجم کے چچا تک بھی پہنچ نہیں سکتا۔ چونکہ بارش کے قطروں سے پتہ دُھل چکا ہے، شاید قدرت کو ان لڑکیوں کا اور امتحان مقصود ہے۔ لیکن اس امتحان میں میں بھی شریک کر لیا گیا ہوں۔ بیچاری ستم نصیب لڑکیوں نے نام بھی کتنے اُلٹے رکھ لئے ہیں، مہر و مہ و انجم۔ تینوں کے پاس اندھیرا ہے، اندھیرے میں جا رہی ہیں۔ آگے بھی اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں وہ اس خط سے نور کی کرن کی کتنی امید باندھی ہوئی ہیں، اور یہ خط میرے پاس ہے۔

گزشتہ چار روز سے یہ خط میرے پاس ہے اور میری عقل گُم ہو گئی ہے۔ کچھ سمجھائی نہیں دیتا کہ اس خط کو کیا کروں۔

محبوب حسین جگر

غزل

ان کی الفت میں سب گوارا ہے — وہ ہیں پیارے تو غم بھی پیارا ہے

موت کی جستجو میں نکلا ہوں — زیست نے کیوں مجھے پُکارا ہے

دیدۂ تر سے اشک یوں ٹپکا — جیسے ٹوٹا ہوا ستارا ہے

زندگی جس کو لوگ کہتے ہیں — نگہِ دوست کا اشارا ہے

دل کی کشتی جہاں بھی رُک جائے — ہم سمجھتے ہیں وہ کنارا ہے

اشک آنکھوں میں ہے نہ خوں باقی — سسکیوں پر ہی اب گزارا ہے

دو ہی آنسو ظفر بہائے تھے
ایک جگنو ہے، ایک تارا ہے

احمد ظفر (راولپنڈی)

محبت

اف وہ طغیانِ محبت، ہائے وہ جوشِ جنوں
وقت کے قدموں پہ ہوتا ہی نہیں جو سرنگوں

موج و طوفاں میں بھی جو مرکز سے ہٹ سکتا نہیں
جس کا رُخ دریا کا دھارا بھی پلٹ سکتا نہیں

عشق کی فطرت ہواؤں سے بدلتی ہے کہیں
قالبِ شبنم میں ایسی آگ ڈھلتی ہے کہیں

صرصرِ ایام سے افسردہ ہوں نغموں کے پھول
قہقہے ہو جائیں طوفانِ حوادث سے ملول

عشق کی فطرت حریفِ گردشِ ایام ہے
عشق جس عالم میں ہے، آزادِ صبح و شام ہے

گرمِ احساسِ شباب و تیز نبضِ کائنات
از زمیں تا آسماں رقصِ رگِ جانِ حیات!!

ایک نشہ، اک تبسم، اک ترنمِ صبح و شام
گریۂ فطرت سے دل کے قہقہوں کا انتقام!

اک سرورِ سرمدی، اک عالمِ کیفِ تمام
عشق کیا ہے روح کی مستی میں کھو جانا تمام

وقت بدلے عشق کا عالم بدلتا ہی نہیں
وقت کے شعلے میں یہ سونا پگھلتا ہی نہیں

صفحۂ فردا کے افسانے پڑھے جاتے بھی ہیں
عشق کے پُر کیف لمحے جا کے پھر آتے بھی ہیں؟

روئے مہر و ماہ سے پردہ اٹھا سکتا ہے کون
قسمتِ آدم کی تحریریں مٹا سکتا ہے کون؟

آ مرے نزدیک او فردوسِ فطرت کی بہار
عشرتِ کونین کر دوں تیرے قدموں پر نثار!

لوٹ کر اے دوست پھر عہدِ شباب آتا نہیں
انقلاب آتے ہیں، ایسا انقلاب آتا نہیں!!

شورش

سوزِ دروں

(اس افسانے کی تخلیق اپنے وقت سے دو سال پہلے ہوئی ہے اس لئے دو سال بعد پڑھئے اس افسانے کو)

وہ ایک اندھیری گلی تھی، جہاں سے کسمپرسی چند انسانی آوازیں آ رہی تھیں۔ شام کے دھندلکے میں لالہ رام جی کی کوٹھی کی چاندنی پر چند انسانیت سوز شخصیتیں براجمان تھیں جنھوں نے صرف سڑی ہوئی نعشوں کو چاٹنا سیکھا تھا، اور اکیلے دکیلے کا دستہ ہی بیلی کہہ کر لوٹ پڑتی تھیں۔ یہ اس تنگ گلی کے شہر کہلاتی تھیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کبھی الٹ کر دیکھو تو پتہ چلے کہ انھوں نے کیسے کیسے سورماؤں کو موت کے گھاٹ اتار لیا تھا۔ جن کا جینا بھرنا خود دو بھر تھا، اور ہمیشہ زندگی کو کوسا کرتے تھے۔ نہ صرف انھوں نے سورماؤں کی جانیں لیں بلکہ زمین پر پھول رکھ کر ساٹھ سترفٹ کی بلندی سے اس پر سلیں پھینک کر پاش پاش کر دیا تھا۔ ان کی کامیابی کا راز دراصل ان کی اپنی جماعت کا ناقابلِ شکن اتحاد تھا، یہ جماعت ہمیشہ لالہ رام جی کی کوٹھی پر بیٹھا کرتی تھی جہاں ساری کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں۔ یہیں سوڈے کے شیشے، کانچ کے ٹکڑے، لوہے کے گولے اور پتھر کی سلیں لئے کسی بھولے بھالے، گم کردہ راہ مسلمان کا انتظار کیا کرتے تھے وہ! یہ وہ تنگ و تاریک گلی تھی جدھر سے پولیس کا گذر کبھی نہ ہوتا تھا، اور ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ گلی ناقابلِ توجہ تھی ——— اور ناقابلِ توجہ ہوتی بھی کیوں نہیں، جبکہ مردوں پر جو نے تھے بلی اوپر گھبراتی تھی، اور جو ہے اس کی آمد کا نام سنتے ہی دم سادھ کر خاموش ہو رہتے۔ بہرحال چوہے اپنی جان و مال کو دور ہی سے دعائیں دیتے تھے، اور بلی چوہوں کو موٹا موٹا دیکھ گھبراتی تھی۔

فساد کو شروع ہوئے کچھ اوپر دو گھنٹے ہوتے تھے، مگر ابھی تک پولیس کھلے کھلے میدانوں میں فسادیوں پر آتش باری کر رہی تھی، مگر فسادی تھے، کہ اپنے حقوق کو دم توڑتا دیکھ کر آگ کی چادر اور گولیوں کی دیواریں ہتھیلیوں میں اپنی جانیں رکھے، گھسے جا رہے تھے۔ ایسے میں مصیبت کا مارا ایک نوجوان گھبرا کر پاس کی جانی پہچانی گلی میں گھس گیا، اور ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کی ایک سانس لی ——— وہ بلوائیوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے آج تک کبھی ایسے انسانیت کش مظاہرے نہیں دیکھے تھے، وہ اپنی زندگی کی ڈور میں بائیسویں گرہ ڈال رہا تھا، مگر اس کو قسم کھانے جگہ نہ تھی جو کہیں انسان کے حلقوم سے ابلتا ہوا خون دیکھا ہو۔ میدانِ جنگ سے لوٹے ہوئے سپاہیوں کی زبانی اس نے صرف مرچ مسالے کے ساتھ تحیر زا واقعات سنے تھے، مگر سنی سنائی باتیں، آج حقیقت کا روپ کاڑھے جلوہ افروز تھیں۔ انسان جو کمخواب و دیبا میں اٹھتا بیٹھتا ہے، انسان جو گھاس پھوس کے نرم نرم بستر پر لیٹنا اٹھتا ہے، سڑکوں پر، گلیوں میں ادھر ادھر خون میں لت پت ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، جانے روح اس سے دور ہو رہی تھی، یا خون علیحدہ ہو رہا تھا، یا ہندوستان کی فرقہ واریت اور باہمی نفاق پر یہ لاشے خندہ زن تھے۔ ہندوستان کو آزادی دلانے والے بہادر ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔ اگر یہی سڑکوں پر جان دینے والے اور ہر سنگ و خشت سے ٹکر لینے والے مذہبی فرہاد ہند ماتا کے نام قربان ہوتے تو کیا انھیں آزادی نہیں مل سکتی تھی؟ مگر یہ ہندو! یہ مسلمان! ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ...... ان میں ہوش و خرد کا نام کہاں، جو سمجھتے ہندو مسلمان خون ایک ہی، کوئی علیحدہ خون نہیں۔ دو درخت پاس پاس ہوتے ہیں تو ضم ہو کر ایک ہو جاتے ہیں لیکن یہ دونوں آپس میں

بنتے بنتے نیل کے پانی کی طرح علیٰحدہ ہو کر موسیٰ کی فوج کو گزرنے کیوں دیتے ہیں، ہوش کی دوا کیوں نہیں کرتے. بہت ساری فوجیں گزرتی رہیں، اب فرعون کی فوج بھی گزرنے لگی ہے۔ کیا ہوا انہیں جو موسیٰؑ اور فرعون میں تمیز نہیں کرتے! یہ دونوں مل جائیں تو کیا فرعون کی ساری فوج اور اس کے اپنے سارے درماؤں کا خون نہ ہو سکے گا.. ؟ ——.

وہ گرم گرم گولیوں کے درمیان سے کبھی نہ گزرا تھا، ہر بار جب گولی اس کے کان پر سے گزر جایا کرتی تو اس کو زندگی کی کچھ قدر و قیمت محسوس ہوتی، اس کا سارا جسم پسینہ سے تر بتر تھا، اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ہر ہر عضو سے پسینے کے جھرنے بہہ رہے ہیں. تقریباً کچھ دن اوپر ایک سال تک اس نے بنجر زمین پر ہل چلایا تھا، بڑے بڑے پہاڑ کھود کر نہریں نکالی تھیں، سبل اور کدال لئے پہروں سڑکوں پر پسینہ بہایا کیا، پسینہ اس کے ہر ہر بال سے بہتا تھا، ہر بال کی جڑ میں پسینے کے چشمے ہی چشمے تھے۔ مگر وہ پسینہ ہی کیا تھا، جو اس کا مقابلہ کرتا، کیا بلی طاقت اور کیا بلی طاقت، اس پسینے اور اس پسینے میں خورشید و اختر کا فرق تھا۔ پہلا خون عرق ہو کر بہتا تھا، اور اب ہمت پانی ہو رہی تھی، اور یہ مناظر دیکھ کر تقدیر آپ ہی آپ پانی پانی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات کے سہارے بڑھنے لگا، اس گلی میں سے وہ کئی دفعہ گزر چکا تھا، وہ اچھی طرح پہچانتا تھا، یہی گلی آگے چل کر بڑی سڑک میں کھلتی تھی، جہاں سے تھانہ بالکل قریب پڑتا تھا، بس یہی کان اور ناک کی مسافت! جہاں تک ہو سکے فضوی کو پوسٹ آفس بحفاظت تمام پہنچ جانا چاہیئے تھا، اس لئے کہ ذرا سی آہٹ ہوتی اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر دہنی جیب کی طرف اٹھ جاتا تھا، حالانکہ اس کو وہاں کا ذرہ ذرہ جانتا اور پہچانتا تھا، وہ دل ہی دل میں کہنے لگا. یہی تو ہے چندر بھان کی کوٹھی اور یہ جو برابر میں سیٹھ لکشمی نارائن ہی تو ہے، اور ہاں یہ اونچا مکان سردار بابو کا ہے نا ——

یکایک وہ ٹھٹکا، کیا اعتبار اس دنیا کا —؟ باپ بیٹے کو نہیں سمجھتا، موقع پر بہن بھائی کو آنکھیں دکھاتی ہے —— یہاں تو ہندو مسلم بات ہے، وہ قدم قدم پر بچھے ہوئے انسانیت سوز جال، آزادی کی راہ میں پھیلے ہوئے روڑوں کو دیکھ کر شانتا کے گھر چلا جانا مناسب جانا، مگر اس کے پیش نظر شانتا کی گھریلو عزت اور بیرونی وقار ہر دو چیزیں تھیں، اگر وہ چلا جاتا تو بہت ممکن ہے شانتا اس کو چھپا لیتی، مگر اس کے باپ کو پتہ چل جاتا تو —— جانے بیٹی کا کیا حشر ہوتا، آخر وہ مسلمان ہی تو تھا اور جو محلے والوں کو اس کی خبر ہو جاتی! کیا ایسے نازک موقع پر شانتا سر اٹھانے کے قابل رہتی؟ اس کے اپنے مذہب والے اس کی تکابوٹی نہ کر دیتے —— ؟ وہ چہرے کا پسینہ پونچھنے لگا، اور خدا کا نام لیکر جلد جلد اس نے قدم اٹھائے، ابھی گلی کی اس نکڑ پر پہنچ نہ پایا تھا جہاں سے اس کو قوی امید تھی کہ حیوان شکھڑی کو بکھرے ہوئے خار مغیلاں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ایک اچھے مقام پر پہنچا دے گا، عین اس وقت جب وہ رام جی کی کوٹھی تلے تھا، بمبار میں سے بم پھینکنے والوں کی طرح ان لوگوں نے بھی نشانہ باندھ کر ایک دو —— تین چار سلیں غریب رضوی پر دے ماریں، تیورا کر کہاں سے گرتا، بس کھڑا کھڑا دفن ہو گیا، نہ سر کی جگہ سر رہا اور نہ دل و جگر میں کوئی امتیاز ہی باقی رہا، وہ لہو کی خیر ہوئی دو تین سلیں اوپر ہی اوپر ٹکرا کر دور دور جا پڑیں، کھوپڑی پچک کر رہ گئی، اور اس کے اونچے اونچے خیالات، بس رام جی کو مس کرتے ہوئے اوپر چلے گئے.

"بھگوان کی قسم! مار کھا کے سور کی طرح گر پڑا سالے کا بچہ" تنفق القلب حیوان اپنی جوانمردی پر دانت دکھانے لگا.

ہی —— ... ہی ہی ... ہی ہی ہی!!! ——.

"ہم سے کہیں بڑھ سکتے ہیں ایک قدم بھی یہ" دوسرا خاندانی بہادری کا تذکرہ کرنے لگا.

"پرماتما کی قسم گن گن نہ ماروں تو کہنا میں اپنے ایک باپ کا بیٹا نہیں"

"ایک ہی وار میں سکت کی تاب بھی نہ رہی، آیا ہے جاسوسی کرنے، ذرا اس کا دل گردہ تو دیکھو کہ ایسے خطرناک موقع پر

نئے نئے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس نئی شیروانی اس کے حق میں کفن ہو کر رہ گئی"۔

"سوچ سمجھ کر پہنے ہوں گے اس نے کپڑے، غسل بھی کر لیا ہو گا، ہوشیاری سے ملاشی لو، کہیں

کچھ نہ جائے وہ، گرگٹوں کی طرح سخت جان ہوتے ہیں بڑے وہ، کچھ مل جائے تو اچھا ہے۔"

دو تین نیچے اتر گئے، اور دو چار اوپر کے اوپر ہی رہے۔

رضوی نہ جانے کیوں ہر سال ایک ایک ٹھوکر کھاتا آیا، اور جب اس نے بائیسویں ٹھوکر کھائی تو گر کر پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کو حیدرآباد چھوڑے کچھ دن اوپر ایک سال ہو چکا تھا۔ حیدرآباد میں اس کو کس چیز کی کمی تھی، کھاتے پیتے گھرانے کا خوش حال فرد تھا، نہ خیالِ امروز نہ فکرِ فردا، بس زندگی ہنستی کھیلتی ایک ہی سڑک پر دوڑتی تھی۔ کالج سے گھر، گھر سے کالج! فرصت کے اوقات میں سسکتی ہوئی روحوں اور لرزتے ہوئے جیون کو، دل سوز، دل فگار مناظر کی اس عمدگی سے پُرکاری کرتا کہ الفاظ کی صورت میں قرطاس پر کھنچی ہوئی تصویریں ہندوستان کا منہ چڑاتی تھیں، وہ پُرسوز مناظر دیکھ کر خود کے دل میں بھی ہلا دینے والے سنّاٹے محسوس کرتا تھا، مگر اس کی خاندانی خوش حالی اور تمول نے مذاقاً اس کے دل میں سوز اور رنج و غم پیدا ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔ لاکھ دولت ہو لیکن زندگی سدا مست و خوشی کی نذر نہیں ہوتی، اس کو اٹھتے ہوئے بڑے بڑے طوفانوں سے بھی گزرنا ہوتا ہے، مکھی صرف شکر پر ہی نہیں بیٹھتی، زخموں پر بھی بیٹھ بیٹھ کر زخمی کو تنگ کرتی ہے، ایسی خوشی زندگی کے دن کاٹنے والے خاندان پر یکایک عقابی کی بھسم کر دینے والی نظریں پڑیں، اور رضوی کے بڑے بھائی پر ناگہاں پہاڑ ٹوٹ پڑے، اور حکومت نے اس کو حادثۂ شاہ منزل کا ملزم ٹھہرا کر حراست میں لے لیا۔ بات فی الحقیقت یہ تھی کہ حکومت کی ذرا سی غلطی پر مسجد شہید ہو گئی۔ بارہا احتجاج پر بھی حکومت کے کان پر جوں نہ رینگی، اگر اس کو اپنی غلطی کا علم ہو چکا تھا تو یہ احساس بہت دیر بعد ہوا۔ مسلم عوام تاخیر کا سبب نہ سمجھ سکے، ان میں مزید تابِ صبر نہ تھی، اپنے سروں پر منڈلاتے ہوئے عقاب کو دیکھ کر پہلے تو انھوں نے اپنا منہ چھپایا، لیکن جب انھیں یقین ہو گیا کہ بات بے پرواز عقاب کے اوپر کڑکڑانے والی بجلی موجود ہے تو فوراً بغاوت پر کمر باندھ لی اور جوشِ غضب میں صدرِ اعظم بہادر کے گھر کو بھی آگ لگا دی۔

رضوی کے بھائی کی ایک بڑی دکان تھی، اور دکان کا یکایک بند ہو جانا تجارتی نقطۂ نظر سے زبردست خسارہ کا موجب ہوتا ہے۔ بڑے بھائی نے جیل میں پند و نصائح کا دامن پھیلایا، اور خوب نصیحتیں کیں، زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے، اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے۔ رضوی بھائی کی حسرت بھری نظروں سے نظر نہ ملا سکا، رضوی کے باپ نے بھی بہت دنوں پہلے اپنی آخری سانسوں میں بالکل اسی طرح دیکھا تھا کہ وہ نظر نہ ملا سکا، اور بے اختیار اشک بہنے لگے تھے۔ بھائی کی گریہ آلود آواز اس کے کانوں میں دھماکے پیدا کر رہی تھی، جو بری بم کے دھماکوں سے بھی بڑی اور خطرناک آواز، وہ لرزنے لگا، اور جی میں آئی کہ کھڑے ہوئے پہرے والے کو ایک ایسا تھپڑ جمائے کہ چکرا کر مہر کھاتے ہوئے کتے کی طرح گرے، اور یہ جو جیلر بیٹھا ہے اس کے ایک ایسی دولتی لگائے کہ بیٹھا بیٹھا دم چھوڑ دے، آخر ان لوگوں کو محض شبہ پر حراست میں رکھنے کا حق کیوں حاصل ہو گیا، وہ جیل کی اونچی اونچی دیواروں کو اپنے سر کی ضربوں سے برباد و مسمار کر سکتا تھا، اور وہاں سے اپنے بھائی سمیت نو دو گیارہ ہو سکتا تھا، راہِ سفر تلاش کرتی نظریں پاس ہی کھڑے ہوئے پہرے والے پر پڑیں، اور اس کو ایسا لگا کہ آنسوؤں میں سے گزرتی ہوئی دھندلی نظریں، پہرے والے کو نہیں چاند بی بی کو دیکھ رہی ہیں، جو فصیل سے لگی کھڑی تھی، چاند بی بی کے آگے اس نے ہتھیار

ڈال دیے اور بھائی کی طرف متوجہ ہوا۔ حالانکہ بھائی شروع سے اب تک برابر کچھ جا رہا تھا، رضوی نے بھائی کو دلاسا دیا، ضمانت پر چھڑا لینے کی ممکنہ سعی کا وعدہ کیا، حالانکہ "مجلس اتحاد المسلمین" گرفتاران شاہ منزل کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی، پھر بھی اپنوں کی دوڑ دھوپ قیدی کو ایک نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوتی ہے، کافی تسلی اور تشفی دینے کے بعد اس نے اپنی ساری توانائیاں دکان پر صرف کرنے کا پُر زور وعدہ کیا۔

رضوی نے جیسے بھی بن پڑا دو مہینے دکان سنبھالی اور جب بھائی آیا تو چند جھوٹوں اور چند سچوں نے دکان بھرے کو خود بھائی کو بھائی پر شبہ ہونے لگا۔ جب بھائی پر بھائی شبہ کرتا ہے تو دونوں میں اتفاق کیونکر ممکن ہوگا، اور جب اتفاق ہی نہ ہوگا تو گھر کیسے چلے گا، کیا دوسرے اس گھر کی تاک میں نہ لگے رہیں گے، ہندو، مسلمان، دونوں بھائی بھائی، اگر ہر دو ایک دوسرے کو شکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں اتحاد ممکن ہوگا، کیا وہ اپنا گھر بچانے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ . . . . . . بھائی کے جھوٹے بہی خواہوں نے اپنی ہمدردی جتانے کے شوق میں اور اپنے احسان کے دکھاوے کی خاطر، اتنی دفعہ، اتنی دفعہ کہا کہ جھوٹ بھی سچ ہو کر رہ گیا، اور ایک دن بھائی نے رضوی سے حساب لیتے ہوئے کہا: "تم نے چار سو روپے اپنی ناجائز خواہشات پر صرف کئے ہیں!" رضوی بھائی کی زبانی یہ الفاظ سننے کے لئے کسی قیمت بھی تیار نہ تھا، "نیکی کر اور دریا میں ڈال" کے مصداق معاملہ درپیش تھا، اپنے مذاق کے خلاف اس نے دکان چلائی تھی، چونکہ دکان داری اس کے مذاق کی چیز نہ تھی، بہت ممکن ہے کچھ نقصان بھی ہوا ہوگا۔ دن بھر غور و فکر کرنے والا، اپنے خیالات میں آپ مست رہنے والا انسان بھلا تجارت کیا خاک کرے گا، یہی وجہ تھی کہ دکان کا وہ پہلے کا سا رنگ نہ رہا تھا، لیکن چار سو روپیوں کا اس کی ناجائز خواہشات پر صرف ہونا سراسر بہتان تھا، اس نے تھوڑی ہی دیر میں جو کچھ فیصلہ کرنا تھا کر لیا، اور بھائی کے لگائے ہوئے اتہام پر جلا بھنا وہاں سے اُٹھ گیا۔ سیدھا گھر گیا، کسی سے کچھ کہا نہ کسی کو کچھ بتایا، اپنے افسانوں کے مجموعے کو اُٹھایا، اور برسوں کا بکھرا ہوا سوز لئے جو نا سفورس کی طرح چمک رہا تھا، اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بھابی نے چہرے پر ناگوار شکنیں دیکھیں جن میں سے غم و اندوہ کے بادل، اور رنج و ملال کی بجلیاں جھانک رہی تھیں ہنس مکھ، اور ہمیشہ صاف رہنے والے چہرے پر رنج و غم کی لکیریں شدت کے ساتھ مرتسم ہوتی جا رہی تھیں۔ خلاف معمول چیز دیکھ کر بھابی جھجکی، اور بولی: "کیوں بھیا خیر تو ہے؟"

"دعا ہے تمہاری!" رضوی نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے ہی جواب دیا۔

"آج کچھ کھوئے کھوئے سے معلوم ہو رہے ہو؟" بھابی کا فطری جذبہ انگڑائی لینے لگا۔ بھابی اپنے دیور کو بیٹے سے بھی زیادہ چاہتی تھی۔

"کھانا کھا لو نا بھیا:—"

"نہیں بھابی!—" وہ کتاب کے اوراق اُلٹ پلٹ کر رہا تھا، مگر نظریں بہت دُور دیکھ رہی تھیں۔

"بھوک نہیں ہے مجھے"

بھابی سمجھ گئی، آج کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ اس نے اپنے دیور کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہا،

"نسرین آ رہی ہے آج مجھے فرصت بہت کم ملے گی"

"پرواہ نہیں—" وہ حیران رہ گئی، نسرین سے اتنی دلچسپی رکھنے والا لڑکا آج جانے کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا، وہ پکارتی کی پکارتی رہ گئی اور رضوی گھر چھوڑ چل دیا۔

افسانوں کا مجموعہ اس نے ایک ناشر کے حوالے کیا جس میں پندرہ تڑپتی ہوئی زندگیاں دفن تھیں۔ بولا "مہربانی کیجئے، اس مجموعے کو آپ اپنے یہاں محفوظ رکھئے گا، آج مجھ پر بجلی گری ہے، اگر زندگی باقی رہی تو مستقبل قریب میں واپس لے لونگا ورنہ ـــــ ـــــ!" وہ آگے نہ بول سکا، اور وہ بول بھی نہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس نے اسی ناشر کو اپنی کتاب دی تھی اور نہایت فخر سے کہا تھا: "دل و جگر کے خون سے لکھا ہے میں نے!" ناشر نے اس کا معاوضہ اتنا کم بتایا کہ وہ صرف اس کے ایک لمحہ کی بے چینی اور اضطراب کی بھی قیمت نہ تھا۔ رضوی اس معاوضہ پر راضی نہ ہوا تو اس نے کہا تھا "یہ فاسفورس ہے، صرف رات میں چمکتا ہے، روپیہ بٹورنے کے لئے دہکتا ہوا انگارہ پیدا کرو کہ دن میں بھی چمکے اور رات بھی چمکے ـــــ" رضوی نے مجموعہ یہ سوچتے ہوئے واپس لے لیا تھا کہ سورج بھی تو آخر صرف دن ہی میں چمکتا ہے، اور چاند بھی تو صرف رات ہی میں روشن نظر آتا ہے ـــــ ناشر نے جلدی سے اس کی رسید پھاڑ دی اور احتیاط سے اپنی شیروانی کے جیب میں رکھتے ہوئے "شکریہ" کہا اور چلتا بنا۔ ناشر شکریہ کے جواب میں چہرے سے خوشی کا اظہار کرنے لگا۔

بھابی کے بھیجے ہوئے نوکروں نے بھائی کو اطلاع دی، اور بھائی کے آدمی اور بھابی کے نوکروں نے ملک سارا حیدرآباد چھان مارا، مگر کہیں بھی اس کی پرچھائیں تک نہ ملی۔

البتہ کچھ ہی دنوں بعد وہ دہلی کی سڑکوں پر ٹن ٹن کرتا، دوڑتا پھرتا نظر آیا، گرد اور پسینہ میں اٹا ہوا مزدور رکشا کھینچ رہا تھا، اور وہ رکشا بھی بڑی مشکلوں سے سیٹھ نے رحم کھا کر دیا تھا۔

"خیر بابا! تیرا ایمان تیرے ساتھ، اگر واقعی جو کچھ کہ تو نے کہا ہے سچ ہے تو نے تجھ پر سے یہ رکشا قربان، لے جا، اپنا پیٹ پال، مگر سن! روز روپیہ دے دیا کرنا اس کا"

وہاں اس نے دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات جانی، بس ایک دھن سوار تھی کہ کسی طرح بھی بن پڑے، چار سو روپے الگ کرلے۔ رکشا کھینچنے میں اس کو ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ پیسہ زیادہ بچا سکتا تھا، اس لئے کہ اس کی آمدنی کافی ہوتی ہے اگر فضولیات پر پیسہ نہ اڑایا جائے تو بہت جلد چار سو کیا، ایک ایک کرکے پانچ سو بھی ہو جاتے تھے، ان کا معیار زندگی پست جو ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس نے اچھی سی نوکری کیوں نہیں دیکھ لی، آخر تعلیم کا مصرف کیا! وہ جانتا تھا کہ ہندوستان میں اچھی نوکری اور اچھی بیوی بہت کم ملا کرتی ہے، اور پھر نوکری کے ساتھ ساتھ معیار زندگی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جو لاکھ کماتا ہے سوا لاکھ خرچ کرتا ہے۔ اور بیس کمانے والا ۱۹ روپے صرف کرتا ہے۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ حالانکہ اس نے موٹی موٹی سواریاں بھی کھینچی تھیں، پیٹ نکلے ہوئے مرد اور پیلی عورتوں کو بھی اس نے رکشا میں بٹھایا تھا، سیٹھ لوگوں کو بھی بتائے ہوئے مقام پر پہنچایا تھا، کالج کے بابا لوگ اور بی بی لوگوں کو بھی وقت پر پہنچایا تھا، مگر اس دن جانے اس کی کون ادا تھی جو بھا گئی، ہلکی پھلکی گل اپنی نازک لڑکی کو سڑکوں پر کھینچا کھینچا پھرا، اور اپنی محنت کا معاوضہ لیتے ہوئے اس نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا، ویسے تو وہ ہر ایک کا اپنی محنت کا صلہ پاکر شکریہ ادا کیا کرتا تھا مگر کسی نے اس کے شکریہ پر اپنے کان نہ دھرے تھے حتیٰ کہ اس ناشر نے بھی کچھ نہ کہا تھا جو ادب کی بڑی بڑی کتابیں شائع کرتا ہے۔ نفسیات کی یہ طالبہ تڑپ کر رہ گئی، اور ذہن ہی ذہن میں نفسیات کی موٹی موٹی کتابیں نیچے اوپر کردیں مگر کچھ بھی سمجھائی نہ دیا، جیسے اس کے دماغ کے محفوظ ہزار ہا صفحوں پر کائی پڑ گئی۔ دلوں کے اندر تک گھس کر رتی رتی کی جانچ کرنے والی نظریں بار بار رکشا والے کے سینے پر سے لوٹ لوٹ جاتی تھیں۔ حالانکہ وہاں ذرا چھوڑ پورے کپڑے نہیں تھے، گرد، مٹی، پسینے میں اٹے ہوئے رکشا والے کے نیچے اس نے ایک بلند شخصیت دیکھی اور

جاتے جاتے اس نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ روز کالج چھوڑ دیا کرے اور گھر پہنچا دیا کرے۔

وہ دن بھر کالج میں اسی رکشا والے کے متعلق سوچتی رہی۔ کئی دفعہ خواہش زبان تک آ کر رہ گئی ورنہ وہ اپنے پروفیسر کے آگے اپنی قلبی کشمکش اور ذہنی انتشار کا راز کھول کر رکھ دیتی۔ مگر نفسیات سے کھیلنے والی ذہین طالبہ جانتی تھی کہ اندرونی خلفشار اور کلیجے میں کھٹکتی ہوئی پھانس کو دور کر دیا جائے تو وہ ٹیس کی لذتوں سے یکسر محروم ہو جائے گی تو اپنے قیمتی جذبات کے اظہار کے بعد اب اس کی قیمت ہی کیا رہی؟ اس معاملہ میں پروفیسروں کی مدد کی توقع محض فضول تھی۔ دارالمطالعے میں نفسیات کی ساری کتابیں کھول کھول کر رکھ دیں مگر ان سے اس معاملہ میں کچھ بھی مدد نہ ملی۔ ڈھیروں کتابیں سامنے پڑی تھیں، مگر ان کتابوں میں محض فضولیات اور خرافات کے کچھ نہ دھرا تھا۔ اس کا جی بھر آیا! غصہ سے تلملانے لگی۔ ضخیم ضخیم کتابیں لکھ کر عالمی شہرت کمانے والے، اس کے سامنے بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے، آج یہ پہلا موقع تھا کہ نفسیات کے شہرۂ آفاق عالم اور ماہرین خس و خاشاک کی طرح سیلِ جذبات میں رواں دواں تھے۔ ان کی عزت و توقیر ہی کیوں کی جائے، جبکہ یہ اوٹ پٹانگ لکھ کر اپنے نام کا ڈھول پیٹ لیا کرتے ہیں۔ وہ ان ساری کتابوں کو دیا سلائی دکھا دینا چاہتی تھی مگر بس نہ چلتا تھا۔

تین بجے ہی سے وہ رکشا... رکشا والے کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ ٹھن ٹھن کرتا ہوا عین وقت پر جبکہ کالج کی گھنٹی ٹن ٹن کر رہی تھی گیٹ کے سامنے پہنچا، وہ دھڑ سے رکشا میں سوار ہو گئی، جیسے اس کے سارے اعضا شدتِ تفکر کی باعث مضمحل ہو کر رہ گئے، وہ اپنے تقریباً مفلوج اعضا کو دیکھ دیکھ سوچنے لگی، میرے اعضا جانے کیوں مفلوج ہو رہے ہیں، وہ اپنے بازو میں چیونٹی لے کر اعضا کی حساسیت کا پتہ چلانے لگی، ابھی اس کے سارے جوڑ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے، اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی، اگر قوتِ گویائی جواب دے دیا کرتی تھی، ورنہ وہ تو رکشا والوں کو چھوڑ موٹر والوں کو بآسانی ڈانٹ لیا کرتی تھی۔ اس کے تنفس سے دل میں ہمدردی و مہربانی کے جذبات لہریں لینے لگے، وہ بہت دیر تک رکشا والے کی پشت، کہنیوں اور ڈنڈے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے پنجوں کو گھورتی رہی، لیکن وہ قطعی بے خبر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھے بنا۔ وہ اس کی پنڈلیوں کو تکنے لگی، بھاگتے وقت جو مچھلی بنتی تھی وہ مزدوروں کی سی نہ تھی، اس نے ننگے پنجوں کو دیکھا، ایڑی پر نظر پڑتے ہی وہ آپ ہی آپ کہنے لگی "شاندار! میں تجھ سے شرط بد سکتی ہوں، یہ صاف ایڑی رکشا والے اور مزدور لوگوں کی نہیں ہوتی، مزدوروں کی ساری ایڑیاں ہمیشہ برہنہ رہتی ہیں اور گرمی اور شدتِ سردی کی تاب نہ لا کر پھٹ پھٹ جاتی ہیں۔ میں شرط بد سکتی ہوں، بہت بڑی شرط!" وہ تیز ہونے لگی، رکشا والے نے رفتار سست کرتے ہوئے کہا "کیوں بی بی یہاں اترنا چاہتی ہیں آپ؟"

"نہیں، نہیں!!" وہ بولی "گھر تو ابھی بہت آگے ہے۔ میں ذرا خبطی قسم کی لڑکی ہوں، جانے وقت بے وقت کیوں بڑبڑا لیتی ہوں۔" اس نے اپنی ایک کمزوری کو دوسری کمزوری میں چھپا لیا۔

"میں بھی کیسا عقل سے گیا گزرا ہوں سرکار! آپ کی باتیں سمجھ نہ سکا۔" وہ بھی اپنی کمزوری کا بھانڈا پھوڑنے لگا۔

اب کوئی چیز مانعِ صحتِ خیال نہ تھی کہ جو کچھ اس نے رکشا والے کے متعلق اپنا خیال باندھا تھا سو فیصدی سچ نکلا، اس نے صرف دو باتیں کیں، اور دو باتیں بھی کس لطیف انداز اور کس پیارے پیرایہ میں! میری کمزوری کو اس نے اپنی کمزوری میں ڈھکیل کر مجھے سمجھا دیا کہ کمزوری ہر فردِ بشر میں ہونی ضروری ہے۔

وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر ساری باتیں حلق تک آکر رہ جاتی تھیں ۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ رکشا والے نے سلسلۂ خیالات کو توڑا ۔

"یہی گھر ہے نا حضور آپ کا ؟"

"نہیں ! ــــ" وہ بیدار سی ہونے لگی " ارے ہاں ، یہی یہی بہت جلد پہنچ گئے ہم گھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رکشا والا جواب میں خاموش تھا ، پھر خود ہی بولی " روز ٹھیک وقت پر آنا ــــ سن لیا نا !"

"اچھا حضور !" وہ تڑپ گئی ۔

دوسرے دن رکشا والا وقت پر اپنی سواری کے گھر گیا ، شانتا کہنے لگی " کیوں بھئی اتنی دیر لگا دی آج تم نے ؟"

"ابھی تو اس موڑ کے گھنٹہ گھر نے نو بجائے ہیں ، بی بی ــــ دیر کیسی ؟"

" نو بجے ہیں اب ؟" بناوٹی تعجب کا اس نے اظہار کیا ، اور اپنی کلائی کی سنہری گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا " مجھے نے کانٹے گھما دئے ہیں شاید ، دس بج رہے ہیں میری گھڑی میں " ۔ حالانکہ گھڑی میں چھوٹی سوئی نو پر اور بڑی ایک پر تھی ۔ رکشا والا جلد جلد قدم اٹھانے لگا ، شانتا کبھی اپنی کتابیں گود میں ڈال بیٹھ رہتی کبھی اپنے برابر میں اسی سیٹ پر رکھ لیتی ، کبھی ہاتھ میں پکڑ لیتی ، کبھی ٹانگ پر ٹانگ ڈالے بیٹھتی ، بیٹھک مناسب نہیں معلوم ہوتی تو غرارے کو نیچے کھینچ کر پاؤں کے نیچے چھپا لیتی ، کبھی ٹانگیں برابر کر لیتی ، کبھی آگے بڑھ جاتی ، کبھی پیچھے ہٹ جاتی ، یہ راز خود اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ آج اس کو بے قراری سی کیوں ہو رہی ہے ۔ اس کے بازو کا آپریشن تو نہیں کیا جا رہا تھا ، پھر یہ اضطراب ، یہ بے چینی کیا معنی ؟ جیسے اس کے کسی قریبی عزیز کو بے حد دکھ پہنچ رہا ہو ، شاید شاعر بیچارہ اپنے دل کے نقصان پر بھی کسی رات اتنی کروٹیں نہ بدلا ہوگا ، جتنی دفعہ کہ شانتا نے رکشا کو ہلا کے رکھ دیا تھا ، وہ بولنے لگی :۔

" تم رکشا کھینچنے میں بہت کچے نظر آرہے ہو ؟" اس کو شبہ نہیں ، یقین تھا کہ یہ اعلیٰ گھرانے کا شخص ہے ۔

"کسی طرح بھی پیٹ پالنا ہے بی بی !"

"تم مجھے جانتے ہو ؟ غالباً نہیں ! میں ہوں لالہ رام جی کی اکلوتی بیٹی ، اچھا بتاؤ تو سہی تم کتنے بھائی بہن ہو ؟"

"دنیا میں صرف میں ایک اکیلا ہوں ، کوئی نہیں اس جہان میں میرا !"

"اوہ !" شانتا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی " کھاتے کہاں ہو ــــ ؟"

"جہاں کہیں مل جاتا ہے !" شانتا کا معصوم دل کانپنے لگا ، غریبوں کی زندگی مصائب کا گھر کیوں ہوتی ہے ۔۔۔؟

"میں بی ۔ اے میں پڑھ رہی ہوں ، اس سال چند ہی دن ہوئے ، میں پورے کالج میں اول رہی ، مجھے بہت ساری چیزیں انعام میں ملیں ، ہمارے پتا جی بہت خوش ہوئے کہنے لگے :۔

" شانتا میں تجھے ایک موٹر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اچھا تو تمہارا کیا نام ہوا ــــ ؟

"میرا نام ؟" جیسے وہ طنز کرنے لگا ، غریبوں کا نام پوچھ کر مزید دکھ پہنچانا چاہتی ہیں " رضوی کہتے ہیں مجھے !"

"تمہیں موٹر چلانی آتی ہے رضوی ؟"

"نہیں ، سیکھ جاؤں گا سرکار ! اگر آپ موقع دیں گی !"

"خبردار رضوی ! احتیاط کرو ، تم میرا نام بگاڑ رہے ہو ، شانتا ، شانتا ہوتی ہے ، سرکار نہیں ہوتی وہ"

اچھا جب تم موٹر سیکھ جاؤ تو مجھے روز کالج پہنچا دیا کرنا، وہاں سے پارک جائیں گے، جب کالج کی لڑکیاں سرکاری طور پر پکنک منانے جائیں گی تو ہم بھی اپنی موٹر میں وہاں جائیں گے۔ میں تعارف کراؤں گی تمھارا۔ میری ایک بڑی پیاری سہیلی ہے، بڑی خوب صورت ہے وہ!" وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ "رکشا کھینچنا چھوڑ دو، بہت بُرا اثر پڑتا ہے اس کا صحت پر"

رضوی شانتا کو کالج چھوڑ کر دوسری سواری کی فکر میں آگے بڑھ گیا، وہ شانتا کی باتوں پر غور کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا، مگر اس کو رہ رہ کر تعجب ہوتا تھا، یہ لڑکی اتنی تیز کیوں ہے، سمجھتی نہیں، جب بولنے پر اترآتی ہے تو سب کچھ کہہ جاتی ہے، حیدرآباد میں بھی لڑکیاں رکشا والوں سے ایسی ہی باتیں کرتی ہیں کیا؟ شانتا کدھر، اور میں کدھر، لیکن وہ مجھ سے چاہتی کیا ہے۔ یہ تو شگفتہ کلی جس پر ابھی ابھی بادِ صبا کے لطیف طمانچوں کے نشانات اترے ہیں، وہ گلچیں کی طرف اپنا ہاتھ کیوں بڑھا رہی ہے۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر خیالات تھے کہ رہ رہ کر آتے تھے، اس کے ملاقاتی رنگ برنگی موٹروں پر لیے عطر و گلاب میں بسے ہوئے آتے ہیں مگر میں ——— میں تو ایک ادنیٰ مزدور ہوں، جس کے سارے جسم سے پسینے کی بو آتی ہے۔

رضوی شانتا کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا محض اس لیے کہ وہ اخلاقی فرض سے مجبور تھا، مگر لوٹتے وقت شانتا کہنے لگی، ذرا اس گلی سے چلو، میں اپنی سہیلی سے مل لیتی ہوں۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد گھر ملا، شانتا کہنے لگی: خیر چلو! کیا ملتے ہیں اس سے، اب گھر بھی نہیں ہوگی!" رکشا والا اتنی دُور آنے کی وجہ کافی تھک چکا تھا۔ لیکن شانتا کی میٹھی میٹھی باتیں تھکاوٹ کو ایک حد تک کم کر دیتی تھیں، نماز پڑھتے جاتے ہیں، تو قدم قریب قریب ڈال کر خدا کو زاید قدم دکھاتے ہیں تاکہ حصول نیاز میں ہمیں اتنے قدم اٹھانے پڑے۔ شانتا بھی یہی طریقہ اختیار کرنے لگی کہ گھر ایک طویل چکر کاٹ کر جانا چاہیئے۔ شانتا رکشا سے اتر کر رکشا والے پر محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے کتابیں اٹھانے لگی "دیکھو رضوی آج تو تم خوب تھک چکے، آؤ کھانا کھاتے جانا ———"

"نہیں شانتا!" وہ کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر رہی تھی، مگر نظریں بہت دُور دیکھ رہی تھیں، "بھوک نہیں ہے مجھے" رضوی کا دھیان یکایک اس جملے پر بھابی کی طرف پلٹا، وہ کھانا کھانے بلا رہی تھی، بھابی کو اس نے نفی میں جواب دیا تھا، یہ تو شانتا ہوئی .... "آپ بُرا نہ مانئے مجھے بھوک نہیں ہے اس وقت۔"

شانتا دل گیر ہوگئی، گھر سے اس نے روپیہ منگوایا اور دیتے ہوئے کہنے لگی "رضوی اپنی دل گیر اور آزردہ شانتا سے اپنا معاوضہ لیتے ہوئے انکار نہ کرنا، میں تمھیں انعام نہیں تمھارا اپنا معاوضہ دے رہی ہوں!"

"شش شں ــ ک ....." وہ شکریہ نہ بول سکا، اس لیے کہ یہ معاوضہ اس کی محنت سے سوا تھا۔

وہ بہت دنوں تک شانتا کو لاتا اور لے جاتا رہا، کئی دفعہ شانتا کالج جانے کی بجائے رکشا والے کے ساتھ پارکوں میں پھرتی رہی۔ شانتا کے آگے رضوی ایک وفادار ملازم کی طرح پیش آتا رہا، مگر شانتا کا اصرار تھا، وہ اس کو بہت کچھ سمجھتی تھی، دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے اس کی شانتا نے دس ہزار بار اپنی قسمیں دے کر پوچھا ہوگا، مگر وہ سرے ہی سے انکار کرتا رہا۔ شانتا کہتی "تم خاصے پڑھے لکھے ہو، طور طریقے بڑے گھرانے کے معلوم ہوتے ہیں، گفتگو کا انداز رکشا والوں کا سا نہیں۔ تم اپنے آپ کو چھپا رہے ہو، ایک دفعہ میں نے اپنی دوست کے سامنے انگریزی میں تمھیں برا بھلا کہا تھا ــ اس وقت میں تمھارا امتحان لے رہی تھی، تم نے ایک دم پلٹ کر غضبناک نظروں سے ہمیں گھورا، جیسے تمھاری خودی پر کسی نے اپنا وزنی پاؤں رکھ دیا تھا، جب میں نے تمھاری رفع غلط فہمی کی خاطر انگریزی ہی میں لڑکی سے کہا "رضوی کو انگریزی خوب آتی ہے ـــ" اس وقت میں بلا شبہ کہتی ہوں تم بے طرح محجوب

ہوئے تھے ـــــــ رضوی اب نہ چھپاؤ تم، خود کو میرے سامنے۔ اگر میں نے غلطی کی ہے اس میں تو پھر یہ سمجھو میرا نفسیات کا پڑھنا محض فضول ہوگا، صرف تم اتنا کہو میں آج کل جس آزمایش میں مبتلا ہوں اس میں پوری پوری اتروں گی ـــ یہی سوال اور اسی قسم کے بے شمار سوالات اس نے تاروں کی چھاؤں میں، کہکشاں تلے ہمپتوں میں، باغوں میں پوچھے تھے اگر رضوی جانے کیوں مصر تھا، صرف اتنا کہہ کر شانتی کی تشویش میں مسلسل اضافہ کئے جاتا تھا" شانتا، میرے برسوں کے زخم کو نہ چھیڑو، کیا تمھیں مسرت ہوگی میرے زخم کو دوبارہ جو یہ ستا دیکھو گی، میں وہ نہیں ہوں، جو تم سمجھتی ہو۔ میں ایک ادنیٰ رکشا والا ہوں۔ دن بھر سڑکوں پر دوڑتا دوڑتا پھرتا ہوں، کبھی کوئی مرد ہوتا ہے، اور کبھی کوئی عورت لدی پھرتی ہے۔

"رضوی!" شانتا بولی "اب تم رکشا کھینچنا چھوڑ دو، کچھ اپنی حالت بناؤ، روز بروز گرے جا رہے ہو، کل پرسوں میری موٹر آجائے گی، چلانا سیکھ لو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" شانتا منی بیگ رضوی کو دینے لگی۔

"یہ کیا ـــ؟" رضوی گھبرانے لگا

"رکھ لو تم ـــ کام آئیں گے"

"نہیں شانتا، مجھے شرمندہ نہ کرو"

"رضوی! تم میری بات نہیں مانوگے تو بس یہ سمجھ لو کل تمھیں شانتا کہیں بھی نظر نہ آئے گی"

"شانتا! تم میری سوانح حیات سننا چاہتی ہو تو میری قسم اُسے تم ہی رکھ لو، پرسوں میں تمھیں اسی پارک میں اپنی کہانی سناؤں گا!" وہ ایک بڑے احسان سے بال بال بچ گیا۔

رضوی نے اسی دن رکشا واپس کر دیا، کچھ کپڑے سلوائے، اور تیسرے روز جمع کئے ہوئے سارے روپیے شیروانی کی جیب میں رکھے، اور پوسٹ آفس کی طرف جانے لگا، شام کو اُسے اپنی روداد غم سنانی تھی۔

رضوی چلنے بھی نہ پایا کہ جان نکل گئی۔ اس کی جھڑتی لی تو داہنی جیب میں سے چار سو کے نوٹ اور بائیں جیب سے ڈیڑھ سو کے نوٹ، چند خون میں لت پت اور چند پتھر کی ضرب سے چور چور نکلے۔

لالہ رام جی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا بھولا شکار انھوں نے کم از کم اپنی پوری عمر میں کہیں نہیں دیکھا تھا، اُنھیں تعجب ہو رہا تھا، کہ یہ یکّا گھر میں اپنی خیر نہیں مناکر اس گلی میں کیوں آنکلا۔ کیا پہچانتا نہیں تھا اس گلی کو وہ؟ لالہ جی کو اس کی موت پر افسوس ہونے لگا، لالہ جی بہادر تھے، اور ہمیشہ بہادروں کی قدر کرتے تھے۔ انھیں بہت افسوس ہوا، مگر بعد کے پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ نوٹوں کو پھاڑ دینا چاہتے تھے مگر ہاتھ نہ بڑھتے تھے۔ خدا کی دین ہے۔ خدا کی دین سے انحراف کرنے والا، پاپی ہوتا ہے۔ بھگوان جس کو دینا چاہتے ہیں، چھپر پھاڑ کر یا سر پھوڑ کر بھی دیدیتے ہیں، وہ نوٹوں کی گڈی زور سے دباتے ہوئے اپنے بہادروں کی ہمت افزائی کی خاطر بولے:-

"پانچ روپے کی مٹھائی دوڑ کر بھگوان داس کی دوکان سے لے آؤ، ہم سب مل کر کھائیں گے"

لالہ جی مال غنیمت اپنی جیب خاص میں اتارتے ہوئے لونڈے کو مٹھائی لانے بھیج رہے تھے، اور اس دوران میں چیل کی تیز نظر تھے ان کی، چاندی کی تعویذ پر پڑی، جو پتھر کی ضرب سے سینے پر چپک گئی تھی، پچک گئی تو کیا ہوا، چاندی تھی آخر وہ! ایک دوسرے شخص نے لالہ رام جی کی نظر بچا کر تعویذ اتار لی، اگر لالہ جی دیکھ پاتے تو وہ بھی ان کی نذر ہو جاتی۔

پٹرول اور مٹی کا تیل چھڑک کر نعش کو کچرے کی کنڈی میں پھینکا گیا اور دیا سلائی دکھا دی۔
جب سب مٹھائی کھا چکے تو بیٹھے بیٹھے اس شخص نے تعویذ نکالی اور اس کو کھولا تو خلاف توقع اس میں سے کسی ناشر کی رسید نکلی:
"مسٹر رضوی سے اُن کے اپنے پندرہ افسانوں کا ایک مجموعہ بعنوان "دردکی کہانیاں" وصول ہوا ...."
سب تعجب کرنے لگے، اور آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مرحوم بلاشبہہ پاگل تھا، اور دُنیا کا بہت بڑا بے وقوف!

سُنتے ہیں شانتا ہر روز نو بجے ہی سے رکشا والے کا انتظار کرتی ہے، مگر مہینوں گزر گئے، وہ اِدھر کبھی نہیں پھٹکا۔ آخر انتظار سے تنگ آکر خود ہی پیدل نکل پڑتی ہے، باپ موٹر میں جانے کے لئے اصرار کرتا ہے مگر وہ اس کی ایک نہیں مانتی!

سہام مرزا

نذرِ محمد قلی قطب شاہ

سبک فصلِ گُل کو کیا جائے نا — گریبان و دامن سیا جائے نا
لگے جو نہ لب سے ترے ساقیا — وہ ساغر تو مجھ سے پیا جائے نا
تری دل ربائی ہے افسوں گری — تجھے دے کے دل پھر لیا جائے نا
یہی زندگی ہے تو مرنا بھلا — یہاں پر تو اک پل جیا جائے نا
تری کل سے ہے رات دن بے کلی — موا جائے نا اور جیا جائے نا
ترے اک اشارے کے ہیں منتظر — جو تو چاہے پھر کیا کیا جائے نا
تمنّا ہے تجھ سے یہی ساقیا — کہ محشر کو رسوا کیا جائے نا

محشر نقوی

جنازہ

فضا کی جبیں پر پسینہ ہے غم کا
یہ اشکِ مژہ آبگینہ ہے غم کا
جوانی کا دامن خزینہ ہے غم کا
یہ دُنیا میں کوئی قرینہ ہے ستم کا

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

رخِ زندگانی پہ آنسو ہیں رقصاں
کہ لیلائے شب کی ہیں زلفیں پریشاں
مشیت بھی حیراں ہے فطرت بھی لرزاں
قبائے محبت کا دامن گریباں

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

چراغِ شبستاں کی لَو تھرتھرائی
کدورت سی آئینۂ دل پہ آئی
ہوئی رنگِ ماحول سے غم نمائی
بتِ کفر پرور خدا کی دُہائی

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

کرم چاہتا تھا ستم ہو رہا ہے
قیامت کا معیار کم ہو رہا ہے
وجود اب برنگِ عدم ہو رہا ہے
فرشتوں کو جبریل غم ہو رہا ہے

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

جبریل

نئی کتابیں

۱۔ کڑیاں (افسانے) از لیلیٰ لکھنوی۔ قیمت ۸ر۔ پتہ جنرل ٹریڈرز حضرت گنج لکھنؤ۔
۲۔ دامنِ گلچیں۔ (مزاحیہ) از مقرب دہلوی۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ مشہور پبلشنگ ہاؤس۔ فراش خانہ۔ دہلی۔
۳۔ بدلیاں (افسانے) از سحاب قزلباش قیمت ۸ر۔ پتہ نگارستان ایجنسی اُردو بازار۔ دہلی۔
۴۔ دُنیائے راز (نظمیں) از راز چاندپوری قیمت ۸ر۔ پتہ محمود ابن راز۔ جی سی نیا کٹرہ جبلپور۔
۵۔ چھلّے (افسانے) از قدوس صہبائی۔ قیمت ے۔ پتہ نیا کتاب گھر۔ اُردو بازار۔ دہلی۔
۶۔ زینت (ناول) از قیسی رام پوری حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ۔ پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ دہلی
۷۔ خاکستر (افسانے) از بہار وکی حجم ۱۹۲ صفحے۔ قیمت عا ” ” ” ” ” ” ”
۸۔ پھندا (ناول) از قیسی رام پوری حجم ۲۰۶ صفحے قیمت عا ” ” ” ” ” ” ”
۹۔ آخری رات (ناول) از ایم۔ اسلم حجم ۲۳۵ صفحے۔ قیمت ۲ کلعہ۔ پتہ دارالبلاغ محمد نگر میور روڈ۔ لاہور
۱۰۔ سندیسہ (افسانے) از مولارام گوپی۔ قیمت عا۔ پتہ مکتبہ چاند۔ جموں۔ کشمیر
۱۱۔ خوش انجام (ڈراما) از سعید الحق۔ قیمت ۸ر۔ پتہ دانش محل۔ کوچہ ناہر خاں۔ دہلی
۱۲۔ طغیان (افسانے) از محمد یونس آحمر۔ قیمت عہ۔ پتہ خاتون کتاب گھر، اُردو بازار۔ دہلی
۱۳۔ مرگِ پروانہ (منظوم افسانہ) از سیدہ اختر قیمت ۱ر۔ پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ اُردو بازار۔ دہلی
۱۴۔ وزارتی مشین۔ مرتبہ ادارۂ نئی زندگی۔ بالتصویر۔ قیمت عا۔ پتہ منیجر رسالہ نئی زندگی۔ الہ آباد
۱۵۔ دیس سے باہر (جنگی مضامین) از آغا محمد اشرف۔ قیمت عا۔ پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار۔ لاہور
۱۶۔ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ۔ (ڈرامے) مرتبہ اختر شیرانی۔ قیمت ے۔ پتہ ” ” ” ” ” ” ”
۱۷۔ مقالاتِ شیرانی (تنقیدی مضامین) از حافظ محمود شیرانی۔ قیمت ے۔ پتہ ” ” ” ” ” ”
۱۸۔ معاشیاتِ قومی۔ مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ قیمت ے پتہ ” ” ” ” ” ”
۱۹۔ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے۔ از ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ قیمت ۸ر۔ پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۲۰۔ غبارِ خاطر۔ از ابوالکلام آزاد۔ قیمت للعہ۔ پتہ ” ” ” ”
۲۱۔ سحر ہونے تک (ناول) مترجمہ ابن انشا۔ قیمت عا۔ پتہ سنگم پبلشرز لمیٹڈ۔ ۱۳۔ نسبت روڈ۔ لاہور
۲۲۔ ایک کاروباری (ناولٹ) از اختر اورینوی۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ نگارستان ایجنسی۔ اُردو بازار۔ دہلی
۲۳۔ تاریخ آزاد ہند فوج۔ از منشی عبدالقدیر۔ قیمت ے۔ پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۲۴۔ نئی تہذیب نئی تعلیم۔ مترجمہ برکت علی فراق۔ قیمت عا ” ” ” ” ” ” ”
۲۵۔ ہمالیہ کی گود میں (افسانے) از ساگر چند گورکھا قیمت ۱۲ر۔ پتہ راج محل پبلشرز۔ جموں۔ کشمیر
۲۶۔ پنچم مدھم۔ از محمد عمر۔ قیمت عا پتہ ” ” ”
۲۷۔ ارمان (ناول) از آغا شاعر۔ قیمت عا پتہ ہندوستانی پبلشرز۔ دہلی
۲۸۔ ٹیڑھی لکیر (ناول) از عصمت چغتائی پتہ مکتبہ اُردو۔ لاہور
۲۹۔ ایک بات (افسانے) از ” قیمت عا پتہ ” ”
۳۰۔ پردۂ سیمیں (افسانے) از ڈاکٹر محمد نصیر الدین۔ قیمت ے۔ پتہ

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

تاریخ علم نباتات
از پروفیسر محمد سعید الدین مطبوعہ چشتیہ پریس حیدر آباد۔

یہ چھوٹی سی کتاب "ادارۂ اشاعت علوم و فنون" کے سلسلۂ مطبوعات کی چوتھی کڑی ہے۔ اس میں جامعۂ عثمانیہ کے صدر شعبۂ نباتیات نے اس علم کی مختصر سی تاریخ پانچ ابواب میں قلمبند کی ہے سعید الدین صاحب نے اردو میں نباتیات کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چار پانچ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک کتاب "پودوں کی کہانی" بچوں اور طلبہ کے لئے خود پودوں کی زبانی بہت ہی سلیس اور سادہ انداز میں لکھی گئی ہے، اور زیر نظر کتاب جو "تاریخ علم نباتیات" کے عنوان سے چھپی ہے، کا اسلوب بیان عالمانہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر سعید الدین صاحب اپنے موضوع پر بخوبی حاوی ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی تمہید میں علم نباتات کے متعلق گزشتہ زمانوں میں جن مصنفین نے اپنی تحریریں چھوڑی ہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اصل کتاب کا پہلا باب شروع ہوتا ہے جو سنہ ۱۵۴۳ء سے سنہ ۱۶۲۳ء تک اس علم کے جو ماہرین گزرے ہیں اور انھوں نے جو کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے ہر باب میں علم نباتات کے سنہ وار ارتقاء کو بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب مشاہیر علماء، اور ان کے علمی اور فنی نظریوں کے ناموں اور اصطلاحوں سے بہت زیادہ بحث کرتی ہے، اس لئے اس کے سمجھنے کے لئے نباتات سے تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے اور اسی لئے نباتیات کے طلبہ اس کتاب سے بطور خاص استفادہ کر سکیں گے۔

حیدرآباد کے جدید دستور پر ایک نظر
از جانکی پرشاد صاحب۔

اس کتابچہ میں حیدرآباد کے جدید دستور کا ایک عمدہ پیرایہ میں تعارف کرایا گیا ہے، اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید دستور کے پس منظر اور اس کی ترتیب و تدوین کی منزلوں کو نہایت خوبی سے واضح کیا جائے۔ چونکہ اس کتاب کے مرتب جانکی پرشاد صاحب کا انداز بیان نہایت ہی شگفتہ اور سلجھا ہوا ہے اس لئے اس کتابچہ کے پڑھنے میں وہ ذہنی بار محسوس نہیں ہوتا جو بالعموم قانونی اور دستوری موضوعوں پر لکھی ہوئی کتابوں کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے حیدرآباد کے رسائل و جرائد میں حیدرآباد کے جدید دستور کے متعلق جو بیانات اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ان کے پیش نظر پڑھنے والے اس دستور کی خوبیوں یا خرابیوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے، اور اصل دستور کے پورے خد و خال ٹھیک طور پر واضح نہیں ہو سکتے، اس لئے زیر نظر کتابچہ اس قابل ہے کہ اس کے ذریعہ سے حیدرآباد کی جدید دستوری کشمکش کو سمجھا جائے۔ اس میں جانکی پرشاد صاحب نے اس موضوع کو بہت ہی دلکش پیرایہ میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے طرز بیان کی دلکشی کتاب کو بیک وقت ختم کر لینے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

معروضہ
از مولوی محمد الیاس برنی صاحب۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد۔

یہ چھوٹی سی کتاب جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مولوی الیاس برنی صاحب کی متصوفانہ شاعری کا مجموعہ ہے اور اس کے ہر حصہ کی ابتداء میں مصنف نے جو صفحات نثر کے لئے وقف کئے ہیں وہ بھی اپنی معنوی اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے مصنف کے شاعرانہ کلام سے کم دلچسپ نہیں۔ مولوی الیاس برنی صاحب کی تقریر اور تحریر

دونوں کا اندازِ بیان نہایت شگفتہ اور رنگین ہے۔ ان کو شعر و سخن کا بھی ایک خاص ذوق حاصل ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ان کے مرتب کردہ منتخبات نظم کی متعدد جلدوں کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شایع ہو کر اردو دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، لیکن زیرِ نظر مجموعۂ کلام کی اشاعت سے قبل شاید کسی کو بھی علم نہ تھا کہ برنی صاحب خود بھی شعر لکھتے ہیں۔ ان کے زیرِ نظر دونوں مجموعے شاعری کے اعلیٰ نمونوں سے معمور ہیں اور ان کے کلام میں نعت و منقبت کے پاکیزہ مضامین کے علاوہ اتنی رنگینی اور موسیقیت بھی موجود ہے کہ یقین ہے کہ ان کا کلام بہت جلد سماع کی مجلسوں میں مقبولیت حاصل کرے گا۔ تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لئے تو یہ دونوں کتابیں ایک نعمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سلطانہ رضیہ از خورشید لکھنوی۔ ناشر کتابستان لاہور۔

یہ ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جس میں ہندوستان کی مشہور جانباز ملکہ سلطانہ رضیہ کی زندگی کے ڈرامائی پہلوؤں کو دلچسپ اور فنی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ فلم کی ضروریات کے پیشِ نظر قلمبند ہوا ہے اور اس کا پیش لفظ سید احتشام حسین لکچرار شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے لکھا ہے جس میں انھوں نے یہ صحیح رائے ظاہر کی ہے کہ جب اس ڈرامہ کی فلم تیار کی جائے تو وہ ضرور پسندیدہ ہوگی۔

رضیہ سلطانہ کی زندگی کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں عام طور پر رائج ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رضیہ سلطانہ اور اس کے حبشی غلام یاقوت کے آپس میں عشق عاشقی کا تعلق تھا۔ اس ڈرامہ کے مصنف نے اس واقعہ کا بڑی خوبی کے ساتھ ابطال کیا ہے اور تاریخ کی اس تحقیق کو پیشِ نظر رکھ کر یہ ڈرامہ لکھا ہے کہ یاقوت دراصل ایک وفادار اور عقلمند غلام تھا، اس لئے رضیہ اس کی عزت اور قدر کرتی تھی اور حقیقت میں اس کو بھٹنڈے کے گورنر ملک التونیا سے محبت تھی۔

موجودہ فلمی ڈراموں میں جہاں تاریخی پس منظر پیش کیا جاتا ہے یا تاریخی اشخاص سے متعلق قصہ تیار کیا جاتا ہے تو اس امر کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ جو باتیں ڈرامہ میں پیش کی جا رہی ہیں وہ تاریخی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخی فلموں سے متعلق اخبارات و جرائد میں اعتراضات شایع ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے اسلاف کی برائیوں کو اُجاگر کرنا یا ان کے معائب کو نمایاں کر کے دکھانا بجائے خود بہت بڑا عیب ہے، اور جو برائیاں یا خرابیاں ان میں موجود نہ تھیں محض ڈرامہ میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر ان کو زیبِ داستان کرنا نہ صرف عیب بلکہ جرم ہے اور اس قسم کے ڈرامے پیش کرنے والی فلم کمپنیوں کے خلاف شاید مقدمے بھی دائر کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم کے لئے ڈرامہ تیار کرتے وقت فلم سازی کو ٹکنیک کی پابندی ضروری ہوتی ہے اور مکالمے اور کہانی میں ایسے پہلو بھی پیدا کرنے پڑتے ہیں جو فن کی ضرورت کو پورا کریں لیکن ان ضرورتوں کی خاطر کوئی غیور قوم اپنی تاریخ اور اپنی زبان کو مسخ ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ زیرِ نظر کتاب میں جو مکالمے قلمبند کئے گئے ہیں وہ نہایت برجستہ ہیں۔ اس میں زبان کی ادبیت کو بھی باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مشہور تاریخی فلموں کی طرح اس کتاب کے مکالموں اور زبان میں تصنع نظر نہیں آتا، اور در واقعہ یہ ہے کہ اگر اس ڈرامہ کے پیش لفظ اور تمہید میں اس امر کی طرف اشارہ نہ کیا جاتا کہ یہ ڈرامہ فلمی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے تو زیادہ بہتر ہوتا، اس لئے کہ بحالتِ موجودہ اردو ادب میں اچھے ڈراموں کی جو کمی ہے اس کو رفع کرنے کے لئے اس قسم کے عمدہ ڈراموں کی بیحد ضرورت ہے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ

از سید عبدالہادی ایم۔ اے لکچرار دارالعلوم کالج۔ ناشر نفیس اکاڈیمی حیدرآباد۔

عہد حاضر کے ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت اسی مسئلہ کو حاصل ہوگئی ہے، اور اہل ہند کی قدیمی تنگ نظریوں میں برطانوی راج کی پیدا کردہ تہذیب و ثقافت کے باوجود کسی طرح کی کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ دُنیا کے دوسرے ممالک اور خاصکر مصر اور بلقان میں بھی اقلیتوں کا مسئلہ موجود تھا لیکن وہاں کبھی کے اس کو حل کر لیا گیا۔ ہندوستان ہی ایک ایسا بدقسمت خطہ ہے کہ جہاں اس میں روز بروز پیچیدگیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ بھی دیں تو اقلیت و اکثریت کے تصور کی جو متعدی بیماری وہ اس ملک میں پھیلا چکے ہیں اس کی سمیت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ زیر نظر کتاب اسی معرکہ آرا موضوع سے بحث کرتی ہے۔ اس کے مضامین کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مسئلہ اقلیت کا تاریخی پس منظر دکھایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی سامراج کو ہندوستان میں کس قسم کے خطرے درپیش ہوئے تھے اور کس طرح فرقہ واریت کی ابتدا کی گئی۔ تیسرے باب میں مسلمانوں کے مطالبات اور سنہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات پر روشنی ڈالی گئی۔ چوتھا باب ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد اور اس کے محرکات پر مشتمل ہے اور لکھنؤ کے سنہ ۱۹۱۶ء کے میثاق سے بحث کرتا ہے۔ پانچویں باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں جو اصلاحات نافذ کی گئیں ان میں اقلیتوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ چھٹا باب اس فرقہ داری جد و جہد کو پیش کرتا ہے جو سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک کی گئی۔ ساتویں باب میں سنہ ۱۹۲۵ء کے قانون حکومت ہند کے ذریعہ فرقہ وارانہ مسائل کے لئے جو تجویزیں نافذ کی گئی تھیں ان کو پیش کیا گیا ہے۔ آٹھواں باب ہندو مسلم اختلافات کے حقیقی اسباب بیان کرتا ہے۔ اور آخری باب میں مسئلہ اقلیت کی موجودہ صورت حال سے بحث کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب پُر از معلومات اور مفید ہے۔ خاص طور پر ان نوجوانوں کو چاہیے کہ اس کا مطالعہ کریں جو سیاسی امور میں حصہ لے رہے ہیں یا اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

"ق"

ہمالیہ کی گود میں

ساگر چند گورکھا

(۱۱۹) صفحات۔ قیمت عہ/ ۱۲ ۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

ساگر چند گورکھا کا نام کسی کتاب کے مصنف کی حیثیت سے پہلی دفعہ سُنا گیا ہے۔ سترہ چھوٹے چھوٹے ادب پاروں کو انھوں نے "ہمالیہ کی گود میں" کا ارزاں نام دیا ہے۔ کیونکہ ان کے تاثرات وہی ہیں جو "ہمالیہ کی گود میں" انھوں نے محسوس کئے۔ انھیں فطرت سے محبت ہے۔ خصوصاً ہمالیہ کے حُسن سے۔ طرز بیان دلچسپ ہے اور مزاج کی ہلکی ہلکی لہریں ہیں۔ مگر ہر مضمونچہ بجائے خود بے حد مختصر اور تشنہ ہے۔ گورکھا اگر اپنے مشاہدات کو فنکارانہ تفصیل سے بیان کرنے تو یہی باتیں اور چمک جاتیں۔ بہرحال اُردو ادب میں یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ "سپنوں کی دُنیا" میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر چمکنے والی برف بن جاتے۔ اس سے زیادہ فطرت سے محبت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ کوئیے والی، پاپا، مرہم بہت اچھے افسانچے ہیں۔ شُعلے کی آب دھوا اچھا طنزیہ ہے۔ ان کے افسانوں کے پس منظر میں کشمیر کی مفلس و معصوم دیہاتنیں مسکراتی ہیں، روتی ہیں اور فطرت سے محبت

کرنے کی دعوت دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔

راجندر سنگھ بیدی اُردو کے سب سے بلند پایہ ادیب نے مقدمہ لکھا ہے ، مگر انھوں نے بجائے گورکھا کے فن پر بحث کرنے کے ان کے ذاتی حالات زیادہ لکھ دیئے ہیں ، اس سے مصنف کے متعلق معلومات تو حاصل ہو جاتی ہیں مگر ساتھ ہی محسوس ہوتا ہے کہ بیدی نے مقدمہ لکھا تو ہے مگر وہ ان کے فن سے متعلق کچھ لکھنا نہ چاہتے تھے ۔

مثنوی عورت اور سماج از صائب عاصمی ۔ (۳۲) صفحے ۔ قیمت ۸ر پبلشرز یونائیٹڈ ۔ چوک انارکلی لاہور ۔ ولنے از بک ڈپاٹ ۔ بیرون دہلی دروازہ لاہور ۔

اس مثنوی میں شاعر نے طوائف کی زندگی پر آنسو بہائے ہیں نتیجہ یہی نکالا ہے کہ مفلسی اور بھوک عصمت کو بھی ویران کر دیتے ہیں جو ہندوستانی عورت اور ہر عورت کا جوہر ہے ۔ زبان ستھری طرز بیان دلکش ۔

مثنوی کا مقدمہ ثریا جبیں صاحبہ بی ۔ اے فاضل نے لکھا ہے جو اس چھوٹی سی مثنوی کے لئے بے حد طویل ہے ۔ اگر صائب صاحب اسے اپنے دیوان کے لئے بھی محفوظ رکھیں اور استعمال کریں تو اچھا ہے ، کیونکہ اس میں ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق نہایت تفصیل سے کام لیا گیا ہے ۔

اسلام اور مشاہیر عالم مرتبہ حبیب عبداللہ ابن حسن بالفقیہ ۔ (۱۱۶) صفحات ، قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں ۔ لائق مولف نے ایک قابل قدر کام نہایت محنت اور کاوش سے انجام دیا ہے ۔

اس میں انھوں نے قرآن مجید ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور رحمت اسلام کے متعلق ہندو ، سکھ ، چینی اور عیسائی عالموں کے اقوال اور تاثرات جمع کر دئے ہیں جنھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دشمنان اسلام بھی جب اسلام کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو سوائے تعریف کے کچھ نہیں کہہ سکتے ۔

زیر نظر مجموعہ میں رابندر ناتھ ٹیگور ، سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی کے تاثرات بھی موجود ہیں ۔

انیسیات مجموعۂ کلام انیسہ ہارون شروانیہ ۔ (۱۹۲) صفحات ۔ قیمت عاں ۔ ملنے کا پتہ اُردو محل حیدرآباد دکن ۔ محترمہ انیسہ شروانیہ کی مختلف نظمیں ، غزلیں ، نعت اور حمد اس مجموعۂ کلام میں شامل ہیں ۔ ترتیب میں مختلف ادوار کا خیال رکھا گیا ہے جس سے موصوفہ کے فن کی ارتقائی منازل کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے ۔ زبان شیریں اور سلیس ہے ۔ ہر شعر خلوص دل اور شدت احساس کا آئینہ دار ہے خصوصاً وہ نظمیں جو بارگاہ رسالت میں حج کے موقع پر لکھی گئی ہیں عشق محمدی و عشق خداوندی کی بہترین تفسیر ہیں ۔ جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے آسان حدیثوں اور آیتوں کا حوالہ بھی دیا ہے ۔

البیان ـــــ ختم نبوت نمبر مرتبہ اقبال سلمانی ۔ قیمت ۸ر ۔ ملنے کا پتہ دفتر امت مسلمہ ۔ بیرون دروازہ حکیماں امرتسر ۔

سلمانی صاحب نے فرقۂ احمدیہ کے دعوئے نبوت سے متاثر ہو کر یہ کتاب مرتب کی ہے ، اور رسولہ لائق مشاہیر اسلام کے مضامین درج کئے ہیں ، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام میں نبوت آنحضرت صلعم پر ختم ہو گئی ، اب ہر دعویٰ باطل ہے ۔ مضامین نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا عبداللہ سندھی ، سر محمد اقبال ، سید سلیمان ندوی اور مولانا اسلم جیراج پوری کے نام ہی اس بات کے ضامن ہیں کہ مضامین دلائل و براہین کی مدد سے لکھے گئے ہیں کج بحثی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے ۔

پنچم مدھم محمد عمر (نور الٰہی)
(۲۰۸) صفحات. قیمت عمار. راج محل پبلشرز. جموں کشمیر.

محمد عمر صاحب کے سات ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو مصنف نے غیر زبان سے لے کر ہندوستانی طرز پر اردو میں ڈھالے ہیں۔ اکثر ڈرامے تاریخ سے متعلق ہیں۔ تخت طاؤس کا خاتمہ غیر مکمل ہے جو عہد شاہجہانی سے متعلق ہے۔ حادثہ جو اس مجموعہ کے آخر میں ہے ان کا طبعزاد ڈرامہ ہے۔ طنزیہ ڈرامہ ہے۔ اردو ادب میں ڈرامہ نگاری کے فن نے ترقی نہیں کی ہے اس لئے یہ قدر کی نظر سے ضرور دیکھے جائیں گے بعض اوقات زبان ثقیل استعمال کی ہے

ساحلی خاموشی اور دوسرے ڈرامے از سید عبد القدوس مہاراج کالج میسور۔
(۵۰) صفحات قیمت درج نہیں مطبوعہ سنٹرل پبلشنگ ہاؤز۔ شہر بنگلور۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اب حیدرآباد سے باہر بھی اشاعت اردو ادب کا کام شروع کر دیا ہے اور اردو میں لکھنے کا شوق پیدا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی وہاں کے ایک طالب علم کی پہلی ادبی کوشش ہے اس لئے قابل قدر ہے۔ تین مختصر ڈرامے شامل ہیں۔ آیندہ معیار اور بڑھایا جائے۔ کتاب میں فن ڈرامہ نگاری ایک مضمون بھی ہے جو بجائے خود قابل قدر ہے۔ عبد القادر سروری صاحب اور عبد الواحد صاحب نے دیباچہ اور پیش لفظ لکھا ہے۔

ادب لطیف سالنامہ ۴۶ء مکتبہ اردو۔ حجم (۲۷۲) صفحات۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔

سالناموں کو اس قدر حسن ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ادارۂ ادب لطیف کا ہی حصہ ہے۔ کیا مقالات و منظومات کیا غزلیات و افسانے سبھی انتخاب ہیں۔ تقریباً تمام مشاہیر اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔ خصوصاً افسانوں کا مجموعہ تو بے حد اچھا ہے۔ کرشن چندر نے اردو ادب میں اس دفعہ نئی چیز پیش کی ہے۔ "پودے" جس میں واقعات نگاری کے باوجود افسانوں کا سا حسن ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے افسانے کے لئے نیا موضوع اختیار کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی "ناسور" لکھ کر ہمیشہ کی طرح اپنے آپ کو ممتاز ثابت کر دیا ہے۔ ان کے ہر افسانہ میں کچھ نہ کچھ انوکھا اچھوتا پن ضرور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عزیز احمد، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی اور ابراہیم جلیس نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ بحیثیت مجموعی پورا شمارہ دلچسپ ہے۔ نئے ادب کے مخالفین کو اسے پڑھنا چاہیئے اور سوچنا چاہیئے کہ اگر ترقی پسند ادب یہ کچھ ہے تو پھر کیا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ اچھا ہے۔

افکار ماہنامہ بھوپال۔ چندہ سالانہ ۶ؔ۔

بھوپال ہمیشہ سے علمی و ادبی خدمت کے لئے مشہور ہے چنانچہ ترقی پسند رجحانات کا عکاس ایک رسالہ افکار جاری کیا گیا ہے۔ مجلس ادارت میں رشدی بھوپالی، صہبا لکھنوی اور کوثر چاند پوری کے نام ملتے ہیں معیار کافی اچھا ہے۔ مقالات، نظموں اور افسانوں کا انتخاب اچھا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں تسنیم سلیم کا افسانہ بہت اچھا ہے۔

سوویت روس اور مسئلہ قومیت مترجمہ تمنائی۔ حجم (۱۶) صفحات قیمت ۳؍۔ ملنے کا پتہ نیا سنسار اباکی پور پٹنہ۔

تمنائی صاحب مترجم کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ "زندہ چین" کا انھوں نے ہی ترجمہ کیا تھا۔ روسی مسائل پر چھوٹے چھوٹے مضامین کا ترجمہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کتابچہ میں سوویت روس میں قومیت کے مسئلہ اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ عوام کے لئے اس کا مطالعہ صحت بخش اور

معلومات آفریں ہوگا۔

دور دیس کی شہزادی بھائی جان (دفتر میزان) قیمت ۴ر۔ حجم (۲۳) صفحات۔
بھائی جان نے بچوں کے لئے ایک انتہائی دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ ایسی کہانیاں بچپن میں ہم بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں لیکن اندیشہ تھا کہ زمانہ شاید اسے بھلا دے۔ اس لئے ان کو لکھنا اور محفوظ کر لینا مفید ہے۔ ان شہزادے شہزادیوں کے روپ میں بچے ان کرداروں سے متاثر ہوتے ہیں جو حصول مقصد کے لئے دکھ جھیلتے ہیں، زمانہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بھائی جان کی زبان فصیح نہیں ہے، اور اکثر جگہ انھوں نے معمولی معمولی غلطیاں کی ہیں۔ اس طرف انھیں زیادہ توجہ دینی چاہیئے کیونکہ بچوں پر اس کا بہت اثر پڑتا ہے۔ زبان سلجھی ہوئی ہونی چاہیئے۔

راجکماری چمپا راجہ مہدی علی خان۔ حجم (۴۸) صفحات۔ قیمت ۶ر۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔
راجہ مہدی علی خان نے پانچ چھوٹی چھوٹی کہانیاں دلچسپ انداز میں لکھی ہیں۔ زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ سرورق بھی خوب صورت ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر یقیناً بچے خوش ہوں گے۔

بولوں کا قلعہ راجہ مہدی علی خان۔ حجم (۴۷) صفحات۔ قیمت ۶ر۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔
اس میں بھی پانچ دلچسپ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ "بہادر پرشین" اور "ذیوار چین" ان میں تاریخی ہیں۔ بچوں کے لئے ایسی دلچسپ تاریخی کہانیاں بہت اچھی ثابت ہوں گی، اور دل بہلائی کے ساتھ ساتھ وہ بہت کچھ سیکھ لیں گے۔

ہمارے آس پاس غوث انصاری۔ قیمت ۶ر۔ حجم (۵۱) صفحات۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔
بچوں کے لئے سائنس کی عام فہم کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اس کی بے حد ضرورت ہے۔ انصاری صاحب نے آسان پیرایہ میں بچوں کے لئے اکثر اہم ایجادات کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں مثلاً "بس کی کہانی" "برقی قوت کی کہانی"۔ کیڑے مکوڑے وغیرہ۔ کتاب کا انتساب بچوں کو بہت پسند آئے گا کیونکہ لکھا ہے "تمہارے نام" ہر بچہ اسے پڑھے اور زمانہ کی ترقی سے باخبر ہو۔

توافق للبقاء نعیم صدیقی، (۶۹) صفحات۔ قیمت ۱۰ر۔ دار الاشاعت نشاۃ الثانیہ حیدر آباد دکن۔
یہ کتاب ڈارون کے نظریۂ تنازع للبقاء کی تردید میں لکھی ہے۔ اپنے مضمون کا انھوں نے اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ انداز عالمانہ ہے۔ زبان ادبی استعمال کی گئی ہے۔ باوجود خشک نظریوں سے بحث کرنے کے طرز دلچسپ ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔

ایک کاروباری اختر اورینوی۔ حجم (۶۴) صفحات۔ قیمت ۲ر۔ ہندوستانی پبلشرز دلی۔
اورینوی کا نام، ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر جنوبی بہار کی فطری دل کشی ہے۔ مگر اس کاروباری کی نفسیات نگاری کرتے کرتے انھوں نے انوکھی چیز پیش کی ہے کہ فطری حسن دل کشی کی بھی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ اس کی نفسیاتی الجھنوں کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ انجام تو بس ایسا ہے کہ تعریف کئے بغیر نہ رہا جائے۔ "زس"

ادارے کی خبریں

شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے تاثرات

بتاریخ ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء م ۱۴ صفر ۱۳۶۵ھ روز جمعہ صبح ۹ بجے آنریبل مولوی سید زاہد حسین صاحب صدر المہام فینانس سرکار عالی اور شمس العلما مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی ادارۂ ادبیات اردو کے معائنہ کے لئے تشریف فرما ہوئے۔ اس موقع پر ادارے کی مصروفیات معلوم کرکے حضرت خواجہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ دہلی تشریف لیجانے کے بعد اس گروپ فوٹو کو جو اس روز ادارے میں لیا گیا تھا ایک بڑے پوسٹر میں شایع کیا۔ اور اس پوسٹر میں بحرف جلی جو عبارت از راہ قدردانی درج فرمائی وہ حسب ذیل ہے:

> **ایوانِ اردو حیدرآباد دکن**
>
> **ادارۂ ادبیات اردو**
>
> **گروپ فوٹو**
>
> "آل نبی اولاد علی سید محی الدین قادری زورؔ نے حیدرآباد دکن میں اردو زبان کا یہ ایوان بنایا ہے جس نے اعلیٰ درجہ کی علمی اور تاریخی کتابیں شایع کی ہیں۔ زورؔ صاحب کی رفاقت میں بڑے بڑے تعلیم یافتہ ہندو مسلمان بلا معاوضہ اردو زبان کی ترقی کا بہت بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔"
>
> جنوری ۱۹۴۶ء کے شروع میں آنریبل مولوی زاہد حسین وزیر خزانہ شاہ دکن اور خواجہ حسن نظامی دہلوی کو یہ ایوان اردو دکھایا گیا۔
>
> ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں ہندو مسلمان مل جل کر اردو زبان کا وہ شاندار کام کر رہے ہیں جس کی مثال ہندوستان کے کسی مقام پر نہیں ملتی۔
>
> ---
>
> شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی جانشین حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی کے لئے ایڈیٹر اخبار منادی دہلی نے شایع کیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۶ء

یہ پوسٹر ہزاروں کی تعداد میں شایع ہوا اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے علم دوست اصحاب کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ اس قدر افزائی کے لئے منجانب ادارہ حضرت شمس العلما خواجہ حسن نظامی صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

روزنامچہ

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچہ میں جو اخبار منادی سوختہ ۹ روزنامہ فروری ۱۹۴۶ء کے ساتھ شائع ہوا ہے ۱۰ جنوری کی تاریخ کے تحت ادارۂ ادبیات اردو کا عنوان قائم کرکے اپنے معائنہ کے حسب ذیل تاثرات قلمبند فرمائے ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو

"دن میں ادارۂ ادبیات اردو میں گیا تھا۔ یہاں مولوی زاہد حسین صاحب صدر المہام فینانس تشریف لائے تھے۔ مولوی سید محی الدین صاحب زور بانی ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے بے مثال کاموں کو دکھایا۔ اتنی زیادہ خوبیاں یہاں جمع تھیں کہ روزنامچے میں ان کی تفصیل لکھوں تو ایک کتاب بن جائے۔ صدر المہام صاحب بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ایسے سائنٹفک طریقے سے اردو کی نسبت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اور ایسی عجیب و غریب خدمات انجام دی گئی ہیں کہ زور صاحب کو اردو پاشا خطاب دینے کو جی چاہتا ہے۔

ایک عجیب کتاب

ابوالحسن تانا شاہ کی قید کے زمانے میں قلعہ دار جو روزنامچہ لکھتا تھا یا جو معروضے شہنشاہ اورنگ زیب کو بھیجتا تھا اور جس قسم کے انتظامی جوابات اورنگ زیب کی طرف سے آتے تھے۔ وہ سب اس کتاب میں درج ہیں اور یہ دکن کی تاریخ کا وہ قیمتی خزانہ ہے جو دنیا میں نہیں میسر نہ آسکے گا اور ایک کتاب حضرت ٹیپو سلطان شہید کا روزنامچہ ہے اور وہ بھی نہایت بیش قیمت چیز ہے میں نے زور صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان دونوں کتابوں کی نقلیں مجھے شائع کرنے کے لئے عنایت فرمائیں اور انھوں نے وعدہ کیا ہے۔ اگر میں اس ارادے میں کامیاب ہوجاؤں تو یہ سمجھوں گا کہ موجودہ سفر دکن بہت کامیاب ہوا جس نے مجھے تھکا دیا ہے۔ کیونکہ رات دن کے ہجوم کی وجہ سے مجھے کوئی وقت سکون اور آرام کا نہیں ملتا ہے۔

یہاں تصویر بھی لی گئی۔ مگر واجبی تکلفات بالکل نہیں تھے کیونکہ ایک سچے مخصوص ہو علمی ایوان تھا۔"

۷ ستمبر کے منادی میں حضرت خواجہ صاحب کے چار روزہ سفر حیدرآباد کے تاثرات درج ہیں۔ ان میں خواجہ صاحب نے حسب ذیل تاثرات ادارہ کے متعلق ظاہر فرمایا۔

ادارۂ ادبیات اردو کے بانی

"مولوی سید محی الدین صاحب قادری زور حیدرآباد کے ان درخشندہ باشندوں میں ہیں جن کے کاموں کی روشنی اب بھی حیدرآباد کو منور کررہی ہے اور آئندہ بھی صدیوں تک درخشاں رہے گی۔ انھوں نے اور ان کے ادارے کے رفیقوں نے اردو زبان کی بے نظیر اور قابل تقلید خدمات انجام دی ہیں۔ اور مجھے تمنا رہتی ہے کہ اگر فرصت ملے تو میں ادارۂ ادبیات اردو کے ان کاموں کو بار بار دیکھوں جن سے اردو زبان کی خدمت کرنے کے لئے دماغوں میں عملی نور پیدا ہوتا ہے۔"

اردو امتحانات کے مرکزوں کی رودادیں

مرکز بمبئی

سال حال ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات انجمن اسلام ہائی اسکول کی نگرانی میں ماہ جون ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوئے۔ امتحان دینے والوں میں چھوٹے بڑے اور ہر طبقے کے امیدوار شریک تھے۔ امیدواروں کے تعلیمی شوق کا حال سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی کارخانے، دفتر یا تجارتی ادارے وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض ایسے اصحاب بھی امتحان گاہ میں نظر آئے جو ادارہ کے امتحانات کے ذریعہ سے لکھنے پڑھنے کی نعمت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ میں نے جب ان سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ انھیں اردو زبان سیکھنے، اخبارات و رسائل پڑھنے اور خطوط لکھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ اور باوجود تمام دن کی محنت و مصروفیت کے وہ کچھ نہ کچھ وقت اس علمی بھوک اور پیاس بجھانے کے لئے نکال ہی لیتے ہیں۔

بمبئی کی بارش مشہور ہے۔ اس زمانہ میں یہ اپنے شباب پر تھی۔ بارش کا سلسلہ امتحان کے دن بھی جاری رہا۔ علاوہ ازیں امتحان کے دن کام کا دن تھا ورنہ اتوار کو تعطیل نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے پیشہ ور لوگ متوقع تعداد میں نہ آسکے۔

ادارہ کی یہ شاخ عبدالرزاق صاحب قریشی مددگار انجمن اسلام ہائی اسکول کی نگرانی میں تعلیم بالغان کا کام انجام دے رہی ہے۔ صاحب موصوف اس شاخ کے بانی اور روح رواں ہیں۔ صاحب موصوف کی ذاتی دلچسپی اور اردو کی نشر و اشاعت سے والہانہ لگاؤ قابل داد ہے۔ قریشی صاحب نہایت مخلص کارکن ہیں جو نہایت مستعدی سے باوجود کئی موانعات کے زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اگر حکومت بمبئی کا محکمہ تعلیم بالغان ادارہ کی شاخ بمبئی کو [illegible] اس کی ہمت افزائی کرے تو بہت آسانی سے اور ایک وسیع پیمانہ پر اردو کی نشر و اشاعت کا انتظام انجام پا سکتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر مجھے وہاں کئی علم دوست اصحاب سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ قریشی صاحب نے اس مقصد کے تحت چند حضرات کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ اس پارٹی میں "تعلیم بالغاں" "اردو کی نشر و اشاعت" اور ادارہ کے امتحانات کے متعلق بات چیت ہوئی۔ دیر تک تبادلۂ خیالات کے بعد طے پایا کہ بمبئی کے افسر تعلیم بالغاں سے اس خصوص میں ربط پیدا کیا جائے تاکہ اس نیک مقصد کے لئے سرکاری و خانگی ذرائع کو استعمال میں لایا جاسکے۔ اس گفتگو میں شہاب الدین صاحب دسنوی سابق پرنسپل انجمن اسلام ہائی اسکول اور موجودہ پرنسپل صاحب نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ دسنوی صاحب اردو کے ایک مخلص اور دیرینہ خدمت گزار ہیں۔ آپ بمبئی کی انجمن ترقی اردو کے معتمد بھی ہیں۔ ادارہ کے امتحانات سے آپ کو گہری دلچسپی ہے۔ ادارہ سے آپ کا یہ اشتراک عمل نہ صرف قابل تحسین ہے بلکہ لائق تقلید بھی۔

میرا قیام بمبئی میں گو مختصر رہا لیکن دلچسپ رہا۔ میں اسمٰعیل منصوری صاحب اور انصار احمد صاحب وارڈن انجمن اسلام ہاسٹل کی عنایات کو فراموش نہیں کرسکتا۔ منصوری صاحب کا حسن سلوک، انصار صاحب کی مہمان نوازی اور قریشی صاحب کا خلوص میرے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ — محمد بن عمر

مرکز باگلی جاگیر

بتاریخ ۱۲ جون ۱۹۴۶ء یوم پنجشنبہ شام کی ٹرین سے باگلی روانہ ہوا۔ غلط رہبری کی وجہ سے مرکز باگلی کے پہنچنے میں چند گھنٹوں کی تاخیر ہوئی۔ نظام الاوقات میں خفیف سی ترمیم کے بعد جملہ امتحانات حسب قاعدہ بہ پابندی اوقات لئے گئے۔ چنانچہ ذکور و اناث میں حسب ذیل امیدوار شریک رہے۔

اردو فاضل (ذکور) ایک

اردو عالم	(اناث)	ایک
اردو زباں دانی	(ذکور)	۱۲
اردو دانی	(ذکور)	۲۰
اردو دانی	(اناث)	۹

طبقۂ ذکور کی نگرانی مولوی کریم خاں صاحب صدر مدرس وظیفہ یاب و مولوی آغا ناتک صاحب مدرس وظیفہ یاب نے نہایت فرض شناسانہ طور پر فرمائی اور طبقۂ اناث کی نگرانی افضل النساء بیگم صاحبہ بنت کریم خاں صاحب اردو فاضل نے کی۔

سرپرست شاخ ادارہ | مولوی شیخ لعل محمد صاحب بی ایس سی ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ ادارہ کی شاخ کے سرپرست ہیں۔ صاحب موصوف اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ اورنگ آباد تشریف لے جاچکے تھے چنانچہ واپسی پر اورنگ آباد میں حسن ملاقات کی۔ صاحب ممدوح کا خلوص، علمی دلچسپی اور جوش عمل نے نہ صرف ٹاکلی جاگیر پر احسان کیا ہے بلکہ سنگمنیر اورنگ آباد میں بھی غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں۔

صدر شاخ ادارہ | مولوی محمد حنیف صاحب تحصیلدار ٹاکلی جاگیر شاخ ادارہ کے صدر ہیں۔ آپ ہر روز امتحان گاہ تشریف لاتے رہے۔ آپ کا وجود ٹاکلی جاگیر کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں۔

معتمد | مولوی وزیر خاں صاحب شاخ ادارہ کے معتمد اور نہایت سرگرم کارکن ہیں۔

ایک بے لوث خدمت گزار | مولوی کریم خاں صاحب صدر مدرس (وظیفہ یاب) بلحاظ عمر سن رسیدہ معلوم ہوتے ہیں مگر آپ کی محنت اور غیر معمولی قابلیت سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ موصوف کی ان تھک کوششوں سے ایک خانگی درسگاہ مدرسہ ٹاکلی جاگیر کے سربرآوردہ حضرات کی اعانت سے انتہائی کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور ممکن ہے کہ وہ بہت جلد فوقانیہ کے درجہ تک پہنچ جائے۔ چنانچہ صاحب موصوف نے اس مدرسہ کا تفصیلی معائنہ کرایا۔

منتظم پولیس | مولوی محمد جعفر صاحب ٹاکلی جاگیر کے منتظم پولیس ہیں۔ میرے قیام و طعام کا انتظام آپ ہی کے ہاں رہا۔ آپ نے جس عمدگی کے ساتھ مہمان نوازی فرمائی ہے میں اس کو کبھی بھی نہ بھلا سکوں گا۔ آپ کی اعلیٰ ظرفی مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

شکریہ | مذکورالصدر حضرات جن کا میں نے مختصر طور پر ذکر کیا ہے قابل مبارکباد اور انتہائی شکریہ کے قابل ہیں۔ چنانچہ بحیثیت صدر نگران کار میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے بھی ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نیز افضل النساء بیگم صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ موصوفہ نے اپنا قیمتی وقت دیکر ادارہ کی پرخلوص خدمت انجام دی۔ منظہر الدین

مرکز پرلی | تاریخ ۱۴ جون ۱۹۴۶ء روز جمعہ تقریباً نو بجے شب اسٹیشن پرلی پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی شیخ حسین صاحب مددگار مدرسہ تحتانیہ و رکن شاخ سابق معتمد مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب اور لال خاں صاحب موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ادارہ کے دفتر پر پہونچا جہاں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ طعام کا انتظام واپسی تک مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب۔ مولوی شیخ حسین صاحب۔ مولوی شیخ وزیر صاحب معتمد شاخ اور مولوی محمد عزیز الدین صاحب قریشی سابق نائب صدر نے کیا تھا۔ امتحان گاہ کے انتظامات کی نسبت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سب کچھ مقامی ادارہ نے کر لئے ہیں۔ چنانچہ میں صبح ۹½ بجے پہونچکر امتحان گاہ کا انتظام معقول پایا۔ امیدواروں کی نشستیں بہت ہی اصولی طریقہ پر جمائی گئیں تھیں۔ اناث کی نشستوں کا انتظام ایک علحدہ مکان میں کیا گیا تھا۔

شرکاء امتحانات کی تفصیل درج ذیل ہے

اردو دانی	(ذکور)	۱۶	جملہ ۲۷
اردو دانی	(اناث)	۴	
زباندانی	(ذکور)	۵	
"	(اناث)	۱	
اردو عالم	(")	۱	

مقامی حالات اور اردو کی سرگرمی

مولوی شیخ وزیر صاحب سحر، مولوی شیخ حسین صاحب اور مولوی ابوظفر محی الدین صاحب اردو زبان کی اشاعت و ترویج میں سعی بلیغ کر رہے ہیں اور مجھے جہاں تک معلوم ہوا مقامی ادارہ نے جو بھی اس وقت تک ترقی کی ہے وہ ان ہی حضرات کی انتہائی دلچسپی کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ رفاہی کاموں میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان حضرات کا وجود باشندگان پرلی کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ان اصحاب کے دلوں میں اردو کی خدمت کا حقیقی جذبہ موجزن ہے۔ اور عام لوگوں کی بھلائی کے لئے جو کام کئے ہیں وہ قابل تحسین ہیں مجھے امید واثق ہے کہ مستقبل میں اس ادارہ کے فارغ طلباء پرلی میں اردو کی ترقی و ترویج میں سب سے زیادہ حصہ لیں گے۔

مولوی شیخ حسین صاحب مددگار تحتانیہ اور ان کی اہلیہ صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں نے ہالیان پرلی میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں جو حصہ لیا ہے وہ قابل تعریف و ستائش ہے۔ میں وہاں کے کمسن طلبہ وطالبات کے علمی شوق کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ آئندہ چل کر اردو کی گراں بہا خدمات انجام دیں گے۔

جن حضرات نے ادارہ کے کاموں کو آگے بڑھانے میں اپنے قیمتی اور عزیز وقت کو صرف کیا۔ ضروری انتظامات اور کار و بار امتحان میں مدد دی ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

مولوی شیخ وزیر صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ
" شیخ حسین صاحب مددگار " "
" ابوظفر محی الدین صاحب۔
" محمد ہاشم صاحب کرمانی۔
" محمد عزیز الدین صاحب قریشی۔
" لال خاں صاحب۔
محترمہ نیاز النساء بیگم صاحبہ مددگار مدرسہ نسواں۔
" صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں

ظہیر الدین

مرکز میسور

اس دفعہ مرکز میسور میں اردو امتحانات بہادر کالج میسور میں منعقد ہوئے اور میری شخصی نگرانی میں نہایت باضابطگی کے ساتھ تکمیل کو پہنچے۔ نگرانی میں حسب ذیل حضرات نے میرا ہاتھ بٹایا

(۱) مولوی غلام حیدر صاحب بی اے آنرز، لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج، میسور۔

(۲) مولوی سید عبدالعزیز صاحب اردو فاضل، معلم جامع مولوی، گورنمنٹ ٹریننگ کالج، میسور۔

ان کے علاوہ خواتین امیدواروں کی نگرانی میں محترمہ رحمت النساء بیگم صاحبہ بی اے بی ٹی صدر اردو زنانہ مڈل اسکول، میسور نے حسب سال گزشتہ میرا ہاتھ بٹایا اور خواتین کو امتحانات کے لئے تیار کیا جس کے لئے وہ ادارے کے شکریہ کی مستحق ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو شاخ میسور

شاخ میسور کی کارگزاری کی بابت عرض ہے کہ:۔

۱۔ یہ شاخ میسور میں اردو کی اشاعت کے لئے ممکنہ کوشش کر رہی ہے۔ "اردو پڑھو اور پڑھاؤ" کا براہ راست پروپگنڈا کیا جارہا ہے۔ گزشتہ دو سال سے اردو امتحانات کے لئے امیدواروں کو تیار کیا جارہا ہے، جن میں سے اکثر امتحانات میں شریک ہوکر کامیاب بھی ہورہے ہیں۔ چنانچہ اس سال اردو فاضل کے ایک امیدوار، مسٹر حمید احمد بی ایس سی (علیگ)، جو اس امتحان میں شریک ہوئے تھے، وہ نہ صرف درجہ اول میں کامیاب ہوئے بلکہ سارے امیدواروں میں اول آئے اور سر عقیل جنگ تمغہ طلائی کے مستحق قرار پائے۔

ادارہ میسور کی شاخ اشاعت کی جانب سے اس وقت تک حسب ذیل تین کتابیں شائع کی گئی ہیں اور چند زیر ترتیب ہیں۔

۱۔ مرآۃ الاسرار، از شاہ محمد صدر الدین، جو آج سے ڈیڑھ

دو سال پہلے میسور کی اردو نثر کا نمونہ ہے۔ میرے حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

۴ ساحل خاموشی اور دو ڈرامے۔ از سید عبدالقدوس بی اے آنرز۔

۳۔ مہتاب سخن۔ لالہ مہتاب رائے، منشی سرکار حیدری کے اردو و فارسی کلام کا نادر مجموعہ جو میری ترتیب اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا گیا۔ عبدالقادر سروری

شاخ بشیر آباد

بشیر آباد پہلی مرتبہ امتحان اردو دانی منعقدہ ۳۰ نومبر ۱۳۵۴ھ م ۲۶ دے ۱۳۵۵ف کا مرکز بنا۔ میرے رفقائے کار مولوی سید بدرالدین احمد صاحب شہرت منشی فاضل و اردو فاضل مددگار مدرس اور محترمہ حسینی بیگم صاحبہ امیدوار اردو فاضل معلمہ مدرسہ نسواں کی کوششوں اور دیگر مخلص دوست احباب کے تعاون عمل سے یہ کام بخوبی انجام پایا اور امتحان کا نتیجہ (۶۹) فیصد رہا۔

قیام شاخ ادارۂ ادبیات اردو | مرکز امتحان کے قیام کے ساتھ قیام شاخ ادارہ کا مسئلہ بھی پیش نظر رہا۔ اور مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ایم اے مہتمم ادارہ کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے اس کا قیام بھی عمل میں آیا۔ چنانچہ حسب مراسلہ نشان (۱۴۱ / ۱۷) مورخہ ۹ امرداد ۱۳۵۵ف قیام شاخ کی منظوری بھی شرف صدور لائی۔

دوسرا امتحان منعقدہ ۱۳ امرداد ۱۳۵۵ف | اس امتحان میں اردو دانی کے علاوہ زباندانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امیدواروں نے بھی شرکت کی۔ اردو دانی اور اردو فاضل کا نتیجہ سو فی صد اور زباں دانی اور اردو عالم کا نتیجہ (۶۰) فیصد سے زائد رہا۔ جو کارکنان ادارہ کی محنت اور دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔

شیوع مرض طاعون | اگرچہ بشیر آباد ایک اونچے اور پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ مکانات بھی دور دور واقع ہیں۔ صفائی کا معقول انتظام ہے۔ لیکن گرد و نواح کے متاثرہ مقامات کے باشندوں کی آمد و رفت کے باعث بشیر آباد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ماہ شہریور میں ہی پریشانی پھیل گئی .... اور آبادی کا تخلیہ ہو گیا۔ شہریور، مہر، آبان تین ماہ تک ادارہ کے کاروبار حالت تعطل میں رہے۔

جلسہ انتخاب عہدہ داران و ارکان | جب ماہ آذر میں لوگ آبادی میں منتقل ہو گئے تو فوراً ہی ضروری انتظامات عمل میں لائے جا کر بصدارت عالیجناب مولوی سید عزیز الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ بتاریخ ۲۱ آذر ۱۳۵۵ف روز جمعہ انتخاب عہدہ داران کا ایک جلسہ بمقام عمارت مدرسہ منعقد ہوا۔ بغلبۂ آرا حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہو گئے۔

۱۔ مولوی سید عزیز الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ صدر شاخ ہذا

۲۔ مولوی عبدالحکیم صاحب منشی فاضل — نائب صدر

۳۔ سید کریم الدین فیاض منشی فاضل اردو فاضل — معتمد و خازن

۴۔ سید بدرالدین احمد صاحب شہرت منشی فاضل — شریک معتمد

علاوہ ازیں حسب ذیل ارکان انتظامی کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

مولوی شیر علی خاں صاحب اڈیٹر انجمن امداد باہمی۔ مولوی داؤد خاں صاحب انصاری سب انسپکٹر آبکاری۔ مسٹر تکارام جی اسٹون کنٹراکٹر۔ نالو راؤ صاحب (عثمانیہ) جنرل مرچنٹ۔ مولوی عبدالباری صاحب اردو عالم۔ مولوی مرزا احسن بیگ صاحب مدرس۔ مولوی امجد علی صاحب امجد صیغہ دار۔ مولوی محمد عزیز الدین صاحب صیغہ دار۔ مولوی محمد وہاب الدین صاحب مدرس۔

جلسہ دوم برائے مباحثہ "تقدیر و تدبیر" | یہ جلسہ جناب صدر شاخ صاحب کی صدارت میں ۲۳ اسفندار ۱۳۵۵ف منعقد ہوا۔ اس میں ارکان ادارہ کے علاوہ مدرسین اور طلبائے مدرسہ نے بھی کثیر تعداد میں حصہ لیا۔ مقررین نے اپنی بحث و تقریر سے یہ ثابت کر دیا کہ انھوں نے اس مباحثہ کی تیاری میں کافی محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے۔ یہ تصفیہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کس کو ترجیح دی جائے۔ بالآخر آرا شماری ہوئی اور

بتغلبۂ آرا آمد ہیر کو ترجیح دی گئی۔ آئندہ مباحثہ کے لئے "شہری اور دیہاتی زندگی" کا عنوان مقرر کیا جا کر جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ سوم منعقدہ ۸ اردی بہشت سنہ ف مباحثہ برعنوان "شہری و دیہاتی زندگی" | اس جلسہ کی صدارت بھی نائب صدر ادارہ نے کی۔ اس جلسہ میں مباحثہ کے لئے یہ عنوان مقرر تھا۔ اکثر مقررین نے شہری زندگی کو پسند کیا۔ بچوں کے مباحث بڑے دلچسپ رہے۔ جن سے حاضرین بہت ہی محظوظ ہوئے۔ بالآخر بتغلبۂ آرا طے پایا کہ "شہری زندگی" دیہاتی زندگی سے اچھی ہے۔

جلسہ چہارم منعقدہ ۲۰ شہریور سنہ ف انتظام تعلیم برائے امیدواران امتحانات | سال ف کا یہ چوتھا جلسہ تھا۔ اس جلسہ کی صدارت مولوی سید عزیز الدین صاحب صدر ادارہ نے فرمائی۔ اولاً معتمد ادارہ نے صدر صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ادارہ کی سرپرستی کے لئے علم دوست عہدہ دار مولوی حافظ محمد علی صاحب سے استدعا کی جائے۔ صدر صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور بالمشافہ تصفیہ کر لینے کا وعدہ فرمایا۔

دوسرا مسئلہ اردو امتحانات کے لئے امیدواروں کی تیاری کا تھا۔ مستقر کے حالات کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ بلا معاوضہ یا کم سے کم معاوضہ پر کام کرنے والے مل جائیں۔ چنانچہ اس کا حسب ذیل انتظام روبہ عمل لایا گیا۔

برائے اردو عالم و اردو فاضل

۱۔ مولوی محمد عبدالحکیم صاحب منشی فاضل نائب صدر ادارہ
۲۔ سید کریم الدین فیاض منشی فاضل اردو فاضل معتمد ادارہ

برائے اردو دانی و زبان دانی

۱۔ مرزا حسن بیگ صاحب مدرس و رکن ادارہ
۲۔ محمد وہاب الدین صاحب مدرس " "
۳۔ محمد بشیر احمد صاحب مدرس

جلسہ پنجم منعقدہ ۸ آبان سنہ ف قیام کتب خانہ و دار المطالعہ | سال سنہ ۱۳۵۵ف کا یہ پانچواں اور آخری جلسہ بصدارت مولوی سید عزیز الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ صدر ادارہ بمقام عمارت مدرسہ منعقد ہوا جب کہ اس کو علم دوست عہدہ دار مولوی حافظ محمد علی صاحب اول تعلقدار کی سرپرستی کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔ اس جلسہ میں ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ مطالعہ کے فوائد اور قیام کتب خانہ کی ضرورت پر پُر زور تقاریر ہوئیں۔ آخر میں معتمد ادارہ نے اس کی اہمیت و ضرورت پر زور دیتے ہوئے ایک موثر تقریر کی اور کہا کہ کوئی علمی ادارہ کوئی درس گاہ اس وقت تک ترقی نہیں پا سکتی جب تک کہ اس کو مقامی مقتدر اور اہل کرم حضرات کی توجہ اور امداد حاصل نہ ہو۔ ہم کام کرنے تیار ہیں جب تک کہ علم دوست اور مخیر اصحاب دست تعاون اور دست کرم دراز نہ فرمائیں ہماری تمام سعی اور ساری کوششیں بیکار اور بے سود ثابت ہو جائیں گی۔

خاتمہ تقریر پر بیشتر اصحاب نے ماہانہ چندہ دینے کا وعدہ فرمایا۔ صدر ادارہ مولوی سید عزیز الدین صاحب نے اپنی ملکی اور ذاتی کتب کے علاوہ کتب خانہ مسجد کی کتابیں بھی ادارہ ہذا کے کتب خانہ کو مستعار دینے کا وعدہ فرمایا۔ مسٹر ناگور اؤجی جنرل مرچنٹ بشیر آباد نے بھی اپنے پاس کی تمام کتابیں مستعار دینے کا وعدہ کیا۔ علاوہ ازیں حسب ذیل حضرات نے رسائل و اخبارات عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔

۱۔ مولوی سید عزیز الدین صاحب صدر ادارہ۔ اخبار رہبر دکن تنویر۔ ترجمان القرآن۔
۲۔ دیو و کار یڈی صاحب سب انسپکٹر تباکو۔ اخبار میزان
۳۔ مسٹر ناگور اؤجی جنرل مرچنٹ۔ اخبار مدینہ سہ روزہ
۴۔ مسٹر شنکٹ لال جی ساہو۔ اخبار پیام

۵۔ مولوی محمد عزیز الدین صاحب صحیفہ دار — اخبار مدینہ
(اخبار کی مدت کچھ باقی رہ گئی ہے اس کے بعد آپ دوسرا کوئی اخبار یا رسالہ جاری فرمائیں گے)
۶۔ مسٹر بھگا رام جی امتون کنٹراکٹر — اخبار رعیت

اس کے بعد آئندہ یکم آذر ۱۳۵۹ف کو کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا افتتاحی جلسہ کیا جانا قرار پایا اور جلسہ ہذا کے برخاست کا اعلان کر دیا گیا۔

شاخ پرلی

شاخ پرلی ادارۂ ادبیات اردو کے کاروبار مولوی فیض محمد خاں صاحب بی اے ڈیپ ایڈ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ پرلی کی صدارت میں بحسن خوبی انجام پا رہے ہیں ہر سال شاخ ہذا کے سرگرم رکن مولوی نیر الدین صاحب، مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی نواز الدین صاحب، مولوی سعید الدین صاحب صدیقی کی کوششوں سے اردو کی ترویج اور اردو امتحانات کے اہم کام پورے ہو رہے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ شاخ کی جانب سے قصبات میں وفد بغرض ترویج و اشاعت اردو کی تشہیر کے لئے روانہ کیا جاتا ہے وفد کے ارکان مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی سعید الدین صاحب، مولوی ابوظفر محی الدین صاحب متعلم سٹی کالج (جو تعطیلات میں پرلی آیا کرتے ہیں) ان ہی حضرات کی دلچسپی اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاخ ادارۂ ادبیات اردو پرلی قائم اور کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ وفد ہر سال مندرجۂ ذیل قصبات و دیہاتوں کا دورہ کرکے سابقہ کامیاب شدہ امیدواروں کے اسناد بذریعہ جلسۂ عام تقسیم کرکے عوام الناس پر اردو امتحانات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور آئندہ سال کے لئے بالاتر امتحانوں میں شرکت کے لئے سند گیرندہ امیدواروں کو ترغیب و تحریص کرتا ہے۔ سیل گاؤں۔ سون پیٹھ جاگیر مہاراجہ کشن پرشاد۔ گنگا کھیڑ گھاٹ ناندورہ جاگیر۔ رینا پور۔ پات گاؤں۔ وفد کا دوسرا دورہ ہر سال ماہ تیر میں فراہمی امیدواران برائے امتحان ادارہ مندرجہ قصبات میں ہوا کرتا ہے اور ان قصبات سے زیادہ تر امیدوار شریک امتحان ہوا کرتے ہیں۔

مستقر پرلی پر اردو امتحانات کے لئے باضابطہ انتظام ہے اس کام کے انجام دینے کے لئے صاحبان صدر منتخب ہیں اور تدریس کا انتظام قاضی محبوب الدین صاحب صدیقی کے دیوانخانے میں ہوا کرتا ہے شاخ ادارہ جناب قاضی صاحب کا بہت ہی ممنون ہے کہ موصوف نے ازراہ عنایت اپنا دیوانخانہ شاخ کے لئے وقف کر دیا ہے جہاں تدریس کا کام ہوتا ہے اور شاخ کا کتب خانہ بھی ہے۔

کتب خانہ شاخ کا کتب خانہ جو مولوی قاضی محبوب الدین صاحب کے دیوانخانے میں قائم ہے روز آنہ شام میں لوگ کتب کا مطالعہ کرکے مستفید ہوتے ہیں۔ چند اہم اردو کتب پر مشتمل ہے جس کے مطالعہ سے لوگوں میں اردو کے تدریس کا شوق ہوکر امتحانات میں شرکت کا باعث بنتے ہیں۔

اردو امتحانات ہر سال شاخ ہذا کی کوشش سے پرلی امتحانات کا مرکز رہا کرتا ہے اور ہر سال تقریباً ۵۰ سے زائد امیدوار مندرجۂ ذیل امتحانات میں مرکز پرلی سے شرکت و کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ معلومات اردو زباندانی۔ اردو عالم اراکین ادارہ کی کوششوں سے ان امتحانات میں ہندو امیدوار بھی شریک ہوتے ہیں۔

نتائج امتحانات ہر سال مرکز پرلی کے امتحانات کے نتائج تشفی بخش رہا کرتے ہیں سال گزشتہ مرکز پرلی سے ۳۰ امیدوار شریک ۲۲ کامیاب مندرجۂ ذیل مقامات کے حضرات کا شاخ ادارہ پرلی کی جانب سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے جو ہر وقت ادارہ کے لئے دامے، درمے، سخنے اعانت کرتے ہیں۔

پرلی۔ قاضی مولوی محبوب الدین صاحب۔ سیٹھ حاجی سلیمان احمد صاحب۔ سالارام جی بھاؤ صاحب۔ عبداللہ بھائی کچی مہتمم صاحب مارکٹ۔ مولوی عبدالستار صاحب۔ مولوی عبدالحکیم خاں صاحب۔ مولوی مہتاب صاحب انجینیر۔ مولوی سید رسول صاحب گرداور۔

سون پیٹھ۔ مولوی نبے میاں صاحب تاجر۔

سیل گاؤں۔ مولوی ہدایت علی صاحب پٹیل۔ مولوی قاضی نیر الدین صاحب

گھاٹ ناندورہ۔ مولوی امین الدین صاحب۔

گنگا کھیڑ۔ مولوی آصف خاں صاحب سوداگر۔ مولوی رحمت اللہ خان صاحب

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں سے سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ دو آنے

سب رس
بچوں کے لئے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
زیر ادارت
معین الدین احمد انصاری
بی - ایس سی (علیگ)

جلد ۹ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء | شمارہ (۱۰)

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ) کے اہتمام سے محمودیہ مشین پریس میں طبع ہو کر خیرت آباد سے شائع ہوا۔

آپ کی ہماری باتیں

آپ کی ہماری باتیں تو ہر ماہ ہوتی ہیں لیکن ہمیشہ ہم نئی نئی باتیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مضمون ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ننھے بھولے بھالے سب رسی بھائی نے ہم سے کہا کہ "آپ سے ہم کو ایک شکایت ہے"، ہم نے پوچھا "وہ کیا؟" کہنے لگے "آپ ہر ماہ لبر اپنے ہی مضمون شایع کرتے ہیں جب ہم خواہش کرتے ہیں کہ ہمارا مضمون ہر ماہ شایع کیجیے تو کہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی موقع دینا چاہئے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟" ہمیں ہنسی آگئی۔ ہم نے کہا "بھئی وہ مضمون نہیں بلکہ اداریہ ہے جسے انگریزی میں ایڈیٹوریل کہتے ہیں۔ ممکن ہے اکثر بچوں کا یہی خیال ہو۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر ماہ ایڈیٹر کو کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ بعض پرچوں میں اس صفحہ پر ایڈیٹر کچھ اپنی رام کہانی پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ چندہ وقت پر نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں اور بعض لوگ اس میں ایسی باتیں لکھتے ہیں جو موجودہ مسائل سے تعلق رکھتی ہیں یا موجودہ حالات پر تنقید کرتے ہیں۔ بہرحال ہر ایڈیٹر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا ہے۔ چنانچہ آپ ہر ماہ کچھ ہمارے خیالات بھی پڑھ لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ آپ کے لئے مفید ثابت ہوں یا بعض باتیں ایسی ہوتی ہوں جسے آپ پہلے سے جانتے ہوں۔ بہرحال ہم کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے آپ کو فائدہ پہنچے۔ اپنے مطلب کی باتیں تو ہم بہت کم کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے اداریہ کا عنوان بھی کچھ ایسا رکھا ہے کہ آپ پڑھتے ہوئے کبھی نہ اکتائیں۔ ہم اس صفحہ پر آپ سے سیاسی، اخلاقی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے علاوہ سائنس سے متعلق بھی بات چیت کرتے ہیں یا بعض وقت اس پرچے کے مضامین پر تنقید کرتے ہیں تاکہ مضمون لکھنے والے بچے اسے پڑھیں اور ان کو اپنے مضامین سے متعلق صحیح اندازہ ہوسکے اور دوسروں کو بھی مضامین لکھنے کی ترغیب ہو۔

معین الدین احمد انصاری

ماہی گیر اور اُس کی بیوی



بہت زمانہ گزرا ایک ماہی گیر اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہ بہت غریب تھے۔ رہنے کے لئے کوئی جھونپڑی تک نصیب نہیں تھی۔ دن بھر کھیتوں میں رہتے اور راتیں پیڑوں کے تلے پڑ رہ کر گزار دیتے تھے۔ ماہی گیر اپنی اس زندگی سے بہت خوش تھا۔ وہ ہنس کر کہتا تھا کہ لوگ جانے کیوں تکلیفیں اٹھا اٹھا کر بڑے بڑے مکانوں میں رہتے اور نرم گدّے دار بستروں پر سوتے ہیں، انھیں کیا معلوم کہ درختوں کے سائے میں بیٹھنے اور خاک پر سونے میں کتنا لطف ہے"۔ مگر اس کی بیوی خوش نہیں تھی، وہ بڑبڑاتی اور دل ہی دل میں کڑھتی کہ اللہ میاں نے اُسے ایک غریب مچھلیاں پکڑنے والے کی بیوی کیوں بنایا جس کے پاس رہنے تک کو گھر نہیں اور کھانے کے لئے سوائے مچھلیوں کے اور کوئی غذا نہیں"۔

ایک دن ماہی گیر حسبِ معمول اپنا جال لئے سمندر کے کنارے پہنچا اور اُسے پھیلا کر وہیں ایک سایہ دار درخت کے نیچے پتھر پر بیٹھ گیا۔ دھوپ بہت تیز ہوتی جا رہی تھی اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس لئے اسے نیند آ گئی۔ جب جاگا تو شام ہو رہی تھی اور سورج میں سرخی آ چلی تھی۔ گھبرا کر جو جال کھینچا تو صرف ایک ہی مچھلی آئی تھی لیکن اس میں خاص بات یہ تھی کہ سنہری اور عام مچھلیوں سے خاصی بڑی تھی۔ بڑا خوش ہوا کہ جب بیوی اس خوبصورت اور سنہری مچھلی کو دیکھے گی تو خوشی سے پھول جائے گی۔ تھیلی میں بند ہی کرنے والا تھا کہ مچھلی کو بولتے سنا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی " اچھے ماہی گیر مجھے

نہ مارو اور دوبارہ سمندر میں لوٹا دو"۔ جب اس نے ایک جانور کو بولتے دیکھا تو کہا کیا تم بات بھی کر سکتی ہو؟ میں نے تو اپنی ساری عمر میں کوئی بولنے والی مچھلی نہیں دیکھی! مچھلی التجا کرنے لگی "تم بڑے اچھے آدمی ہو مجھے پھر پانی میں چھوڑ دو"۔ ماہی گیر کسی قدر خوف زدہ ہو کر بولا "میں ایسی مچھلیاں نہیں کھاتا جو بات کرتی ہوں، چلی جاؤ، میں تمہیں نہیں ماروں گا"۔ یہ کہہ کر اس نے زور سے مچھلی کو سمندر میں پھینک دیا اور اپنی بیوی کے پاس چلا آیا۔

ان کے پاس رات کو کھانے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ بیوی کے پوچھنے پر ماہی گیر نے تمام کہانی کہہ سنائی اور کہا کہ میں نے اُسے مارے بغیر سمندر میں پھینک دیا ہے۔ جب بیوی نے یہ سنا تو بولی "مچھلی کبھی بات نہیں کر سکتی، ہو نہ ہو یہ کوئی بڑا جادوگر تھا جو مچھلی کے روپ میں پھنسا تھا"۔ اس نے جواب دیا "مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ جادوگر ہے! کیونکہ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے میں اندازہ لگا سکتا کہ وہ جادوگر ہے"۔ بیوی نے کہا "وہ ضرور جادوگر ہے۔ تمہیں جا کر اس سے کچھ مانگنا چاہیئے"۔ ماہی گیر نے جواب دیا "نہیں میں نہیں مانوں گا اور ہمیں مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اللہ کا دیا کھاتے ہیں اور رات کو نیند بھر سوتے ہیں"۔ لیکن بیوی بولی "تو کیا ہم اسی طرح ان اجڑے ہوئے کھنڈروں میں زندگی کے دن گزاریں گے؟ تمہیں ضرور اس سے کچھ نہ کچھ مانگنا چاہیئے"

آخر بیوی کے بہت مجبور کرنے پر وہ دوسرے دن سمندر کے کنارے پہنچا اور ایک پتھر پر کھڑے ہو کر پکارا "سمندری آدمی باہر آؤ۔" ایک منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ مچھلی نے اپنے سر کا کچھ حصہ پانی سے باہر نکالا اور پوچھنے لگی "کہو! کس لئے آئے ہو؟" اس نے

جواب دیا میں تو کچھ نہیں مانگتا لیکن میری بیوی اس موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہے وہ رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا مکان چاہتی ہے" مچھلی نے جواب دیا "اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ تم اسے ایک مکان میں پاؤ گے" یہ کہہ کر وہ پانی میں غائب ہو گئی۔

ماہی گیر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ جب گھنے درختوں کے قریب پہنچا تو اسے وہاں ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ یہ ایک چھوٹا خوبصورت اور بالکل نئے ڈزائن کا مکان تھا۔ اس میں دو ننھی ننھی کھڑکیاں اور ایک نیلے شیشوں والا دروازہ لگا تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں ایک خوبصورت باغ بھی تھا جس میں تر و تازہ پھول لہلہا رہے تھے اور میدان میں مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ گھر میں ایک ہی کمرہ تھا۔ جب وہ داخل ہوا ہے تو سورج کی روشنی کھڑکی کے شیشوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی اور سارا کمرہ روشن تھا۔ اس کی بیوی ایک کرسی پر بیٹھی سنگھار کر رہی تھی۔

ماہی گیر نے بیوی کو مخاطب کر کے کہا "کہو! اب بھی تم خوش ہو کہ نہیں"؟ وہ ہنس کر بولی "ہاں اب میں بہت خوش ہوں" کچھ دنوں تک وہ اطمینان سے رہی مگر اس نے ایک رات جب وہ مچھلیاں پکڑ کر واپس آیا تھا کہا "یہ گھر تو اتنا چھوٹا ہے کہ اس سے گھونسلا بھلا۔ دن بھر مرغیاں ادھر سے ادھر پھر کر ناک میں دم کر دیتی ہیں! تم مچھلی سے کہو کہ ہمارے رہنے کے لئے ایک کوٹھی کا انتظام کرے"۔



جب بیوی کی طرف سے زیادہ

اصرار ہوا تو وہ پھر سمندر کے کنارے آیا اور پتھر پر کھڑے ہو کر آواز دی "سمندری آدمی باہر آؤ" مچھلی نے پہلے کی طرح اس کی آواز سن کر تھوڑا سا سر پانی سے باہر کیا اور دریافت کیا "کہو! اب کیا کہنے آئے ہو؟" وہ بولا "میں کچھ نہیں چاہتا لیکن میری بیوی کو وہ چھوٹا سا گھر پسند نہیں وہ چاہتی ہے کہ ایک بڑی کوٹھی میں رہے"۔ مچھلی نے کہا "تم اپنے گھر واپس جاؤ کوٹھی تیار ملے گی"۔ جب وہ آیا تو معمولی مکان کی جگہ ایک شاندار کوٹھی کھڑی تھی، جس کے باغ میں اودے، سرخ اور طرح طرح کے رنگین پھول کھلے تھے۔ اس نے پھر بیوی سے پوچھا "غالباً اب تو تمھیں کوئی شکایت نہیں ہوگی" اس نے جواب دیا "شکایت تو خیر کچھ نہیں لیکن یہ کہ کوٹھی باہر سے جتنی خوش نما اور اچھی معلوم ہوتی ہے اندر سے اتنی ہی خراب اور بیکار ہے، اچھا کوئی مضائقہ نہیں کام چل جائے گا"۔



گزشتہ کی طرح اب بھی اس کی مسرت کے چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ اس نے کہا "اگرچہ کہ ہم اتنی بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں ہمارا باغ ہے لیکن تم وہی ماہی گیر ہو اور میں وہی تمہاری بیوی۔ نہ کوئی ہمیں جانتا ہے نہ ملنے آتا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر تم بادشاہ بن جاؤ اور میں رانی پھر پوری آزادی رہے گی،

ہم جو چاہیں گے کر سکیں گے، عورتیں آکر ادھر میرے ہاتھوں کو چومیں گی اور ادھر مرد تمہارے قدموں میں گر جائیں گے اور دروازوں پر نوکر ہمارے حکم کے منتظر کھڑے ہوں گے۔ کتنا لطف رہے گا اس وقت؟" مگر ماہی گیر بولا "لیکن میں تو نہیں چاہتا کہ بادشاہ بنوں مجھے مچھلیاں پکڑنے اور ماہی گیر کہلانے ہی میں بہت مزہ آتا ہے۔" بیوی کسی قدر غصے سے بولی "لیکن میں تو رانی بننا چاہتی ہوں، چاہے تم چاہو پسند کرو یا نہ کرو" وہ ہچکچاتا ہوا آیا اور اسی طرح پتھر پر کھڑے ہو کر مچھلی کو پکارا "سمندری آدمی باہر آؤ"

مچھلی نے اپنا سر نکالا اور بیزاری سے بولی "بتاؤ اب کیا کہنا ہے" اس نے بتایا کہ بیوی کیا چاہتی ہے۔ مچھلی نے کہا "اچھا جا کر دیکھو اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی گئی ہے"

وہ واپس آیا، دروازوں پر سرخ لباس پہنے کئی نوکر اس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے، انھوں نے اسے ایک بڑے خوبصورت اور سجائے ہوئے ہال میں پہنچایا جہاں اس کی بیوی ایک قیمتی کرسی پر جس میں بیش قیمت جواہرات ٹکے تھے ملکہ کے کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی۔" ماہی گیر نے اپنی بیوی سے کہا "اب تو تمہیں خوش ہو جانا چاہئے کہ تمام چیزیں تمہاری مرضی کے مطابق ٹھیک کر دی گئی ہیں" بدقسمتی سے اس کی یہ مسرت بھی چند گنتی کے دنوں تک محدود تھی۔

جب برسات آئی تو مینھ برسنا شروع ہوا جس کی وجہ سے وہ باغ میں جا سکی اور نہ کہیں گھوم سکی تب اس نے شوہر سے کہا "یہ تو بڑی توہین ہے کہ میں رانی کہلاؤں اور پانی میرے حکم کی خلاف ورزی کرے، جاؤ اور مچھلی سے کہو کہ وہ مجھے سورج کی دیوی بنا دے تا کہ جب میں کہوں "تھم جا" تو مینھ کا برسنا ختم ہو جائے"

بے چارہ سادھا سیدھا آدمی تھا۔ بیوی کی بات ماننی ہی پڑی۔ بہ ہزار مجبوری پھر پہنچا اور اسی طرح پتھر پر کھڑے ہو کر مچھلی کو آواز دی "سمندری آدمی باہر آؤ"

مچھلی نے جواب میں پہلے کی طرح اپنے تھوڑے سے سر کو پانی کی سطح سے اونچا کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ یا اس کی بیوی اب کیا چاہتے ہیں۔ ماہی گیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور ڈرتے ڈرتے کہا "میری بیوی کم بخت مانتی ہی نہیں، اب وہ کہتی ہے کہ اسے سورج کی دیوی بنایا جائے تاکہ وہ بارش پر حکومت کر سکے"۔ مچھلی کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اس کی آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں، وہ کہنے لگی "تمہاری بیوی کسی حال میں خوش نہیں رہ سکتی، میں نے غلطی کی جو تمہیں اتنا آرام پہنچایا۔ واپس کھیتوں کو جاؤ اور پہلے کی طرح مچھلیاں کھا کر پیڑوں کے نیچے مٹی پر سویا کرو۔ تمہارے لئے یہی اچھا ہے"

یہ ٹکا سا جواب سن کر وہ منھ لٹکائے ہوئے واپس آیا۔ دیکھتا ہے تو نہ وہ شاندار کوٹھی تھی نہ وہ فرماں بردار نوکر بلکہ وہاں پہلے کی طرح صرف بڑے بڑے اور گھنے درخت کھڑے سائیں سائیں کر رہے تھے اور اس کی بیوی ایک درخت کے نیچے بیٹھی پتھروں کا چولھا بنائے مچھلی کا سالن پکا رہی تھی۔

اقبال احمد صدیقی

باتیں۔ بچوں کی دلچسپی اور ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے مجلس ادبیات اطفال ادارۂ ادبیات اردو نے جن مفید کتابوں کا سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کی چوتھی کڑی ہے۔ مولوی شجاع احمد صاحب قائم نے بڑے مزے مزے کی باتیں نئے انداز میں لکھی ہیں۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ صفحات ۸۰ قیمت ۸

مغربی جزیروں کی کہانیاں

میں مغربی جزیروں کے ایک جزیرے آئیونا میں بیٹھا یہ مضمون لکھ رہا ہوں مضمون لکھتے وقت اس جھونپڑی کی نالیدار لوہے کی چھت اور دیواروں سے بارش کا پانی ٹکرا رہا ہے اور کھڑکیوں پر بوچھاڑ پڑ رہی ہے۔ ایک ہفتہ سے قدرتی مناظر کا پینٹر یعنی میرا میزبان صحیح معنوں میں کوئی کام نہیں کر سکا۔ بارش اور ہوا نے کام نہیں ہونے دیا۔ اس کے برعکس میرے پاس کام نہ کرنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے جس پر مجھے افسوس ہے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر جانسن نے یہاں کہا تھا کہ اس جزیرے میں جس شخص کے تقدس میں اضافہ نہ ہو۔ (جہاں ۱۳ صدیاں پہلے سینٹ کولمبیا نے آکر عیسائیت پھیلائی تھی) اس پر رشک کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کے فلسفہ کے مسائل پر غور کرنے کی قوتوں میں بھی اضافہ نہ ہو تو وہ عجیب شخص ہوگا کیونکہ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں موسلا دھار بارش کے بعد شدت کی دھوپ پڑتی ہو۔

لیکن آئیونا میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے۔۔ کہ ایک آدمی یہاں امن سے رہ سکتا ہے میرے خیال میں یہاں ایک موٹر ٹرک ہے لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں۔ ہم بندرگاہ کے پل سے جو ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے اپنے تھیلے اس جھونپڑی میں گھسیٹ کر لے آئے تھے۔ رات کے وقت ہم بیل گاڑی میں بیٹھ کر لکڑی کی اس جھونپڑی میں گئے جو ڈاک خانے کے نام سے پکاری جاتی ہے تاکہ اپنی ڈاک لے آئیں۔ اس گھر میں کوئی عورت کام نہیں کرتی۔ پینٹر اور ماہر نباتات اور ایک ڈراما نویس نیز آپ کا یہ حقیر خادم گھر کا کام کاج خود کرتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ باتوں کا موضوع بھوت پریت بغیر سر کے

شاہ سوار، سبز پوش خاتون، چار راہب (جن میں سے ایک کے چہرے سے خباثت ٹپکتی ہے) ساحل پر اکیلے رہنے والے دو ماہی گیر ہوا کرتے ہیں۔ ان سب ہم زادوں کی تصدیق وقتاً فوقتاً مختلف ایسے لوگوں نے بھی کی ہے جن کو زیادہ دیانت دار سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں " ان پہاڑوں میں عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کو جھیل میں جہاز چلنے کی آواز آئے گی۔ ایک ایسا خوبصورت جہاز جسے کوئی نہیں جانتا اور جس وقت اسے دیکھا جاتا ہے تو وہ گم ہو جاتا ہے۔ گم کیا گھل جاتا ہے "

ہاں۔ صرف ہم زاد ہی غائب نہیں ہوتے۔ لوگ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ سر والٹر اسکاٹ نے لکھا ہے کہ ۱۳۰ سال پہلے آیونا کی آبادی ۴۰۰ آدمیوں پر مشتمل تھی۔ (۶۰) سال ہوئے یہاں ۲۴۳ آدمی رہ گئے۔ ۱۵ سال پہلے اس جگہ ۱۴۱ آدمی تھے۔ آج یہاں ستر سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اسکول میں صرف چار طالب علم ہیں اور وہ بھی تین جماعتوں میں۔ پہلی جماعت میں ۷ سال کا ایک بچہ ہے۔ دوسری میں ۹ سال کی دو لڑکیاں ہیں اور تیسری جماعت میں ۱۳ سال کا ایک لڑکا ہے۔ میں نے لڑکے کو دیکھا ہے اس کی آنکھیں نیلی ہیں چہرہ اور ٹانگیں ہوا اور بارش کی وجہ سے سرخ تھیں۔ وہ چار گائیں دودھ دوہنے کے لئے لے جا رہا تھا۔ آپ کہیں گے کہ یہ آیونا کا قابل فرزند ہے کیونکہ وہ دودھ دوہ سکتا ہے۔ اسکاچ تانی زبان بول سکتا ہے اور جغرافیہ کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہے۔ (مجھے اس میں ملاح کی صفات نظر آتی تھیں) مگر افسوس اس کا تعلق روتھر گلن گلاسکو سے ہے۔

مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی مگر کیسے ہوئے اس کسان نے جس نے دوسری عالمگیر جنگ میں ہوم گارڈ کی کمان کی تھی اور جسے فوجی اعزازات کے ساتھ ایک جرمن ہوا باز کو دفنانا پڑا تھا کسی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ دفنانے کے صحیح طریقہ کا علم نہ ہونے کی

وجہ سے وہ سخت ناراض تھا (ہوم گارڈ کے ایک سپاہی نے اپنی بندوق پتھر کی دیوار پر رکھ دی تھی لیکن جب سلامی کا فائر کرنے کا وقت آیا تو وہ اسے نہ مل سکی) اس کے علاوہ کمر کسے ہوئے اس کسان نے مجھے بتایا کہ آیونا میں ایک بھی نوجوان نہیں پچھلے بیس سال سے یہاں کوئی شادی نہیں ہوئی"۔ لیکن جب میں نے اس بات پر بھی حیرت ظاہر کی تو اس نے مجھے سمجھایا کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو بھائی بہن اپنے چھوٹے سے کھیت پر کام کرتے کرتے جوان ہو جاتے ہیں۔ بہن اس لئے شادی نہیں کرتی کہ وہ اپنے بھائی کو کس پر چھوڑے اور بھائی اس لئے شادی نہیں کرتا کہ شادی ہو جانے کے بعد اسے کھیت چھوڑنا پڑے گا۔ اس لئے کہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے دو عورتیں ایک ہی مکان میں نہیں رہ سکتیں اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ نئی آنے والی بیوی گھر کی مالکن بن جائے جب کہ اس کے آنے سے پہلے بہن گھر کی مالکن رہ چکی ہو۔ چنانچہ بہن بھائی ساتھ رہتے رہتے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے بہت خلوص رکھتا ہو اور اس وقت تک شادی نہ کرے جب تک کہ وہ مر نہ جائے۔

مجھے اسکاٹی کا ایک واقعہ یاد پڑتا ہے جہاں سولھویں اور سترھویں صدی کی لڑائیوں کے دوران میں ایڈنبرا کا ایک باقاعدہ گروہ اس جگہ کے علاقوں میں جھوٹے وعدے کر کے کھیتوں پر کام کرنے والوں کو دھوکا دے کر اور انھیں کوئی نشہ آور چیز کھلا کر جہازوں پر بیٹھا دور دراز ملکوں کو لے جاتا تھا اور اس دوران میں ان کی جھونپڑیوں کو آگ لگا دی جاتی تھی اور ان کی زمینیں چرا لی جاتی تھیں۔

اس سے بحث نہیں کہ یہ واقعات کہاں تک صحیح ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسکاٹی کے باشندے کئی بار پھاوڑے اور کدال لئے اور شہنائیاں بجاتے ہوئے آئے ہیں اور انھوں نے

زمینوں پر اپنے دعوے پیش کئے ہیں۔ نئے مکانات کی بنیادیں رکھی ہیں اور ان مکانوں کو کافی سے زیادہ مکمل کرلیا ہے (ان میں بعض بالکل عمدہ نہ تھے) کہ قانون کے پنجے نے انھیں آدبوچا اور اس سے پہلے کہ انھوں نے ان علاقوں کی دو فصلیں بھی کھائی ہوں قانون اپنا کام انجام دے چکتا ہے۔

لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آئیونا کے لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہے۔ ان کے کھیتوں کی تعداد ایک درجن کے قریب ہے اور سیاحوں سے انھیں تھوڑے بہت پیسے بھی مل جاتے ہیں۔ یہاں کے ۵۰ ۱۲ گھوڑے جو میں گن سکا ہوں اور بے شمار بھیڑ، بکریاں کافی عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس چار میل لمبے جزیرے کی دونوں طرف لمبی اور پتلی مشترکہ چراگاہیں واقع ہیں اس میں شک نہیں کہ جنگ سے تباہ شدہ برطانیہ کے درمیان آئیونا اگر ہر اعتبار سے نہیں تو بعض لحاظ سے تو ضرور ایک چھوٹا سا نخلستان معلوم ہوتا ہے۔ ایسے زمانہ میں جب کہ برطانیہ میں دودھ کی اتنی قلت ہے ہمیں یہاں عمدہ سے عمدہ دودھ ملا یہی نہیں بلکہ یہاں مکھن انڈے سب کچھ مل سکتے ہیں۔ لیکن اگر آئیونا اور مل کے درمیان کی آبنائے میں جس میں سے آئیونا کے گھوڑوں اور دوسرے مویشیوں کو اکثر تیر کر آنا پڑتا ہے طوفان آیا ہوا ہو تو ڈاک نہیں آتی۔

یہاں آنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقی دنیا سے ہمارا تعلق منقطع ہوگیا ہے۔ بعض ایسی چیزیں جو اصل ملک میں افراط سے پائی جاتی ہیں مثلاً گدھا وہ یہاں ناپید ہیں۔ کچھ سال ہوئے آئیونا میں ایک گدھا لایا گیا تھا مگر اب وہاں کوئی گدھا نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ گدھا ساحل پر آیا تو گاڑیوں میں جتے ہوئے گھوڑے گودی میں لپک پڑے۔ انھوں نے گدھا کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ ان کے لئے ایک بہت بیسے

کم نہ تھا۔ اس کے علاوہ گدھا بار برداری کے کام کے لئے بھی یہاں مفید ثابت نہ ہوا۔ ممکن ہے سہمے ہوئے گھوڑوں نے گدھے کو بھی ڈرا دیا ہو۔

یہ باتیں دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے کی ہیں۔ جنگ کی وجہ سے یہاں بھی کچھ تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔ یہاں کے تقریباً ایک درجن نوجوان جنگ پر گئے تھے اور ان میں سے ابھی تک ایک بھی واپس نہیں آیا ہے۔ مجھے ایک دو ایسے چرواہوں سے ملنے کا موقعہ ملا جو ساحل کی پاسبانی کرنے والے سپاہیوں کی خاکی جیکیٹس پہنے ہوتے تھے۔ انھوں نے آبنائے میں تیرتی ہوئی سرنگوں کو رائفلوں سے اڑانے کے واقعات بیان کئے۔ ہوم گارڈ کے بیس سپاہی صبح شام گشت لگاتے تھے جنگ سے پہلے آئیونا میں ٹوئیڈ کی قسم کا کپڑا بننے کے لئے صرف ایک ہی جلاہا تھا لیکن آج کل وہاں کوئی جلاہا نہیں۔ ایک بھورے رنگ کے چوگوشیہ بادبان والی کشتی کے بجائے اب ایک موٹر بوٹ مسافروں کو لاتی اور لے جاتی ہے۔ یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد بہت کم ہے۔ گولف کا ایک ایسا قدرتی میدان جس سے بہتر میدان ملنا مشکل ہے یہاں بیکار پڑا ہے اور کوئی کھیلنے والا موجود نہیں۔

پرانی گرجا کی مرمت کا کام جاری ہے۔ یہ گرجا یہاں کے ہی پتھروں سے بنا ہے اور وہ پتھر ایسے ہی بے ترتیب ہیں جو پتھر کی دیواروں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا رنگ گلابی اور ارغوانی ہے۔ گرجا کے صحنوں میں اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، ناروے اور فرانس کے بادشاہ دفن ہیں۔ یہاں ان کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور گھاس میں چھپے ہوئے قبروں پر لگے ہوئے پتھر ان کی تائید کرتے ہیں۔ یہی نہیں یہاں پر اس جنگ کے بھی آثار پائے جاتے ہیں۔ ان پرانی قبروں سے تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر ان

گم نام تاجر ملاحوں کی قبریں ہیں جو ۱۹۴۰ء میں یہاں کنارے پر آگئے تھے

دوسرے مقامات کی طرح آیئونا کی پرانی تاریخ اور جدید تاریخ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں وہ لوگ جو سازوں پر لعنت بھیجتے تھے اور انھیں شیطان کی آوازیں کہتے تھے اب ریڈیو سنتے ہیں۔ وہ لوگ جو آج کل ہر جھونپڑی میں پانی پہنچانے کے لئے پائپ لائن بچھا رہے ہیں ان لوگوں کی یادگاروں کو دیکھتے ہیں جو اُن سے ایک سال پہلے گزرے ہیں۔ جہاں کبھی تیل کے پمپوں کے علاوہ کسی اور چیز کی روشنی نہیں ہوا اب وہاں بجلی کی روشنی پھیلنے والی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جو تبدیلیاں یہاں واقع ہوچکی ہیں یا آئندہ واقع ہونے والی ہیں انھوں نے خود یہاں کے رہنے والوں میں بہت کافی تبدیلی پیدا کردی ہے۔

جیمز لنسڈیل ہوڈس

(ترجمہ)

پودوں کی کہانی پروفیسر محمد سعید الدین صاحب ایم اے۔ بی الیس سی۔ ایف آر اے الیف الیف سی الیس الیف ایل سی۔ صدر شعبۂ نباتیات جامعۂ عثمانیہ و معتمد شعبۂ سائنس ادارۂ ادبیات اُردو جیسے اعلیٰ ماہر فن نے عوام اور بچوں کے لئے یہ کتاب نہایت سلیس اور سادہ زبان میں مرتب کی ہے پودوں کی زندگی کے مختلف مدارج کو کئی ابواب میں تقسیم کرکے بہت خوبی کے ساتھ ان کے نشو ونما کو سمجھایا گیا ہے۔ تقریباً ہر صفحہ پر تصویریں درج ہیں صفحات (۸۰) قیمت

عرب اور عربستان شعبۂ ادبیات اطفال کی طرف سے یہ باتصویر کتاب شائع کی گئی ہے محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت دلچسپ سلیس انداز میں مرتب کیا ہے تقریباً ہر صفحہ پر تصویر دی گئی ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت صرف ۱۰/

لال باغ

میسور سے دس میل کے فاصلے پر سرنگاپٹم کے جنوب مشرق میں دریائے کاویری ایک مختصر سا ٹاپو بناتا ہے۔ یہی ٹاپو وہ لال باغ ہے جس میں ٹیپو سلطان نے کابل اور قندھار سے نادر درخت منگا کر لگائے تھے۔ کہتے ہیں کہ انھیں پانی کی جگہ دودھ دیا جاتا تھا۔ شاہی بیگمات نقاب چہروں پر ڈالے ہوئے اس باغ کی سیر کرتی تھیں۔ لال باغ اپنی خوبصورتی میں بہت مشہور تھا۔ کیونکہ اس کا چپّہ چپّہ سلطان کے ذوقِ تعمیر کا آئینہ دار تھا۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ سلطان نے لال باغ میں ایک محل بھی تعمیر کیا تھا۔ اب اس کا کوئی نام و نشان باقی نہیں ہے۔ اس محل کی بنیاد حیدر علی نے رکھی تھی۔ مگر وہ اس کی تکمیل تک زندہ نہیں رہ سکا۔ اور ٹیپو ہی نے اسے مکمل کیا۔ گو یہ محل چونے گارے کا تھا۔ مگر اس پر کافی روپیہ صرف ہوا تھا اور جنوبی ہند میں اس پائے کی اس وقت کوئی اور عمارت نہیں تھی۔ لوگ ایک عظیم الشان محراب دار دروازے سے داخل ہوتے تھے، جو اپنی بناوٹ کی سادگی کے باوجود بہت پُرشکوہ تھا۔ چبوترے کی سیڑھیوں سے ایک سیدھا راستہ مقبرہ تک جاتا ہے۔ جس کے دونوں طرف اشجار کھڑے ہیں۔

باغ میں داخل ہوتے ہی ہم کو ایک نوبت خانہ نظر آتا ہے۔ کسی وقت میں شہزادگان اور امرائے سلطنت کی شاہانہ دعوتوں کے موقع پر اس نوبت خانے سے سازوں کی خوش آئند صدائیں بلند ہوا کرتی تھیں۔ مگر آج روزانہ صرف طلوع و غروب آفتاب کے وقت حیدر علی اور اس کے بہادر فرزند کی یاد تازہ کرنے کے لئے نقارہ بجتا ہے۔ یہاں ایک اداسی چھائی رہتی ہے یہی وہ سابق جنت ارضی ہے جو کبھی کبھی قہقہہ زار بنا رہتا تھا اور جو اب اپنی افسردہ فضا کے آغوش میں موت کی خوابگاہ معلوم ہوتا ہے۔ سرو کے مغموم اشجار مایوسی کے

عالم میں سر جھکائے کھڑے ہیں۔ ان کی شاخوں میں قمریوں نے آشیانے بنا لئے ہیں۔ اور اپنی پکاروں سے باغ میں دردناک سماں طاری کر دیتے ہیں۔ دریائے کاویری اس کی تباہ حالی پر آنسو بہاتا ہوا خاموشی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔

مقبرے کی عمارت ٹیپو سلطان نے اپنے باپ کی یادگار میں تعمیر کروائی تھی۔ بعد میں اس کی ماں اور وہ خود بھی اسی جگہ دفن ہوئے۔ یہ ایک وسیع سفید عمارت جس کے سر پہ ایک گنبد تاج کی مانند دھرا ہے۔ جس کے چاروں گوشوں پر چار مینار ہیں۔ میناروں پر خاص قسم کا چمکدار سیاہ پتھر لگایا گیا ہے، جو ریاست میسور کے تمور ڈسٹرکٹ کی چٹانوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ میناروں کے علاوہ پیڑی کا ایک حصہ بھی اسی خوبصورت پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اندرونی حصہ میں دیواروں اور چھت پر خوبصورت بیل بوٹے اور ٹیپو سلطان کے شاہی نشان شیر کی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔

گنبد سنگ مرمر کا نہیں ہے بلکہ اینٹوں اور چونے کی استرکاری کر کے بنایا گیا ہے۔ ایک وسیع اور خاموش کمرے کے اندر ایک بیش قیمت ریشمی شامیانے کے سائے میں جس پہ سونے کا کام ہے تین قبریں ہیں۔ حیدر علی کی قبر درمیان میں اس پر زرد رنگ کا دوشالہ پڑا ہوا ہے۔ ٹیپو کی قبر پر سرخ رنگ کا شال ہے اور ٹیپو کی ماں کی قبر پر گلابی رنگ کا شال ہے۔ تاریخ اس خاتون کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی جس نے ٹیپو سلطان جیسے بہادر اور زبردست انسان کو پیدا کیا۔ ہر قبر پر مورچھل لگا ہوا ہے جس کے سائے میں سینۂ مرقد پر گلاب اور زرد یاسمین کے پھول اپنی خوشبو سے عطر بیزی کرتے رہتے ہیں۔

سید محمد احسن الدین

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ دو آنے

سب رس

بچوں کے لئے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
زیر ادارت
معین الدین احمد انصاری

جلد ۱۰	بابت ماہ نومبر ۱۹۴۶ء	شمارہ ۱۱

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ) کے اہتمام سے محمودیہ مشین پریس میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شائع ہوا۔

باشندگان ہند کے نام شہریارِ دکن و برار اعلیٰحضرت بندگان عالی کی اپیل

جس منصب پر میں فائز ہوں اس کے اقتضا کے مطابق میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ ہماری تاریخ کے موجودہ نازک وقت میں اپنے ہم وطنوں کو اور خاص کر شمالی ہند کے رہنے والوں کو جہاں نہایت دردانگیز اور ہولناک واقعات رونما ہورہے ہیں، مخاطب کرکے یہ چند کلمے کہوں۔

ف - ہمارے مذہبی یا سیاسی اختلافات چاہے جو کچھ ہوں مگر ان المناک واقعات نے ہم سب کے دلوں کو خوف اور نفرت کے جذبات سے لبریز کردیا ہے۔ جو لوگ اس بے معنی برادرکشی اور خوں ریزی میں مبتلا ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک قدیم اور عظیم الشان ملک کے رہنے والے اور ایک دوسرے کے برادر شہری ہیں اور یہ وہ ملک ہے کہ جس کے سامنے ایک بڑا اور شان دار مستقبل ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کوئی ایک فرقہ کسی دوسرے فرقے کو نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ خود اپنے آپ کو اور مجموعی حیثیت سے ہندوستان کو بھی دائمی نقصان پہونچائے اور وہ اس کا بھی خیال نہیں کرتے کہ خدا معاف نہیں کرتا اُن لوگوں کو جو بے گناہ مرد، عورت اور بچوں کا خون بہاتے ہیں۔

ف - ہندوستان کی تاریخ کے اِس نازک موقع پر ہر ایک وطن پرست شہری کا عین فرض ہے کہ وہ ہندوستان کو اس بے رحمی کی مصیبت سے بچائے اور اس کو ایک ایسے راستے پر چلنے سے ہٹائے جس کا انجام ہلاکت ہے اور اس طرح اس کو خود اپنی نظروں میں اور دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہونے سے محفوظ رکھے۔

ف - اس موقع پر حکومت کا جو فرض ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ امن وامان کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے اور ممکنہ ذرائع سے کم زور اور بے بس افراد کی حفاظت کی جائے۔

آخر میں میری یہ دلی دعا ہے کہ خداوندعالم اپنے لطف وکرم سے ہندوستان کے تمام باشندوں کو امن وچین اور خوش حالی نصیب کرے۔

شیر شاہ سوری

شیر شاہ سوری کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا یہ وہی شیر شاہ سوری ہے جس کی وجہ سے
ہمایون کو ہندوستان چھوڑنا پڑا تھا۔ یہ نہایت بہادر اور رحم دل بادشاہ گزرا ہے۔
ؤ آج تمہیں اس کے متعلق کچھ سناتے ہیں۔ ہم تمہیں پہلے اس کے اخلاق و
عادات سے واقف کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔

شیر شاہ بڑا نمازی اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ بہت صاف گو اور بلند ارادوں کا
لک تھا۔ جس کام کے کرنے کا شیر شاہ خیال کرتا اس کو تکمیل کو پہنچا کر ہی دم لیتا اور
پھر اس کو دنیا کی کوئی طاقت اس ارادہ سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ شیر شاہ نہایت ہی
منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس کی فطرت میں تعصب نام کو نہ تھا۔ یہ ہندو اور مسلمان
دونوں کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کی حکومت میں ہندو رعایا بہت ہی آرام اور چین
سے زندگی بسر کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے۔ اسی طرح شیر شاہ
کا سلوک بھی رعایا کے ساتھ تھا۔

اچھا اب ہم تمہیں شیر شاہ کی رواداری کی دو چھوٹی چھوٹی مزے دار کہانیاں سناتے ہیں
شیر شاہ کے زمانے میں کڑے کے حاکم نے مندر کو توڑ کر مسجد بنوادی تھی جس سے ہندو
رعایا ناراض تھی۔ شیر شاہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اس حاکم کو نہ صرف معزول
ہی کیا بلکہ اسے قید بھی کر دیا اور از سر نو حکومت کے خرچ سے نیا مندر تعمیر کر دیا گیا۔

اس زمانے کا دوسرا قصہ یہ ہے کہ :-

چندیری رائے سین کا قلعہ بہت مشہور تھا اور یہاں کے حاکم کا نام پورن مل تھا۔

پورن مل نے مسلمانوں پر انتہائی مظالم توڑ رکھے تھے۔ مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو پکڑ کر بازاروں میں نچواتا تھا۔ جب شیر شاہ سوری کو اس کی خبر ملی تو وہ ۱۵۴۳ء میں اس کی سرکوبی کے لئے آیا۔ پورن مل بھی بڑا چالاک اور ہوشیار حاکم تھا۔ اس نے فوراً قلعہ خالی کر دیا اور قیمتی جواہرات شیر شاہ کے سامنے پیش کرکے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ شیر شاہ نے اس کی عاجزی اور انکساری کو دیکھ کر اس کی جان بخش دی۔ رعایا ادھر تُلی ہوئی تھی کہ پورن مل کو قتل کر دیا جائے مگر کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ بادشاہ سے کہہ کر پورن مل کو قتل کرا دے۔

لیکن جب شیر شاہ چندیری میں داخل ہوا تو معزز خاندان کی زخم خوردہ عورتیں بادشاہ کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں اور انھوں نے شیر شاہ سے کہا کہ جب تو ہماری عزت اور عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتا تو تجھے بادشاہ بننے کا کوئی حق نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ سفاک پورن مل نے ہمارے شوہروں اور عزیزوں کو بے قصور تہ تیغ کر دیا اور ہم کو لونڈیاں بنایا، ہماری بہو بیٹیوں کی بے حرمتی کی۔ ہمارا مال ہماری دولت اور ہماری عزت اس بے حیا نے چھین لی لیکن آج تو صرف دولت اور مال کی خاطر اپنے انصاف کو بھول رہا ہے۔

یہ سن کر شیر شاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور ان مظلوم عورتوں کو تسلی دیتے ہوئے اس بات کا انہیں یقین دلایا کہ سب کچھ ٹھیک کر دیا جائے گا۔ بادشاہ نے اپنے لشکر کے چند اچھے افسروں کو طلب کرکے یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ میں نے پورن مل کی جاں بخشی کا وعدہ کر لیا ہے۔ اب یہ عورتیں چاہتی ہیں کہ ایسا نالائق اور کمینہ انسان قتل کر دینے کے قابل ہے۔ آپ لوگ اس کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں۔

تمام علماء نے اس سفاک کے قتل کا فتویٰ دے دیا چنانچہ اس کو قتل کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ شیر شاہ سوری کی زندگی میں اس قسم کے واقعات اکثر و بیشتر پیش آئے مگر اس نے حکومت کے کاموں میں مذہبی اختلاف کو جگہ نہیں دی۔

سعدی تسکین

میری بہادری

شورا پور ایک پہاڑی مقام ہے اور ہمارا مکان ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ ہمارے
سے تھوڑی ہی دور پر ایک پہاڑی ہے۔ اس کے نیچے ایک جھیل ہے۔ یہ مشہور ہے کہ
ں پریوں کا قبضہ ہے اس لئے لوگ وہاں جانے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ امی اور ابا اکثر
تے جایا کرتے ہیں مگر ان کو کوئی بات دکھائی نہیں دی۔ ایک دن صبح کا وقت تھا ہماری
، چار سہیلیاں جمع تھیں۔ باتوں باتوں میں بہادری کا بھی ذکر آیا۔ نجمہ بولی اچھا
و تم میں سے کون اس جھیل پر جا سکتی ہے؟ شریر عذرا بولی "شمیم سے کہو یہ بہت
ں رہتی ہیں کہ جن اور پری کوئی چیز نہیں ہم جب جانے جو وہاں تک چلی جائیں"۔
نے بھی منہ بنا کر کہا: "آہا۔ بڑی جائیں گی یہ"۔ میں بولی "کیوں نہیں میں اکیلی
سکتی ہوں مگر رات کو نہیں کیونکہ سانپ، بچھو کا ڈر ہے"۔ اس پر تسنیم بولی "ہاں بھئی
ت کو نہیں"۔ "اجی، آج ہی دوپہر کے کھانے کے بعد سہی"۔ عذرا نے کہا "ہاں ہاں
ج ہی دوپہر کو ہی"۔ سب ایک دم بول اٹھیں۔ پھر نجمہ نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا "اجی
ن کا منہ تو دیکھو جائیں گی پھر"۔ سب نے قہقہہ لگایا اب تو مجھے غصہ آگیا اور میں تن کر
اگر نہ جاؤں تو اڑانا مذاق مگر ابھی سے آپ کو مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں"۔ پھر
ں میں سوچنے لگی کچھ بھی ہو آج ضرور جاؤں گی۔ مگر وہاں کی تنہائی کا خیال کر کے
سم میں کپکپی سی پیدا ہو گئی اور اس کو چھپانے کے لئے میں ہنسنے لگی۔ پھر سوچا یہیں کہیں
ے پتھر کے پیچھے چھپ جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہو آئے۔ مگر تو یہ ہماری سہیلیاں
یں ایسی بے وقوف تھوڑی تھیں تجویز یہ ہوئی کہ تین کیلے اور ایک چھوٹی صراحی

ہم کو دی جائے تاکہ وہاں گاڑ کر صراحی میں پانی لاؤں۔ مجھے ہاں کہنا ہی پڑا۔
پھر ہم سب نے کھانا کھایا اور تیمن کیلیے اور ایک صراحی لے کر ہم باغ میں آئے۔
میں نے سب سے پوچھا اچھا تو مجھے کیا ملے گا۔ تو کہنے لگیں انعام میں ایک پُرتکلف
دعوت ملے گی۔ میں نے کہا اچھا مگر اس دعوت میں تم سب کو بہادری یا ہمت پر تقریر
کرنی ہو گی۔ اس پر وہ راضی ہو گئیں اور ہم آگے روانہ ہوئے۔ بہت دور تک تو مجھے
بالکل ڈر نہیں لگا۔ لیکن جب میں نے پہاڑی اترنا شروع کی تو وحشت ہونے لگی۔
خود رو گھاس سے راستہ چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ پتّہ کھڑکا
اور دل دھڑکا۔ میں نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کی اور قدم نہ روکے آگے
بڑھتی چلی گئی۔ کالے رنگ کی ایک چڑیا اکثر ہمارے باغ میں سیٹی بجایا کرتی ہے۔
مجھے اس کی سیٹی اتنی اچھی لگتی تھی کہ پہروں سنا کرتی۔ مگر اب جو سیٹی کی آواز سنی تو
میں بہت ڈری اور اللہ آمین کرنے لگی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اتنے میں
جھیل کا نیلا اور کچھ ہرا پانی نظر آیا۔ میں اللہ کا نام لے کر آگے بڑھی اور صراحی میں
پانی بھرنا شروع کیا لیکن کیلیے گاڑنے کا خیال دل سے نکل گیا اب جو اٹھنا چاہتی ہوں تو ایسا
معلوم ہوا کہ پیچھے سے کسی نے میرا دامن پکڑ لیا ہے۔ اب تو میں دھک سے رہ گئی۔
میرے منہ سے چیخ نکل گئی ایک دم اٹھی اور پیچھے جو دیکھا تو میرا دامن ایک خاردار جھاڑی
میں الجھا ہوا ہے۔ اب ذرا جان میں جان آئی اور صراحی لے لی اور بے تحاشا بھاگنا
شروع کیا جب میں پہاڑی پر سے اتر رہی تھی تو مجھے اپنا باغ نظر آ رہا تھا اور اب مجھے
ڈر کچھ زیادہ نہیں ہو رہا تھا مگر میں بے تحاشہ بھاگتی ہی گئی۔ ایک طرف سے ہنسنے کی
آواز آئی میں نے پیچھے جو مڑ کر دیکھا تو بی نجمہ ایک پتھر کے پیچھے سے نکلیں۔ ان کے پیچھے

بانو پھر نسیم اور عذرا سب ہی میرے قریب آگئیں اور خوب زور سے قہقہے لگانے لگیں۔ میں بدحواس تو پہلے ہی سے تھی ان لوگوں کے قہقہوں سے کھسیانی سی ہو گئی۔ بانو بول اٹھی اجی جناب دوپٹہ کہاں ہے اور عذرا نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بڑی مشکل سے ہنسی روک کر کہا "اور صراحی کو تو دیکھو" اب تو سچ ہیں بھی بہت ہنسی آئی بدحواسی میں دوپٹہ کہیں گر گیا تھا اور صراحی کسی پتھر سے لگ کر آدھی جھڑ چکی تھی۔ خیر ہم ہنستے ہوئے گھر آئے دوسرے دن ہمارے جانے کی تصدیق ہوئی اور جب سچ نکلا تو ایک شاندار دعوت ہوئی جس میں تسنیم نے نظم اور سب نے تقریریں کیں۔

سلطان جہاں بیگم (شوراپور)

ذرا ہنسیے!

(۱) ایک بوڑھی عورت راستے سے جا رہی تھی راستے میں وہ ایک سیکل سے ٹکرا گئی۔ سیکل سوار کے ڈاڑھی بھی تھی۔ بوڑھی نے کہا کہ "اتنی بڑی ڈاڑھی رکھ کر ٹکر دیتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی"۔ اس آدمی نے کہا "یہ ڈاڑھی ہے، بریک تھوڑا ہی ہے"

(۲) ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو چور کسی مکان میں چوری کرنے کے لئے گئے۔ وہاں ایک چور سے کوئی چیز ٹکرا گئی تو اس نے کہا "میاؤں میاؤں"۔ مالک مکان سمجھا کہ بلی ہو گی۔ اتفاق سے دوسرے کی بھی کسی چیز سے ٹکر ہوئی، وہ گھبرا گیا کہ کیا کرے جب کچھ بن نہ پڑا تو بولا "میں دوسری بلی ہوں"۔ مالک مکان سمجھ گیا اور ان دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

سیدہ غزالی

نیا سال

آیا پھر سے سال نیا ہے

چہک رہے ہیں بلبل سارے | مہک رہے ہیں گلشن سارے
آؤ ہم اس خوشی میں گائیں | گزری ہوئی باتوں کو بھلائیں

گزری ہوئی باتوں کا غم کیا ہے
آیا پھر سے سال نیا ہے

آج کریں گے عہد یہ ہم سب | جی لگا کر پڑھیں گے ہم سب
کہا سنیں گے بڑوں کا ہم سب | کہیں وہ جو کریں گے ہم سب
ماں باپ کی خدمت کرینگے ہم سب | رکھیں گے راضی ان کو ہم سب
گلے سب کو لگائیں گے ہم سب | سب کو ایک بنائیں گے ہم سب
ہندو ہوں یا مسلم ہم میں | سب سے مل کر رہیں گے ہم سب
سوئے ہوؤں کو جگائیں گے ہم سب | غیروں کو اپنا بنائیں گے ہم سب
خدا کی پوجا کریں گے ہم سب | دعا خدا سے کریں گے ہم سب
رہے سلامت شاہ ہمارا | پھولے پھلے یہ ملک ہمارا
اپنے وطن کی الفت میں سب | خون پسینہ کریں گے ہم سب
سالِ نو کی خوشیاں منائیں | رامؔ کی گیتیں مل کر گائیں

آیا پھر سے سال نیا ہے
آیا پھر سے سال نیا ہے

رام چندر ا ریڈی رامؔ

ہر دل عزیز

ہر دل عزیز ہونا ہر ایک انسان کے اپنے اختیار میں ہے، ہر شخص ہر دل عزیز بن سکتا ہے۔ بعض آدمی یہ خیال کر لیتے ہیں کہ دوسرے شخص کو سب لوگ بہت چاہتے لیکن ہمیں کون چاہے گا۔ ہم غریب ہیں اور بدصورت بھی۔ اُن کا یہ خیال غلط ہے۔ وہ چاہے بدصورت ہوں یا غریب لیکن محبت کی باتیں ہر ایک کا دل موہ لیتی ہیں اور ایسی باتیں کرنے والا بہت جلد ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔ دوست جب کبھی پکنک کے لئے جاتے ہیں اور وہ شخص ساتھ نہ ہو جس سے محفل کی رونق ہے۔ تو انھیں پکنک میں بھی لطف نہیں آتا۔

جہاں وہ شخص بیٹھتا ہے اس کی چاروں طرف دوست جمع ہو جاتے ہیں۔
یہ کیوں؟ اس کی محبت نواز باتوں اور مذاق سے سب دوست اس سے خوش رہتے ہیں۔

ہم بھی کیوں نہ کوشش کر کے دوستوں میں ہر دل عزیز بن جائیں۔ یہ کوئی ایسی مشکل بات بھی نہیں جو آدمی کے بس میں نہ ہو۔ ہم اگر کسی سے روکھے پن سے بات کریں گے تو اس کا دل کیونکر خوش ہو گا۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہر ایک سے محبت سے ملیں اور محبت سے باتیں کریں۔ اتنی باتیں بھی نہ کریں کہ دوست اکتا جائیں۔ ہر ملنے والے کی عادت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اگر وہ کم سخن ہے تو اس سے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں، اگر وہ مذاق کا دلدادہ ہے اور خوب باتیں کرنا پسند کرتا ہے۔ تو ہمیں بھی اس سے اس کی خوشی کے اور مذاق سے متعلق باتیں کرنی چاہئیں۔ ہر ایک دوست کی عادات و اطوار سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم سے کوئی بھی ملے تو ہمیں گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کرنا چاہئے اور اس طرح ملنا چاہئے کہ

معلوم نہ ہو کہ یہ پہلی ملاقات ہے۔ اور محبت سے باتیں کرنا چاہئے۔ ! اگر ہم اپنے دوست احباب اور رشتہ داروں کے مزاج کے مطابق کام کریں گے اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کریں گے تو بہت جلد ہر دل عزیز ہو جائیں گے اور ہر شخص ہم کو پسند کرنے لگے گا۔

کے۔ سلطان حور

کالے بادل

کالے بادل آتے ہیں جب کالے بادل آتے ہیں
من میرا بر ماتے ہیں تب من میرا برماتے ہیں

بجلی بھی کڑکی کڑ کڑ کم
بادل پھر گرجے اُس ہی دم
بادل شور مچاتے ہیں۔ لو، بادل شور مچاتے ہیں

کوئل اپنی کوک بھلا کر
مور بھی ہائے شور مچا کر
گیت خوشی کے گاتے ہیں لو گیت خوشی کے گاتے ہیں

ننھی بوندیں پتے دھو کر
پنچھی بھی بے خود سے ہو کر
دنیا نئی بساتے ہیں لو دنیا نئی بساتے ہیں

کالے بادل آتے ہیں جب کالے بادل آتے ہیں
من میرا بر ماتے ہیں تب من میرا برماتے ہیں

روشن لال نادان (پٹھانکوٹی)

جاذب

پرانے زمانے میں لوگ سیاہی کو خشک کرنے کے لئے حرفوں پر ریت بکھیرا کرتے تھے۔ اس طرح سیاہی خشک ہو جاتی تھی۔

اگر ایک سست اور کاہل مزدور کی غلطی سے جاذب ایجاد نہ ہوتا تو ہم کو بھی سیاہی خشک کرنے کے لئے ریت بکھیرنی پڑتی تھی۔

انیسویں صدی کے شروع میں ولایت کے ایک شہر "برگ شائر" میں کاغذ کا ایک کارخانہ تھا۔ ایک دن ایک مزدور سے کاغذ بنانے کے گودے میں ایک ایسی دوائی ڈالنا بھول گیا جس سے کاغذ میں ملائمت آتی ہے۔

جب مالک پھرتا پھراتا آنکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ نوکر گھبرایا ہوا ادھر سے اُدھر بھاگ رہا ہے۔ پاس جاکر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گودے میں ایک ایسی دوائی ڈالنا بھول گیا ہے جس سے کاغذ ملائم ہوتا ہے۔ مالک کو سخت غصہ آیا مگر کیا کر سکتا تھا۔ قلم، دوات لے کر شہر کے اخباروں میں نوکروں کی بے وقوفی اور لاپرواہی پر ایک مضمون لکھنے بیٹھ گیا۔ مالک نے کہا کاغذ لاؤ۔ اب کارخانے کے مزدور بہت گھبرائے۔ کیونکہ کارخانے میں اس ناقص کاغذ کے سوا اور کوئی اچھا کاغذ نہ تھا۔

آخر ناچار مالک نے اسی ناقص کاغذ پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر اس نئے کاغذ پر جونہی پہلا لفظ لکھا۔ سیاہی چاروں طرف پھیل کر سوکھ گئی۔ مالک نے سوچا کہ اگر اس کاغذ سے سیاہی چوسنے کا کام لیا جائے تو شاید فائدہ مند ہو۔

تجربہ کرنے پر معلوم ہوا کہ بات ٹھیک ہے۔ مالک نے اس کاغذ کا نام "جاذب" رکھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے مسامات ہوتے ہیں جن کے باعث سیاہی کو جذب کرتا ہے۔ رام چندر اریڈی

خوب تربوز خریدے

ایک مرتبہ ایک غریب کنجڑے نے چھے آنے کے تربوز خریدے اور ان کو بازار میں فروخت کرنے کے لئے لے گیا۔ راستے میں چوکی پر کچھ پیسے بطور محصول دینے پڑے۔ چنگی کے منشی کا دل تربوز کھانے کو چاہا تو اس نے کنجڑے کے ٹوکرے میں سے ایک تربوز اٹھالیا۔ کنجڑے نے نہایت عاجزی سے کہا "جناب تمام تربوز فروخت کرنے کے بعد یہی تربوز میں مجھ کو نفع ملتا ہے جو آپ نے لے لیا ہے، میں غریب آدمی ہوں خدا کے لئے مجھ پر رحم کھائیے اور یہ تربوز واپس دیدیجئے۔

بے چارے کنجڑے کو تربوز تو کیا ہی واپس ملتا بلکہ چپراسی نے بھی ایک تربوز چھین لیا اور کنجڑے کو دھتکار دیا۔

غریب آدمی روتا ہوا بازار کی طرف چل دیا۔ اسی راستے میں جہاں کنجڑا روتا ہوا جا رہا تھا، شہر کے مجسٹریٹ صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے کسی ضروری کام سے جا رہے تھے۔ انھوں نے جو کنجڑے کو روتے ہوئے دیکھا تو ان کو اس پر بڑا رحم آیا۔ فوراً گاڑی روکی اور کنجڑے کو پاس بلا کر رونے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے تمام واقعہ بیان کردیا۔ صاحب کو منشی اور چپراسی کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ کنجڑے کو اس گاڑی میں بٹھا کر چوکی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ چوکی پر پہنچے تو منشی جی اور چپراسی کنجڑے کو صاحب کے ساتھ دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوئے اور بہت ادب سے مجسٹریٹ صاحب کو سلام کیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے غصہ میں سلام کا جواب بھی نہیں دیا اور کنجڑے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ بتاؤ کس نے تمہارا تربوز لیا ہے؟

کنجڑا۔ حضور ایک ان منشی جی نے اور ایک ان چپراسی صاحب نے۔
مجسٹریٹ (منشی جی اور چپراسی کی طرف مخاطب ہو کر) "کیا تم نے اس کے تربوز لئے ہیں؟"
منشی جی اور چپراسی " جی حضور"
مجسٹریٹ۔ کیا ان کی قیمت ادا کر دی ہے؟
منشی جی۔ نہیں حضور۔
مجسٹریٹ۔ کیوں؟
چپراسی۔ حضور ہم نے اس سے کہہ دیا تھا کہ باقی تربوز اور جگہ فروخت کر کے جس قیمت پر وہ بکیں وہی قیمت ہم سے لے لینا۔
مجسٹریٹ۔ (کنجڑے سے) کیا انھوں نے تم سے ایسا کہا تھا۔
کنجڑا۔ نہیں حضور یہ تو مجھ سے نہیں کہا۔
مجسٹریٹ صاحب تمام معاملے کو سمجھ گئے اور پھر کنجڑے سے مخاطب ہو کر کہا) اچھا تمہارے پاس اب کتنے تربوز باقی ہیں؟
کنجڑا۔ حضور چار ہیں۔
مجسٹریٹ۔ اچھا ہم ایک تربوز چار روپے کو لیتے ہیں۔ (منشی جی اور چپراسی سے) تم بھی چار چار روپے دو۔ (منشی جی اور چپراسی) حضور یہ تو بہت ہیں۔
مجسٹریٹ۔ کوئی پروا نہیں۔ تم کو اتنا ہی دینا ہوگا۔ تم نے کہا تھا کہ جو قیمت اور کہیں ملے گی وہی ہم دیں گے۔
مجسٹریٹ صاحب نے چار تربوزوں کی قیمت سولہ روپے دی اپنی طرف سے اور دو تربوزوں کی قیمت آٹھ روپے منشی جی اور چپراسی کی طرف سے کنجڑے کو دے دی۔

کنجڑا چوبیس روپے لے کر رحم دل مجسٹریٹ کو دعائیں دیتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا مہینے کے آخر میں منشی جی اور چپراسی کی تنخواہوں میں سے چار چار روپے کاٹ دئے گئے۔ منشی جی کی تنخواہ پندرہ روپے تھی ان کو گیارہ روپے ملے اور چپراسی کی تنخواہ سات روپے تھی اس کو صرف تین ہی روپے ملے۔

سب رسی بھائیو اور بہنو! اس قصے سے دو نتیجے نکلتے ...... ہیں کہ جب کوئی بڑا آدمی بن جائے تو اس کو مجسٹریٹ صاحب کی طرح عدل و انصاف سے کام لینا چاہیئے دوسرے یہ کہ کبھی کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہیئے۔ جو کسی کو نقصان پہونچانا چاہتا ہے تو وہ خود ہی نقصان اٹھاتا ہے۔ اس لئے بھول کر بھی کسی کو تکلیف نہ دو بلکہ مجسٹریٹ صاحب کی طرح غریبوں کی مدد کرو تاکہ وہ دعائیں دیں۔

سیّدہ غزالی

باتیں - بچوں کی دلچسپی اور ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے مجلس ادبیات اطفال ادارۂ ادبیات اُردو نے جن مفید کتابوں کا سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کی چوتھی کڑی ہے۔ مولوی شجاع احمد صاحب قائد نے بڑے مزے مزے کی باتیں نئے انداز میں لکھی ہیں۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ صفحات ۴۸ قیمت ۲؎

کشمش نانی - یہ کتاب بھی ادارہ کے شعبۂ اطفال کی طرف سے بچوں کے لئے بطور خاص شائع کرائی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی شجاع احمد صاحب قائد نے اس کتاب میں پرانی طرز کی کہانیوں کو نئے انداز میں لکھا ہے جو دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ اس میں کئی دیدہ زیب تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی زینت بڑھ گئی ہے۔ صفحات ۸۰ قیمت ۱۰/

دلچسپ معلومات

سورج ہم سے ۹ کروڑ میل دور ہے۔

چاند ہم سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے۔

زمین ایک گھنٹے میں ۸۰ ہزار میل کے قریب گردش کرتی ہے۔

ایک روپیہ بھر جگہ میں کم سے کم پانچ سیر ہوا ضرور ہوگی۔

اصل میں دنیا میں رنگ صرف تین قسم کے ہیں۔ سرخ، زرد اور سیاہ۔ باقی جتنے بھی رنگ ہیں مثلاً بنفشی، نیلگوں، آسمانی، سبز، نارنجی وغیرہ وہ سب انہی تینوں سے مل کر بنے ہیں اور سب رنگ مل کر سفید رنگ بنتا ہے۔

روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ نو ہزار میل کے قریب جاتی ہے۔

آواز ہوا میں (۱۱۰۰) گیارہ سو فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے گزرتی ہے۔

دھاتوں میں فولاد ہی سب سے زیادہ سخت اور مضبوط ہے۔ کوٹنے کے بعد پھیل جانے کی خاصیت میں سونا سب سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ایک مکعب انچ سونے کی ڈلی کوٹنے سے اس قدر پھیل جاتی ہے کہ ۵۰ فٹ لمبے اور ۴۰ فٹ چوڑے کمرے کو ڈھانک لے۔

ایک مکعب انچ پانی کا وزن (۲۵۲) گرین کے قریب ہوتا ہے۔

ٹھوس چیزوں میں ہیرا سب سے زیادہ سخت ہے۔ یہ ہر چیز کو کاٹ سکتا ہے اور اسے کوئی چیز کاٹ نہیں سکتی۔

ایک تندرست، بالغ انسان کے دل کا وزن ۸ سے ۱۱ اونس تک ہوتا ہے اور یہ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں ایک لاکھ مرتبہ حرکت کرتا ہے۔

انسان کے جسم میں (۵۰۰) سے زیادہ اعصاب اور ۷ لاکھ مسامات ہوتے ہیں۔

تندرست بچہ ۲ سال میں اپنے پیدائشی قد کا ڈیوڑھا ہو جاتا ہے۔

سید مراد علی طالع

شریر لڑکی

شور مچاتی ہے وہ اکثر!
گھر کو اٹھاتی ہے وہ سر پر
چین نہیں لیتی ہے دم بھر
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

مانگتی ہے وہ پیسہ پائی
اور لیتی ہے کوئی مٹھائی
سب کرتے ہیں اس کی برائی
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

اپنی زباں سے جو کہتی ہے
کام وہی کرتی رہتی ہے
دکھ دیتی ہے دکھ سہتی ہے
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

اس کی گھر بھر سے چھنتی ہے
ہر اک بات پہ وہ تنتی ہے
بگڑی تو پھر کب منتی ہے
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

اچھے کھانوں پر مرتی ہے
اپنی بات کا دم بھرتی ہے
ہر اک بات پہ ضد کرتی ہے
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

قینچی سی وہ زبان چلاتی
ایک کہو تو چار سناتی
باز شرارت سے نہیں آتی
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

شوق سے مکتب کب ہے جاتی
گھر کو سیدھی کب ہے آتی
اپنی شرارت ہے وہ دکھاتی
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

گو وہ محبت سے پلتی ہے
ماں کے کہے پر کب چلتی ہے
اپنی بات سے کب ٹلتی ہے
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

کہتے ہیں سب پگلی پگلی
رہتی ہے سب سے بدلی بدلی
پھرتی ہے ہر دم چچلی مچلی
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

ماں اور باپ سے کب ڈرتی ہے
کب ماں باپ کا دم بھرتی ہے
دل میں جو آتا ہے کرتی ہے
شریر لڑکی جو ہوتی ہے

جوہرؔ چاندوڑی